ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (للعہ) | بیرون ہند کے لئے (۸ شلنگ) | قیمت فی پرچہ ۸ر

11652

87

الجہاد فی الاسلام

تالیف

ابو الاعلیٰ مودودی

کتاب کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے اس کے صرف ایک باب (باب ہفتم) کی فہرست مضامین ملاحظہ ہو۔

جنگ اور تہذیب جدید

ماخذ کی تحقیق۔ بین الملی قانون (International Law) کی حقیقت۔ بین الملی قانون کے ماخذ۔ بین الملی قانون کا شعبۂ جنگ۔ مغربی جنگ کا اصلی قانون۔ ضروریات جنگ۔ قوانین جنگ کی ناپائداری۔ فوجی اور قانونی گروہ کا اختلاف۔

مقصد جنگ۔ جنگ عظیم کے اسباب و وجوہ۔ تمدن کی چند نمایاں شرکائے جنگ کے پوشیدہ مقاصد۔ تمدن جنگ عظیم کے معاہدے۔ جنگ کے بعد قوموں اور ملکوں کی تقسیم۔ مغرب کی حق پرستی کا معیار۔ قیام امن اور نزع سلاح کی تحریکیں۔ جمعیت اقوام۔ تحریم جنگ اور نزع سلاح کی جدید تجاویز۔

قوانین جنگ۔ مغربی قوانین جنگ کی تاریخ۔ ہیگ کے سمجھوتے اور ان کی قانونی حیثیت۔ اعلان جنگ۔ اہل قتال (Combatants) اور غیر اہل قتال کا امتیاز و وجوہ امتیاز۔ امتیاز کا احساس کب پیدا ہوا۔ دور جدید کی جنگ میں امتیاز ناممکن ہے۔ اہل قتال کے حقوق و فرائض۔ قواعد حرب کی پابندی۔ امان۔ اسیران جنگ۔ مجروحین و مرضیٰ و مقتولین۔ تباہ کن اسلحہ کا استعمال۔ جاسوسی۔ خدع فی الحرب۔ مقام غیر اہل قتال کے حقوق و فرائض۔ غیر مقاتلین کا اولین فرض۔ غیر مقاتلین کی عصمت۔ غیر محفوظ آبادیوں پر گولہ باری۔ مفتوحہ علاقے کے شہریوں کا حکم۔ احتلال (Occupation) اور اس کے قوانین۔ غارت گری اور تباہ کاری۔ غیر جانبداروں کے حقوق و فرائض۔

غیر جانبداری کی تاریخ۔ دور جدید میں غیر جانبداری کی حیثیت۔ محاربین (Belligerents) کے فرائض غیر جانبداروں کے متعلق۔ غیر جانبداروں کے فرائض محاربین کے متعلق۔ آخری تصویر مغربی قانون کے مقابلے میں اسلامی قانون کی برتری۔ دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے

فہرست مضامین

ماہ رجب ۱۳۵۳ھ جلد ۵ عدد ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

ماہ گزشتہ کے اشارات میں ان اثرات پر ایک مجموعی تبصرہ کیا گیا تھا جو دنیا کے مسلمانوں پر مغربی تہذیب کے استیلاء اور مغربی قوموں کے علمی اور سیاسی اقتدار سے رونما ہوئے ہیں، اس وقت ہمارے پیش نظر کسی خاص اسلامی جماعت کے حالات نہ تھے، بلکہ وہ حالات تھے جو تمام مسلمان قوموں میں عام ہیں۔ لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کی استثنائی حالت اس عمومی نظر کے علاوہ ایک خصوصی نظر بھی چاہتی ہے۔ اس لیے آج ہم خصوصیت کے ساتھ ان اثرات پر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں جو انگریزی علوم اور انگریزی تمدن و تہذیب کے غلبہ سے اسلامی ہند کی فکری اور عملی دنیا میں ظاہر ہوئے ہیں۔

دنیائے اسلام کا بیشتر حصہ ان ممالک پر مشتمل ہے جو صدر اول کے مجاہدین کی کوششوں سے فتح ہوئے ہیں۔ ان کو جن لوگوں نے فتح کیا تھا وہ ملک گیری اور حصول غنائم کے لیے نہیں بلکہ خدا کے کلمہ کو دنیا میں بلند کرنے کے لیے سر سے کفن باندھ کر نکلے تھے، وہ طلب دنیا کے بجائے طلب آخرت کے نشہ میں سرشار تھے، اس لیے انھوں نے اپنے مفتوحین کو مطیع و باجگزار بنانے پر اکتفا نہ کیا بلکہ انہیں اسلام کے رنگ میں رنگ دیا، ان کی پوری آبادی یا اس کے سواد اعظم کو ملت حنیفی میں جذب کر لیا، اور علم و عمل کی قوت سے ان میں اسلامی فکر اور اسلامی تہذیب کو اتنا راسخ کر دیا کہ وہ خود تہذیب اسلامی کے علم بردار اور علوم اسلامی کے معلم بن گئے۔ ان کے بعد وہ ممالک ہیں جو اگرچہ صدر اول کے بعد اس عہد میں فتح ہوئے جبکہ اسلامی جوش سرد ہو چکا تھا اور فاتحین کے دلوں میں خالص جہاد فی سبیل اللہ کی روح سے زیادہ ملک گیری کی ہوس نے جگہ لے لی تھی، لیکن اس کے باوجود اسلام وہاں پھیلنے اور جڑ پکڑ لینے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے

ان ممالک میں کلیتہً ایک قومی مذہب اور قومی تہذیب کی حیثیت حاصل کرلی۔

بدقسمتی سے ہندوستان کا معاملہ ان دونوں قسم کے ممالک سے مختلف ہے۔ صدر اول میں اس ملک کا بہت تھوڑا حصہ فتح ہوا تھا اور اس تھوڑے سے حصہ پر بھی جو کچھ اسلامی تعلیم و تہذیب کے اثرات پڑے تھے ان کو باطنیت کے سیلاب نے ملیامیٹ کردیا۔ اس کے بعد جب ہندوستان میں مسلمانوں کی فتوحات کا اصلی سلسلہ شروع ہوا، تو فاتحوں میں صدر اول کے سے مسلمانوں کی خصوصیات باقی نہیں رہی تھیں۔ انھوں نے یہاں اشاعت اسلام کے بجائے توسیع مملکت میں اپنی قوتیں صرف کیں، اور لوگوں سے اطاعت خدا و رسول کے بجائے اپنی اطاعت اور باج گزاری کا مطالبہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدیوں کی فرمانروائی کے بعد بھی ہندوستان کا سواد اعظم غیر مسلم رہا، یہاں کے اسلامی تہذیب جڑ نہ پکڑ سکی، یہاں کے باشندوں میں سے جنھوں نے اسلام قبول کیا ان کی اسلامی تعلیم و تربیت کا بھی کوئی خاص انتظام نہ کیا گیا، نومسلم جماعتوں میں قدیم ہندوانہ خیالات اور رسم و رواج کم و بیش باقی رہے، اور خود باہر کے آئے ہوئے قدیم الاسلام مسلمان بھی اہل ہند کے میل جول سے مشرکانہ طریقوں کے ساتھ رواداری برتنے، اور بہت سی جاہلانہ رسوم کا اتباع کرنے لگے۔

اسلامی ہند کی تاریخ اور اس کے موجودہ حالات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جس زمانہ میں اس ملک پر مسلمانوں کا سیاسی اقتدار پوری قوت سے چھایا ہوا تھا اس زمانہ میں بھی یہاں اسلام کے اثرات کمزور تھے، اور یہاں کا ماحول خالص اسلامی ماحول نہ تھا۔ اگرچہ ہندوؤں کا مذہب اور تمدن بالذات ضعیف تھا، اور ایک محکوم و مغلوب قوم کا مذہب و تمدن ہونے کی حیثیت سے اور بھی زیادہ ضعیف ہوگیا تھا، لیکن پھر بھی مسلمان حکمرانوں کی رواداری اور غفلت کی بدولت وہ ملک کے سواد اعظم پر چھایا ہوا رہا اور ہندوستان کی فضا پر اس کے مستولی ہونے اور خود مسلمانوں کی اسلامی تعلیم و تربیت مکمل نہ ہونے کی وجہ سے یہاں کے مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ اپنے عقائد اور اپنی تہذیب میں کبھی اتنا صحیح اور پختہ اور کامل مسلمان نہ ہوسکا جتنا وہ خالص اسلامی ماحول میں ہوسکتا تھا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں وہ سیاسی اقتدار بھی مسلمانوں سے چھن گیا جو ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا سب سے بڑا سہارا تھا۔ پہلے مسلمانوں کی سلطنت متفرق ہو کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوئی۔ پھر مرہٹوں اور سکھوں اور انگریزوں کے سیلاب نے ایک ایک کر کے ان ریاستوں میں سے بیشتر کا خاتمہ کر دیا، اس کے بعد قضائے الٰہی نے انگریزوں کے حق میں اس ملک کی حکومت کا فیصلہ صادر کیا، اور ایک صدی سے زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ مسلمان اس سرزمین میں مغلوب و محکوم ہو گئے جس پر انھوں نے صدیوں حکومت کی تھی۔ انگریزی سلطنت جتنی جتنی پھیلتی گئی مسلمانوں سے ان طاقتوں کو چھینتی چلی گئی جن کے بل پر ہندوستان میں اسلامی تہذیب کسی حد تک قائم تھی۔ اس نے فارسی اور عربی کے بجائے انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنایا، اسلامی قوانین کو منسوخ کیا، شرعی عدالتیں توڑ دیں، دیوانی اور فوجداری معاملات میں خود اپنے قوانین جاری کیے، اسلامی قانون کے نفاذ کو خود مسلمانوں کے حق میں صرف نکاح و طلاق وغیرہ تک محدود کر دیا، اور اس محدود نفاذ کے اختیارات بھی مسلمان قاضیوں کے بجائے عام دیوانی عدالتوں کے سپرد کر دیے جن کے حکام عموماً غیر مسلم ہوتے ہیں اور جن کے ہاتھوں "محمڈن لا" روز بروز مسخ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ انگریزی حکومت کی ابتدا سے یہ پالیسی رہی کہ مسلمانوں کو معاشی حیثیت سے پامال کر کے ان کے اس قومی فخر و ناز کو کچل ڈالے جو ایک حاکم قوم کی حیثیت سے صدیوں تک ان کے دلوں میں پرورش پاتا رہا ہے۔ چنانچہ ایک صدی کے اندر اندر اس پالیسی کی بدولت یہ قوم مفلس، جاہل، پست خیال، فاسد الاخلاق، اور ذلیل و خوار ہو گئی۔

اس گرتی ہوئی قوم پر آخری ضرب وہ تھی جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں لگی۔ اس نے مسلمانوں کی صرف سیاسی قوت ہی کا خاتمہ نہیں کیا، بلکہ ان کی ہمتوں کو توڑ دیا، ان کے دلوں پر مایوسی اور احساس ذلت کی تاریک گھٹائیں مسلط کر دیں، ان کو انگریزی اقتدار سے اتنا مرعوب کیا کہ ان میں قومی خودداری کا شائبہ تک باقی نہ رہا، اور ذلت و خواری کی انتہائی گہرائیوں میں پہنچ کر وہ ایسا سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ دنیا میں سلامتی حاصل کرنے کا ذریعہ انگریز کی اطاعت، عزت حاصل کرنے کا ذریعہ انگریز کی خدمت، اور ترقی کرنے کا ذریعہ انگریز کی تقلید کے سوا اور کوئی نہیں ہے، اور ان کا اپنا سرمایۂ علم و تہذیب جو کچھ بھی ہے ذلیل، سبب ذلت اور موجب نکبت ہے۔

انیسویں صدی کے نصف دوم میں جب مسلمانوں نے سنبھل کر پھر اُٹھنے کی کوشش کی تو وہ دو قسم کی کمزوریوں میں مبتلا تھے:-

ایک یہ کہ وہ فکر و عمل کے اعتبار سے پہلے ہی اسلامی عقائد اور تہذیب میں پختہ نہ تھے، اور ایک غیر اسلامی ماحول اپنے جاہلی افکار اور تمدن کے ساتھ ان کو گھیرے ہوئے تھا۔

دوسرے یہ کہ غلامی اپنے تمام معائب کے ساتھ نہ صرف ان کے جسم پر بلکہ ان کے قلب و روح پر بھی مسلط ہو چکی تھی، اور وہ ان تمام قوتوں سے محروم کر دیئے گئے تھے جن سے کوئی قوم اپنے تمدن و تہذیب کو برقرار رکھ سکتی ہے۔

اس دوہری کمزوری کی حالت میں مسلمانوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو انہیں نظر آیا کہ انگریزی سلطنت نے اپنی ہوشیاری سے معاشی ترقی کے تمام دروازے بند کر دیئے ہیں، اور ان کی کنجی انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں رکھ دی ہے۔ اب مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کرتے، چنانچہ مرحوم سید احمد خان کی رہنمائی میں ایک زبردست تحریک اُٹھی جس کے اثر سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا ہو گیا۔ پرانے لوگوں کی مخالفت بے کار ثابت ہوئی، دولت، عزت، اور اثر کے لحاظ سے قوم کی اصلی طاقت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی انہوں نے اس نئی تحریک کا ساتھ دیا، ہندوستان کے مسلمان تیزی کے ساتھ انگریزی تعلیم کی طرف بڑھے، قوم کا تلچھٹ پرانے مذہبی مدرسوں کے لیے چھوڑ دیا گیا تاکہ مسجدوں کی امامت اور مکتبوں کی معلمی کے کام آئے، اور خوشحال طبقوں کے بہترین نونہال انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں بھیج دیئے گئے تاکہ ان کے دل و دماغ کے سادہ اوراق پر فرنگی علوم و فنون کے نقوش ثبت کیے جائیں۔

یہ انیسویں صدی کی آخری چوتھائی کا زمانہ تھا۔ یورپ میں اس وقت مادیت اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ اٹھارہویں صدی میں سائنس پوری طرح مذہب کو شکست دے چکا تھا۔ جدید فلسفہ اور نئے علوم حکمت کی رہنمائی

میں سیاسیات، معاشیات، اخلاقیات اور اجتماعیات کے پرانے نظریے باطل ہو کر نئے نظریے قائم ہو چکے تھے، اور یورپ میں ایک مکمل تہذیب پیدا ہو چکی تھی جس کی بنیاد کلیۃً انہی جدید نظریوں پر قائم تھی۔ اس انقلاب عظیم نے زندگی کے عملی معاملات سے تو مذہب اور ان اصولوں کو جو مذہبی رہنمائی پر مبنی تھے کلی طور پر خارج ہی کر دیا تھا۔ البتہ تخیل کی دنیا میں مذہبی اعتقاد کی تھوڑی سی جگہ باقی رہ گئی تھی، سو اب اس کے خلاف زبردست جنگ جاری تھی۔ اگرچہ علوم حکمت میں سے کسی علم نے بھی کائنات کے الٰہی نظریے کے خلاف کوئی ثبوت (جس کو "ثبوت" کہا جا سکتا ہو) بہم نہیں پہنچایا تھا۔ مگر اہل حکمت بغیر کسی دلیل کے اپنے طبعی رجحان کی بنا پر خدا سے بیزار اور الٰہی نظریہ کے دشمن تھے، اور چونکہ انہی کو اس وقت دنیا کی عقلی و علمی امامت کا منصب حاصل تھا، اس لیے ان کے اثر سے خدا سے بیزاری (Theophobia) کا مرض ایک عام وبا کی طرح پھیل گیا تھا۔ وجود باری کا انکار، کائنات کو آپ سے آپ پیدا ہونے والی اور آپ سے آپ قوانین طبیعی کے تحت چلنے والی چیز سمجھنا، خدا پرستی کو توہم (Superstition) قرار دینا، مذہب کو لغو اور مذہبیت کو تنگ نظری و تاریک خیالی کہنا، اور نیچریت (Naturalism) کو روشن خیالی کا ہم معنی سمجھنا اس وقت فیشن میں داخل ہو چکا تھا، اور ہر شخص خواہ وہ فلسفہ و سائنس میں کچھ بھی دستگاہ نہ رکھتا ہو، اور اس نے خود ان مسائل کی تحقیق میں ذرہ برابر بھی کوشش نہ کی ہو، صرف اس بنا پر ان خیالات کا اظہار کرتا تھا کہ سوسائٹی میں وہ ایک روشن خیال آدمی سمجھا جائے۔ روحانیات (Spritualism) یا فوق الطبیعیت (Supernaturalism) کی تائید میں کچھ کہنا اسی قدر کفر کا درجہ رکھتا تھا۔ اگر کوئی بڑے سے بڑا سائنس دان بھی اس قسم کے کسی خیال کا اظہار کرتا تو سائنٹفک حلقوں میں اس کی ساری وقعت جاتی رہتی، اس کے تمام کارناموں پر پانی پھر جاتا اور وہ اس قابل نہ رہتا کہ اسے کسی علمی جماعت کی رکنیت کا شرف بخشا جائے۔

۱۸۵۹ء میں ڈارون کی کتاب اصل الانواع (Origin of species) شائع ہوئی جس نے نیچریت اور دہریت کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ اگرچہ ڈارون کے دلائل جو اس نے اپنے مخصوص نظریہ ارتقاء کی تائید میں

پیش کیے تھے، کمزور اور محتاجِ ثبوت تھے، اور اس کے سلسلۂ ارتقاء میں ایک کڑی نہیں بلکہ ہر موجود کڑی کے آگے اور پیچھے بہت سی کڑیاں مفقود تھیں، اور اہلِ حکمت اس وقت بھی اس نظریہ سے مطمئن نہ تھے، حتیٰ کہ خود اس کا سب سے بڑا وکیل ہکسلے Huxley بھی اس پر ایمان نہ لایا تھا، مگر اس کے باوجود محض خدا سے بیزاری کی بنا پر ڈارونیت کو قبول کر لیا گیا اس کی حد سے زیادہ تشہیر کی گئی، اور مذہب کے خلاف ایک زبردست آلہ کے طور پر اسے استعمال کیا گیا، کیونکہ اس نظریہ نے اہلِ حکمت کے زعمِ باطل میں اس دعوے کا ثبوت فراہم کیا تھا (حالانکہ درحقیقت ایک اور دعویٰ کیا تھا جو محتاجِ ثبوت تھا) کہ کائنات کا نظام کسی فوق الطبیعی قوت کے بغیر خود بخود طبیعی قوانین کے ماتحت چل رہا ہے۔ اہلِ مذہب نے اس نظریہ کی مخالفت کی اور برٹش ایسوسی ایشن کے جلسہ میں بشپ آف آکسفورڈ اور گلیڈ اسٹن نے اپنی خطابت کا پورا زور اس کے خلاف صرف کیا، مگر شکست کھائی، اور آخر کار اہلِ مذہب اُس مسلکِ دہریت سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ ۱۸۸۲ء میں جب ڈارون نے وفات پائی تو چرچ آف انگلینڈ نے وہ سب سے بڑا اعزاز اسکو بخشا جو اس کے اختیار میں تھا، یعنی اسے ویسٹ منسٹر ایبی میں دفن کرنے کی اجازت دی، حالانکہ وہ یورپ میں مذہب کی قبر کھودنے والوں کا سرخیل تھا اور اس نے افکار کو الحاد و زندقہ اور بے دینی کی طرف چلانے اور وہ ذہنیت پیدا کرنے میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا جس نے آخر کار بولشوزم کو پھلنے پھولنے اور بار آور ہونے کا موقع دیا۔

یہ زمانہ تھا جب ہماری قوم کے نوجوان انگریزی تعلیم اور فرنگی تہذیب سے استفادہ کرنے کے لیے مدرسوں اور کالجوں میں بھیجے گئے۔ اسلامی تعلیم سے کورے، اسلامی تہذیب میں خام، انگریزی حکومت سے مرعوب، فرنگی تہذیب کی شان و شوکت پر فریفتہ پہلے ہی سے تھے۔ اب جو انھوں نے انگریزی مدرسے کی فضا میں قدم رکھا تو اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ ان کی ذہنیت کا سانچہ بدل گیا، ان کی طبیعت کا رخ مذہب سے پھر گیا کیونکہ اس آب و ہوا کی اولین تاثیر یہ تھی کہ یورپ کے کسی مصنف یا محقق کے نام سے جو چیز پیش کی جائے اس پر وہ بے تامل آمنّا و صدّقنا کہیں، اور قرآن و حدیث یا ائمۂ دین کی طرف سے کوئی بات پیش ہو تو اس پر دلیل کا مطالبہ کریں۔ اس منقلب ذہنیت کے ساتھ انھوں نے جن مغربی علوم کی تعلیم حاصل کی ان کے اصول و فروع اکثر و بیشتر اسلام کے اصول

اور جزئیات احکام کے خلاف تھے۔ اسلام میں مذہب کا تصور یہ ہے کہ وہ زندگی کا قانون ہے۔ اور مغرب میں مذہب کا یہ تصور ہے کہ وہ محض ایک شخصی اعتقاد ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام میں پہلی چیز ایمان باللہ ہے اور یہاں اللہ کا وجود ہی مسلّم نہیں۔ اس کا نظام شریعت رسالت کے اعتقاد پر قائم ہے اور یہاں وحی کی حقیقت ہی میں شک اور رسالت کے منجانب اللہ ہونے ہی میں شبہ ہے۔ وہاں حیات اخروی کا اعتقاد پورے اسلامی اخلاقیات کا سنگ بنیاد ہے، اور یہاں یہ بنیاد خود بے بنیاد نظر آتی ہے۔ وہاں جو عبادات و اعمال فرض ہیں، یہاں وہ محض عہد جاہلیت کے رسوم ہیں جن کا اب کوئی عملی فائدہ نہیں۔ اسی طرح اسلام کے اصول تمدن و تہذیب بھی مغربی تہذیب و تمدن کے اصول سے یکسر مختلف ہیں۔ قانون میں اسلام کا اصل الاصول یہ ہے کہ خدا خود واضع قانون ہے، رسول خدا شارح قانون اور انسان صرف متبع قانون۔ مگر یہاں خدا کو وضع قانون کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں۔ لیجسلیچر واضع قانون ہے اور قوم لیجسلیچر کو منتخب کرنے والی ہے۔ سیاسیات میں اسلام کا مطمح نظر حکومت الٰہی ہے اور مغرب کا مطمح نظر حکومت قومی۔ اسلام کا رخ Internationalism (بین الملیت) کی طرف ہے اور مغرب کا کعبۂ مقصود نیشنلزم Nationalism ہے۔ معاشیات میں اسلام اکل حلال اور زکوٰۃ و صدقہ پر زور دیتا ہے، اور مغرب کا سارا نظام معاشی سود اور منافع پر چل رہا ہے۔ اخلاقیات میں اسلام کے پیش نظر آخرت کی کامیابی ہے اور مغرب کے پیش نظر دنیا کا فائدہ۔ اجتماعی مسائل میں اسلام کا راستہ قریب قریب ہر معاملہ میں مغرب کے راستہ سے مختلف ہے۔ ستر و حجاب، حدود زن و مرد، تعدد ازواج، قوانین نکاح و طلاق، ضبط ولادت، حقوق ذوی الارحام، حقوق زوجین اور ایسے ہی دوسرے بہت سے معاملات میں ان دونوں کا اختلاف اتنا نمایاں ہے کہ بیان کی حاجت نہیں۔ اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے اصول مختلف ہیں۔ ہمارے نوجوانوں نے مرعوب بلکہ غلامانہ ذہنیت اور پھر غیر مکمل اسلامی تعلیم و تربیت کے ساتھ جب ان مغربی علوم کی تحصیل کی۔ اور مغربی تہذیب کے زیر اثر تربیت پائی تو نتیجہ جو کچھ ہونا چاہیے تھا وہی ہوا۔ ان میں تنقید کی صلاحیت پیدا نہ ہو سکی۔ انھوں نے مغرب سے جو کچھ سیکھا اس کو صحت اور درستی کا معیار سمجھ لیا۔ پھر ناقص علم کے ساتھ اسلام کے اصول و قوانین کو اس معیار پر جانچ کر دیکھا۔ اور جن مسائل میں دونوں کے درمیان اختلاف پایا اس میں کبھی مغرب کی غلطی محسوس نہ کی بلکہ اسلام ہی کو برسر غلط سمجھا، اور اس کے اصول و قوانین میں ترمیم و تنسیخ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

جدید تعلیم نے معاشی اور سیاسی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمانوں کو خواہ کتنا ہی فائدہ پہنچایا ہو، مگر ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی کسی فائدے سے نہیں ہو سکتی۔

مقالات

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

(۱۷)

ایمان

۵- ایمان بالیوم الآخر

اعتقاد یوم آخر کی ضرورت اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ اس دنیوی زندگی کے بعد ایک اخروی زندگی کا وجود میں آنا ممکن، اور اغلب، اور اقتضائے حکمت کے مطابق ہے، اور عقل (بشرطیکہ صحیح و سلیم ہو، اور علم (بشرطیکہ حقیقی ہو) ہم کو اخروی زندگی کے اس تصور پر جو قرآن نے پیش کیا ہے، ایمان لانے سے روکتے نہیں، بلکہ اس پر آمادہ کرتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ اخروی زندگی کے اس تصور پر ایمان لانے کی ضرورت کیا ہے؟ اس کو ایمانیات میں کیوں داخل کیا گیا ہے؟ اس پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے کہ مسلمان ہونے کے لیے اس کو ماننا لازم ہے۔ اور کوئی شخص اس کو تسلیم کیے بغیر مسلمان نہ ہو سکتا ہو؟ اس کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے کہ اس کا انکار کرنے کے بعد خدا اور رسول اور کتاب پر ایمان لانا بھی نافع نہ ہو، حتیٰ کہ زندگی بھر کے نیک اعمال بھی غارت ہو جائیں؟ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ اخروی زندگی کا نظریہ بھی ویسا ہی ایک مابعد الطبیعی نظریہ ہے، جیسے مابعد الطبیعیات کے دوسرے نظریات ہیں۔ ہم نے مانا کہ یہ نظریہ دلیل و حجت سے خوب مستحکم کر دیا گیا ہے، اور اس کو تسلیم کرنے کے لیے کافی وجوہ موجود ہیں۔ لیکن مابعد الطبیعیات کے کسی مسئلہ کا دلیل سے ثابت ہو جانا یہ معنی تو نہیں رکھتا کہ اس پر ایمان لانا ضروری ہو جائے اور اسی پر کفر و اسلام کا

ملا ٹھیرے۔ حیات اخروی کی طرح، مابعد الطبیعیات کے اور بھی بہت سے نظریات ایسے ہیں جن کی تائید میں قوی دلائل موجود ہیں۔ پھر ان سب کو بھی اسی طرح داخلِ ایمان کیوں نہ کر لیا گیا؟

اگر حیات اخروی کے اعتقاد کی حیثیت محض ایک مابعد الطبیعی مسئلہ کی ہوتی، تو یہ اعتراض یقیناً قوی ہوتا۔ اس صورت میں اس مسئلہ کو ایمانیات میں داخل کرنے کی کوئی معقول وجہ نہ تھی، کیونکہ کسی خالص مابعد الطبیعی مسئلہ کا اس حیثیت سے کہ وہ مابعد الطبیعی مسئلہ ہے، ہماری عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر ہم اس سے خالی الذہن ہوں، یا اس کو ماننے سے انکار ہی کر دیں تو ہمارے اخلاق اور اعمال پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن حیات اخروی کے مسئلہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض ایک فلسفیانہ مسئلہ ہی نہیں ہے، بلکہ انسان کی اخلاقی اور عملی زندگی سے اس کا ایک گہرا تعلق ہے۔ اسکے ماننے اور نہ ماننے سے دنیوی زندگی اور اس کے معاملات کے متعلق انسان کا نقطۂ نظر بنیادی طور پر بدل جاتا ہے۔ اس اعتقاد کو تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو ایک ذمہ دار اور جوابدہ ہستی سمجھے، اور اپنی زندگی کے تمام معاملات یہ سمجھتے ہوئے انجام دے کہ وہ اپنی ہر حرکت اور ہر فعل کے لئے ذمہ دار ہے، آیندہ زندگی میں اسکو اپنے تمام اعمال کی جواب دہی کرنی ہے، اور مستقبل کی سعادت و شقاوت، اس کے حال کی نیکی اور بدی پر منحصر ہے۔ بخلاف اسکے اس اعتقاد کو تسلیم نہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور غیر مسئول ہستی سمجھے اور اپنی دنیوی زندگی کا سارا پروگرام اس خیال کے تحت مرتب کرے کہ وہ اس زندگی کے اعمال کے لئے کسی دوسری زندگی میں جواب دہ نہیں ہے اور آیندہ کوئی اچھا یا برا نتیجہ اس زندگی کے اعمال و افعال پر مترتب ہونے والا نہیں ہے۔ اس عقیدہ سے خالی الذہن ہونے یا اسکو نہ ماننے کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ انسان کی نظر اپنے اعمال کے صرف ان نتائج پر ہوگی جو اس دنیوی زندگی میں مترتب ہوتے ہیں، اور انہی نتائج کے لحاظ سے وہ رائے قائم کرے گا کہ کون سا فعل اس کے لیے مفید ہے اور کون سا مضر۔ وہ زہر کھانے اور آگ میں ہاتھ ڈالنے سے ضرور احتراز کرے گا، کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ وہ ان دونوں حرکتوں کے برے نتائج اپنی اسی زندگی میں بھگت لے گا۔ لیکن ظلم، بے انصافی، جھوٹ، غیبت، خیانت، زنا اور ایسے ہی دوسرے افعال کے پورے نتائج چونکہ اسی دنیوی زندگی میں ظاہر نہیں ہوتے، اس لیے وہ ان سے صرف اسی حد تک اجتناب کرے گا جس حد تک ان کا کوئی برا نتیجہ

اس زندگی میں مترتب ہونے کا اندیشہ ہو، اور جہاں کوئی برا نتیجہ مترتب ہوتا نظر نہ آئے، یا برعکس اس کے ان سے کوئی فائدہ حاصل ہونے کی امید ہو تو وہ ان افعال کے ارتکاب میں کوئی تامل نہ کرے گا۔ غرض یہ کہ اس تصور کے ماتحت اسکی نگاہ میں کسی اخلاقی فعل کی کوئی متعین اخلاقی قدر نہ ہوگی۔ بلکہ ہر ایسے فعل کی اچھائی اور برائی اس نتیجہ کی اچھائی اور برائی پر منحصر ہوگی جو اس پر اس دنیا میں مترتب ہوتا ہو۔ بخلاف اس کے جو شخص یوم آخر کا معتقد ہوگا اسکی نظر اپنے اخلاقی افعال کے صرف انہی نتائج پر نہ ہوگی جو اس زندگی میں مترتب ہوتے ہیں، بلکہ وہ اُن آخری نتائج پر نگاہ رکھے گا جو اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی میں ظاہر ہونے والے ہیں اور ان نتائج کے لحاظ سے ہر فعل کے مفید یا مضر ہونے کا فیصلہ کریگا۔ اسکو جس طرح زہر کے ہلاک اور آگ کے موذی ہونے کا یقین ہوگا اسی طرح خیانت اور جھوٹ کے مہلک اور موذی ہونے کا بھی یقین ہوگا۔ وہ جس طرح صدق اور راستی کو مفید سمجھیگا اسی طرح عدل اور امانت کو بھی مفید سمجھیگا۔ وہ اپنے ہر فعل کے ایک متعین اور یقینی نتیجہ کا قائل ہوگا خواہ وہ نتیجہ اس زندگی میں قطعاً ظاہر نہ ہو، بلکہ برعکس صورت میں ظاہر ہو۔ اس کے پاس تمام اخلاقی افعال کی متعین اخلاقی قدریں ہونگی، اور ان قدروں میں دنیوی فوائد یا مضرتوں سے کوئی تغیر واقع نہ ہوگا۔ اس کے نظام اخلاق میں صداقت، انصاف، اور وفائے عہد بہرحال صواب اور حسن ہی ہونگے، خواہ اس دنیا میں ان سے سراسر نقصان ہی نقصان ہو اور قطعاً کوئی فائدہ نہ ہو اور جھوٹ، ظلم اور بدعہدی بہرحال گناہ اور بدی ہی ہونگے خواہ ان سے دنیا میں سراسر فائدہ ہی فائدہ ہو اور ذرہ برابر کوئی نقصان نہ ہو۔

پس حیات اخروی کے اعتقاد سے خالی الذہن ہونے یا اس کا انکار کردینے کے معنی بس اسی قدر نہیں ہیں کہ انسان ایک مابعد الطبیعی نظریہ سے خالی الذہن رہا یا اس نے اس نظریہ کو ماننے سے انکار کردیا۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی ذمہ دارانہ اور مسئولانہ حیثیت سے غافل ہوگیا، اپنے آپ کو مطلق العنان اور جواب دہی سے بری الذمہ سمجھ بیٹھا، دنیا اور اسکی ظاہری زندگی اور اس کے غیر مکمل بلکہ بسا اوقات دھوکا دینے والے نتائج سے مطمئن ہوگیا، اس نے آخری منافع اور آخری نقصانات سے غافل ہو کر محض ابتدائی اور عارضی اور ناقابل اعتبار منفعتوں اور مضرتوں کا اعتبار کرلیا اور انہی کے لحاظ سے اپنے افعال کی ایسی اخلاقی قدریں متعین کیں جو بدلنے والی اور دھوکہ دینے والی ہیں۔ وہ ایک صحیح اور پائیدار اخلاقی ضابطہ سے محروم ہوگیا جو صرف ذمہ داری کے احساس اور آخری نتائج کے ملاحظہ ہی

تعیین اخلاقی قدروں کے اعتبار ہی سے منضبط ہوسکتا ہے، اور اس طرح اس نے اپنی پوری زندگی دنیا کے ناقص سطحی مظاہر سے دھوکا کھا کر ایک ایسے ناپائیدار اور غلط اخلاقی ضابطہ کے تحت بسر کی جس میں حقیقی مضرت، منفعت بن گئی، اور حقیقی منفعت، مضرت قرار پائی، حقیقی حسن، قبیح بن گیا اور حقیقی قبح، حسن قرار پایا، حقیقی گناہ، صواب بن گیا، اور حقیقی صواب، گناہ قرار پایا۔

یوم آخر پر ایمان نہ لانے کے یہی نتائج ہیں جن کو قرآن مجید میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس باب میں آیات قرآنی کا تتبع کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ تمام خرابیاں ایک ایک کر کے گنائی گئی ہیں جو یوم آخر کو نہ ماننے سے انسان کے اخلاق اور اعمال میں پیدا ہوجاتی ہیں۔

(۱) انسان اپنے آپ کو مہمل، مطلق العنان، غیر ذمہ دار سمجھتا ہے، اپنی زندگی کو بحیثیت مجموعی بے نتیجہ خیال کرتا ہے، اور یہ سمجھ کر کام کرتا ہے کہ کوئی اس کے کام کا نگران اور اس سے حساب لینے والا نہیں ہے:۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (۲۳ : ۶)	کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا ہے اور تم ہمارے پاس واپس نہ لائے جاؤگے ؟
اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى (۷۵ : ۲)	کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یوں ہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا ؟
اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗۤ اَحَدٌ (۹۰)	کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اس پر کسی کا بس نہ چلے گا؟ وہ کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا، کیا وہ سمجھتا ہے کہ کسی نے اسکو نہیں دیکھا ؟

(۲) ایسے آدمی کی نظر دنیا کے صرف ظاہری پہلو پر ہوتی ہے۔ ابتدائی اور سطحی نتائج کو وہ آخری اور حقیقی نتائج سمجھتا ہے، اور ان سے دھوکہ کھا کر غلط رائے قائم کرتا ہے۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ (۳۰ : ۱)	وہ صرف ظاہر حیات دنیا کو دیکھتے ہیں اور آخرت سے تو وہ غافل ہی ہیں۔

إِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوْا بِهَا (۱۰:۱)

جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے اور حیات دنیا سے راضی اور مطمئن ہوگئے ہیں۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (۷۵:۱)

ہرگز نہیں ؟ تم تو فوری حاصل ہونے والے نتائج کو پسند کرتے ہو اور آخرۃ کے نتائج کو چھوڑ دیتے ہو۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (۸۷)

تم حیات دنیا کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر ہے اور زیادہ پائیدار ہے۔

وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا (۷:۶)

ان کو حیات دنیا نے دھوکہ میں ڈال دیا ہے۔

(۳) اس ظاہر بینی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی نگاہ میں اشیاء کی اخلاقی قدروں کا معیار بالکل الٹا ہوجاتا ہے۔ جو چیزیں حقیقت میں اپنے آخری نتائج کے لحاظ سے مضر ہوتی ہیں ان کو وہ فوری فوائد پر نظر رکھنے کی وجہ سے مفید سمجھتا ہے، اور جو اعمال آخری نتائج کے لحاظ سے غلط ہیں ان کو وہ ابتدائی نتائج کا لحاظ کرکے خیر و صلاح سمجھنے لگتا ہے۔ اس وجہ سے اسکی دنیوی کوششیں صحیح راہوں سے بھٹک جاتی ہیں اور آخر کار ضائع ہوجاتی ہیں۔

قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَا اُوْتِيَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا (۲۸:۸)

جو لوگ دنیوی زندگی ہی کے فائدوں کو چاہتے تھے انھوں نے کہا کہ کاش ہم کو بھی وہی ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے وہ بڑا ہی خوش نصیب ہے اور جن لوگوں کو علم دیا گیا تھا انھوں نے کہا کہ تم پر افسوس! اللہ کا ثواب اس شخص کیلیے بہت اچھا ہے جو ایمان لایا اور جسنے نیک اعمال کیے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ (۲۷:۱)

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے انکیلیے ہم انکے اعمال کو خوشنما بنا دیتے ہیں اور وہ بھٹکتے پھرتے ہیں۔

اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ

کیا یہ لوگ اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں کہ ہم جو ان کو

نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ بَل لَّا يَشْعُرُونَ (۲۳:۴)	مال اور اولاد سے مدد دیتے ہیں تو گویا ان کے لیے خیرات میں جلدی کرتے ہیں؟ مگر یہ لوگ حقیقت کو نہیں سمجھتے۔
هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۔ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ (۱۸:۱۲)	کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ ٹوٹے میں کون لوگ ہیں؟ وہ جن کی کوششیں حیات دنیا میں بھٹک گئیں مگر وہ سمجھتے رہے کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی نشانیوں اور اسکی ملاقات کا انکار کیا، اس لیے ان کے اعمال ضائع ہو گئے۔

(۴) ایسا شخص کبھی دین حق کو قبول نہیں کر سکتا۔ جب کبھی اس کے سامنے مکارم اخلاق اور اعمال صالحہ اور راست روی کے طریقے پیش کئے جائیں گے، وہ ان کو رد کر دیگا، اور جب ان کے خلاف عقائد اور اعمال پیش کئے جائیں گے تو وہ انہیں اختیار کرے گا۔ کیونکہ دین داری کے جتنے طریقے ہیں، وہ دنیوی زندگی کے بہت سے فوائد و منافع اور بہت سی لذتوں کی قربانیاں چاہتے ہیں، اور ان کا اصل الاصول یہ ہے کہ آخرت کے بہتر اور پائندہ تر فوائد کے لیے دنیا کے عارضی فوائد کو قربان کر دو، مگر منکر آخرت اسی دنیا کے فوائد کو فوائد سمجھتا ہے، اس لیے وہ نہ ایسی کسی قربانی کے لیے طیار ہو سکتا ہے اور نہ دین داری کے ان طریقوں کو اختیار کر سکتا ہے جو ان قربانیوں کے طالب ہیں۔ لہٰذا انکار آخرت اور دین حق کی پیروی دونوں ایک دوسرے کے نقیض ہیں۔ جو منکر آخرت ہوگا وہ کبھی دین حق کا پیرو نہیں ہو سکتا۔

سَأَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَإِن يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا بِهَا وَإِن يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا وَإِن يَرَوْا سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا	میں اپنی نشانیوں پر سے ان لوگوں کو پھیر دونگا جو زمین میں حق کے بغیر تکبر کرتے ہیں۔ وہ اگر کسی آیت کو دیکھیں گے تو اسپر ایمان نہ لائیں گے، اور اگر راہ راست کو دیکھیں تو اسے اختیار نہ کریں گے اور اگر غلط راستے کو دیکھیں گے تو اسپر چل پڑیں گے۔ یہ اسلیے کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو

وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (۷:۱۶)

جھٹلایا اور ان سے غافل رہے اور جو لوگ ہماری نشانیوں اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلائیں گے انکے اعمال غارت ہو جائیں گے کیا ان کو ویسا ہی بدلہ نہ ملیگا جیسے انھوں نے عمل کیے ہیں؟

(۵) انکار آخرت سے انسان کی پوری اخلاقی اور عملی زندگی متاثر ہوتی ہے۔ وہ متکبر اور سرکش ہو جاتا ہے:-

فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُمْ مُنْكِرَةٌ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ۔ (۱۶:۳)

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے دل حق بات سے انکار کرنے لگتے ہیں اور وہ متکبر ہو جاتے ہیں۔

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ إِلَيْنَا لَا يُرْجَعُونَ (۲۸:۴)

فرعون اور اس کے لشکروں نے زمین میں بغیر کسی حق کے تکبر کیا اور سمجھنے لگے کہ وہ ہمارے پاس واپس لائے جائنگے

اس کے معاملات بگڑ جاتے ہیں:-

وَيْلٌ لِلْمُطَفِّفِينَ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُمْ مَبْعُوثُونَ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ (۸۳)

تباہی ہے ان بدمعاملہ لوگوں کے لیے جو دوسروں سے لیتے ہیں تو پورا پورا ناپ تول کر لیتے ہیں اور جب دوسروں کو ناپ یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں کیا وہ نہیں سمجھتے کہ وہ ایک بڑے دن کے لیے اٹھائے جائیں گے۔

وہ سنگ دل، تنگ نظر، ریا کار، خود غرض، اور عبادت الٰہی سے روگرداں ہو جاتا ہے:-

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ۔ (۱۰۷)

کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جو روز جزا کی تکذیب کرتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر نہیں ابھارتا۔ بس تباہی ہے ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہیں جو عمل نیک کرتے بھی ہیں تو دکھانے کے لیے اور جو چھوٹی چھوٹی ضرورت کی چیزیں بھی لوگوں کو دینے میں دریغ کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ حق سے تجاوز کرنا اور گناہوں میں مبتلا ہوجانا انکار آخرت کا لازمی نتیجہ ہے :-

وَمَا يُكَذِّبُ بِهِۦٓ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ (۸۳) یوم الجزا کی تکذیب نہیں کرتا مگر ہر وہ شخص جو حق سے تجاوز کر گیا اور گناہوں میں پھنس گیا

یوم آخر کے اعتقاد سے خالی الذہن یا منکر ہونے کے یہ ایسے نتائج ہیں جن سے کوئی صاحب عقل انکار نہیں کر سکتا خصوصاً جبکہ ہم اپنی آنکھوں سے اُس تمدن کے ثمرات بھی دیکھ چکے ہیں جو ظاہر حیات دنیا پر فریفتہ ہو کر زندگی کے محض دنیوی اور مادی مطمح نظر پر قائم ہوا ہے، اور حیات اخروی کے عقیدے سے یکسر خالی ہے، تو ہمارے لیے اس حقیقت سے انکار کرنے کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہی کہ انکار آخرت کے ساتھ خدا پرستی، دین داری اور مکارم اخلاق کا قیام بالکل ناممکن ہے۔

اب دیکھیے کہ اسلام جب انہی چیزوں کو قائم کرنا چاہتا ہے، جب وہ انسان کو اخلاق فاضلہ اور اعمال صالحہ کی طرف دعوت دیتا ہے جن کے لیے دنیا کے بہت سی مادی منفعتوں اور لذتوں کی قربانی ضروری ہے، جب وہ انسان کو عبادت الٰہی اور تزکیۂ نفس کی تلقین کرتا ہے جس کا کوئی فائدہ اس دنیا میں مترتب ہوتا نظر نہیں آتا، بلکہ اس کے برعکس بہت سی تکلیفوں اور مشقتوں میں انسان کے نفس اور جسم کو مبتلا ہونا پڑتا ہے، جب وہ زندگی کے تمام معاملات اور دنیا کے اسباب و وسائل سے متمتع ہونے میں حرام و حلال اور خبیث و طیب کا امتیاز قائم کرتا ہے، جب وہ بالاتر روحانی مقاصد کے لیے انسان سے شخصی اغراض، شخصی محبتوں اور رغبتوں، اور بسا اوقات جان و مال تک کو قربان کر دینے کا مطالبہ کرتا ہے، اور جب وہ انسان کی زندگی کو ایک ایسے اخلاقی ضابطہ کے تحت منضبط کرنا چاہتا ہے جس میں دنیوی فائدے اور نقصان سے قطع نظر کرکے ہر شئے کی ایک خاص اخلاقی قدر متعین کر دی گئی ہے تو کیا وہ ایسے دین اور ایسی شریعت کو قائم کرنے میں عقیدۂ حیات اخروی کے بغیر کامیاب ہو سکتا تھا؟ کیا یہ ممکن تھا کہ انسان اس عقیدہ سے خالی الذہن یا منکر ہوتے ہوئے ایسی تعلیم کو قبول کر لیتا؟ اگر جواب نفی میں ہے، اور یقیناً نفی ہی میں ہے تو ماننا پڑے گا کہ اس قسم کے نظام دینی اور ضابطۂ اخلاقی کو قائم کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ سب سے پہلے انسان کے دل میں حیات اخروی کے عقیدہ کو راسخ کر دیا جائے۔ بس یہی وجہ ہے کہ جس کی بنا پر اسلام نے اس عقیدہ کو ایمانیات میں داخل کیا ہے اور اس پر اتنا زور دیا ہے کہ ایمان باللہ کے بعد اور کسی چیز پر اتنا زور نہیں دیا۔

آئیے اب ہم دیکھیں کہ اسلام نے اس عقیدہ کو کس شکل میں پیش کیا ہے اور اس سے انسان کے اخلاق و اعمال پر کیا اثرات مترتب ہوتے ہیں۔

دنیا پر آخرت کی ترجیح سب سے پہلی چیز جس کو قرآن مجید نے انسان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا انسان کے لیے ایک عارضی جائے قیام ہے۔ اُس کے لیے صرف یہی ایک زندگی نہیں ہے بلکہ اس کے بعد ایک دوسری زندگی اس سے بہتر اور پائندہ تر بھی ہے جس کے فوائد یہاں کے فائدوں سے زیادہ فراواں اور جس کے نقصانات یہاں کے نقصانات سے زیادہ سخت ہیں۔ جو شخص اس دنیا کے مظاہر سے دھوکہ کھا کر اسی کی لذتوں اور منفعتوں کے پیچھے پڑا رہتا ہے، اور ان کو حاصل کرنے کے لیے ایسی کوششیں کرتا ہے جن کی بدولت اس دوسری زندگی کی لذتیں اور منفعتیں اسے حاصل نہیں ہو سکتیں وہ بہت برا سودا کرتا ہے اور حقیقت میں اس کی یہ تجارت سراسر نقصان کی تجارت ہے۔ اسی طرح جو شخص اس دنیا کے نقصانات ہی کو نقصان سمجھتا ہے اور ان سے بچنے کے لیے ایسی سعی کرتا ہے جس سے وہ اپنے آپ کو اس دوسری زندگی کے نقصان کا مستحق بنا لیتا ہے، وہ بہت بڑی حماقت کا مرتکب ہوتا ہے اور اس کا یہ فعل کسی طرح عقلمندانہ دانشمندی نہیں ہے۔ اس مضمون کو قرآن مجید میں اس کثرت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ تمام آیات کا استقصا یہاں ممکن نہیں ہے۔ مثال کے طور پر آیات ذیل ملاحظہ ہوں:۔

مَا هٰذِهِ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَّإِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (۲۹:۷)

یہ دنیا کچھ نہیں ہے مگر لہو و لعب۔ اور اصلی زندگی کا گھر آخرت ہی ہے۔

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَّالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى (۴:۱۱)

کہو اے محمد کہ متاع دنیا تھوڑی سی ہے، اور آخرت اس کے لیے بہتر ہے جو پرہیزگاری کے ساتھ زندگی بسر کرے۔

اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ (۹:۶)

کیا تم آخرت کے عوض دنیا کی زندگی سے راضی ہو گئے؟ دنیا کی زندگی کے سامان تو آخرت کے مقابلہ میں بہت ہی تھوڑے ہیں۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (۸۷)

تم حیات دنیا کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت زیادہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔ (۳: ۱۹)

ہر شخص کو موت کا مزا چکھنا ہے اور تم کو اپنی اس زندگی کے پورے پورے بدلے قیامت کے دن ملنے والے ہیں۔ پس اس روز جو شخص آگ کے عذاب سے بچ گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہی اصل میں کامیاب ہوا۔ یہی اس دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا سامان ہے۔

وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ (۱۰:۱۱)

جن لوگوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا ہے وہ انہی لذتوں کے پیچھے پڑے رہے جو ان کو دی گئی تھیں اور وہ مجرم ہوئے۔

قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ (۳۹:۲)

اے محمد! کہہ دو کہ سخت نقصان میں وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو اور اپنے بال بچوں کو قیامت کے دن نقصان میں ڈالا۔ یہی اصلی اور کھلا ہوا ٹوٹا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (۷۹: ۲)

پھر جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تو جہنم اس کا ٹھکانا ہے اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو خواہشات سے روکا، تو جنت اس کا ٹھکانا ہے

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا وَفِى الْاٰخِرَةِ عَذَا

جان لو کہ حیات دنیا تو اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس میں کھیل اور کود اور زینت اور آپس کا تفاخر، اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانا ہے۔ اسکی مثال بارش کی سی ہے کہ اس سے کھیتی لہلہاتی ہے اور کسان اسکو دیکھ کر

شَدِيْدٌ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ وَّ	خوشیاں منانے میں پھر وہ پک کر خشک ہو جاتی ہے اور تو
مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (۵۷:۳)	دیکھتا ہے کہ وہ زرد پڑ گئی اور آخر کار روند ڈالی گئی۔ اس کے بعد

آخرت کی زندگی ہے جس میں کسی کے لیے سخت عذاب ہے اور کسی کے لیے اللہ کی طرف سے مغفرت اور خوشنودی ہے۔ پس دنیا کی زندگی محض ایک دھوکے کا سامان ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ	لوگوں کے لیے عورتوں اور بچوں اور سونے چاندی کے ڈھیروں
الْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ	اور نشان لگے ہوئے گھوڑوں اور جانوروں اور کھیتوں کی
وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ	محبت خوشنما بنا دی گئی ہے۔ یہ دنیوی زندگی کی متاع ہے
ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ	مگر اللہ کے پاس اس سے اچھا ٹھکانا ہے۔ کہو اے محمد کیا
حُسْنُ الْمَاٰبِ قُلْ أَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ	میں تمہیں اس سے بہتر سامان کی خبر دوں؟ جن لوگوں نے
ذٰلِكُمْ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ	پرہیزگاری اختیار کی ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا	جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ ان میں وہ
وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ	ہمیشہ رہیں گے اور ان کو پاکیزہ ازواج ملیں گی اور وہ اللہ
(۳:۲)	کی خوشنودی سے سرفراز ہوں گے۔

دنیا پر آخرت کی ترجیح اور آخرت کی دائمی کامیابی کے لیے دنیا کے عارضی منافع کو قربان کرنے، اور آخرت کی ابدی نامرادی سے بچنے کے لیے دنیا کے چندروزہ نقصانات کو برداشت کرنے کی یہ تعلیم نہایت پرزور اور موثر انداز سے اسلام میں دی گئی ہے۔ اور اس کا منشا یہ ہے کہ جو شخص قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا ہے وہ کسی زور اور زبردستی سے نہیں بلکہ اپنی دلی رغبت سے ہر وہ کام کرے جس کو کتاب اور رسول نے آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بتایا ہے، اور ہر اس چیز سے اجتناب کرے جس کو ان دونوں نے آخرت کے نقصانات کا سبب قرار دیا ہے، خواہ دنیا میں اس کے لیے کتنا ہی مفید یا مضر ہو۔

نامۂ اعمال اور عدالت دوسری بات جس کو قرآن مجید نے انسان کے دل میں بٹھانے کی کوشش کی ہے، یہ ہے کہ انسان اپنی دنیوی زندگی میں جو کچھ کرتا ہے خواہ کتنا ہی چھپا کر کرے اس کا ٹھیک ٹھیک ریکارڈ محفوظ رہتا ہے، قیامت کے روز یہی ریکارڈ خدا کی عدالت میں پیش ہوگا، ہر ہر ذرہ جس کو انسان کے افعال سے کسی نوع کا تعلق رہا ہے، اس کے ان افعال پر گواہی دیگا، حتیٰ کہ خود اس کے اپنے اعضا بھی اس کے خلاف گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے ہونگے، پھر اس کے نامۂ اعمال کا نہایت صحیح وزن کیا جائے گا، میزان عدل کے ایک پلڑے میں اسکے نیک اعمال ہونگے اور دوسرے میں برے اعمال۔ اگر نیکی کا پلڑا جھک گیا تو آخرت کی کامیابیاں اس کا خیر مقدم کریں گی اور جنت اس کے لئے جائے قیام ہوگی۔ اور بدی کا پلڑا بھاری رہا تو خسران مبین اس کا نتیجہ ہوگا اور وہ بدترین مقام اس کے لیے تجویز کیا جائے گا جس کا نام دوزخ ہے۔۔ اس عدالت میں ہر شخص تنہا اپنے نامۂ اعمال کے ساتھ حاضر ہوگا اور دنیوی اسباب میں سے کوئی چیز اس کے کام نہ آئے گی۔ نہ نسبی اعزاز، نہ سعی و سفارش، نہ مال و دولت، اور نہ قوت و طاقت۔

اس مضمون کو بھی بڑی تفصیل کے ساتھ اور بڑے مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند آیات یہاں پیش کی جاتی ہیں:

نامۂ اعمال کی کیفیت:-

سَوَاءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (۱۳ : ۲)

تم میں سے جو شخص چھپا کر بات کرتا ہے اور جو زور سے بولتا ہے اور جو شخص رات کی تاریکی میں چھپا ہوا ہے اور جو دن کی روشنی میں چل رہا ہے، دونوں یکساں ہیں۔ بہرحال ہر ایک کے آگے اور پیچھے نگرانی کرنے والے لگے ہوئے ہیں اور وہ خدا کے حکم سے اسکی ہر بات ثبت کر رہے ہیں۔

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا

نامۂ اعمال پیش ہوگا تو اس میں جو کچھ لکھا ہوگا، تم دیکھو گے کہ مجرم اس سے ڈریں گے اور کہیں گے کہ ہائے افسوس! اس کتاب کا

يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَّلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا۔ (۱۸: ۶)	کیا حال ہے کہ کوئی چھوٹی یا بڑی بات نہیں چھوٹی سب اس میں موجود ہے جو کچھ انھوں نے عمل کیے تھے ان سب کو وہ حاضر پائیں گے۔

اعضاء کی گواہی اور انسان کا اعتراف :-

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲۴: ۳)	وہ دن جبکہ ان پر خود انکی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان اعمال کی گواہی دیں گے جو انھوں نے کیے تھے۔
حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ وَقَالُوا أَنطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنطَقَ كُلَّ شَيْءٍ ..... وَمَا كُنتُمْ تَسْتَتِرُونَ أَن يَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَا أَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُودُكُمْ وَلَٰكِن ظَنَنتُمْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِّمَّا تَعْمَلُونَ۔ (۴۱: ۳)	یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو ان پر ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں ان اعمال کی گواہی دیں گی جو وہ کرتے تھے۔ وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی وہ جواب دیں گی کہ ہم کو اس خدا نے گویائی بخشی ہے جس نے ہر شے کو گویا کر دیا ہے .... تم چھپا کر کام کرتے تھے اور نہ جانتے تھے کہ تمہارے اعمال پر خود تمہارے کان اور آنکھیں اور کھالیں گواہی دیں گی۔ بلکہ تم سمجھتے تھے کہ تمہارے بہت سے اعمال سے اللہ ناواقف ہے۔
وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ (۶: ۱۹)	وہ خود اپنے خلاف شہادت دیں گے کہ وہ ناشکرگزار بندے تھے۔

اس نامہ اعمال اور ان شاہدوں کے ساتھ انسان خدا کی عدالت میں پیش ہوگا۔ پھر اس ہستی کی کیا کیفیت ہوگی وہ اکیلا بے یار و مددگار کھڑا ہوگا :-

وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ	اب تم ہمارے پاس ویسے ہی یکہ و تنہا آئے ہو جیسا ہم نے

وَتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ (۶: ۹۴)

تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔ تم ان سب چیزوں کو پیچھے چھوڑ آئے ہو جو ہم نے تم کو دی تھیں۔

ہر شخص آپ اپنا حساب پیش کرے گا :-

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ حَسِيْبًا (۱۷: ۲۹)

ہر شخص کی برائی اور بھلائی کا نوشتہ ہم نے اسکے گلے میں لٹکا رکھا ہے اور ہم اسکے لیے قیامت کے روز ایک کتاب نکالیں گے جس کو وہ اپنے سامنے کھلا ہوا پائے گا۔ اس سے کہا جائے گا کہ اپنا نامۂ اعمال پڑھ آج خود تیری اپنا حساب کرنے کیلئے کافی ہے۔

خاندانی اثرات کسی کام نہ آئیں گے :-

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (۶۰: ۱)

قیامت کے روز نہ تمہارے نسبی رشتے کسی کام آئیں گے اور نہ اولاد۔

سفارش سے کام نہ چلے گا :-

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ (۴۰: ۲)

ظالموں کے لیے نہ کوئی دوست ہوگا نہ کسی سفارشی کی بات مانی جائے گی۔

رشوت نہ چلے گی :-

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ (۲۶: ۵)

وہ دن جبکہ نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد

اعمال تولے جائیں گے اور ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا :-

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ (۲۱: ۴)

ہم قیامت کے روز ٹھیک تولنے والے ترازو رکھ دیں گے کسی پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا اور اگر رائی کے دانہ بھر بھی عمل ہوگا تو ہم اس کو لے آئیں گے اور ہم حساب کرنے کیلئے کافی ہیں۔

جزا اور سزا جو کچھ بھی ہو گی عمل کے مطابق ہو گی :-

اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۴۵ : ۲۸) آج تمکو ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسے تم عمل کرتے تھے۔

وَلِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۶ : ۱۶) اور ہر ایک کے لیے ویسے ہی درجے ہونگے جیسے انھوں نے عمل کیے۔

یہ وہ پولیس اور عدالت ہے جس کا خوف انسان کے نفس میں بٹھا دیا گیا ہے۔ یہ دنیا کی پولیس نہیں ہے جس کی نگاہ سے انسان بچ سکتا ہے، نہ یہ دنیا کی عدالت ہے جس کی گرفت سے انسان شہادتوں کے فراہم نہ ہونے یا جھوٹی شہادتیں فراہم ہو جانے یا ناجائز اثرات پڑ جانے کی بدولت رہائی پا سکتا ہے۔ بلکہ یہ ایسی پولیس ہے جو ہر حال میں اس کی نگرانی کر رہی ہے اور یہ ایسی عدالت ہے جس کے گواہوں کی نظر سے وہ کسی طرح بچ ہی نہیں سکتا، جس کے پاس اس کے ہر خیال اور ہر عمل کی روداد موجود ہے، اور جس کے فیصلے اتنے منصفانہ ہیں کہ کوئی گناہ سزا سے اور کوئی صواب جزا سے چھوٹ ہی نہیں سکتا۔

اعتقاد یوم آخر کا فائدہ اس طرح اسلام نے یوم آخر کے عقیدہ کو اپنے ضابطۂ اخلاقی اور نظام شرعی کے لیے ایک زبردست پشت پناہ بنا دیا ہے جس میں ایک طرف خیر و صلاح پر عمل کرنے اور شر و فساد سے بچنے کے لیے عقلی ترغیب بھی موجود ہے، اور دوسری طرف نیکی پر یقینی جزا اور بدی پر یقینی سزا کا خوف بھی ہے۔ اس کا ضابطہ اور نظام اپنے بقا و استحکام کے لیے مادی طاقت اور حاکمانہ اقتدار کا محتاج نہیں ہے، بلکہ وہ ایمان بالیوم الآخر کے ذریعہ سے انسان کے نفس میں ایک ایسی طاقتور ضمیر کی تشکیل کرتا ہے جو کسی بیرونی لالچ اور خوف کے بغیر انسان کو آپ سے آپ ان نیکیوں کی طرف راغب کرتا ہے جن کو اسلام نے آخری نتائج کے اعتبار سے نیکی قرار دیا ہے اور ان گناہوں کے انجام سے بچنے کی تاکید کرتا ہے جن کو اس نے آخری نتائج کا لحاظ کرتے ہوئے گناہ ٹھیرایا ہے۔

قرآن مجید میں آپ دیکھیں گے کہ جگہ جگہ اس عقیدہ کو مکارم اخلاق کی تعلیم کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ تقویٰ اور پرہیزگاری کا حکم دیا جاتا ہے تو ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے کہ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا اَنَّکُمْ مُّلٰقُوْهُ (۲ : ۲۸) "اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ تم کو اس کے پاس حاضر ہونا ہے"۔ راہِ خدا میں سرفروشی کے لیے ابھارا جاتا ہے تو ساتھ ہی یہ بھی یقین دلایا جاتا ہے کہ تم مارے جاؤ گے تو درحقیقت مر نہ جاؤ گے بلکہ ہمیشہ کی زندگی پاؤ گے۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ

أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (۲: ۱۹) مصائب پر صبر کی تلقین کی جاتی ہے تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ صابرین کے لیے خدا کی طرف سے عنایت اور رحمت ہے۔ أُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ (۲: ۱۹) بے خوفی اور بہادری کا جذبہ اس طرح پیدا کیا جاتا ہے کہ وَقَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ أَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ (۲: ۳۳) "جو لوگ سمجھتے تھے کہ انہیں اللہ کے پاس حاضر ہونا ہے انھوں نے کہا کہ اللہ کے حکم سے چھوٹی جماعت بھی بڑی جماعت پر غالب آجاتی ہے" سخت سے سخت مشکلات کے مقابلہ میں ڈٹ جانے کی قوت یہ کہہ کر پیدا کی جاتی ہے کہ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا (۹: ۱۱) "جہنم کی آگ دنیا کی گرمیوں سے زیادہ سخت ہے" نیک کاموں میں مال خرچ کرنے کے لیے یہ کہہ کر ابھارا جاتا ہے کہ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (۲: ۳۷) "جو کچھ تم خیرات کروگے اس کا پورا اجر تم کو ملے گا اور تمہارے ساتھ ظلم نہ ہوگا" بخل سے روکنے کے لیے فرمایا جاتا ہے۔ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَا آتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (۳: ۱۸) "جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے مال دیا ہے وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے لیے اچھا ہے، بلکہ درحقیقت یہ ان کے حق میں برا ہے جس مال میں وہ بخل کرتے ہیں وہی قیامت کے روز ان کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا" سودخواری کے فائدوں سے دست بردار ہونے کے لیے یہ کہہ کر آمادہ کیا جاتا ہے کہ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللّٰهِ (۲: ۳۸) "اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کے پاس لوٹائے جاؤ گے" متاع دنیا سے بے نیازی اور بدکاروں کی خوشحالی پر رشک نہ کرنے کی تعلیم اس طرح دی جاتی ہے کہ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْأَبْرَارِ (۳: ۲۰) ...

(باقی)

کتب سماوی پر ایک نظر

(۸)

عہد جدید (اناجیل وغیرہم)

(از جناب ذوقی شاہ صاحب)

کثرت ازدواج اس مسئلہ پر دنیائے مغرب میں عام طور پر بڑی غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے اور یہ گمان کیا جاتا ہے کہ مذہب عیسوی ایک وقت میں ایک سے زائد بیویاں کرنے کی اجازت نہیں دیتا حالانکہ یہ خیال غلط ہے۔ بائبل اس خیال کی تردید کرتی ہے۔

ہم متعدد بار بتلا چکے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے توریت کو منسوخ نہیں فرمایا اور نہ عیسائیوں کو احکام توریت کی پابندی سے مستثنیٰ کیا ہے۔ اصلی اور سچی عیسویت بائبل کی رو سے توریت اور انجیل دونوں کی پابندی پر مشتمل ہے پہلے توریت کو لیجیے اور مندرجہ ذیل حوالجات کو ملاحظہ فرمایئے:۔

پیدائش باب ۱۶ آیہ ۳ و ۴، باب ۲۵ آیہ ۱، باب ۳۵ آیہ ۲۳ تا ۲۶۔ احبار باب ۱۸ آیہ ۱۸۔ استثنار باب ۲۱ آیہ ۱۵۔ قاضیون باب ۸ آیہ ۳۰۔ اول سموئیل باب ۱ آیہ ۱ و ۲ و ۳، باب ۲۵ آیہ ۴۲ و ۴۳ و ۴۴، دوم سموئیل باب ۳، باب ۵ آیہ ۱۳، باب ۱۱ آیہ ۲۷، باب ۱۲ آیہ ۸، باب ۵ آیہ ۱۶۔ اول سلاطین باب ۱ آیہ ۱ تا ۴، باب ۱۱ آیہ ۱ تا ۳۔ اول تواریخ باب ۳ آیہ ۱ تا ۹، باب ۱۴ آیہ ۳۔ دوم تواریخ باب ۱۱ آیہ ۲۱، باب ۱۳ آیہ ۲۱، باب ۲۴ آیہ ۲ و ۳۔

کتب عہد عتیق کے متذکرہ بالا مقامات کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ ایک ہی وقت میں ایک سے زائد بیویاں کرنے کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ اسمیں برکت اور بزرگی بھی ہے اور اللہ کے برگزیدہ بندوں اور انبیا علیہم السلام کا اس پر نہایت شدومد کے ساتھ بکثرت عمل بھی رہا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے تین نکاح کیے۔ بی بی سارہ بی بی ہاجرہ اور بی بی قطورہ سے، اور اگر بی بی قطورہ سے عقد بی بی سارہ کی وفات کے بعد بھی تسلیم کیا جائے تب بھی دو بیویوں کا بیک وقت مجتمع ہونا تو بالاتفاق ثابت ہے۔ یعقوب علیہ السلام کی چار بیویاں تھیں۔ حضرت سموائیل نبی کے والد ماجد کی دو بیویاں تھیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی دو بیویاں تھیں۔ داؤد علیہ السلام کی سو بیویاں تھیں (یہ وہ برگزیدہ نبی ہیں جنکی نسل سے بلحاظ جسم مسیح ع کا پیدا ہونا بائبل میں بیان کیا گیا ہے۔ بڑی عظمت کے ساتھ آپکا ذکر آیا ہے اور باستثنا۔ اوس معاملہ کے جو زوجہ اوریاہ کے متعلق بائبل میں آپ سے منسوب کیا گیا ہے اور کوئی الزام آپ پر نہیں لگایا گیا حتیٰ کہ آپ کی کثرت ازدواج پر بھی آپ پر کوئی اعتراض نہیں آپکی زبور یہودیوں اور عیسائیوں کی کتب مقدسہ میں اب تک کمال عزت وعظمت کے ساتھ موجود ہے) سلیمان علیہ السلام کی سات سو (۷۰۰) بیویاں تھیں اور تین سو (۳۰۰) حرم (آپ پر بھی بائبل میں اس کثرت ازدواج پر کہیں کوئی الزام نہیں آیا) حضرت سلیمان کے بیٹے رحبعام کی اٹھارہ (۱۸) بیویاں تھیں اور ساٹھ (۶۰) حرم۔ حضرت سلیمان کے پوتے ابیاہ کی چودہ (۱۴) بیویاں تھیں۔ حضرت جدعون کی بھی بہت سی بیویاں تھیں۔

اب اناجیل کو لیجیے۔ اناجیل میں کہیں توریت کی اس اجازت کو منسوخ نہیں کیا گیا۔ عہد جدید کی کتب مقدسہ میں سے کسی کتاب میں ایک سے زائد بیویوں کے ایک ہی وقت میں جمع کرنے کی ممانعت نہیں آئی۔ صرف دو موقعوں پر اس قسم کی عبارت پائی جاتی ہے جس سے شائد اس نوع کی ممانعت کا التباس ہوا ہو۔ پولوس کے تمطاؤس کے نام پہلے خط کے باب ۳ آیہ ۱ و ۲ میں مندرجہ ذیل عبارت واقع ہوئی ہے:۔

"یہ بات سچ ہے کہ جو کوئی کلیسے کی نگہبانی کی آرزو رکھتا ہے وہ اچھا کام چاہتا ہے۔ پس چاہیئے کہ نگہبان بے عیب، ایک جورو کا شوہر، پرہیزگار، صاحب تمیز، مسافر دوست اور تعلیم دینے پر قابل ہو"

اسی سے ملتی جلتی اور اسی مضمون کی عبارت پولوس کے طیطس کے نام خط کے باب ۱ آیہ ۶ میں پائی جاتی ہے۔ اول تو

ان دونوں عبارتوں کو اناجیل اربعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ پولوس کے مشکوک اور غیر معتبر خطوط کی عبارت ہے۔ اگر ان خطوط کو معتبر بھی مانا جائے تو یہ پولوس کی ذاتی رائے ہے جو نہ شریعت موسوی میں ترمیم کا باعث ہو سکتی ہے نہ شریعت عیسوی میں۔ علاوہ ازیں پولوس کی یہ رائے بھی صرف پادریوں اور کلیسے کے خدام سے تعلق رکھتی ہے نہ کہ عام عیسائیوں سے۔ پادریوں اور مذہبی خدمت کرنے والوں کو صرف مشورہ دیا گیا ہے کہ بہتر ہو اگر ان کے ایک ہی بیوی ہو تا کہ بیوی بچوں میں ان کا زیادہ وقت صرف نہ ہو اور کلیسا کی خدمت کے لیے انہیں فرصت زیادہ ملے۔ اس مشورہ کی رو سے بھی پادریوں کے لیے بہتر ہے اگر وہ ایک ہی بیوی رکھیں لیکن ایک سے زائد بیویاں اگر انکے پاس ہوں تو اسے گناہ ہرگز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح کہ قرنتیوں کے باب ۷ آیہ ۱ میں یہی پولوس لکھتے ہیں کہ:-

"مرد کے لیے یہ اچھا ہے کہ عورت کو نہ چھوئے"

اور اسی باب کی آیہ ۲۸ میں مردوں اور عورتوں کو شادی نہ کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے مگر اس مشورہ کے خلاف عمل کرنے والوں کو گنہ گار بھی نہیں ٹھیرایا گیا۔ چنانچہ اسی باب میں جہاں آیہ ۱ میں مرد کے لیے عورت کا نہ چھونا اچھا بیان کیا گیا ہے وہاں آیہ ۲ میں فوراً یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ "اگر حرامکاری سے بچنے کے لیے کوئی مرد جورو کرے یا عورت شوہر کرے" تو مضائقہ نہیں۔ اور آیہ ۲۸ میں جہاں مردوں اور عورتوں کو شادی کے خلاف مشورہ دیا گیا ہے وہاں اوسی آیہ میں یہ بھی صاف جتلا دیا گیا ہے کہ اگر کوئی نکاح کرے تو گناہ نہیں۔ بالکل اسی نوع کا مشورہ پادریوں کو بھی دیا گیا ہے کہ اگر وہ ایک ہی بیوی پر قناعت کریں تو مذہبی خدمت کا انجام دینا ان کے لیے زیادہ آسان ہوگا۔ اگر ایک سے زیادہ بیوی کا ایک ہی وقت میں رکھنا مذہباً گناہ ہوتا تو ممانعت عام ہوتی، نہ کہ پادریوں کے لیے خاص۔ اس ممانعت خاص سے اس بات کا پتہ بھی چلتا ہے کہ اوس زمانہ میں عیسائیوں میں کثیر الازدواجی کی رسم عام تھی جس سے پادریوں کو باز رکھنے کی کوشش کی گئی۔ اس ممانعت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حواریوں کے زمانہ میں، نیز اوس کے بعد بھی اغیار کے ہاتھوں بیچارے عیسائیوں پر ایسے شدید مظالم اور مصائب کی بارش ہوتی رہی ہے کہ اون بیچاروں کو وطن چھوڑنا پڑتا تھا، برسوں جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپنا پڑتا تھا۔ جب پکڑے جاتے تھے تو بڑی اذیت سے قتل کیے جاتے تھے۔ باپ کے سامنے بیٹا اور بیٹے کے

سامنے باپ قتل ہوتا تھا۔ عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہوجاتے تھے۔ جب یہ لوگ بھاگتے تھے تو سارے گھر کو ساتھ لے کر بھاگتا اور عورتوں بچوں سمیت جنگلوں پہاڑوں میں بسر کرنا بہت دشوار ہوتا تھا پادری وِلِش صاحب مصر کی بعض قبروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ رومی سلاطین نے عیسائیوں کو ڈس بار جو خوفناک اور درد انگیز ایذائیں پہونچائیں اور تباہیاں ان پر برپا کیں ان میں عیسائی لوگ انہیں غاروں میں پناہ لیتے تھے اور اپنے مُردوں کو انہیں میں دفن کردیتے تھے۔ قرنتیوں کے باب ۷، آیات ۲۶ تا ۲۹ میں انہیں مصائب کی جانب اشارہ ہے۔ ان حالات میں ایک بیوی کا ہونا بھی مصیبت ہوتا ہے چہ جائیکہ متعدد بیویاں ہوں، خصوصاً پادریوں کے لیے جن کے کاندھوں پر کلیسا کی خدمت اور متبعین مسیح کی رہنمائی کا بھی بار تھا۔ ان پادریوں کے لیے ان حالات میں یہ ایک عارضی مشورہ تھا جو پولوس نے پیش کیا تھا اور وہ کوئی مذہبی حیثیت نہ رکھتا تھا۔

عیسائیوں میں ایک فرقہ ہے جو مورمن Morman کے نام سے موسوم ہے۔ ان میں ہر عیسائی کو بارہ بیویاں رکھنے کی اجازت ہے۔ ان کے پیشوا برگہم ینگ (۱۸۰۱ء تا ۱۸۷۷ء) Bringham Young کے پاس ایک وقت میں پچاس (۵۰) بیویاں رہ چکی ہیں۔ عیسائی عقیدہ کے بموجب عیسیٰ علیہ السلام کی بھی دو بیویاں قرار پاتی ہیں۔ ایک کلیسہ قدیم یعنی جماعت یہود۔ اور دوسری کلیسہ جدید یعنی جماعت نصاریٰ (دیکھو دوم قرنتیوں کا باب ۱۱ آیہ ۲۔ اور مکاشفات باب ۱۹ آیہ ۷، باب ۲۱ آیہ ۹، باب ۲۲ آیہ ۱۷) پراٹسٹنٹ فرقہ کے بانی مارٹن لوتھر نے ایک وقت میں شخص فلپ کو دو بیویاں رکھنے کی اجازت دی۔ لوتھر صاحب اپنی بعض تحریروں میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ انسان دس یا زیادہ بیویاں ایک ساتھ رکھ سکتا ہے۔ تاریخ میں عیسائی دنیا کی متعدد مشہور ہستیاں ایسی پائی جاتی ہیں جنھوں نے ایک ہی وقت میں متعدد بیویاں کیں۔ جرمنی اور فرانس کے متعدد بادشاہ بھی اس زمرہ میں شامل ہیں۔ خود انگلستان کے بادشاہ ہینری ہشتم نے جو فرقہ پراٹسٹنٹ کے زبردست سرپرست تھے متعدد نکاح کیے اور ایک وقت میں تین بیویاں رکھیں۔ جرمنی کے پادری بونیفس نے پوپ گریگوری سے ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں دریافت کیا کہ انسان کو کس حالت میں دو بیبیاں کرنی جائز ہیں۔ پوپ نے جواب دیا کہ جب بیوی کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو کہ

خاوند اس سے مباشرت نہ کر سکے اس صورت میں خاوند کو دوسرا نکاح کر لینا درست ہے بشرطیکہ وہ بیمار بیوی کی ہر طرح خبر گیری کرتا رہے۔ عیسائیوں نے خود کثیر الازدواجی کے جواز میں متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ رومن کیتھولک فرقہ کے راہبوں کی ایک جماعت کپوشینز کے رہنما برنارڈو اوکینس نے اس رسم کے پسندیدہ ہونے کی تائید میں ایک کتاب لکھی ہے۔ ان تائید کرنے والوں میں سے جو کہ متعدد ہیں سب سے زیادہ مشہور شخص جان ملٹن (۱۶۰۸ء - ۱۶۷۴ء) ہے جس نے اس رسم کی حمایت میں بڑا زور صرف کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب مضمون درباب مذہب عیسویت میں اس امر کے ثبوت میں انجیل سے بہت سے فقرے نقل کرتا ہے۔ پھر لکھتا ہے کہ:-

"علاوہ اس کے خدا تعالیٰ نے اپنے آپ کو استعارہ کے طور پر ایک حکایت میں مرد بتایا ہے (حزقی ایل باب ۲۳) جس نے احولا اور احولیبا دو عورتوں سے نکاح کیا۔ اگر یہ رسم دراصل بری ہوتی تو خدا تعالیٰ استعارہ میں بھی اس رسم کو اپنے لئے اختیار نہ کرتا۔ جس رسم کی انجیل میں ممانعت نہ ہو ہم اسکو کس دلیل سے برا اور ذلیل کہیں۔ کیونکہ انجیل نے کسی ملکی قانون کو جو اس سے پہلے رائج تھا برا نہیں کہا۔ انجیل میں صرف یہ حکم ہے کہ ایلڈر اور ڈیکن پادری وہ لوگ بنائے جائیں جو صرف ایک بیوی رکھتے ہوں (اول تمطاؤس باب ۳ آیۃ ۲ اور طیطس باب ۱ آیۃ ۶) اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک سے زیادہ نکاح کرنا گناہ ہے کیونکہ اگر گناہ ہوتا تو یہ حکم سب کے لیے عام ہوتا۔ صرف پادریوں ہی کے لیے نہ ہوتا۔ اس حکم میں یہ مصلحت ہے کہ ایک بیوی والے دنیا میں اتنا گرفتار نہ ہونگے جتنا کہ زیادہ بیویوں والے اور اس وجہ سے یہ لوگ گرجے کا کام بخوبی انجام دے سکیں گے۔ یہ ممانعت بھی کچھ گناہ ہونیکے سبب سے نہیں ہے۔ ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سب کو ایک سے زیادہ بیبیاں جمع کرنے کی اجازت ہے اور اکثر لوگوں نے اس رسم کو اختیار بھی کیا ہے۔ حضرت مسیح نے کوئی ممنوعی صورت بیان نہیں کی۔ ہمارے اکثر نبیوں نے ایک سے زائد بیبیاں جمع کیں

لہٰذا مجھے یقین ہے کہ ایسی بے ادبی کوئی نہ کرے گا کہ اس رسم کو حرام یا زنا ٹھہرائے کیونکہ انجیل میں صاف لکھا ہے کہ حرامکاروں اور زانیوں کو اللہ سزا دیگا اور اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اکا میں خود محافظ ہوں۔ لہٰذا ایک سے زیادہ بیبیاں جمع کرنا نکاح ٹھیرا اور نکاح ہر طرح حلال اور درست ہے۔ حضرت موسیٰ ہی فرماتے ہیں کہ نکاح کرنا بہت اچھا ہے اور گناہ نہیں ہے ''

پادری فاکس صاحب اپنی کتاب الموسوم بہ "غلطیوں کی اصلاح" مطبوعہ امریکن مشن پریس لکھنؤ ۱۸۹۰ء کے صفحہ ۲۶و۲۰ پر تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"تعدد ازدواج کے مقدمہ میں ہم بے تردد تسلیم کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں بھی اس دستور نے رواج پایا تھا اور خدا نے بھی اسکو منع نہیں کیا بلکہ اسی رسم پر چلنے والوں کو اکثر برکت کا وعدہ فرمایا ہے"

یہاں نامناسب نہ ہوگا اگر رسول عربی صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو بعض عیسائی اس معاملہ میں اعتراض پیش کیا کرتے ہیں اون کے جواب میں ایک عیسائی مصنف ہی کی تحریر کو پیش کر دیا جائے۔ جان ڈیون پورٹ اپنی کتاب کے صفحہ ۱۴۷ پر تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"اور یہ جو عیسائی الزام لگاتے ہیں کہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) شہوت پرست تھے (نعوذ باللہ) یہ اون کا الزام باطل ہے۔ کیونکہ جب آپ نے ظہور فرمایا اوس زمانہ میں اہل عرب میں بے انتہا نکاحوں کا رواج تھا۔ پس یہ امر بظاہر بیہودہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسا شخص جو خود شہوت پرست ہو وہ بدکاری کی اس رسم کو معدوم کرے۔ علاوہ اسکے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ہم یہ بات بھی آنحضرت (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ بھی اپنے ہم وطنوں کی مانند عورتوں سے بہت رغبت رکھتے تھے اور آپنے

یہ کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ ہم آپ اُن انسانی خواہشوں سے بری ہوں جو سب آدمیوں کو ہوتی ہیں۔ بلکہ برعکس اسکے یہ فرمایا ہے کہ میں بھی تمہیں جیسا آدمی ہوں۔ اور بمقابلہ حضرت داؤد کے جو نبی اور بادشاہ تھے اور جن کی تعریف انجیل میں لکھی ہے کہ وہ ایسے آدمی تھے جو خدا کا سا دل رکھتے تھے آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) ایسے صاف تھے جیسے ایک برف کا ٹکڑا ذاتی تنا (عفت و پاکدامنی کی دیوی) کے مندر پر گرا ہوا ہو۔ ساؤل کی دوسری دختر بتشبع حضرت داؤد کی پہلی زوجہ تھی۔ اس زوجہ کو اس کے باپ نے آپکی جلاوطنی کے زمانہ میں آپ سے لے لیا۔ بعدازاں آپ نے مسلسل کتنے ہی نکاح کیے گر باین ہمہ اپنی پہلی زوجہ کا بھی دعویٰ برابر کرتے رہے۔ حضرت داؤد نے ایک غیر مختون بادشاہ کی بیٹی سے بھی بے تکلف نکاح کر لیا اور اگرچہ آپکے ہاں اکثر بیویوں سے اولاد بھی تھی مگر آپ یروشلم میں حرمیں کرتے رہے اور آخر کار بتشبع کے معاملہ میں آپ نے حرام اور خون ناحق بھی کیا (نعوذ باللہ) جب حضرت داؤد ایسے ضعیف ہوگئے کہ آپ پر ہر چند کپڑے ڈالے جاتے مگر آپ کو گرمی نہ پہونچتی اور سردی موقوف نہ ہوتی تو یہ تجویز ٹھیری کہ ایک نوجوان باکرہ عورت بہم پہونچائی جائے جو آپ کی خدمت کرے اور آپ کے ساتھ ہم خواب ہو۔ چنانچہ آپنے لوگوں کو حکم دیا کہ ایک نہایت حسین اور نوعمر عورت لائی جائے۔"

اقتباس مندرجہ بالا کے بعد ہم اپنی طرف سے صرف اس اضافہ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ جو لوگ خود شیشے کے مکانوں میں رہتے ہوں ان کا دوسروں پر پتھر پھینکنے میں پیش قدمی کرنا عقل مندی کے خلاف ہے۔

مہر | عورتوں کو نکاح میں مہر دینا شریعت موسوی و عیسوی میں داخل ہے۔ ملاحظہ فرمائیے پیدائش باب ۳۴ آیہ ۱۲۔ خروج باب ۲۲ آیہ ۱۶۔ استثنا باب ۲۲ آیہ ۲۹۔ اول سموئیل باب ۱۸ آیہ ۲۵۔

شوہر کی اطاعت | لوگ موجودہ عیسائی دنیا کی عام روش دیکھ کر تعلیم عیسوی کے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا

نہ ہوں۔ انجیلی تعلیم عورتوں ہی کو مردوں کی فرمانبرداری کا حکم دیتی ہے۔ **افسیون باب۵ آیات ۲۲ و ۲۳ و ۲۴** میں ہے کہ:-

"اے عورتو! اپنے شوہروں کی ایسی فرمانبردار ہو جیسے خداوند کی۔ کیونکہ شوہر زوجہ کا سر ہے جیسے کہ مسیح بھی کلیسہ کا سر ہے اور وہ بدن کا بچانے والا ہے۔ تو بھی جیسے کلیسہ مسیح کی فرمانبردار رہے ویسے ہی بیویاں بھی ہر بات میں اپنے شوہروں کی ہوویں"

اسی طرح اول **تمطاؤس** باب ۲ اور اول **پطرس** باب ۳ میں بھی عورتوں کو اپنے شوہروں کی اطاعت کا تاکیدی حکم موجود ہے۔

فساق و فجار سے اجتناب عیسائی رواداری کا وعظ کہنے والے اس بات کو غالباً دلچسپی سے دیکھیں گے کہ احکام انجیل کی رو سے عیسائیوں کو بالکل اجازت نہیں کہ وہ اپنے ان عیسائی بھائیوں تک سے میل جول رکھیں اور ان کے ساتھ کھانا تک کھائیں جو حرام کار یا لالچی یا بت پرست یا گالی دینے والے یا شرابی یا ظالم ہوں اول **قرنتیوں** کے باب ۵ آیہ ۱۱ میں ہے کہ:-

"اگر کوئی بھائی کہلا کر حرام کار یا لالچی یا بت پرست یا گالی دینے والا یا شرابی یا لٹیرا ہو تو اس سے صحبت نہ رکھنا بلکہ ایسے کے ساتھ کھانا تک نہ کھانا"

توحید و تثلیث تثلیث کے مسئلہ نے عیسائی دنیا میں بڑا تہلکہ برپا کیا، بڑی خونریزیاں کیں اور بہت سے فرقے پیدا کر دیئے۔ مگر ہم یہاں صرف انجیل کی روشنی میں اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔

جن کتابوں کو آسمانی ہونے کا دعویٰ ہے اونکے مطالعہ کرنے والوں کے پاس ان کتابوں کی حقانیت دریافت کرنے کے لیئے ایک اتنا اچھا معیار ہے جس میں مغالطہ نہیں ہونے پاتا۔ وہ معیار توحید کی تعلیم ہے۔ جن کتب سماوی میں توحید کو جس خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہو اتنی ہی حقانیت کا ان میں پتہ چلتا ہے اور انکی عبارتیں جس قدر توحید اصلی سے ہٹی ہوئی ہوں اتنا ہی ان میں تحریف و الحاق کا گمان ہوگا۔ اناجیل مروجہ میں

باوجود اس کے کہ تحریف و الحاق کے وقوع کا عیسائی علماء کو اعتراف ہے تعجب ہے کہ توحید الٰہی اور عبدیت مسیح کی تائید میں کافی مواد موجود ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ باوجود اس مواد کے عیسائیوں نے تثلیث کو بے دھڑک اپنا مسلک قرار دے لیا اور الوہیت مسیح کے قائل ہوگئے اقتباسات ذیل ملاحظہ ہوں:۔

"یسوع نے اس کے جواب میں کہا کہ سب حکموں میں اول یہ ہے کہ اے اسرائیل سن خداوند جو ہمارا خدا ہے ایک ہی خداوند ہے۔" (مرقس باب ۱۲ آیۃ ۲۹)۔

اسی نوع کا مضمون متی باب ۲۲ آیۃ ۳۶ تا ۴۰ میں بھی موجود ہے اور اس توحید و نیز ہمسایہ کو پیار کرنے کی بابت آیۃ ۴۰ میں مسیح کا یہ قول بھی درج ہے کہ "انہیں دو احکام پر ساری شریعت اور سب انبیاء کی باتیں موقوف ہیں"، اس سے زیادہ زبردست ثبوت دین مسیح کی بنیاد کے توحید پر ہونے کا کیا ہو سکتا ہے؟

"خدا ایک ہے اور خدا اور آدمیوں کے بیچ ایک آدمی بھی درمیانی ہے وہ مسیح یسوع ہے"

(اول تمطاؤس باب ۲ آیۃ ۵)

توحید الٰہی اور عبدیت مسیح کا اس سے واضح تر اعتراف کیا ہو سکتا ہے؟ کتب عہد جدید میں کثرت سے ایسی عبارتیں موجود ہیں جن سے عیسیٰ علیہ السلام کا ابن آدم اور نبی اور اللہ کا برگزیدہ بندہ ہونا پایا جاتا ہے پہلے حواری بھی آپ کو اللہ کا بندہ اور نبی تسلیم کرتے تھے۔ مگر باوجود ان تمام باتوں کے بعد کے عیسائی علماء اہل تثلیث ہوگئے اور یہ عقیدہ رکھنے لگے کہ خدا کی ذات واحد تین اقانیم پر مشتمل ہے وجود حیات اور علم جس سے باپ بیٹا اور روح القدس مراد ہیں۔ بعض عیسائی فرقوں نے حضرت مریم علیہا السلام کو بھی تثلیث میں داخل کر لیا۔

منجملہ دیگر اعتراضات کے ایک عقلی اعتراض جو اس تثلیث پر وارد ہوتا ہے یہ ہے کہ اگر اقانیم ثلاثہ میں سے ہر واحد کو ہر قسم کے کاموں کی یکساں قدرت کا مالک تسلیم کیا جائے تو تعین تعداد ثلاثہ اور تخصیص تثلیث کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور اگر اقانیم ثلاثہ میں سے ہر اقنوم کو بطرز خاص جدا جدا کاموں کی قدرت کا مالک تسلیم کیا جائے تو ہر واحد کی شان میں نقص عظیم کا ہونا لازم آئیگا۔ کہ ایک کا کام دوسرا نہیں کر سکتا اور اس بناء پر ذات واحد میں تقسیم کا تعین تثلیث کی ضرورت ہوئی اور یہ

قادر مطلق کی شان سے بہت بعید ہے۔

عیسائی توحید کا بھی دم بھرتے ہیں اور تثلیث کا بھی مگر یہ نہیں سمجھا سکتے کہ اس تثلیث کے ہوتے ہوئے توحید قائم کیونکر رہ سکتی ہے۔ جب سوال کیا جاتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ اس مسئلہ کے سمجھنے سے عقل انسانی قاصر ہے انجیل سے بھی وہ کوئی سند پیش نہیں کر سکتے۔ توریت و انجیل میں لفظ "تثلیث" کسی جگہ نہیں پایا جاتا اور اسکی تعلیم نہ عیسٰی علیہ السلام نے کسی کو دی نہ آپکے کسی حواری نے۔ چنانچہ میزان الحق مطبوعہ مرزاپور (۱۸۴۳ء) میں جو کہ ایک عیسائی کی تصنیف ہے باب ۲ فصل ۴ صفحہ ۱۴۶ پر درج ہے کہ:۔

"مسیحیوں کے اعتقاد میں اس عمدہ مطلب کو تثلیث یا ثلاث واحد کہتے ہیں اور اگرچہ یہ لفظ بعینہٖ انجیل میں نہیں پائے جاتے مگر انجیل کی اس عمدہ تعلیم کا عبارت کے موافق ایسا نام ہوا ہے"

باوجود میزان الحق کی اس عبارت کے عہد نامہ جدید میں تین مقامات ایسے ہیں جہاں تثلیث کا لفظ صاف صاف تو نہیں آیا مگر باپ بیٹے اور روح القدس کا ذکر ایک جگہ جمع ہوگیا ہے۔ ایک تو متی باب ۲۸ آیہ ۱۹ میں ہے کہ:۔

"اس لیے تم جا کر سب قوموں کو شاگرد کرو اور انہیں باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام سے بپتسمہ دو"

یہ ذکر کسی اور انجیل میں نہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہوتی تو اور انجیلوں میں بھی اس کا ذکر ضرور آتا جیسا کہ متعدد امور میں ایک ہی بات کا مختلف اناجیل میں اعادہ کیا گیا ہے۔ لیکن اگر اس عبارت کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس سے تثلیث ثابت نہیں ہوتی بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ سب قوموں کو باپ کے نام سے جو کہ خدا ہے اور بیٹے کے نام سے جو کہ اسکا رسول ہے اور روح القدس سے پیدا ہوا ہے بپتسمہ دیکر شاگرد کرو۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ خدا کے نام کے ساتھ اسکے رسول کا نام آنا بھی ضروری ہے باپ اور بیٹے کے الفاظ کا استعمال اور

نہاد کی رسم کے مطابق محض رسمی ہے جس پر مزید گفتگو آگے آئے گی۔

دوسرے دوم قرنتیوں کے باب ۱۳ آیہ ۱۴ میں ہے کہ :-

"اب خداوند یسوع مسیح کا فضل اور خدا کی محبت اور روح قدس کی صحبت تم سبھوں کے ساتھ

ہووے۔ آمین"

یہ صرف دعائیہ کلمات ہیں اور اقانیم ثلاثہ کے ثبوت کا ان میں شائبہ تک نہیں۔

تیسرے اول یوحنا باب ۵ آیہ ۷ میں ہے کہ :-

"تین ہیں جو آسمان پر گواہی دیتے ہیں باپ اور کلام اور روح قدس اور یہ تینوں ایک ہیں"

یہاں البتہ تثلیث کا صاف صاف اظہار ہے اور یہی آیت اہل تثلیث کے تثلیثی عقیدہ کی بنیاد ہے لیکن بڑے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس آیت کے الحاقی ہونے پر جمیع محققین علمائے عیسوی کا اتفاق ہے۔ پادری فانڈر صاحب اور گریسباخ اور شولز ان لوگوں میں سے ہیں جو اس کے الحاقی ہونے کے معترف ہیں۔ لندن میں ۱۸۳۳ء میں مسیحی علماء کی جانب سے ایک کتاب لائبریری آف یوسفل نالج شائع ہوئی جس میں مرقوم ہے کہ اسحٰق نیوٹن نے ایک پچاس صفحوں کا رسالہ لکھا ہے جس میں نامہ یوحنا اور نامہ پولوس کے ان دو فقروں کے متعلق تحقیقی بحث کی ہے جن سے مسئلہ تثلیث پیدا ہوا ہے اور نیوٹن کی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ ان دونوں آیات میں کاتبوں نے تبدیلی کی ہے۔ اس سے دونوں آیات مندرجہ بالا یعنی دوم قرنتیوں کے باب ۱۳ آیہ ۱۴ اور اول یوحنا باب ۵ آیہ ۷ کے الحاقی ہونیکا ثبوت پایا جاتا ہے ۱۸۷۰ء میں شہر کنٹربری (انگلستان) میں بائبل کی تنقید کی غرض سے ستائیس (۲۷) مشہور عیسائی علماء کی ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں بالاتفاق یوحنا کی متذکرہ بالا آیت الحاقی قرار دی گئی۔

یہودیوں میں تو باوجود عقائد میں اختلافات باہمی کے کوئی شخص بھی عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت تو درکنار رسالت تک کا قائل نہیں۔ نہ توریت اور صحف انبیائے بنی اسرائیل میں کہیں تثلیث کی تعلیم پائی جاتی ہے۔

(باقی)

تنزیل و تاویل

سورۂ فاتحہ

(از جناب مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی)

اس سورہ کو فاتحۃ الکتاب اور فاتحۃ القرآن بھی کہتے ہیں۔ اس لیے کہ کتاب الٰہی کا آغاز اسی سورہ سے ہوتا ہے۔ اس کا ایک نام ام الکتاب بھی ہے یعنی تمام کتاب الٰہی کا خلاصہ اور اجمال۔

جن باتوں کی طرف بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں اشارات کیے گئے ہیں ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ سورۂ فاتحہ میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ میں صفات الٰہیہ کو بیان فرمایا اور مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ سے احوال آخرت کی طرف اشارہ فرمایا۔ اور اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ سے مباحث نبوت و رسالت، ایمان اور کفر، سعادت اور شقاوت، ہدایت اور ضلالت کے فرق کی طرف اشارہ فرمایا۔

تمام قرآن انہی مضامین کی تفصیل ہے جو سورۂ فاتحہ میں اجمالاً ذکر فرمائے گئے ہیں۔ اسی وجہ سے اس سورت کا نام ام الکتاب ہے۔ اور چونکہ کتاب الٰہی کی ہر سورۃ انہی مضامین ثلاثہ کی تفصیل ہے جو اجمالاً بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں درج ہیں، اس لیے ہر سورۃ کی ابتدا میں بسم اللہ کا لکھنا اور پڑھنا مسنون ہوا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

حقیقی ستائش اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے جو تمام جہانوں کا پرورش کرنے والا ہے

(۱) جو فعل علم، اختیار، قدرت اور ارادہ سے صادر ہو اسکی واقعی خوبی بیان کرنے کو "حمد" کہتے ہیں۔ مدح میں نہ فعل کا اختیاری ہونا ضروری ہے اور نہ اس خوبی کا واقعی ہونا لازمی۔ اس وجہ سے مدح کسی وقت ممنوع بھی ہو جاتی ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:-

احثوا التراب فی وجوہ المداحین — مدح کرنے والوں کے منہ پر خاک ڈال دو

مگر حمد سے کسی وقت منع نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ اس میں واقعی خوبی کا اظہار ہوتا ہے۔

بعض علماء نے تعریف حمد سے قید اختیار کو حذف کر دیا ہے اس لئے کہ اس قید کے ہوتے ہوئے حق تعالیٰ شانہٗ کی صفات ذاتیہ کی ثنا کو حمد کہنا دشوار ہوگا کیونکہ صفات ذاتیہ مثل علم و قدرت حق تعالیٰ شانہٗ کے افعال اختیاری نہیں ہیں۔ لیکن یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ یہ صفات اگرچہ غیر اختیاری ہیں مگر ان کے ثمرات ضرور اختیاری ہیں۔

حمد اور مدح میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ حمد انہیں صفات کمال پر ہو سکتی ہے، جن کا صفات کمال ہونا قطعی اور یقینی ہو اور ان میں کسی قسم کے نقص کا شائبہ بھی نہ ہو بخلاف مدح کے کہ اس میں نہ یہ ضروری ہے کہ وہ صفت قطعاً اور یقیناً صفت کمال ہو، ظناً بھی صفت کمال ہو تو مدح کے لیے کافی ہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ وہ صفت نقص کے شائبہ سے پاک ہو، بلکہ اگر اس میں کچھ نقص بھی ہو تب بھی مدح ہو سکتی ہے۔

نیز حمد میں یہ ضروری ہے کہ محاسن و کمالات کا ذکر محبت اور اجلال کے ساتھ ہو اور مدح میں یہ ضروری نہیں۔ مطلقاً محاسن اور کمالات کے بیان کرنے کو خواہ وہ محبت اور اجلال سے ہو یا نہ ہو مدح کہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ لفظ حمد سے جو تعظیم و تفخیم مترشح ہوتی ہے وہ لفظ مدح سے نہیں ہوتی اس لیے حمد کا اکثر اطلاق اس منعم حقیقی پر ہوتا ہے۔

حمد کے بعد سب سے پہلے اسم ذات کو ذکر فرمایا اور اس کے بعد اسماء صفات و افعال کو تاکہ ذاتاً اور صفتاً ہر طرح سے اس کا مستحق حمد و ثنا ہونا معلوم ہو جائے۔

(۲) ربوبیت یعنی پرورش کرنا اور کسی شے کو بتدریج حد کمال تک پہنچانا۔ اگرچہ والدین سے بھی یہ فعل ظہور میں آتا ہے۔ کما قال تعالیٰ

قُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا۔ کہہ کہ پروردگار! ماں اور باپ پر رحم کر جس طرح ان دونوں نے مجھ کو بچپن میں پرورش کیا۔

مگر والدین کی ربوبیت نورِ آفتاب کی طرح اصلی اور ذاتی اور خانہ زاد نہیں بلکہ نورِ زمین کی طرح مستعار اور عطاءِ غیر ہے۔ جس طرح نورِ زمین آفتاب کا فیض اور عطیہ ہے، اسی طرح والدین کی تربیت بھی عطیہ الٰہی ہے نیز حقیقی تربیت جب ہو سکتی ہے کہ کسی شے کو نیست سے ہست کیا جائے، پھر اس کے تمام اسباب تربیت کو پیدا کیا جائے، اور پیدا کرنے کے بعد انتفاع کے تمام موانع دور کر دئے جائیں۔ تب تربیت مکمل ہو سکتی ہے۔ والدین اولاد کی تربیت کرتے ہیں مگر نہ اولاد انکی مخلوق ہے۔ اور نہ وہ سامان تربیت کے خالق ہیں بلکہ سب کا سب خدا ہی کا پیدا کیا ہوا ہے نیز والدین کی تربیت چند اشخاص کے ساتھ مخصوص ہے، تمام عالم کے لیے عام اور محیط نہیں پس قابل ستایش وہی ربوبیت ہو سکتی ہے جو اصلی اور ذاتی ہو۔ مستعار اور عطاءِ غیر نہ ہو۔ ہر طرح سے کامل اور مکمل ہر کسی قسم کا اس میں نقص نہ ہو۔ تمام عالمین کے لیے عام اور محیط ہو اس لیے ارشاد ہوا کہ:۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ یعنی حقیقی ستایش خدا تعالیٰ ہی کے لیے خاص ہے، جسکی ربوبیت اصلی اور ذاتی اور کامل ہونے کے علاوہ تمام جہانوں کے لیے عام اور محیط ہے۔ اسی وجہ سے جب فرعون نے کہا کہ:۔

وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ رب العالمین کیا چیز ہے

تو موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ ارشاد فرمایا:۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وہ جو تمام سماوں اور زمین اور ان کے مابین کی مخلوقات کا پروردگار ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد کے بعد شاید فرعون کو یہ تردد ہوا ہو کہ تربیت کو صرف ذات

خداوندی میں منحصر کر دینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ جبکہ ہم والدین اور آفتاب اور ماہتاب کی تربیتوں کا بھی روزانہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں، اس لیے موسیٰ علیہ السلام دوبارہ جواب کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا:۔

رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ ۔ وہ رب ہے تمہارا اور تمہارے اگلے آباء واجداد کا

یعنی تمہارے آباء واجداد کی تربیت اصلی اور ذاتی نہیں، بلکہ عطیۂ الٰہی ہے، تمہارا اور تمہارے تمام آباء اولین کا حقیقی رب اور پروردگار وہی ہے۔ اور تیسری بار فرمایا:۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ۔ وہ رب ہے مشرق اور مغرب کا اور ان کے درمیان کا اگر تم کچھ عقل رکھتے ہو۔

یعنی آفتاب اور ماہتاب کو اپنی کھیتیوں کا مربی سمجھنا غلط ہے اس لئے کہ خود آفتاب وماہتاب اور ان کے نور کو اسی رب العالمین نے پیدا کیا ہے۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا ۔ وہی جس نے سورج کو چمکتا ہوا اور چاند کو روشن بنایا۔

اگر وہ رب العالمین آفتاب کو ضیاء اور ماہتاب کو نور نہ عطا فرماتا تو پھر آفتاب وماہتاب کس طرح کھیتیاں پکا سکتے۔ فَلِلَّهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْأَرْضِ وَرَبِّ الْعَالَمِينَ وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔

حضرات صوفیہ کرام قدس اللہ اسرارہم فرماتے ہیں کہ ارواح کے کانوں میں سب سے پہلے وصف ربوبیت ہی کا نغمۂ دلفزا پہونچا ہے اور پہلے اسی وصف سے انھوں نے خدا کو پہچانا ہے۔ کما قال تعالیٰ

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ ۔ جب اللہ نے اولاد آدم کی پیٹھوں سے انکی ذریت کو نکالا اور ان کے اوپر خود ان ہی کو گواہ بنایا، پوچھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ ان سب نے کہا ہاں۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے سب سے پہلے اسی اسم رب کے ساتھ ارواح کو مخاطب کیا اور اسی نام سے ان سے

عہد اور میثاق لیا۔ بظاہر یہی وجہ ہوگی کہ سب سے پہلے نبی یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک انبیاء و مرسلین اور عباد اللہ الصالحین کی جو دعائیں حق تعالیٰ جل شانہ نے قرآن کریم میں ذکر فرمائی ہیں وہ اکثر و بیشتر کلمہ ربّنا کے ساتھ وارد ہوئی ہیں اور ایک مقام پر (ربّنا اِنّنا سمعنا مُنادِیاً الخ) کلمہ ربّنا سے دعا کرنے والوں کو اولو الالباب فرمایا ہے۔

(۳) عالم اس چیز کو کہتے ہیں جس سے خالق کا علم حاصل ہوتا ہو۔ عالم علامت سے مشتق ہے۔ عالم کو عالم اس لیے کہتے ہیں کہ وہ علامت ہے اسمائے الٰہی اور صفات خداوندی کی عالم میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اسی کے کسی اسم کا مظہر اور آئینہ ہے۔ مومنین و کافرین اسکی شان انعام اور انتقام کے مظہر ہیں۔ صاحب عزت اور صاحب ذلت اسکی شان تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ کی تجلی گاہ ہیں۔ عالم غیب اور عالم شہادۃ اس کے نام نامی ہو الظاہر و الباطن کے لیئے آئینہ ہیں۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مہربان، رحم کرنے والا

عجب نہیں کہ بسم اللہ میں وہ شان رحمت مراد ہو جو تکوین اور تربیت عالم کے لیے باعث ہوئی۔ اور سورہ فاتحہ میں الرحمٰن سے وہ رحمت مراد ہو جو خاص حالت تربیت میں مبذول ہوتی ہے۔ اگر یہ رحمت روک لی جائے تو تربیت اور پرورش ناممکن ہو جائے۔ اور الرحیم سے وہ رحمت مراد ہو، جو تربیت اور پرورش کے بعد جزاء اور سزا کی شکل میں ظاہر ہوگی۔ اسلیئے کہ تربیت اور تکمیل کے بعد آثار اور ثمرات کا نہ مرتب ہونا اس تربیت کے ضائع کرنے کے مرادف ہے کھیتی پکجانے کے بعد اگر اس پر درانتی نہ چلائی، گندم اور بھوسہ الگ الگ نہ کیا، تو گویا اس کھیتی کو ضائع کر دیا۔ اسی طرح اگر اس عالم کی تربیت ختم ہوجانے کے بعد مومن اور کافر، سعید اور شقی کو جدا جدا نہ کیا جائے تو عالم کی تربیت کا ضائع ہونا لازم آئے گا۔ آئندہ آیت یعنی مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کی تکرار اسکی رحمت کے مکرر اور مضاعف ہونے کی طرف مشیر ہے لیکن اس لیے کہ رحمت کی یہ فراوانی کہیں بندوں کو مغرور نہ بنا دے، مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا اضافہ فرمایا۔ تاکہ عزت کے ساتھ رہبت کا ضروری ہونا معلوم ہوجائے۔ جیسے نَادِ الذنب وقابل التوب کے بعد شدید العقاب کی صفت کو ذکر فرمایا۔"

عجب نہیں کہ الرحمٰن الرحیم کا مالک یوم الدین سے پہلے ذکر کرنا سبقت رحمتی علی غضبی کی جانب مشیر ہو۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

روز جزا کا مالک

بعض قرأتوں میں مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ آیا ہے یعنی روز جزا کا بادشاہ۔ مالکیت اور ملکیت کے لیے یوم جزا کو اس لیے خاص کیا گیا کہ اوسکے جلال وجمال کا اعلی وجہ الاتم ظہور عالم کے ہر فرد کے لیے آن واحد میں اسی روز ہوگا۔ (باقی)

حاملانِ قرآن

شیخ محمد افضل عمادی

(۳)

از مولوی محمد عثمان صاحب عمادی بی ایس سی (علیگ)

بیا بحضرتِ قرآں کہ دولتے است عظیم
فروغ سلطنتش از صفا بہشت نعیم

وقار و جاہ گدایانِ درگہش بنگر — شہان بے کمر و خسروانِ بے دیہیم
نظر بہ وحی ازل گوشش بر حدیث نبی — قدح کشند ز صہبائے کوثر و تسنیم

شراب لعل لبش خور کہ لطف اوست غفور
مے طہور بپیما کہ فیض اوست کریم

تزکیۂ نفس | صوبۂ بہار کے ایک بزرگ شمس الہدیٰ، دست بوسی کو حاضر ہوئے، یہ نام اتنا روشن تھا کہ حاضرین کے چہرے چمک اٹھے اور انگلیاں بڑھیں کہ اولاد کے نام رکھیں تو ایسے ہی رکھیں۔ فرمایا۔ بلکہ نام رکھیں تو ایسے نہ رکھیں، یہ سچ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو احب الاسماء عند اللہ محبوب تھے، اور یہ بھی جھوٹ نہیں کہ جس کا نام ”حزن“ ہوتا تفاؤل خیر کے لیے اسکو ”سہل“ سے مخاطب فرماتے، تاہم ایسے اسماء جن میں اظہار ہو یا اترانے کی ادا ہو محبوب الی اللہ نہیں ہوسکتے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُزَكُّونَ أَنْفُسَهُمْ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّي مَنْ يَشَاءُ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ۔	کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپکو بڑھاتے ہیں، اپنا تزکیہ اور اپنی تعریف آپ ہی کرتے ہیں، بڑھانا اور

قابل تعریف و تزکیہ بنانا تو اللہ ہی کی شان ہے جسے چاہے اس مرتبہ پر فائز کرے، اللہ کی جناب میں لوگوں کو بقدر کھجور کی گٹھلی کے ایک ریشہ کے بھی نقصان اٹھانا نہ پڑے گا۔

مفسرین لکھتے ہیں :۔

وَیدخل فی هذا التلقب بالالقاب المتضمنة للتزکیة کمحی الدین وعز الدین وسلطان العارفین ونحوها ۔	اسی حکم میں وہ لقب بھی داخل ہیں جن سے اپنی تعریف نکلتی ہو مثلاً محی الدین (دین اسلام کو زندہ کرنے والا) عز الدین (دین اسلام کی عزت)، سلطان العارفین (عارفان خدا کا بادشاہ) وغیرہ۔

غرض کی اس آیت سے تو یہود یا نصاریٰ مراد ہیں، حسن کی روایت میں یہودیوں کا دعویٰ تھا :۔

نَحْنُ أَبْنَاءُ اللّٰهِ وَأَحِبَّاؤُهُ	ہم ہیں اللہ کی اولاد و احباب

قتادہ کی روایت ہیں ان مدعیوں کا اصرار تھا کہ :۔

لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ	بجز ان کے جو یہودی یا نصرانی ہوں بہشت میں ہرگز کوئی اور داخل نہ ہوگا۔

ضحاک کی روایت میں ان کو یہ بھی ادعا تھا کہ :۔

لا ذنوب لنا ونحن کالاطفال وان آباءنا یشفعون لنا	ہمیں گناہ سے کیا سروکار، ہم تو بچوں کی طرح معصوم ہیں۔ ہمارے باپ دادا ہماری شفاعت کریں گے اور ہمیں عذاب سے بچالیں گے۔

فرمایا۔ اللفظ یتناول کل من زکی نفسه۔ لفظ عام ہے، جو کوئی اپنا تزکیہ کرے، حق ہو یا باطل،

بحق او بباطل من الیهود وغیرهم وکل من	یہودی ہوں یا اور کوئی، یہ لفظ سب پر شامل ہے جو

ذکر لنفسہ صلاحًا او وصفھا بزکاء العمل او بزیادۃ الطاعۃ والتقوی او بزیادۃ الزلفی عند اللہ

اپنی صلاحیت بیان کی یا اپنے اعمال کے بڑھنے، یا کثرت عبادت وتقوی، یا جناب الٰہی میں زیادہ مقرب ہونے کا دعوی کیا، ایسے تمام لوگ اس مفہوم میں شامل ہیں۔

رویت | عرض کی: "اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یُزَکُّوْنَ اَنْفُسَھُمْ" میں رویت یعنی دیکھنے کا مفہوم ہو، رویت بالعین ہی ہوتی ہے، آنکھ ہی سے دیکھ سکتے ہیں، حدیث میں ہے:-

ستَرون ربکم کما ترون القمر لیلۃ البدر لا تضامون فی رویتہ

عنقریب تمہیں اپنے پروردگار کی رویت اسطرح حاصل ہوگی جیسے کہ چودھویں رات میں چاند کو دیکھتے ہو تم اسے بے تکلف دیکھو گے۔

اس بنا پر "الم تر" (کیا تو نے نہیں دیکھا؟) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیکھنا مقصود ہو، اور جب یہ صورت ہو تو حضرت سے قبل و بعد والوں کے متعلق کوئی حکم اس آیت سے استنباط نہ ہوگا۔

رویت بالعین | فرمایا:- رویت کا تعلق آنکھوں سے بھی ہے، اور یہ متعارف ہے۔

اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ؟ — کیا تو نے اسکو نہیں دیکھا جو دین کو جھٹلاتا ہے؟

اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی؟ — کیا تو نے اسے نہیں دیکھا جو بندہ کو نماز سے روکتا ہے؟

ان سب میں رویت بالعین ہے اور اسکی مثالیں بے پایاں متداول ہیں:-

رُویت بالقلب | رویت کی دوسری قسم رویت بالقلب ہے جو مفید علم ہوتی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَاجَّ اِبْرٰھِیْمَ فِیْ رَبِّہٖٓ اَنْ اٰتٰىہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ، اِذْ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ ۔

کہ اللہ نے اسے ملک دیا تھا کیا تو نے اسکو نہیں دیکھا کہ ابراہیم سے پروردگار ابراہیم کے بارے میں اسنے حجت کی، ابراہیم نے جب کہا کہ میرا پروردگار تو وہ ہے جو مردہ کو زندہ کرتا ہے اور زندہ کو مارتا ہے تو اس نے کہا میں زندہ کرنے اور مار ڈالنے پر قادر ہوں، ابراہیم نے کہا اللہ تو وہ ہے کہ آفتاب کو مشرق سے لاتا ہے، تجھے خدائی کا دعوی ہو تو آفتاب کو مغرب سے لا، یہ سن کے کافر مبہوت ہو گیا۔ اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

یہاں "الم تر" میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے، یعنی اے پیغمبر کیا آپ نے نہیں دیکھا مگر یہی واقعہ کے دیکھنے کے لئے مخاطب فرمایا ہے وہ پیش نظر نہیں ہے، بلکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت پہلے تھے، اس لیے لامحالہ یہ رویت بالقلب ہوگی۔

رویت بالاعتقاد | تیسری قسم کی رویت وہ ہے جو اعتقاد پر مبنی ہو، اللہ اپنے پیغمبر سے خطاب کرتا ہے:۔

لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ۔ — تا کہ اللہ نے تجھ کو جو دکھایا ہے اسی کے مطابق لوگوں کے درمیان تو فیصلہ کرے

یہاں "دکھلانے" سے اعتقاد ہی مراد ہے، جس بصر مراد نہیں، اسی طرح "اراک اللہ" کے معنی "اعلمک اللہ" بھی نہیں ہوسکتے، کیونکہ اس صورت میں از روئے قاعدہ متعدی بسہ مفعول ہونا لازم تھا، یہاں تعدی دو مفعول سے زائد نہیں

رویت بالظن | حدیث میں ہے:۔

إنّ النبيّ صلى الله عليه وسلم بدء بالصلاة قبل الخطبة يوم العيد ثم خطب فرئي أنه لم يسمع النساء فأتاهن ووعظهن۔ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے دن خطبہ عید سے پہلے نماز عید شروع کی، نماز ہو چکی تو خطبہ فرمایا، ایسا دکھائی دیا کہ عورتیں خطبہ نہ سن سکیں، آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام عورتوں کے پاس آئے اور ان کو وعظ سنایا۔

"رُئِيَ" (دکھائی دیا) یعنی گمان ہوا، یہاں بھی رویت متعلق بچشم بصر نہیں بلکہ نظر بظن و حدس ہے، اور اس معنی میں محدثین کے ساتھ لغویین بھی ہمداستان ہیں۔

رؤیا | عرض کی:۔ رویت ہی کے اخوات میں رؤیا بھی ہے جس کے معنی خواب کے ہیں۔

يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَى إِخْوَتِكَ — اے میرے بیٹے اپنی رؤیا (خواب) کا قصہ اپنے بھائیوں سے نہ کہنا

ایک دوسری آیت میں ہے:۔

إِنْ كُنْتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُونَ — اگر تم لوگ رؤیا (خواب) کی تعبیر کرتے ہو؟

اس ذیل میں حل طلب مشکل یہ ہے کہ حدیث معراج سے مترشح ہوتی ہے کہ معراج کے مشاہدات بھی رؤیا سے وابستہ تھے۔

معراج بہ بیداری | فرمایا۔ رؤیا کے ایک معنی رویت کے بھی ہیں یعنی بیداری میں آنکھ سے دیکھنا، راعی کہتا ہے :۔

فکبّر للرؤیا وهش فؤاده   وبشّر نفسا کان قبل یلومها

فکبّر للرؤیا اے للرویۃ متنبی کہتا ہے :۔

ورؤیاك احلیٰ فی العیون من الغمض

رؤیاك اے رویتك ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :۔

وما جعلنا الرؤیا التی اریناك الا فتنة للناس   اور جو رؤیا ہم نے تجھے دکھایا اسکو لوگوں کے لیے محض ایک فتنہ اور آزمایش بنایا ۔

تمام مفسرین نے یہاں رؤیا کے معنی رویت ہی کے لیے ہیں یعنی رویت فی الیقظۃ لا بالمنام اس موقعہ پر مجھ اپنے عزیز بھائی مولوی سعید الحق عمادی بی اے کا ایک شعر یاد آیا اسی معراج کے متعلق صاحب معراج سے خطاب ہے ۔ کہتے ہیں ؎

اے رفتہ فراز عرش بحالت مارحے   معراج بہ بیداری اسلام بخواب اندر

مصداق صلاۃ | غیر انبیا بھی مستحق صلاۃ ہیں یا نہیں، اسکی بحث چھڑی ہوئی تھی، موالف و مخالف اپنے اپنے شواہد پیش کر رہے تھے، مجال کلام کو وسیع ہوتے دیکھ کر فرمایا :۔ ,,صلاۃ,, کے اصلی معنی ,,لزوم,, کے ہیں، یقال قد صلی واصطلی، ومن ہذا من یصلی فی النار اے یلزم النار ۔ ابن ابی اوفی کی روایت میں ہے :۔

اعطانی ابی صدقة ماله فاتیت بها رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فقال اللهم صل علی آل ابی اوفی ۔   میرے والد نے اپنے مال کی زکوٰۃ دی کہ بارگاہ نبوی میں پیش ہو، میں اسے لے کر آنحضرت علیہ الصلاۃ والسلام کی جناب میں حاضر ہوا، حضرت نے فرمایا اللهم صل علی آل ابی اوفی یعنی اے میرے اللہ ابی اوفی کی آل اولاد پر صلوۃ بھیج ۔

راعی کہتا ہے :۔

صلی علی عزة الرحمن وابنتها لیلی وصلی علی جاراتها الاخر

عدی بن رقاع کہتا ہے:-

صلی الاله علی امرئ ودعته واتم نعمته علیه وزادها

صدر اسلام میں یہی تعامل تھا، بعد کو تہذیب نے تخصیص کر دی کہ صرف انبیاء علیہم السلام اور خصوصاً حضرت سید الانبیاء صلواۃ اللہ علیہ ہی صلوۃ کا استحقاق رکھتے ہیں کہ حفظ مراتب و فرق مدارج کا لحاظ قائم رہے۔

دعائے خیر | صلوۃ جنازہ بھی صلوۃ ہے، مگر نماز نہیں، اس پر مکالمہ شروع ہو گیا، ہر ایک کی توجہ کسی نہ کسی ترجیح کی طرف تھی۔ فرمایا: صلوۃ کے معنی دعائے خیر کے بھی ہیں، حدیث میں ہے:-

اذا دعی احدکم الی طعام فلیجب فان کان مفطراً فلیطعم وان کان صائماً فلیصل

تم میں سے کوئی شخص کھانا کھانے کے لیے بلایا جائے تو اس کو قبول کر لینا چاہیے، اگر بحالت افطار ہو تو کھا لے اور اگر روزہ دار ہو تو صلاۃ بھیجے۔

صلاۃ بھیجنے کے معنی محدثین نے دعا کرنے کے لکھے ہیں، یعنی کھلانے والوں کو خیر و برکت کی دعا دے۔ اعشی کہتا ہے

وصہباء طاف یہودیها وابرزها وعلیها ختم

وقابلها الریح فی دنها وصلی علی دنها وارتسم

یعنی یہودی نے شراب کے مٹکے پر صلاۃ بھیجی، یعنی دعا کی کہ شراب بگڑنے نہ پائے اور ذائقہ میں ترشی نہ آجائے۔

اسی اعشی نے ایک اور قصیدہ میں ایک عورت سے خطاب کیا ہے:-

علیک مثل الذی صلیت فاغتمضی نوماً فان لجنب المرء مضطجعا

یعنی جیسی صلاۃ تو نے مجھ پر بھیجی ہے ویسی ہی صلاۃ تجھ پر بھی پہنچے، تو نے مجھے دعا دی، میں تجھے خیر و برکت کی دعا دیتا ہوں۔

استغفار | صلاۃ کے ایک معنی استغفار کے بھی ہیں، ام المومنین سودہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے:-

قالت یا رسول اللہ اذا متنا صلی لنا عثمان بن مظعون حتی تاتینا فقال لها ان الموت اشد مما تقدرین سودہ
نے عرض کی اے رسول اللہ کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ ہم مرگئے تو جب تک آپ نہیں آئیں عثمان بن مظعون اسوقت تک ہم پر صلاۃ بھیجیں۔ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے سودہ موت تمہارے اندازہ سے کہیں زیادہ سخت ہے۔

یہاں صلاۃ کے معنی استغفار کے ہیں، یعنی عثمان بن مظعون ہمارے لیے جناب الٰہی سے مغفرت بخشایش طلب کرتے رہیں۔

ترحم | صلاۃ کے معنی ترحم کے بھی ہیں، کلام اللہ میں ہے:۔ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا صلاۃ جب اللہ کی جانب سے ہو تو اسکے معنی رحمت کے ہونگے، فرشتوں کی صلاۃ دعاء استغفار ہے۔ وبہ سمیت الصلاۃ لما فیہا من الدعاء والاستغفار صلاۃ (نماز) کا نام صلاۃ اسی لئے پڑا کہ اس میں دعاء استغفار ہے۔

حسن ثنا | صلاۃ کے ایک معنی ثنا وستایش کے بھی ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک بندوں کو بشارت دی ہے:۔ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ "یہ لوگ ہیں کہ ان کے پروردگار کی جناب سے ان پر صلاۃ اور رحمت ہوگی" صلاۃ ہوگی یعنی اللہ تعالیٰ ثنا کرے گا

عبادت گاہ یہود | صلاۃ کے ایک معنی یہودیوں کی عبادتگاہ کے بھی ہیں، عبرانی زبان میں صلاۃ کو صلوتا کہتے ہیں عربی اور عبرانی میں اتنا فرق ہے کہ یہاں اگر صلاۃ کے معنی دعا کے ہیں تو وہاں صلوت کے معنی محل دعا کے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ، یہاں صلوات کے معنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے یہودیوں کے کنیسے بتائے ہیں۔

صلاۃ بالجمر | گوشت کو آگ میں ڈالنے کو بھی صلاۃ کہتے ہیں جس سے جلانا مقصود ہوتا ہے ؎

الا یا اسلمی یا ھند ھند بنی بدر   تحیۃ من صلی فؤادک بالجمر

صلاۃ الید | ہاتھ کو آگ سے گرم کرنا بھی صلاۃ ہے ؎ اٰنا فلم نفرح بطلعۃ وجہہ   طروقا وصلی کفہ شدت مانب

صلاۃ عصا | چھڑی کو آگ دکھانا کہ گرم ہو کر سیدھی ہو جائے یہ بھی صلاۃ ہے۔ قیس بن زہیر کہتا ہے ؎

فلا تعجل بامرک واستدمہ   فما صلی عصاک کمستدیم

مصلی | جس طرح نمازی کو مصلی کہتے ہیں اسی طرح گھڑدوڑ میں جو گھوڑا دوسرے نمبر پر آئے وہ بھی مصلی ہے، اول نمبر پر آنے والا سابق ہے۔ امیر المؤمنین علی بن ابی طالب رضی فرماتے ہیں:۔ سبق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصلی ابوبکر وثلث عمر وخبطتنا فتنۃ فما شاء اللہ "رسول اللہ سابق تھے، ابوبکر مصلی تھے، عمر نے تیسرے درجہ کی کامیابی حاصل کی، پھر فتنہ نے ہمکو درہم برہم کر دیا، اب جو اللہ چاہے"۔

رسائل و مسائل

مولانا اسلم جیراج پوری کے جواب پر ایک نظر

(اشاعت گزشتہ میں جناب مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری کا وہ مضمون درج کیا جا چکا ہے جو انھوں نے "تفہیمات قرآن" پر میرے تبصرے کے جواب میں تحریر فرمایا ہے۔ افسوس ہے نہ جگہ کی قلت کے سبب سے میرا جواب الجواب ساتھ ساتھ شائع نہ ہو سکا۔ ناظرین اس کو ملاحظہ فرماتے وقت مولانا کے مضمون کو پیش نظر رکھیں تو سمجھنے میں آسانی ہو گی)

یہ بات پہلے ہی صاف کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں عام مسلمانوں کے کسی ایسے عقیدہ کا معتقد نہیں ہوں جس کا ثبوت کتاب و سنت میں نہ ہو۔ ایسے تمام عقائد کے خلاف "صدائے احتجاج" بلند کرنے میں آپ کے ساتھ میں بھی شریک ہوں۔ مگر جن باتوں کا ثبوت کتاب اللہ و سنت رسول میں موجود ہو، ان کے خلاف جو صدائے احتجاج بلند کی جائیگی، اسکی تائید کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے، بلکہ میں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

آپ نے جو عبارتیں اپنی طرف سے کتاب کے متن یا حاشیہ میں تفسیر و تشریح کے طور پر لکھی ہیں ان کے متعلق میں نے آپ کی اس تصریح کا احترام ملحوظ رکھا ہے کہ آپ کو ان پر اصرار نہیں ہے، اور یہ کہ آپ" انکو اتنی وقعت

بھی نہیں دیتے کہ کوئی صاحب ان پر اعتراض کی زحمت گوارا کریں»۔ لیکن جب آپ کسی آیت کی متعدد احتمالی تاویلات میں سے کسی ایک تاویل کو بیان فرمائیں گے اور اسکی تائید میں دلائل پیش کریں گے، تو میں یہ سمجھنے میں یقیناً حق بجانب ہونگا کہ آپکے نزدیک یہی تاویل راجح ہے، اور اگر میرے نزدیک آپ کی ترجیح درست نہ ہو، اور اس کے بجائے کسی دوسری تاویل کے حق میں مجھ کو زیادہ قوی دلائل نظر آئیں، تو مجھے حق ہونا چاہیئے کہ آپکی ترجیح پر اعتراض کروں اور اس دوسری تاویل کی تائید کروں۔ آپ نے اپنی رائے ظاہر کر کے قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والوں کو غور و فکر کا ایک راستہ دکھایا ہے۔ میں اس رہنمائی میں کہیں کہیں غلطی محسوس کرتا ہوں، اور یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ راستہ جو دکھایا گیا ہے، سیدھا راستہ نہیں ہے۔ اگر آپ اس راستہ کی استقامت ثابت کر دیں گے تو میں مان لونگا۔ اور اگر میں اسکی غلطی ثابت کر دوں تو آپ مان لیجئے۔ بحث کا مدار انشاءاللہ قرآن مجید ہی رہے گا۔ اس سے باہر نہ آپ جائیے اور نہ میں جاؤنگا۔

جن و انس جن و انس کے متعلق قرآن میں ایسی کوئی تصریح مجھے نہیں ملی جس سے یہ شبہ بھی کیا جا سکے کہ جہاں کہیں جن و انس کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں جن کے معنی آتشیں جن کے نہیں ہیں بلکہ انسانوں ہی کے ایک طبقہ کے ہیں۔ جو شیاطین اور جن حضرت سلیمان کے تابع تھے ان پر انسان ہونے کا گمان آپ نے اس بنا پر کیا ہے کہ:۔

اولاً وہ نظر آتے تھے اور انسانوں کے سے کام کرتے تھے مثلاً معماری، غوطہ خوری، ظروف سازی وغیرہ

ثانیاً تاریخ اور خود توریت وغیرہ سے آپ کو ان مزدوروں کا حال معلوم ہو چکا ہے جو حضرت سلیمان نے مصر سے بلوائے تھے۔

لیکن پہلی وجہ اس طرح دور ہو جاتی ہے کہ غیر مادی مخلوقات کو خواہ وہ نوری ہوں یا ناری، اللہ تعالیٰ نے یہ قدرت عطا فرمائی ہے کہ وہ بشری شکل میں متمثل ہوں، اور مرئی و محسوس بن جائیں۔ چنانچہ سورۂ ھود کے ساتویں رکوع میں ذکر ہے کہ فرشتے حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کے سامنے بشری

شکل میں آئے۔ اور حضرت لوط کی قوم نے ان کو کم سن نوجوانوں کی شکل میں دیکھا۔ اور سورہ مریم کے دوسرے رکوع میں بیان ہوا ہے کہ فرشتہ حضرت مریم علیہا السلام کے سامنے انسانی شکل میں متمثل ہوا اور اس نے آپ سے کلام کیا۔ جنگ بدر اور اُحد میں فرشتوں کی شرکت کا ذکر بھی قرآن میں آیا ہے، حتیٰ کہ انہی کی شرکت کی وجہ سے مسلمان کافروں کو اپنے سے دو چند نظر آنے لگے۔ ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آتشیں جنوں اور شیاطین کا مرئی و محسوس بن جانا اور انسانوں کے سے کام کرنا مستبعد نہیں ہے۔

رہی دوسری وجہ تو مجھے تعجب ہے کہ آپ قرآن کی تفسیر قرآن سے کرنے کا دعویٰ بھی فرماتے ہیں اور قرآن کے معانی متعین کرنے کے لیے قرآن سے باہر بھی جاتے ہیں۔ پھر قرآن سے باہر بھی آپ گئے تو جہاں تاریخ میں جو کم از کم حدیث سے تو بہت زیادہ غیر یقینی چیز ہے۔ اور توریت میں جس کا محرّف ہونا تمام اہل قرآن کے نزدیک مسلم ہے۔ آپ نے خود قرآن سے کیوں نہ پوچھا کہ حضرت سلیمان کے پاس جو جن اور شیاطین تھے وہ کس قسم کے تھے؟

قرآن میں بیان ہوا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے خدا سے دعا کی تھی کہ مجھ کو ایسی سلطنت عطا فرما جو میرے بعد کسی اور کو سزاوار نہ ہو۔ هَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّنۢ بَعْدِيٓ۔ اس دعا کو قبول کیا گیا اور اس شکل میں قبول کیا گیا کہ ہوا اُن کے تابع کر دی گئی۔ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ۔ شیاطین یا جن، ان کے بس میں کر دیئے گئے وَالشَّيَاطِينَ كُلَّ بَنَّاءٍ وَغَوَّاصٍ (۳۸: ۳۰) ان کو پرندوں کی بولی سکھائی گئی اور ان کے لشکر میں پرندے شامل کیے گئے۔ قَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ .... وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُودُهُ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ وَالطَّيْرِ (۲۷: ۲) نہ صرف پرند بلکہ دوسرے جانوروں کی بولیاں بھی ان کو سکھائی گئیں جیسا کہ سورہ نمل میں ارشاد ہوا ہے کہ جب سلیمان کا لشکر وادالنمل میں پہونچا تو ایک چیونٹی نے دوسری چیونٹیوں سے کہا کہ اپنے بلوں میں گھس جاؤ کہیں سلیمان اور اس کے لشکر تم کو کچل نہ ڈالیں۔ ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُودُهُ۔ یہ قول حضرت سلیمان نے سن لیا اور وہ اس کو سمجھ کر ہنس دیئے فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّن قَوْلِهَا (۲۷: ۲) یہ سب باتیں اسپر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت سلیمان کو ان کی دعا کے جواب میں

جو چیزیں دی گئی تھیں وہ غیر معمولی تھیں، اور ان کے بعد کسی اور کو عطا نہیں ہوئیں۔ اگر شیاطین اور جنوں سے مراد ایسے آدمی لیے جائیں جو غوطے لگانے والے، اور برتن اور عمارتیں بنانے والے ہوں، تو اس میں کوئی بات غیر معمولی نہ ہوئی، اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت سلیمان کے بعد ایسے آدمی کسی اور کو نصیب نہیں ہوئے بلکہ اگر آپ کے ارشاد کے مطابق "تاریخ اور خود توریت" کی شہادت مان لی جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ غوطہ خور اور معمار تو خود حضرت سلیمان کے عہد ہی میں مصر کے بادشاہ کو حاصل تھے اور حضرت سلیمان نے ان کو شاہ مصر سے درخواست کر کے، نہ کہ خدا سے دعا کر کے حاصل کیا تھا۔

تاہم اگر اب بھی آپ کو ان شیاطین اور جنوں کے آتشیں شیاطین اور جن ہونے میں شک ہے تو سورۂ نمل کا تیسرا رکوع ملاحظہ فرمایئے۔ قرآن مجید خود آپ کا شک رفع کر دیگا۔ جب حضرت سلیمان کے پاس ملکۂ سبا کا جواب پہنچ چکا ہے تو آپ اہل دربار سے خطاب کر کے پوچھتے ہیں۔ اَيُّكُمْ يَأْتِينِي بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ - تم میں کون ہے جو ملکۂ سبا کا تخت میرے پاس اٹھا لائے، قبل اس کے کہ اہل سبا میرے پاس مطیع ہو کر آئیں؟ اس پر جنوں میں سے ایک عفریت کہتا ہے کہ میں اسکو لے آؤں گا قبل اسکے کہ آپ اپنے مقام سے اٹھیں۔ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ اس بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ جن جس نے یہ دعویٰ کیا تھا، آتشیں جن ہی تھا کیونکہ کوئی انسان اسپر قادر نہیں ہے کہ جنوب عرب سے کوئی چیز فلسطین تک چند ساعتوں میں اٹھا لے جائے۔

مفہوم خلافت خلافتِ آدم کے متعلق قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں"۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہاں "خلیفہ" سے مراد پرانے ساکنینِ ارض کا خلیفہ ہے اور اس کے سوا اس آیت کا کوئی دوسرا مفہوم نہیں ہے لیکن اس معنی پر اصرار، اور دوسرے معنی کے احتمال سے انکار کیلئے آپ کے پاس کوئی قرآنی دلیل نہیں ہے اس لیے آپ نے یہ خیالی دلیل پیش فرمائی ہے کہ آدم کو خلیفۃ الحق قرار دینے میں حق تعالیٰ کی کسرِ شان ہے، اور یہ کہ بغدادیوں کی تاریخ شہادت دیتی ہے کہ "خلیفۃ اللہ اور ظل اللہ کے

الفاظ وہ سانچے ہیں جن میں انھوں نے استبداد کے بت دینی روپ میں ڈھالے تھے ۔ لیکن مجھے قرآن کے معانی متعین کرنے کے لیئے قرآن سے باہر جانے اور لغاویوں کی تاریخ یا تخیل کی دنیا میں سند تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ میں خود قرآن ہی میں ایسے اشارات پاتا ہوں جن سے خلافت کی یہ تاویل راجح قرار پاتی ہے کہ اس سے مراد حق تعالیٰ ہی کی خلافت ہے ۔ اس کے لیے آیات ذیل ملاحظہ ہوں :۔

قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۷ : ۱۵)

موسیٰ نے کہا کہ قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور زمین میں تم کو خلیفہ بنالے پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو

وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْئًا (۱۱ : ۵)

اور میرا رب تمہارے سوا دوسری قوم کو خلیفہ بنالیگا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے ۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۲۴ : ۷)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیئے ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ انکو زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اس نے ان لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا جو تم سے پہلے گزرے ہیں ۔

ان تمام آیتوں میں لفظ "استخلاف" وارد ہوا ہے جس کے معنی آپ کو لغت کی ہر کتاب میں اپنا خلیفہ بنانے کے ملیں گے ۔ استخلفہ ای جعلہ خلیفۃ لہٗ ۔ اسکی تائید ایک دوسری آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں حضرت داؤد سے فرمایا گیا ہے کہ "اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ (۳۸ : ۲)" "ہم نے تجھ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے" ، اس میں کوئی اشارہ اس طرف نہیں ہے کہ ہم نے تجھ کو پہلے بادشاہوں کی جگہ مقرر کیا ہے ۔ اگر یہ کہنا مقصود ہوتا تو یوں کہا جاتا کہ انا جعلنٰک فی الارض خلیفۃ للذین کانوا من قبلک ۔ پس جب منوب عنہ کا ذکر نہیں ہے ، اور نائب بنانے کا ذکر ہے تو معنی یہی ہونگے کہ نائب اسی کا ہے

جس نے اسکو نائب مقرر کیا ہے۔ یہ کہنا کہ "میں نے تم کو فلاں شخص کا نائب مقرر کیا" اور معنی رکھتا ہے، اور یہ کہنا کہ "میں نے تم کو نائب مقرر کیا" دوسرے معنی ظاہر کرتا ہے۔ دونوں کا فرق اتنا نازک نہیں ہے کہ تھوڑے سے تامل سے واضح نہ ہو جائے۔

آپ کو نیابت حق کی تاویل قبول کرنے میں اس لیے تامل ہے کہ اس میں حق تعالیٰ کی کسرِ شان ہے اور وہ نائب کا محتاج ٹھیرتا ہے۔ لیکن یہ شبہ نیابت کے مفہوم پر غور نہ کرنے سے پیدا ہوا ہے۔ نیابت کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ منوب عنہ حاضر نہ ہو، یا مر گیا ہو یا عاجز ہو۔ بلکہ کسی ماتحت کا درجہ بڑھانے اور اسکو عزت و شرف بخشنے کے لیے بھی نائب کے مرتبہ سے سرفراز کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ انسان کو حق تعالیٰ نے علم و ادراک، تمیز و اختیار، قدرت و ارادہ، اور تصرف فی الاشیاء کی وہ قوتیں عطا فرمائی تھیں جو کائنات ارض کی کسی دوسری مخلوق کو عطا نہیں کیں، اور زمین میں جو کچھ تھا اسی کے لیے پیدا کیا تھا (خلق لکم ما فی الارض جمیعاً ۲ : ۳) اور زمین و آسمان کی تمام قوتیں اس کے لیے مسخر کر دی تھیں (وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ۴۵ : ۲) اور دنیا میں حضرت حق کے بعد اور کوئی موجود انسان سے اشرف نہ تھا، اسلیئے انسان کو نائب کے خطاب سے سرفراز فرمایا، تاکہ ایک طرف اس کے شرف کا اظہار ہو اور دوسری طرف خود اس میں اپنے مرتبہ کی بلندی کے ساتھ اپنی اخلاقی ذمہ داریوں کا بھی احساس پیدا ہو، وہ خدا کے سوا کسی کے آگے نہ جھکے، اور خدا کی بخشی ہوئی چیزوں میں تصرف کرتے وقت یہ یاد رکھے کہ وہ ان چیزوں کا مالک نہیں ہے بلکہ اصل مالک کا نائب ہے، اور اصل مالک کی رضا اور اس کے مقرر کیے ہوئے قوانین کے خلاف تصرف کرنے کا اسکو حق نہیں ہے۔ نیابت حق کے تصور میں یہی دو معنوی نعمتیں ہیں جن کو آپ "شاعری" قرار دیتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ "بنداویوں" نے خلیفۃ اللہ اور ظل اللہ کے الفاظ کو ان کے اصل مفہوم سے پھیر کر، ان کی اسپرٹ کے خلاف ظلم و استبداد کے لیے استعمال کیا، تو یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ قرآن کے معانی

کی تعیین میں کسی بغدادی یا کسی دمشقی کے فعل کا کیا دخل ہے؟ بغدادیوں نے تو اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ کے سانچے میں بھی استبداد کے بت ڈھالے تھے، وَالْفِتْنَۃُ اَکْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ کو بھی ظلم کے لئے استعمال کیا تھا۔ پھر کیا آپ ان سب سانچوں کو توڑ دیں گے جن میں ظالموں نے اپنی سرکشی سے استبداد کے بت ڈھالے تھے؟ آپ قرآن کی تفسیر قرآن سے کر رہے ہیں یا بغداد کی تاریخ سے؟

آدم کا گناہ آدم علیہ السلام کے متعلق "ساری دنیا" جو کچھ کہتی ہے اس سے مجھے کچھ سروکار نہیں مجھے صرف اس سے بحث ہے کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ قرآن کا ارشاد ہے کہ ثُمَّ اجْتَبٰہُ رَبُّہٗ فَتَابَ عَلَیْہِ (پھر اس کے رب نے اسکو برگزیدہ کیا اور اسکی توبہ قبول کر لی)۔ آپ فرماتے ہیں کہ قبول توبہ اور عفو و مغفرت میں فرق ہے۔ مگر میں قرآن سے پوچھتا ہوں تو وہ کہتا ہے کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ مثال کے طور پر دیکھئے ارشاد ہوتا ہے کہ فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِہٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰہَ یَتُوْبُ عَلَیْہِ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۵: ۶) یہاں یتوب علیہ کے معنی پر ان اللہ غفور رحیم کا فقرہ روشنی ڈال رہا ہے اگر یہاں قبول توبہ کے معنی معاف کر دینے اور بخشش دینے کے نہیں ہیں تو کیا اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو ظلم کرنے کے بعد توبہ کرے گا اور نیکو کار بن جائے گا، اللہ اسکی توبہ قبول کر لے گا مگر اسے معاف نہیں کرے گا؟ ایک دوسری جگہ حق تعالیٰ بنی اسرائیل کو اپنے احسانات یاد دلاتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب تم نے بچھڑے کی پرستش کرنے کے بعد موسیٰ کے کہنے سے توبہ کی تو ہم نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔ فَتَابَ عَلَیْکُمْ اِنَّہٗ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ (۲: ۶) کیا اس آیت کا یہ مفہوم ہے کہ اللہ نے تمہاری توبہ قبول کی مگر تمہیں معاف نہیں کیا؟ اگر یہی مفہوم ہے تو پھر احسان کس چیز کا جتایا گیا ہے؟ ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے کہ تم روزوں کی راتوں میں چھپ چھپ کر اپنی بیویوں سے مباشرت کرتے تھے۔ اللہ کو تمہاری اس حرکت کا علم ہے مگر اس نے تمہیں معاف کر دیا۔ فَتَابَ عَلَیْکُمْ وَعَفَا عَنْکُمْ (۲: ۲۳) یہاں عفا عنکم کے الفاظ تاب علیکم کی تفسیر کر رہے ہیں۔ سورۂ نساء میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ نادانی سے برا فعل کرتے ہیں پھر جلدی

سے توبہ کر لیتے ہیں: اللہ انکی توبہ قبول کر لیتا ہے۔ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓئِکَ یَتُوْبُ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ (۴ : ۳) کیا اس آیت کا یہ مفہوم ہے کہ اللہ ان کو معاف نہیں کرتا۔ صرف توبہ قبول کرتا ہے؟ سورہ توبہ میں ہے کہ جن لوگوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا اور اچھے اور برے دونوں طرح کے عمل کیے، امید ہے کہ اللہ ان کو بھی بخش دیگا عسی اللّٰہ ان یتوب علیھم ان اللّٰہ غفور رحیم (۹ : ۱۳) کیا یہاں خدائے غفور و رحیم کی یہی شان بیان کی گئی ہے کہ وہ توبہ قبول کر لیتا ہے مگر بخشتا نہیں؟ سورہ بقرہ میں حضرت ابراہیم کی دعا کے یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں:۔ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ (۲ : ۱۵) کیا اس دعا کا یہ مفہوم ہے کہ خدایا! تو ہماری توبہ قبول کر مگر ہمیں معاف نہ کر؟ ان تمام آیات میں خود قرآن مجید نے قبول توبہ اور عفو و مغفرت کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ پھر اس کتاب کے وہ کون سے حقائق ہیں جن کا سمجھنا "توبہ، مغفرت اور عفو وغیرہ" کے درمیان فرق کرنے پر موقوف ہے؟

آپ نے قبول توبہ اور مغفرت کا فرق صرف اس بات سے نکالا ہے کہ حضرت آدم کی توبہ قبول کرنے کے باوجود ان کو جنت سے نکالا گیا۔ اس شبہ کا ایک جواب میں اپنی تنقید میں پہلے ہی دے چکا ہوں مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس جواب سے آپ مطمئن نہیں ہوئے اب میں ایک دوسرے پہلو سے اسکو دفع کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اس سے مطمئن ہو جائیں گے۔ قرآن مجید میں آدم علیہ السلام کے قصے کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان پر غور کیجیے۔ جنت کے قیام کی یہ کیفیت تھی کہ وہاں انسانی خواہشات اور حاجات نہ تھیں اور نہ بشری احساسات تھے (اِنَّ لَکَ اَنْ لَّا تَجُوْعَ فِیْھَا وَلَا تَعْرٰی وَاَنَّکَ لَا تَظْمَؤُا فِیْھَا وَلَا تَضْحٰی ۲۰ : ۷) ان احساسات کا سرچشمہ وہ تھا جس کو قرآن نے "درخت" سے تعبیر کیا ہے۔ حضرت حق نے آدم اور انکی بیوی کو ہدایت فرمائی تھی کہ اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم اپنے اوپر آپ ظلم کرو گے (وَلَا تَقْرَبَا ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ فَتَکُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۲ : ۴) شیطان نے ان کو دھوکہ دیا۔ اور کہا کہ تمہارے پروردگار نے تم کو اس درخت سے

اس لیئے منع کیا ہے کہ تم فرشتے نہ بن جاؤ اور تمہیں ہمیشہ کی زندگی نہ ملے (مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ
اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۲:۷) آؤ میں تم کو بقائے دوام کے درخت کا مزا چکھاؤں
(هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۲۰:۷) آدم اپنے اس دشمن کے دھوکے میں آگئے، اور وہ
ان کو شجرۃ الخلد کے پاس لے جانے کے بجائے اس چیز کی طرف لے گیا جس کی خاصیت یہ تھی کہ انسان کی بشری
کمزوریوں کو نمایاں کردے، اس میں وجی احساس (Sexal instinct) پیدا کردے، اسکو
اپنے جسم کے ان مخصوص مقامات کا راز بتادے جو اس وقت تک اس سے چھپے ہوئے تھے، اور اس کے اندر
وہ جذبات پیدا کردے جو آپس کی دشمنی کے لیئے محرک ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس درخت کا مزا چکھتے ہی یہ سب
خصوصیات نمایاں ہوگئیں اور بشری کمزوریوں پر جو پردہ پڑا ہوا تھا یکایک اٹھ گیا (فَوَسْوَسَ لَهُمَا
الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا....... فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ
لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۲:۷) جب یہ چیز پیدا ہوگئی تو آدم
اور انکی بیوی کے اندر جنت میں رہنے کی صلاحیت باقی نہ رہی۔ ان خصوصیات کے نمایاں ہوجانے کے بعد ان
کے لیئے زمین ہی مناسب جائے قیام تھی اس لیئے ان سے کہہ دیا گیا کہ اِهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ
وَّلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (۲:۴) "جاؤ اب زمین ہی تمہارے لیئے جائے قرار ہے جہاں
تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے"۔ اب جنت تمہارا پیدائشی مقام نہیں رہا بلکہ اب جنت میں آنا تمہارے عمل پر
موقوف ہوگا۔ جو ہماری بھیجی ہوئی ہدایت پر عمل کرے گا وہ جنت میں آئے گا اور جو نافرمانی کریگا وہ دوزخ میں
جائے گا۔ (فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ وَالَّذِيْنَ
كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۲:۴) یہ حکم سزا اور انتقام کے طور پر نہ
تھا۔ بلکہ اس "شجر" کا مزا چکھنے کا طبیعی نتیجہ یہی تھا کہ آدم اور انکی بیوی قیام جنت کے قابل نہ رہیں اور زمین ہی میں رہنے
کے قابل ہوجائیں۔ آدم علیہ السلام نے توبہ کی اور وہ قبول بھی ہوئی، مگر قبولِ توبہ کی صحیح صورت یہ نہ تھی کہ حق تعالیٰ

اپنی سنت کے خلاف ان کے فعل کے طبیعی نتیجہ کو بدل دیتا، بلکہ اسکی صحیح صورت یہ تھی کہ انھوں نے حکم خداوندی کے خلاف جو نافرمانی کی تھی اسکو معاف کر دیا گیا، وہ راندہ درگاہ ہونے کے بجائے برگزیدہ ہوئے اور ان کو راہ راست کی طرف ہدایت بخشی گئی (وَعَصٰی آدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ۲۰:۲۰) اس کی مثال ایسی ہی، جیسے کوئی شخص شراب پیئے اور شراب کے اثر سے اس کے اعضائے رئیسہ خراب ہو جائیں۔ پھر وہ توبہ کرلے حق تعالیٰ اپنے وعدے کے مطابق اسکو معاف کر دیگا، مگر اس معافی کی صورت یہ نہ ہوگی کہ اس کے نظام جسمانی میں شراب کی طبیعی تاثیر سے جو خرابی واقع ہوگئی ہے اسکو قبول توبہ کے ساتھ ہی دور کر دیا جائے گا۔ بلکہ اس کی صورت یہ ہوگی کہ ایک حرام اور ممنوع چیز استعمال کرنے کی پاداش میں اسپر جو عتاب ہونا چاہئے تھا وہ نہ ہوگا اور اس گناہ پر اس سے کوئی باز پرس نہ کی جائے گی۔ شرابی کے فعل کے دو اجزا ہیں: ایک اس کا شراب پینا جو اپنی ایک مخصوص تاثیر رکھتا ہے۔ دوسرے اس کا حکم خداوندی کی خلاف ورزی کرنا جس کا نتیجہ حق تعالیٰ کا عتاب ہے۔ شرابی جب توبہ کرے گا اور اسکی توبہ قبول کی جائے گی، تو دوسرا جزء ساقط ہو جائے گا۔ لیکن پہلا جزء اپنے نتائج کے ساتھ باقی رہے گا۔ بالکل اسی طرح حضرت آدم کا شجرۂ ممنوع کے قریب جانا بھی دو اجزاء پر مشتمل تھا۔ ایک ان کا نفس فعل جس کی ایک مخصوص تاثیر تھی۔ دوسرے ان کے فعل کی یہ حیثیت کہ وہ فرمان الٰہی کے خلاف تھا جب حضرت آدم نے توبہ کی اور وہ قبول ہوگئی تو دوسرا جزء اپنے نتیجہ (یعنی عتاب الٰہی) کے ساتھ ساقط کر دیا گیا۔ مگر پہلا جزء بحال رہا جس کا نتیجہ ہبوط تھا۔

مسئلہ غلامی غلامی کے مسئلہ میں قرآن مجید نے یہ بات مسلمانوں کے اختیار پر موقوف رکھی ہے کہ خواہ احسان کے طور پر اسیران جنگ کو رہا کریں خواہ فدیہ (بصورت نقد یا بصورت مبادلۂ اسیران) لے کر چھوڑ دیں۔ یہ کہیں حکم نہیں دیا ہے کہ اگر دوسری صورت نہ ہو تو پہلی صورت پر عمل کرنا لازم ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ فطرت انسانی سے واقف ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ اگر معاملہ دو چار یا دس پانچ قیدیوں کا ہو تو مسلمان بطیب خاطر ان کو بطور احسان رہا کر سکتے ہیں، جیسا کہ انھوں نے عہد رسالت اور عہد صحابہ میں بارہا کیا ہے۔ لیکن اگر سینکڑوں

ہزاروں قیدیوں کا معاملہ ہو تو ایسی صورت میں جبکہ مسلمانوں کے بھی سینکڑوں ہزاروں آدمی کفار کے پاس قید ہوں اور ان کو غلام بنا کر رکھا گیا ہو، مسلمانوں کے لیئے یہ بہت مشکل ہوگا کہ وہ کفار کے آدمیوں کو محض احسان کے طور پر رہا کر دیں۔ اس دوسری صورت میں اسیرانِ جنگ کی رہائی کے لیئے صرف یہی ایک راستہ کھلا ہوا ہے کہ یا تو وہ زرِ فدا ادا کر کے رہا ہوں یا اسیرانِ جنگ کا مبادلہ ہو۔ اب اگر اسیرانِ جنگ زرِ فدا ادا کر سکتے ہوں اور کفار سے مبادلہ کا معاملہ طے نہ ہو سکے، اور کفار کے ہاں مسلمان قیدیوں کی حیثیت مملوکوں کی سی ہو، جیسی کہ فی الواقع ہزار برس بلکہ اس سے بھی زیادہ زمانہ تک رہی ہے، تو کیا وجہ ہے کہ اسی طرح مسلمانوں کو بھی یہ حق نہ ہو کہ وہ کفار کے قیدیوں کو غلام بنا کر رکھیں؟ آپ اس مسئلہ پر ان حالات کی روشنی میں غور فرما رہے ہیں جبکہ غیر مسلم قوموں میں اسیرانِ جنگ کو غلام بنانے کی رسم موقوف ہو چکی ہے، مبادلۂ اسیران کا طریقہ عام طور پر رائج ہو چکا ہے اور وہ حالات باقی نہیں ہے جن میں اسیرانِ جنگ کو غلام بنانے پر مسلمان مجبور ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے آپ کو غلامی کے اسلامی قانون کا جواز تسلیم کرنے میں تامل ہو رہا ہے۔ لیکن اگر آپ ان حالات پر نظر رکھیں جو اب سے سو برس پہلے تک دنیا میں رائج رہے ہیں، تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلامی قانون میں غلامی کے لیئے جو گنجائش رکھی گئی ہے وہ بے جا نہیں ہے۔ یہ دراصل قرآن مجید کا کمالِ حکمت ہے کہ اس نے غلامی کے مسئلہ میں ایسا حکم دیا جس میں وقت کے حالات کی رعایت بھی ملحوظ رکھی گئی تھی، اور آیندہ کے لیئے ایک اصلاحی قانون بھی بنا دیا گیا تھا تاکہ جب وہ حالات بدل جائیں تو آپ سے آپ وہ قانون نافذ ہو جائے۔

آپ نے غلامی کے مسئلہ پر جو اظہارِ خیال فرمایا ہے اس کا پہلا مقدمہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی رو سے غلامی ناجائز ہے۔ اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ صحابہ اور اہل بیت رضی اللہ عنہم اسیرانِ جنگ کو غلام بناتے رہے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صحابہ اور اہل بیت کا فعل قرآن کے خلاف اور ناجائز تھا۔ آپ تاریخی حدود میں جا کر اور اسباب و حالات کی مجبوریوں پر بحث فرما کر خواہ کیسا ہی کافی اور شافی جواب عطا فرمائیں، مگر خود آپ کے اپنے مقدمات سے جو منطقی نتیجہ نکلتا ہے اس پر آپ کسی طرح پردہ نہیں ڈال سکتے۔ آپ کو نہ صرف یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ خلفائے

راشدین، اور اصحاب رسول اور اہل بیت رسول علیہم الرحمہ کا عمل قرآن مجید کے حکم کے خلاف اور ناجائز تھا، بلکہ آپ کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ معاذ اللہ قرآن مجید نے قبل از وقت ایک ایسا غیر حکیمانہ قانون بنا دیا تھا جس میں وقت کے حالات کی کوئی رعایت ملحوظ نہ رکھی گئی تھی، جس پر ۱۲ سو برس تک عمل کرنا دشوار رہا اور جس پر وہ لوگ بھی عمل در آمد نہ کر سکے جو خاص سرکار رسالت مآب کے تربیت یافتہ تھے اور جنھوں نے اپنی زندگیوں کو اسلامی تعلیم کے سانچے میں ڈھالنے کی وہ انتہائی کوشش کی تھی جو کسی انسان کے امکان میں ہے۔

یہ محض منطقی قیاس ہی نہیں ہے بلکہ اگر آپ غور کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آیت فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً کے جو معنی آپ بیان فرما رہے ہیں اگر وہی اسلام کا قانون قرار پاتے تو مسلمانوں کے لیے سخت نقصان دہ اور قطعاً ناقابل عمل ہوتے۔ اس قانون پر عمل در آمد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اگر کفار زر فدیہ ادا نہ کریں اور اسیران جنگ کا مبادلہ بھی قبول نہ کریں تو مسلمان بہر صورت ان کے قیدیوں کو رہا کرنے پر مجبور ہیں۔ اگر مسلمانوں کا قانون یہی ہوتا تو کوئی کافر قوم اتنی احمق نہ تھی کہ زر فدیہ ادا کرتی یا مسلمانوں کے قیدیوں کو رہا کر دیتی۔ اس صورت میں لاکھوں مسلمان کفار کے ہاتھ قید ہوتے اور کبھی رہا نہ ہو سکتے، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غلامی کی مصیبت میں گرفتار رہتے، اور اس کے مقابلہ میں کافروں کے آدمی ہر لڑائی کے بعد آزاد ہو جایا کرتے۔ آپ ہی فرمائیے کیا ایسا قانون منصفانہ کہا جا سکتا ہے؟ اور کیا کسی زمانہ میں اس پر انسان عمل کر سکتے ہیں؟

ملکیت زمین آپ نے اس مسئلہ میں خلط بحث کر دیا۔ اور میرے اصل اعتراض کا کوئی جواب نہیں دیا۔ آپ نے وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اس آیت کی رو سے زمین کی شخصی ملکیت جائز نہیں ہے۔ اس پر میرا اعتراض دو حیثیتوں سے ہے:۔

ایک یہ کہ نظام تمدن میں ایسی انقلاب انگیز اساسی ترمیم کے لیے محض اتنا سا اشارہ کافی نہیں ہے۔ اگر قرآن کا منشا یہی ہوتا جو آپ فرما رہے ہیں تو وہ صاف الفاظ میں نہ صرف پرانے دستور کو بند کرنے کا حکم دیتا بلکہ آئندہ کے لیے زمین سے انتفاع کا نیا طریقہ بھی بتا دیتا۔

دوسرے یہ کہ اگر قرآن مجید کا منشا یہی تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مطابق عمل کیوں نہیں کیا؟ آنحضرت صلعم کی بعثت کا اصل مقصد یہی تھا کہ عقائد، اخلاق، معاشرت، تمدن ہر چیز میں قرآنی احکام کے مطابق اصلاح فرمائیں، اور دنیا میں قرآن کا قانون جاری کر دیں۔ وہ حالات کی بندگی کرنے کے لئے نہیں آئے تھے بلکہ خدا کی بندگی کرنے کے لیے آئے تھے۔ ان کا کام دنیا کی روش پر چلنا نہ تھا، بلکہ دنیا کی روش کو بدل کر قرآن کی بتائی ہوئی روش پر چلانا تھا۔ اب اگر ایک طرف آپ کے قول کے مطابق یہ مان لیا جائے کہ قرآن کا مقصد زمین کی شخصی ملکیت کو مٹانا تھا، اور دوسری طرف اس ناقابل انکار حقیقت کی طرف نظر کی جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پرانے دستور کو نہیں مٹایا بلکہ اسی کے مطابق عمل کرتے رہے، تو لامحالہ دو باتوں میں سے ایک بات ماننی پڑے گی۔ یا یہ کہ قرآن کے اس مقصد سے آنحضرت صلعم خود بے خبر تھے۔ یا یہ کہ حضور کو اس کا علم تھا مگر آپ نے قرآن کے اس حکم پر عمل نہ کیا اور قرآن کے بتائے ہوئے دستور پر اس دستور کو ترجیح دی جو رضائے الٰہی کے خلاف دنیا میں رائج تھا۔ فرمائیے کہ ان دونوں پہلوؤں میں سے کون سا پہلو آپ اختیار کرتے ہیں؟

میرے ان اصولی اعتراضات سے پہلو تہی کر کے آپ نے قرآن کے متعلق اپنے زاویہ نگاہ کی تشریح شروع کر دی جس سے معاملہ سلجھنے کے بجائے اور زیادہ الجھ گیا۔ آپ کی اس تشریح سے یہ بات کھل گئی (جو پہلے ذرا چھپی ہوئی تھی) کہ آپ قرآن مجید کی زیر بحث آیت کو اشتراکیت (Com munism) کے سانچے میں ڈھال کر دولت کی غیر مساویانہ تقسیم کا وہ علاج کرنا چاہتے ہیں جسے کارل مارکس نے تجویز کیا اور لینن نے عملی جامہ پہنایا۔ اس نقطہ نظر سے آپ کو چاہیے تھا کہ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ کے بجائے خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (۲: ۳) سے فائدہ اٹھاتے تاکہ نہ صرف زمین بلکہ جملہ اقسام کے مال و دولت کی شخصی ملکیت ناجائز ٹھیرتی، زمین کے جانور بھی (جن پر آپ نے از روئے قرآن شخصی ملکیت کا حق تسلیم کیا ہے) تمام انسانوں کی مشترک ملکیت قرار پاتے، روپیہ پیسہ بھی (جس میں خود آپ کے اعتراف کے مطابق قرآن نے زکوٰۃ اور وراثت کے قوانین جاری کیے ہیں) تمام انسانوں میں مساوات کے ساتھ تقسیم ہوتا، اور

ایک ہی وقت میں دولت کی غیر مساویانہ تقسیم کا ایسا سد باب ہوتا کہ اسلام اور کمیونزم بغلگیر نظر آنے لگتے۔

اسلام اور ایمان قرآن مجید میں لفظ اسلام دو معنوں میں استعمال ہوا ہے:۔

ایک لغوی معنی یعنی اطاعت و انقیاد کا مترادف ہے۔ مثلاً وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (۳: ۷۷) اور أَيُّكُمْ يَأْتِينِي بِعَرْشِهَا قَبْلَ أَنْ يَأْتُونِي مُسْلِمِينَ (۲۷: ۳) اس معنی میں اسلام، ایمان سے علیحدہ ہے۔ اور اسی معنی کے لحاظ سے قالت الاعراب آمنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا (۴۹: ۲) فرمایا گیا ہے۔

دوسرا اصطلاحی معنی جس میں اسلام، خدا کے برگزیدہ اور پسندیدہ دین کا نام ہے (إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ) اس معنی میں اسلام کے تحقق ہونے کے لئے ایمان کا متحقق ہونا ضروری ہے، اور جب تک کوئی شخص مومن نہ ہو، وہ اس معنی میں مسلم نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید میں یہ اصطلاحی "اسلام"، ایمان کا ہم معنی آیا ہے۔ مثلاً يَا قَوْمِ إِنْ كُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللَّهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوا إِنْ كُنْتُمْ مُسْلِمِينَ (۱۰: ۹) اور قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ...... وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا (۲: ۱۶) اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا نام اسی دوسرے معنی میں "مسلم" رکھا ہے۔ اسی معنی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ کہا۔ اور اپنی اولاد کو وصیت کی کہ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ (۲: ۱۶) اسی معنی میں إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (۳: ۲) کہا گیا ہے، اور رَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا (۵: ۱) کہہ کر اسے پسندیدگی کی سند عطا کی گئی ہے۔

آپ نے ان دونوں معنوں میں کوئی فرق نہیں کیا اور لکھ دیا کہ "اسلام اور ایمان میں ظہور اور بطون کا فرق ہے۔ اللہ نے ظہور کی بنیاد پر ہمارا نام مسلم رکھا ہے"۔ پھر آپ اس سے بھی آگے بڑھ گئے اور آپ نے یہ دعویٰ کیا کہ مسلمان کو ایمان کا دعویٰ کرنے سے روکا گیا ہے۔ یہ بات قرآن مجید کی تصریحات کے خلاف تھی؛ اور اسی پر میں نے اعتراض کیا تھا نہ کہ معاذ اللہ قرآن پر۔

مسئلہ تقدیر اس مسئلہ کے متعلق میں نے جو کچھ عرض کیا تھا آپ نے اس پر غور نہیں فرمایا۔ میری گزارش یہ تھی کہ عقیدۂ تقدیر اسی طرح ایمان باللہ کے اجزا میں سے ہے جس طرح خدا کو سمیع، علیم، بصیر، وغیرہ ماننا۔ جب تک انسان کو اللہ تعالیٰ کی صفات کا صحیح علم حاصل نہ ہو اور یہ علم ایمان کی صورت اختیار نہ کرلے، اسوقت تک ایمان باللہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا عقیدۂ تقدیر بہرحال ایمانیات سے ہے، خواہ آپ اسکو ایمان مجمل میں شامل قرار دیں یا ایمان مفصل میں۔ حضرت یوسف کے بھیڑیئے کی برأت سے اگر انسان خالی الذہن ہو تو ایمان میں نقص واقع نہ ہوگا۔ لیکن اگر تقدیر کے عقیدہ سے انسان خالی الذہن ہو تو ایمان ناقص ہو جائے گا اور عمل پر اس کا اثر پڑے گا۔ ان دونوں باتوں کا فرق اتنا نمایاں ہے کہ آپ جیسے صاحب علم کا اس سے چشم پوشی کرنا قابل تعجب ہے۔ کیا آپ نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں عقیدۂ تقدیر پر کتنا زور دیا ہے۔ کتنی کثرت سے مختلف مواقع پر اسکو پیش کیا ہے، اور کیسے کیسے اخلاقی فوائد اس عقیدہ پر متفرع ہوتے ہیں؟

اتباع علماء و صلحاء آیۂ فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ سے میں نے جو استدلال کیا تھا اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ یہ آیت خاص طور پر علماء اہل کتاب سے وحی کی تصدیق چاہنے کے لیے نازل ہوئی تھی۔ میں بھی جانتا ہوں کہ آیت کی شان نزول یہی ہے۔ مگر کیا اس سے یہ بات نہیں نکلتی کہ جس مسئلہ کے متعلق آدمی کو کافی واقفیت نہ ہو یا جس میں اسکو کچھ شک ہو، اس کے بارے میں اہل علم سے سوال کرنا چاہیئے؟ آپ نے اپنے مدعا کی تائید میں جو آیت پیش کی ہے وہ تو میری پیش کردہ آیت سے بھی زیادہ میرے مدعا کی تائید کرتی ہے۔ اس میں تو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا ہے کہ اگر آپ کو شک ہو تو اہل کتاب کے علماء سے دریافت کر لیجیے۔ غور فرمایئے کہ جب نبی کو یہود و نصاریٰ کے علماء سے دریافت کرنے کی ہدایت ہوتی ہے تو عام مسلمانوں کے لیے مسلمان علماء سے دین کے مسائل دریافت کرنا کیونکر ناجائز ہوسکتا ہے؟ اسی طرح اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ کے متعلق آپ کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیائے سابقین کا اقتداء کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ میں بھی جانتا ہوں کہ ایسا

ہی ہے۔ مگر کیا اس آیت سے یہ قاعدہ کلیہ نہیں نکلتا کہ جو لوگ ہدایت یافتہ ہوں اور خدا کی بتائی ہوئی راہ راست پر چلتے ہوں انکی پیروی کرنی چاہیئے؟ آپ فرماتے ہیں کہ علماء و صلحاء کے کسی قول کو بلا قرآنی سند کے اصل دین سمجھ لینا قطعی شرک ہے۔ میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ جو شخص کسی انسان کے قول کو خدا کے قول کے برابر درجہ دے، یا خدا کے قول کو چھوڑ کر کسی انسان کا قول اختیار کرے وہ مسلمان نہیں ہے۔ لیکن آپ فرمایئے کہ اگر کوئی مسلمان خود کتاب کا علم نہ رکھتا ہو، اور کسی صاحب علم سے کتاب کے احکام اور کتاب کی تعلیمات دریافت کرے، اور اسکی بتائی ہوئی باتوں کو یہ سمجھ کر قبول کرے کہ اس نے جو کچھ بتایا ہے کتاب کے مطابق بتایا ہے، وہ آخر کس گناہ کا مرتکب ہوتا ہے؟ اور قرآن کی کون سی آیت کی رو سے اسکو مشرک یا گنہگار قرار دیا جا سکتا ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ علماء کی کوئی بات نہ مانو جب تک کہ وہ قرآنی سند نہ پیش کریں۔ مگر آپ نے غور نہیں کیا کہ قرآنی سند کو جانچنا عالم کا کام ہے نہ کہ عامی کا۔ جو شخص خود اتنا علم نہ رکھتا ہو کہ قرآنی سند کو جانچ کر عالم کی بات کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کر سکے، اس کے لیے تو بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ جس عالم کے علم اور تقویٰ پر اسکو اعتماد ہو اسکی بات مان لے، اور یہ سمجھتے ہوئے مان لے کہ اس کا قول کتاب و سنت کے مطابق ہی ہوگا۔ اگر جاہل عامیوں میں یہ اسپرٹ پیدا ہو جائے کہ وہ علماء کے بتائے ہوئے مسائل کو نہ مانیں اور خود اپنے نامکانی علم کے ساتھ قرآن کا اصل سیدھا مطلب سمجھ کر اجتہاد کرنا شروع کر دیں، تو مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں سخت ابتری پھیل جائے گی۔ ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ چننے گا۔ آج آپ ۷۰ فرقوں کو روتے ہیں، مگر اس صورت میں تو فرقوں کا شمار لاکھوں سے بھی متجاوز ہو جائے گا بلکہ سرے سے کوئی جمعیت باقی ہی نہ رہے گی۔

تقریظ وانتقاد

"تعلیمات قرآن"

(۳)

اتباع واطاعت رسولؐ جن امور میں مجھ کو مولف سے شدید اختلاف ہے وہ رسالت اور اس کے احکام سے متعلق ہیں۔ اس معاملہ میں فاضل مؤلف نے قریب قریب وہی مسلک اختیار کیا ہے جو گروہ "اہل قرآن" اور "منکرین حدیث" کا مسلک ہے۔ کتاب کے صفحہ ۵۹ پر وہ لکھتے ہیں :-

"اصولی قانون صرف اللہ کی کتاب ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا | جو تمہارے رب کی طرف سے تمہارے اوپر اتارا گیا ہے
تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ | اسی کی پیروی کرو اور اس کے سوا اولیا کی پیروی نہ کرو

جملہ ضوابط اسی کی روشنی میں باہمی مشورہ سے بنائے جائیں گے

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ | اور انکی حکومت آپس کے مشورے سے ہے"

یہاں مؤلف نے بیچ میں سے اسوۂ رسول کو صاف اڑا دیا ہے۔ انکی تجویز یہ ہے کہ قرآن کریم سے اصول لے کر مسلمان باہمی مشورہ سے تفصیلی قوانین مرتب کرلیا کریں۔ لیکن ان دونوں کڑیوں کے درمیان سلسلہ کی ایک اور کڑی بھی تھی جس کو خود اللہ تعالی نے ہی اس زنجیر میں پیوست کیا تھا۔ وہ کڑی یہ ہے

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ | اے محمد! کہو کہ اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی

يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (۳ : ۴) کرو خدا تم سے محبت کرے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اصولی قانون قرآن ہی ہے مگر یہ قانون ہمارے پاس بلا واسطہ نہیں بھیجا گیا ہے بلکہ رسول خدا کے واسطہ سے بھیجا گیا ہے اور رسول کو درمیانی واسطہ اس لیے بنایا گیا ہے کہ وہ اصولی قانون کو اپنی اور امت کی عملی زندگی میں نافذ کرکے ایک نمونہ پیش کردیں، اور الہی ہدایت سے وہ طریقے متعین کردیں جن سے یہ اصولی قانون نافذ کیا جا سکتا ہے۔ پس قرآن مجید کے مطابق صحیح ضابطہ یہ ہے کہ پہلے خدا کا بھیجا ہوا اصولی قانون، پھر خدا کے رسول کا بتایا ہوا طریقہ، پھر ان دونوں کی روشنی میں ہمارے اولی الامر کا اجتہاد۔

أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ (۴ : ۸) اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اولی الامر کی جو تم میں سے ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی بات پر نزاع ہو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو

فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ کا فقرہ خاص طور پر قابل غور ہے۔ مسائل شرعی میں جب مسلمانوں کے درمیان نزاع اور اختلاف واقع ہو تو حکم ہے کہ خدا اور رسول کی طرف رجوع کرو۔ اگر مرجع صرف قرآن مجید ہوتا تو صرف فردوہ الی اللہ کہنا کافی تھا۔ لیکن اس کے ساتھ وَالرَّسُول بھی کہا گیا جس میں صاف اشارہ ہے کہ قرآن کے بعد رسول کا طریقہ تمہارے لیے مرجع ہے۔

اس کے بعد مؤلف نے صفحہ ۱۲۸ پر لکھا ہے :-

رسولوں کا فریضہ صرف پیغام الہی پہونچانا ہے اور بس

مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ (۵ : ۱۳) رسول کے اوپر کچھ نہیں ہے بجز اس کے کہ وہ (پیغام) پہنچا دیں

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (۳۶ : ۲) ہمارے اوپر سوائے واضح تبلیغ کے اور کچھ نہیں ہے"

آگے چل کر صفحہ ۱۵۵ پر پھر لکھتے ہیں :-

"حیثیت منصب رسالت رسول کا فریضہ صرف پیغام الٰہی کی تبلیغ ہے اور بس

اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلَاغُ (۴۲ : ۵)	تیرے اوپر صرف تبلیغ ہے
فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ (۶۴ : ۲)	اگر تم نے منہ پھیر لیا تو ہمارے رسول پر صرف کھل کر تبلیغ ہے اور بس
فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳ : ۶)	تجھ پر پہنچانا ہے اور ہمارے اوپر حساب لینا ہے "

یہاں مولف نے آیات کے سیاق و سباق اور فحوائے کلام کو نظر انداز کر کے رسالت کے منصب کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ گویا وہ محض ایک نامہ بر کا منصب ہے۔ حالانکہ یہ تمام آیات دراصل کفار کے مقابلہ میں نازل ہوتی ہیں۔ جو لوگ روگردانی کرتے تھے، اور رسول کو جھٹلاتے تھے ان سے کہا گیا ہے کہ رسول کا کام ہمارا پیغام پہنچا دینا تھا سو اس نے پہنچا دیا۔ اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے پاس کوئی رہنما نہیں بھیجا گیا۔ مَا جَاءَ نَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ (۵ : ۳) اب خدا پر تمہاری کوئی حجت باقی نہیں رہی۔ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ (۴ : ۲۳) اب تم نہ مانو گے تو اپنا کچھ بگاڑو گے۔ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيْلِ (۵ : ۳) اسی طرح رسول اللہ سے بھی کہہ دیا گیا کہ تم ان کافروں کی روگردانی سے دل گرفتہ کیوں ہوتے ہو؟ تم ان پر داروغہ نہیں بنائے گئے ہو، تم پر ان کی ہدایت و ضلالت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے تمہارا کام پیغام الٰہی کا پہونچا دینا تھا، سو تم نے یہ کام کر دیا۔ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَا اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلَاغُ (۴۲ : ۵)، فَذَكِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (۸۸)

یہ سب کچھ کفار کے مقابلہ میں ہے۔ رہے وہ لوگ جو اسلام قبول کر لیں، اور امت مسلمہ میں داخل ہو جائیں تو ان کے لیے رسول کی حیثیت محض پیغام پہنچا دینے والے کی نہیں ہے، بلکہ آپ ان کے لیے معلم اور مزکی بھی ہیں، اسلامی زندگی کا نمونہ بھی ہیں، اور ایسے امیر بھی ہیں جس کی اطاعت ہر زمانے میں بے چون و چرا کی جانی چاہیے۔ معلم کی حیثیت سے آپ کا کام یہ ہے کہ پیغام الٰہی کی تعلیمات اور اس کے قوانین کی تشریح و توضیح کریں (وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۲ : ۱۵) مزکی ہونے کی حیثیت سے آپ کا کام یہ ہے کہ قرآنی تعلیمات

اور قوانین کے مطابق مسلمانوں کی تربیت کریں اور ان کی زندگیاں اسی سانچے میں ڈھالیں (وَيُزَكِّيهِمْ ۲: ۱۵۰) نمونہ ہونے کی حیثیت سے آپ کا کام یہ ہے کہ خود قرآنی تعلیم کا عملی مجسمہ بن کر دکھا دیں، تاکہ آپ کی زندگی اس زندگی کی ٹھیک ٹھیک تصویر ہو جو قرآن کے مقصود کے مطابق ایک مسلمان کی زندگی ہونی چاہیئے، اور آپ کے ہر قول اور ہر فعل کو دیکھ کر معلوم ہو جائے کہ ایسا ہی قول اور ایسا ہی فعل (جو لازم نہیں کہ بعینہ وہی قول اور وہی فعل ہو) قرآن کے مقصود کے مطابق ہے، اور جو کچھ اس کے خلاف ہے وہ قرآن کے خلاف ہے (لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۳۳: ۳) - اور وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ - ۵۳: ۱) اس کے ساتھ حضور کی حیثیت امیر کی بھی ہے۔ مگر وہ امیر نہیں جس سے نزاع کی جاسکے، بلکہ وہ امیر جس کے حکم کو بے چون وچرا ماننا ویسا ہی فرض ہے، جیسا قرآن کی آیت کو ماننا فرض ہے (فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ- ۴: ۸- وَمَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ - ۴: ۸) اور وہ امیر نہیں جو صرف اپنی زندگی ہی میں امیر ہوتا ہے، بلکہ وہ امیر جو قیامت تک کے لیے امت مسلمہ کا امیر ہے جس کے احکام مسلمانوں کے لیے ہر زمانہ اور ہر حال میں مرجع ہیں۔ اس لیے کہ قرآن کی جتنی آیات اوپر پیش کی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی زمانہ کے ساتھ مقید نہیں ہے، نہ منسوخ ہے۔

مولف نے منصب رسالت کے ان مراتب کو سمجھنے میں دو بہت بڑی غلطیاں کی ہیں:-

اوّلاً، انھوں نے بعض آیات کا غلط مفہوم لے کر رسول کا کام صرف تبلیغ (یعنی نامہ بری) میں محدود کر دیا، پھر تعلیم کتاب و حکمت، اور تزکیۂ نفوس، اور نمونہ بن کر دکھانے کے جملہ مراتب کو "تبلیغ" کے ضمن میں شامل کر دیا حالانکہ قرآن مجید میں تبلیغ کے ساتھ ان میں سے ہر ایک کو ایک مستقل مرتبہ اور بجائے خود منصب رسالت کا ایک جزو قرار دیا گیا ہے۔ اس فرق مراتب کو ملحوظ نہ رکھنے اور بعض کے مراتب کی اہمیت کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ مولف کے لیے منصب رسالت کا سمجھنا دشوار ہو گیا۔ وہ نہ سمجھ سکے کہ معلم کتاب و حکمت اور مزکی نفوس اور قابل تقلید نمونہ ہونے کی حیثیت سے آنحضرتؐ کی زندگی کیا اہمیت رکھتی ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ :-

"آیت وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی کا یہ مفہوم قرار دینا کہ رسول اللہ جو کچھ کلام کرتے تھے وہ سب کا سب وحی تھا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ دعویٰ قرآن کے وحی ہونے کا تھا جس کا کفار انکار کرتے تھے اس کے بارے میں کہا گیا کہ وہ جو کچھ بولتے ہیں وحی ہے۔ گھر میں یا ازواج مطہرات یا باہم دیگر حضرات سے جو گفتگو فرماتے تھے اس کے متعلق نہ وحی ہونے کا دعویٰ تھا نہ کفار کو کوئی بحث تھی"

اس تقریر کو جب ہم مولف کی ان عبارتوں کے ساتھ ملا کر پڑھتے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ "رسول کا کام صرف پیغام الٰہی کی تبلیغ ہے اور بس" اور "رسول کی اطاعت کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ کا پیغام جو وہ لایا ہے اس پر عمل کیا جائے" اور یہ کہ "ہمارے رسول صرف اللہ کی کتاب یعنی قرآن کے مبلغ تھے"، تو اس سے مولف کا مدعا یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمدؐ ابن عبداللہ بحیثیت رسول، اور محمدؐ ابن عبداللہ بحیثیت انسان کے درمیان فرق کر دیں۔ رسول ہونے کی حیثیت سے آنحضرت قرآن کی جو تعلیم دیں اور قرآن کے مطابق جو احکام دیں، وہ تو مولف کے نزدیک سمع و طاعت کے مستحق ہیں۔ مگر بحیثیت انسان آپ کے اقوال و افعال ویسے ہی ہیں جیسے ایک انسان کے ہوتے ہیں ان کا خدا کی طرف سے ہونا، اور ہوائے نفس سے محفوظ ہونا، اور ضلالت و غوایت سے پاک ہونا مولف کے نزدیک مسلم نہیں ہے اور نہ جناب مولف ان کے اندر امت مسلمہ کے لئے کوئی قابل تقلید نمونہ پاتے ہیں۔

لیکن یہ تفریق جو انھوں نے محمدؐ ابن عبداللہ بحیثیت مبلغ قرآن اور بحیثیت انسان کے درمیان کی ہے، قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں ہے۔ قرآن میں آنحضرت صلعم کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسول و نبی ہونے کی حیثیت ہے۔ جس وقت سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب رسالت سے سرفراز کیا، اس وقت سے لیکر حیات جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسول خدا کی حیثیت سے تھا، اسی حیثیت میں آپ مبلغ اور معلم بھی تھے، مربی اور مزکی بھی تھے، قاضی اور حاکم بھی تھے، امام اور امیر بھی تھے، حتیٰ کہ آپ کی خانگی اور عائلی اور شہری زندگی کے سارے معاملات بھی اسی حیثیت کے تحت

آ گئے تھے ، اور ان تمام حیثیتوں میں آپ کی حیات طیبہ ایک انسان کامل اور مسلم قانت اور مومن صادق کی زندگی کا ایسا نمونہ تھی جس کو حق تعالی نے ہر اس شخص کے لیے بہترین قابل تقلید نمونہ قرار دیا تھا جو اللہ کی خوشنودی اور آخرت کی کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہو۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ (۳۳ : ۳) قرآن مجید میں کہیں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت رسالت اور حیثیت انسانی اور حیثیت امارت میں کوئی فرق کیا گیا ہو۔ اور یہ فرق کیسے کیا جا سکتا ہے ؟ جب آپ خدا کے رسول تھے تو لازم تھا کہ آپ کی پوری زندگی خدا کی شریعت کے ماتحت ہو اور اس شریعت کی نمائندہ ہو۔ اور آپ سے کوئی ایسا فعل اور کوئی ایسی حرکت صادر نہ ہو جو خدا کی رضا کے خلاف ہو۔ اسی بات کی طرف سورہ نجم کی ابتدائی آیات میں اشارہ کیا گیا ہے کہ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ۔ تمہارا صاحب (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نہ بے راہ ہوا اور نہ گمراہ ہوا۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ۔ اور وہ جو کچھ کہتا ہے ہوائے نفس کی بنا پر نہیں کہتا۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ۔ اس کی بات کچھ نہیں ہے مگر وحی جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ۔ اس کو ایسے استاد نے تعلیم دی ہے جس کی قوتیں بڑی زبردست ہیں۔ جناب مؤلف فرماتے ہیں کہ ان آیات میں قرآن کے وحی ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے جس کا کفار انکار کرتے تھے۔ لیکن مجھے ان آیات میں کہیں کوئی خفیف سا اشارہ بھی قرآن کی طرف نظر نہیں آتا۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ میں هُوَ کی ضمیر نطق رسول کی طرف پھرتی ہے جس کا ذکر وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ میں کیا گیا ہے۔ ان آیات میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی بنا پر نطق رسول کو صرف قرآن کے ساتھ مخصوص کیا جا سکتا ہو۔ ہر بات جس پر نطق رسول کا اطلاق ہوگا ، آیات مذکورہ کی بنا پر وحی ہوگی ، اور ہوائے نفس سے پاک ہوگی۔ یہ تصریح قرآن میں اسی لئے کی گئی ہے کہ رسول کو جن لوگوں کے پاس بھیجا گیا ہے ، ان کو رسول کے ضلالت اور غوایت اور ہوائے نفس سے محفوظ ہونے کا کامل اطمینان ہو جائے اور وہ جان لیں کہ رسول کی ہر بات خدا کی طرف سے ہے۔ ورنہ اگر کسی ایک بات میں بھی یہ شبہ ہو جائے کہ وہ ہوائے نفس پر مبنی ہے اور خدا کی طرف سے نہیں ہے تو رسول کی رسالت پر سے اعتماد

اُٹھ جائے۔ کفار اسی چیز کے منکر تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ رسول کو نعوذ باللہ جنون ہے، یا کوئی آدمی اس کو پڑھاتا ہے یا وہ اپنے دل سے باتیں بنا لیا کرتا ہے۔ حق تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرما کر اس غلط خیال کی تردید کی ہے اور صاف الفاظ میں فرما دیا ہے کہ نہ تمہارا صاحب بے راہ یا گمراہ ہے، نہ وہ ہوائے نفس کی بنا پر کچھ کہتا ہے۔ اس کی زبان مبارک سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے جو خاص ہماری طرف سے ہے۔ اور اس کو کوئی انسان یا جن یا شیطان نہیں پڑھاتا بلکہ وہ علم سبق دیتا ہے جو شدید القویٰ ہے۔ یہی بات خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی زبان مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمائی ہے کہ قو َالذی نفسی بیدہٖ ما یخرج منہ الاحقا" اس ذات پاک کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اس سے جو کچھ نکلتا ہے حق ہی نکلتا ہے"۔

افسوس ہے کہ صاحب تعلیمات قرآن کو اس حقیقت سے انکار ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ اپنے گھر میں ازواج مطہرات سے یا باہر دیگر حضرات سے جو گفتگو فرماتے تھے اس کے متعلق نہ وحی ہونے کا دعویٰ تھا، نہ کفار کو کوئی بحث تھی۔ بایں ہمہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ آنحضرت جس وقت جس حالت میں جو کچھ بھی کرتے تھے رسول کی حیثیت سے کرتے تھے۔ سب کچھ ضلالت و غوایت اور ہوائے نفس سے پاک تھا، اور اللہ نے جو فطرت سلیمہ آپ کو عنایت فرمائی تھی، اور تقویٰ و پاکیزگی کے جو حدود آپ کو بتائے تھے، آپ کے تمام اقوال و افعال اسی فطرت سے صادر اور انہی حدود سے محدود ہوتے تھے، ان کے اندر تمام عالم انسانی کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ تھا، اور انہی سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کیا چیز جائز ہے اور کیا ناجائز۔ کونسی چیز حرام ہے اور کون سی حلال۔ کون سی باتیں حق تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہیں اور کون سی اس کے خلاف ہیں۔

ثانیاً، انھوں نے رسول اللہ کی حیثیت امارت کو حیثیت رسالت سے الگ کر دیا ہے جس کا ثبوت قرآن میں نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"اطاعت بحیثیت رسول اور اطاعت بحیثیت امیر میں دو باتوں کا فرق ہے۔

(۱) بحیثیت رسالت رسول اللہ کو کسی سے مشورہ لینے کا حکم نہ تھا بلکہ فریضۂ تبلیغ اللہ کی طرف سے

آپ کے ذمے لازم کیا گیا تھا۔ یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ (۵ : ۱۰۰) اور امیر کی حیثیت سے لوگوں سے مشورہ لینے کا حکم دیا گیا تھا وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ (۳ : ۱۷)

(۲) بحیثیت رسول آپ کی اطاعت قیامت تک فرض ہے کیونکہ قرآن ہمیشہ کے لیے ہے لیکن بحیثیت امیر آپ کی اطاعت بالمشافہ تھی یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (۸ : ۳) اور امارت کے فرائض ہمیشہ ہنگامی ہی ہونگے کیونکہ زمانہ کے ساتھ ساتھ ماحول بھی بدلتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آج جو امیر ہوگا وہ غزوۂ بدر و احد کی متابعت میں صرف نیزہ و شمشیر سے جہاد میں کام نہ لے گا بلکہ موجودہ زمانہ کے اسلحہ استعمال کرے گا۔ امراء کے مقابلہ میں منازعت کا حق حاصل ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ (۴ : ۸)"

یہ سب کچھ قرآن کے منشا کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ چونکہ مولف نے یہ نہیں سمجھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے بنائے ہوئے امیر نہیں تھے بلکہ خدا کے مقرر کیے ہوئے امیر تھے، اور آپ کی امارت آپ کی رسالت سے الگ نہ تھی بلکہ آپ رسول خدا ہونے کی حیثیت ہی سے امیر تھے۔ اس لیے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت امارت کو عام امراء کی حیثیت امارت کے مانند سمجھ لیا۔ پھر اس کی تائید میں قرآن کی جن آیات سے استدلال کیا ہے اُن کو بھی وہ ٹھیک نہیں سمجھے ہیں۔ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، مگر وہ اس لیے تھا کہ آپ اپنی امت کے امراء کے لیے مشاورت کا نمونہ پیش کریں اور خود اپنے عمل سے شوریٰ Democracy کے صحیح اصول کی طرف رہنمائی کریں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ آپ کی حیثیت دوسرے امراء کی سی ہے۔ دوسرے امراء کے لیے تو یہ قانون مقرر کیا گیا ہے کہ وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (۴۲ : ۴) اور یہ کہ اگر اہل شوریٰ میں نزاع ہو تو وہ خدا اور رسول کی طرف رجوع کریں۔ (فَاِنْ

تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (۴: ۸) لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاں مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا کہ جب آپ کسی بات کا عزم فرمالیں تو خدا پر بھروسہ کرکے عمل کا اقدام فرمائیے۔ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (۳: ۱۷) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ مشورہ کے محتاج نہ تھے، بلکہ آپ کو شوریٰ کا حکم صرف اس لیے دیا گیا تھا کہ آپ کے مبارک ہاتھوں سے ایک صحیح شوروی طرز حکومت کی بنیاد پڑ جائے۔

رہی یہ بات کہ امیر کی حیثیت سے آنحضرت صلعم کی اطاعت صرف آپ کے عہد تک تھی تو یہ بھی غلط ہے اور جس آیت سے استدلال کیا گیا ہے اس سے یہ مفہوم نہیں نکلتا۔ مؤلف نے وَأَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ سے یہ سمجھا ہے کہ اطاعت رسول کا حکم صرف ان لوگوں کو دیا گیا تھا جو اس وقت اس حکم کو سن رہے تھے۔ لیکن اگر وہ سورۂ انفال کو ابتدا سے پڑھتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ وہاں مقصود ہی کچھ اور ہے۔ ابتدا میں فرمایا گیا ہے کہ وَأَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ (اگر تم ایمان رکھتے ہو تو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو) پھر ان لوگوں کو ڈانٹا گیا ہے جو رسول اللہ کی دعوت جہاد پر دلوں میں کڑھتے تھے۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ وَمَنْ يُشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَإِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول سے جھگڑا کرے گا تو اسے معلوم ہو جائے کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے) اس کے بعد یہ ارشاد ہوا ہے کہ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ۔ اس آیت میں اور پچھلی تمام آیات میں رسول کے ساتھ اللہ کی اطاعت کا ذکر بار بار کیا گیا ہے جس سے یہ یاد دلانا مقصود ہے کہ رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔ پھر لفظ رسول آیا ہے۔ امیر کا لفظ کسی جگہ بھی استعمال نہیں کیا گیا، اور نہ کوئی مخفی سے مخفی اشارہ ایسا موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ یہاں رسول سے مراد رسول کی ایسی امیرانہ حیثیت ہے جو رسالت سے مختلف ہو۔ پھر رسول کے حکم سے منہ موڑنے کو منع کیا گیا ہے جس پر سخت عذاب کی دھمکی اوپر دی جا چکی ہے۔ اس کے بعد "وَأَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ" کہنے کا منشا صاف یہ ہے کہ تم ہمارے ان تاکیدی احکام کو سنتے ہوئے ہمارے رسول کی اطاعت سے کبھی منہ نہ موڑو۔ اس انتم اور تسمعون کے مخاطب صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو اس وقت موجود تھے بلکہ قیامت تک جو

لوگ ایمان کے ساتھ قرآن کو سنیں گے ان سب پر لازم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حکم ان کو پہنچے اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں اور حدا کے عذاب سے ڈریں۔

اور یہ جو مؤلف نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض امارت اسی طرح ہنگامی ہیں جس طرح دوسرے امراء کے ہوا کرتے ہیں، کیونکہ آج ہم جہاد میں بدر و اُحد کی طرح نیزہ و شمشیر سے نہیں لڑ سکتے، تو یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔ رسول اللہ صلعم نے اپنے عہد میں جن اسلحہ سے کام لیا تھا وہ اسلحہ تو ضرور ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتے تھے، لیکن حضور نے اپنی لڑائیوں میں جو اخلاقی ضوابط برتے تھے اور جن ضوابط کو برتنے کی ہدایت فرمائی تھی وہ کسی عہد کے لیے مخصوص نہ تھے، بلکہ انھوں نے مسلمانوں کے لیے ایک دائمی قانون جنگ بنا دیا ہے۔ شرعی نقطۂ نظر سے یہ سوال اہمیت نہیں رکھتا کہ آپ تلوار استعمال کرتے ہیں یا بندوق یا توپ۔ بلکہ اہمیت اس سوال کی ہے کہ آپ اپنے اسلحہ کس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں، کس پر استعمال کرتے ہیں، اور کس طرح ان سے خونریزی کا کام لیتے ہیں۔ اس باب میں جو نمونہ آنحضرت صلعم نے اپنے غزوات میں پیش فرمایا ہے وہ ہمیشہ کے لیے اسلامی جہاد کا ایک مکمل نمونہ ہے، اور معنوی حیثیت سے سرورِ عالم قیامت تک کے لیے ہر مسلمان فوج کے سپہ سالارِ اعظم ہیں۔

مؤلف نے امارت اور رسالت میں ایک فرق اور بھی بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ امراء سے منازعت کا حق حاصل ہے۔ اب میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیتِ امارت ویسی ہی ہے جیسی دوسرے امراء کی ہے تو کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منازعت کا حق حاصل تھا؟ جس امیر کے مقابلہ میں آواز بلند کرنے تک کی اجازت نہ تھی، اور صرف اتنی سی گستاخی پر تمام عمر کے اعمال غارت ہو جانے کی دھمکی دی گئی تھی (۴۹: ۱) اور جس سے جھگڑا کرنے والے کو دوزخ میں جھونک دیئے جانے کا خوف دلایا گیا تھا (۴: ۱۷) کیا اس امیر سے منازعت کرنے کا حق بھی مسلمان کو حاصل ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں تو کہاں اس امیر کی امارت اور کہاں ان امراء کی امارت جن سے منازعت کا حق مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔

مؤلف نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیثیتِ امارت اور عام امراء کی حیثیتِ امارت میں قطعاً کوئی امتیاز نہیں رکھا ہے، حتیٰ کہ ان تمام احکام کو جو اطاعتِ رسول سے متعلق ہیں، اطاعتِ امیر کے احکام قرار دیا ہے صفحہ ۱۵۷

کے حاشیہ پر لکھتے ہیں :-

"اللہ اور رسول کے الفاظ قرآن میں اکثر جہاں جہاں ساتھ آتے ہیں ان سے مراد امارت ہے جس کا قانون کتاب اللہ ہے اور جس کے نافذ کرنے والے رسول اللہ یا ان کے جانشین ہیں۔ مثلاً یسئلونک عن الانفال قل الانفال للہ والرسول (۸:۱) اموال غنیمت کا حکم صرف عہد رسالت تک محدود نہ تھا بلکہ آیندہ کے لئے بھی ہے جس کی تعمیل خلافت کا فریضہ ہے"

پھر فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول کے متعلق صفحہ ۱۰۸ پر حاشیہ لکھتے ہیں:-

"آخری اختیار اللہ رسول یعنی امارت ہے۔ اسلیے رسول اللہ کا جو منصب بحیثیت امیر کے ہے وہی ان کے خلفاء کا بھی ہوگا"

یہ حق سے صریح تجاوز ہے۔ قرآن مجید میں اطاعت خدا، اطاعت رسول، اور اطاعت اولی الامر کے تین مراتب بیان کئے گئے ہیں۔ اطاعت خدا سے مراد قرآن مجید کے احکام کی اطاعت ہے۔ اطاعت رسول سے مراد رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے قول اور عمل کی پیروی ہے۔ اور اطاعت اولی الامر سے مراد مسلمانوں کے امراء اور ارباب حل و عقد کی اطاعت ہے۔ پہلے دونوں مراتب کے متعلق قرآن میں ایک جگہ نہیں بیسیوں جگہ اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ خدا اور رسول کے احکام میں کسی چون و چرا کی گنجایش نہیں ہے۔ مسلمانوں کا کام سننا اور اطاعت کرنا ہے۔ خدا اور رسول کے فیصلہ کے بعد کسی مسلمان کو یہ اختیار باقی نہیں رہتا کہ وہ اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرے۔ رہا تیسرا مرتبہ تو اس کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت، خدا و رسول کے احکام کے تابع ہے، اور نزاع کی صورت میں خدا اور رسول کی طرف رجوع کرنا لازم ہے۔ ایسے صاف اور کھلے ہوئے احکام کے موجود ہوتے ہوئے اسکی قطعی کوئی گنجایش نہیں ہے کہ خدا اور رسول سے مراد امارت لی جائے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب امارت کو اس امارت کے ساتھ ملا دیا جائے جو مسلمانوں کے امراء کو حاصل ہے۔ اس معاملہ میں قل الانفال للہ والرسول سے جو استدلال کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ "اموال غنیمت خدا اور رسول کے لیے ہیں" کہنے کا مدعا یہ ہے کہ خدا اور رسول نے اسلامی جماعت کا جو

نظام قائم کیا ہے اس کے مصالح میں یہ غنائم صرف کیے جائیں۔ اس سے یہ مطلب کہاں نکلتا ہے کہ اللہ اور رسول سے مراد امارت ہے؟

حدیث کے متعلق مولف کا مسلک حدیث کے متعلق مولف نے قریب قریب وہی مسلک اختیار کیا ہے جو منکرین حدیث کے ایک بڑے گروہ کا مسلک ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"تعلیم کتاب کا ایک شعبہ یہ بھی تھا کہ رسول اس کے احکام پر عمل کر کے دکھا دے تاکہ امت اسی نمونہ پر چل سکے

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔	تمہارے لیے رسول اللہ کے اندر اچھا نمونہ ہے۔

چنانچہ ہمارے رسول نے جملہ احکام قرآنی مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ پر عمل کر کے دکھلا دیا اور مسلمان اسی نمونہ پر عمل کرنے لگے۔ یہ اسوۂ حسنہ اُمت کے پاس عمل متواتر کی شکل میں موجود ہے جس کے مطابق رسول اللہ کے عہد سے نسلاً بعد نسل وہ عمل کرتی چلی آتی ہے۔ اس لیے یہ یقینی اور دینی ہے۔ اسکی مخالفت خود قرآن کی مخالفت ہے"

دوسری جگہ مولف نے لکھا ہے :-

"غیر یقینی شے کا دین میں کچھ دخل نہیں"

ان عبارات اور مولف کی ان تصریحات سے جو اوپر بیان ہو چکی ہیں، ان کا مسلک واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ :-

(۱) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قضایا اور وہ قوانین جو آپ نے سیاسی، جنگی، اور تمدنی و اجتماعی امور میں امیر قوم کی حیثیت سے نافذ کیے تھے، اس اسوۂ رسول کی حدود سے خارج ہیں جس کی پیروی کا حکم عام قرآن میں دیا گیا ہے۔ لہٰذا انکی تو اب ضرورت ہی نہیں رہی، کیونکہ امارت کے فرائض ہنگامی ہیں اور زمانہ کے ساتھ ساتھ ماحول بھی بدلتا رہتا ہے۔

(۲) صرف ان امور میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا عمل (نہ کہ قول) قابل تقلید ہے جو عبادات اور دینی عمل سے تعلق رکھتے ہیں، اور جن میں آنحضرت صلعم نے قرآنی احکام پر عملدرآمد کرنے کی صورت خود اپنے عمل سے بتادی ہے۔

(۳) مولف کے نزدیک صرف وہ عمل متواتر یقینی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے ابتک جاری ہے اور جس کی پیروی ہر نسل اپنے سے پہلی نسل کو دیکھ کر کرتی رہی ہے۔ رہیں وہ روایات جو آنحضرت صلعم کے اقوال و اعمال کے متعلق احادیث میں وارد ہوئی ہیں، تو وہ یقینی نہیں ہیں، اور دین میں ان کا کچھ دخل نہیں۔

ان میں سے پہلی دونوں باتوں کے متعلق میں قطعیت کے ساتھ کہتا ہوں کہ قرآن کے بالکل خلاف ہیں قرآن میں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر یہ حکم نکلتا ہو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے محض دینی اعمال دائماً قابل تقلید ہیں، اور تمدنی و اجتماعی امور میں آپ کے فیصلے اور آپ کے نافذ کردہ قوانین صرف اس عہد کے لیے مخصوص ہیں جس عہد میں وہ نافذ کیے گئے تھے۔ اگر ایسی کوئی آیت قرآن میں ہو جس سے ان دونوں قسم کے اعمال میں فرق کیا جاسکتا ہو اور دونوں کے احکام مختلف قرار دیئے جاسکتے ہوں تو اسکو پیش کیا جائے۔ مجھکو تو قرآن میں یہ حکم ملتا ہے کہ

وما كان لمؤمن ولا مؤمنة إذا قضى الله ورسوله أمراً أن يكون لهم الخيرة من أمرهم ومن يعص الله ورسوله فقد ضل ضلالاً مبيناً (۱۳۳ ۵)

کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر میں فیصلہ کردے، تو ان کو اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اسکے رسول کی نافرمانی کریگا وہ صریحاً بہت بھٹک جائیگا

اس آیت میں زمانہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ مومن اور مومنہ سے خاص عہد رسالت کے مومن مرد و عورت مراد نہیں لیئے جاسکتے۔ اَمراً کا لفظ نہایت عام ہے جو ہر قسم کے معاملات پر حاوی ہے، خواہ وہ دینی ہوں یا دنیوی۔ اللہ اور رسول سے مراد اللہ اور رسول ہی ہیں "امارت" ہرگز نہیں ہے کیونکہ امیر یا اولی الامر بہرحال مومن ہی ہونگے اور یہاں تمام مومنین و مومنات سے یہ حق سلب کیا گیا ہے کہ خدا اور رسول نے جس معاملہ کا فیصلہ کردیا ہو اس میں انہیں مجتمعاً یا منفرداً خود فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار باقی رہے۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ جو اس کے خلاف عمل کریگا وہ صریحاً

بہت دور بھٹک جائیگا"، یہ اشارہ ہے اس طرف کہ اللہ تعالیٰ نے اور اسکی ہدایت سے اسکے رسول نے اپنے احکام اور اپنے قوانین سے اسلامی جماعت کا جو نظام قائم کر دیا ہے، اس نظام کا قیام منحصر ہی اس پر ہے کہ جو احکام جاری کر دیئے گیے ہیں اور جو قوانین نافذ کر دیئے گیے ہیں انکی ٹھیک ٹھیک پیروی کی جائے۔ اگر خدا اور اس کے رسول کی قولی اور عملی رہنمائی سے قطع نظر کر کے لوگ خود اپنی رائے اور اپنے اختیار سے کچھ طریقے اختیار کریںگے تو یہ نظام باقی نہ رہے گا، اور اس نظام کے ٹوٹتے ہی تم راہ راست سے بھٹک کر بہت دور نکل جاؤگے۔ تعجب ہے، کہ جس قرآن میں ایسی صاف اور صریح ہدایت موجود ہو اسکی تعلیمات لکھنے والے نے وہ مسلک اختیار کیا ہے جو آپ ابھی سن آئے ہیں۔

رہی تیسری بات، تو اس کے متعلق میں اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ "ترجمان القرآن" کی گذشتہ اشاعتوں میں عرض کر چکا ہوں۔ ان کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ البتہ میں جناب مولف سے صرف یہ سوال کروں گا کہ اگر کوئی شخص ان تمام بدعات و خرافات کو جو آج مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں رائج ہو گئی ہیں وہ یقینی عمل متواتر قرار دے جو رسول اللہ ؐ کے عہد سے نسلاً بعد نسل چلا آ رہا ہے، اور اس بنا پر انہیں داخل دین سمجھے تو آپکے پاس کونسا ایسا یقینی ذریعہ ہے جس سے آپ یہ فیصلہ کر سکیں کہ یہ عمل رسول اللہ ؐ کا نہیں ہے بلکہ بعد کے لوگوں کی ایجاد ہے؟ آپ فرمائیں گے کہ ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کریں گے اور اسکی آیات سے ان بدعات کی تردید کریں گے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اول تو رسول اللہ ؐ کے قول و عمل سے آیات قرآنی کے معانی کی جو تعیین ہوتی ہے اسکو نظر انداز کر دینے کے بعد آیات کی تاویل میں ایک بدعت پسند انسان اتنی گنجائش نکال سکتا ہے کہ اسکی بہت سی بدعتوں کی تردید مشکل ہو جائیگی۔ دوسرے اگر آپ نے قرآن سے اسکی بدعات کی تردید کر بھی دی تو یہ اس کے اس دعوی کی تردید نہ ہوگی کہ یہ وہی یقینی عمل متواتر ہے جو رسول اللہ ؐ کے عہد سے نسلاً بعد نسل چلا آ رہا ہے۔ آپ اپنے مسلک کے مطابق اس عمل متواتر کو غیر یقینی کہہ نہیں سکتے۔ اور آپ تاریخ سے بھی (جو روایات کی طرح غیر یقینی ہی ہونی چاہئیے) یہ استدلال نہیں کر سکتے کہ یہ بدعات عہد رسالت میں نہ تھیں بلکہ فلاں عہد میں جاری ہوئیں۔ اب صرف یہی صورت رہ جاتی ہے کہ آپ ان کو یقینی مان لیں اور اس صورت میں احکام قرآنی اور عمل رسول کے درمیان اختلاف اور رسول اللہ کی رسالت میں طعن لازم آتا ہے۔

اس کے علاوہ مولف نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور عالم برزخ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں بھی

(باقی مضمون صفحہ ۹۰ پر ملاحظہ ہو)

مطبوعات

بشائر النبیین بظہور خاتم الانبیاء والمرسلین از مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی۔ ضخامت ۸۰ صفحات۔

بشارات کے باب میں، اردو میں، بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن علم، فرسودہ و پامال مباحث میں بھی نئی شان پیدا کر دیتا ہے۔ بشائر النبیین ایسا ہی رسالہ ہے۔ فاضل مؤلف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی نسبت انبیاء علیہم السلام کی بشارات، توراۃ و انجیل سے بلفظہا اقتباس کی ہیں، اور بذیل آیۃ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ ان کی تفسیر کی ہے، اور آیات کلام اللہ و احادیث و آثار سے اس توضیح و انطباق کو مؤثق کیا ہے۔

کلمۃ اللہ فی حیات روح اللہ از مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی۔ ضخامت ۷۰ صفحات

قرآن عزیز نے مسیح علیہ السلام کے قتل و صلب کی بشدت نفی کی ہے، اور بجسد عنصری ان کا آسمان کی طرف اٹھایا جانا اور زمین پر واپس آنے تک اپنے خدا کے حضور میں رہنا، نصوص سے ثابت ہے اور سلف و خلف کا اس پر اجماع ہے

(بقیہ صفحہ ۷۰) بہت سی غلطیاں ہیں، اور بعد میں مولف نے جو ترمیم اپنی کتاب میں کی ہے اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انھوں نے اپنی پچھلی رائے سے رجوع کر لیا ہے۔ لیکن یہاں میں ان غلطیوں سے بحث کرنا اس لیے مناسب نہیں سمجھتا کہ ان پر "معارف" کے صفحات میں کافی بحث ہو چکی ہے۔ اگرچہ اس طریق بحث سے مجھے اتفاق نہیں ہے جو وہاں اختیار کیا گیا ہے، لیکن ان دلائل سے مجھ کو پورا اتفاق ہے جو "معارف" کے فاضل مضمون نگاروں نے مولف کے مقابلہ میں پیش کیے ہیں۔

لیکن دورِ حاضر کی "روشن خیالی" نے جہاں بہت سے عقائد میں قطع و برید کی ہے، حیاتِ مسیح کے اس مسلم مسئلہ کو بھی متنازع فیہ بنا دیا ہے خصوصیت کے ساتھ قادیانی جماعت نے مرگ مسیح کے اعتقاد کو بڑی قوت کے ساتھ پھیلانے کی کوشش کی ہے، جس کے وجوہ اس سے زیادہ ظاہر ہیں کہ ان کو ظاہر کرنے کی ضرورت ہو۔ فاضل محترم مولانا محمد ادریس دامت برکاتہم نے زیرِ نظر رسالے میں اسی مسئلہ پر کلام کیا ہے اور اس فاسد عقیدہ کی ایسے دلائل سے بیخ کنی کی ہے کہ معتقدین و مشتبہین کے لیے کسی پہلو سے انکار کی گنجائش نہیں چھوڑی۔

اعجاز القرآن از مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی۔ ضخامت ۴۰ صفحات

اس مختصر رسالے میں مولانا موصوف نے کلام اللہ کے اعجاز پر دس براہین خود کلام اللہ ہی سے پیش کیے ہیں اور ان پر کلام کر کے قرآن کریم کا کلامِ ربانی و وحیِ رحمانی ہونا ثابت کیا ہے۔ جو حضرات اس باب میں مختصرات پڑھنا چاہیں ان کے لیے یہ رسالہ بغایت شافی ہے۔

یہ تینوں رسالے ۱۲ار میں مل سکتے ہیں۔ جناب مؤلف سے عابد روڈ حیدرآباد دکن کے پتہ پر طلب فرمائیے

تاریخ الفقہ از مولوی قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی۔ ضخامت ۹۰ صفحات کاغذ، کتابت و طباعت دیدہ زیب قیمت ۱۲ار

ملنے کا پتہ :- دفتر اشاعت العلوم سرکار عالی، شبلی گنج، حیدرآباد۔

قاضی صاحب ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں، اور جب آزاد حالات میں بھی ان کا قلم اپنی مدت کی ذہنی، اخلاقی ضیافت کا سامان کرنے سے نہیں رکتا۔ اس سے قبل الخوانی محمود اور فردوسی، غازیان ہند، معجزات اسلام وغیرہ رسائل لکھ چکے تھے جو عام طور پر پسند کیے گئے۔ اس مرتبہ تاریخ الفقہ پر قلم اٹھایا اور ایک مفید کتاب کا اردو میں اضافہ کر دیا۔ موضوع کی وسعت کے لحاظ سے یہ کتاب اگرچہ بہت مختصر ہے لیکن لائق مؤلف نے اس میں بہت سی کام کی باتیں جن سے اردو داں طبقہ عموماً بے خبر ہے، جمع کر دی ہیں۔ قیاس و اجتہاد کی شرعیت و حجیت پر بدلیل کتاب و سنت و آثارِ صحابہ کلام کیا ہے، صحابہ کرام و تابعین باحسان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اختلاف کے وجوہ اور ایسے اختلاف کے سراسر رحمت ہونے پر گفتگو کی ہے۔ موضوع کی مناسبت کا لحاظ رکھتے ہوئے قرن اولیٰ کے ائمہ مجتہدین کے تراجم احوال لکھے ہیں۔ مستند دلائل سے ثابت کیا ہے کہ تقلیدِ شخصی کا آغاز انہی عہد خیر و برکت ہی میں جیسی خیر القرون کہتے ہیں پھر ان اسباب کی تشریح کی ہے جن کی بنا پر علمائے ربانیین نے ائمہ اربعہ رضی اللہ عنہم کی تقلیدِ شخصی پر اجماع کیا۔ آخر میں امم سابقہ کے قوانین کا فقہ اسلام سے مقابلہ کر کے فقہ اسلامی کی افضلیت ثابت کی ہے۔

فہرست مضامین

ماہ شعبان ۱۳۵۳ھ جلد ۵ عدد ۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

اسلامی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے نیم پختہ یا بالکل خام نوجوانوں کے مذہبی خیالات پر مغربی تعلیم و تہذیب کا جو اثر ہوتا ہے اس کا اندازہ، ان تحریروں اور تقریروں سے ہو سکتا ہے جو اس قسم کے لوگوں کی زبان و قلم سے آئے دن نکلتی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک تازہ نمونہ ملاحظہ ہو۔

سید مقبول احمد صاحب صوبہ متحدہ کے ایک مسلمان گریجویٹ جو غالباً ڈپٹی کلکٹر بھی ہیں، کچھ مدت ہوئی کہ چین و جاپان کی سیاحت کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ ان کا سفرنامہ گورکھپور کے رسالہ "ایوان" میں شائع ہو رہا ہے۔ ہانگ کانگ کے حالات تحریر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ہمارے ساتھ جتنے چینی مسافر ہیں وہ انتہا کے بلانوش اور شراب خوار ہیں۔ سور کا گوشت تو اُن کی جان ہے...... اب میں نے عیسائیت کی ترقی کا راز سمجھا۔ چین اپنے قدیم مذہب کی پیروی کو نئی تعلیم کے ساتھ عار پاتا ہے۔ اس کو اسلام قبول کرنے میں تامل نہ ہوتا اگر وہ اس کو سمجھتا ہوتا مگر اسلام اُسکو اسکی تمام مرغوب غذا سے محروم کر دیتا ہے۔ چار و ناچار وہ عیسائی ہو جاتا ہے...... کچھ عجب نہیں کہ آیندہ چین کا سرکاری مذہب عیسائیت ہو جائے۔ میں سور کے گوشت کے معاملہ میں اہل یورپ اور اہل چین کے نو مسلموں میں فرق دینا پسند کرتا ہوں۔ قرآن سے بھی

مجھے اس کے قطعی حرام ہونے میں شک ہے۔ زیادہ بریں نیست کہ اس کو کسی خاص وجہ سے حرام کر دیا گیا ہو۔ مگر ایسے ممالک میں جہاں اس کے بغیر فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ ہو جائے تو کیا حرج ہے؟

بہرحال قرآن کا یہی ایک حکم ہے جس کی ممانعت عمومی کی علت میری سمجھ میں اب تک نہیں آئی۔

اللہ اصولاً معدہ اور محرکات اخلاق میں اس قدر بُعد ہے کہ مذہب ہمارے کھانے کا مینو MENU بھی تیار کرے تو کچھ کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہم کو آہن گری اور زرگری خیالی وغیرہ کا کام بھی کیوں نہ سکھائے۔ میرا خیال ہے کہ دنیا بہ حیثیت عالم کے ترقی نہ کرنے کا راز اسی میں پنہاں ہے کہ وہ آدمی سے تمام حقوق انسانی سلب کر کے اس کو ایک لاشۂ بے جان اور ایسا بچہ بنا دیتا ہے کہ وہ اپنی دنیاوی ترقی کی راہیں سب بھول جاتا ہے۔ ورنہ مذہب درحقیقت اسی قدر ہونا چاہیے جیسا عیسائیوں نے سمجھ رکھا ہے"

اس کے بعد وہ شنگھائی کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"خدا کی اس بے شمار خلقت کو خوش و خرم و خوشحال دیکھ کر دل گوارا نہیں کرتا کہ یہ تمام کے تمام چند سال کے بعد دوزخ کے ایندھن بنائے جائیں گے گویا ان کی پیدائش کا یہی ایک مقصد خدا کے پاس رہ گیا ہے۔ پھر یہ سب کے سب الّا ماشاء اللہ چند نفوس کے علاوہ اگر بت پرست اور کافر ہیں تو انھوں نے دوزخ میں رکھے جانے کے لیے کیا یہی قصور کیا ہے کہ انھوں نے خدا کی زمین کو معمور کر دیا ہے؟ نہ وہ حاجیوں کو قتل و غارت کرتے ہیں، نہ ان میں قوم لوط کا عمل ہے، نہ وہ کسی کے مال کو ہضم کر لیتے ہیں اور نہ اس کو جائز کرنے کے لیے تاویلیں کرتے ہیں۔ خاموشی سے اس زندگی کو کس خوبی سے طے کر رہے ہیں، پھر بھی وہ مستحق دوزخ ہیں۔ آخر کیوں؟ ......

یقیناً مشکل شعبدہ ایک سودائے خام ہے۔ لیکن یہ تو بتادو کہ اگر ایک شخص ایک ایسی ہستی کا منکر یا قائل ہو جاتا ہے جو اس کو ماتا اور جلاتا ہے تو محض اس لیے کہ اسکی ماہیت اسکی سمجھ سے اتنی ہی باہر ہے جتنی ہماری سمجھ سے، یا وہ عربی کو خدا کی زبان نہیں سمجھتا، تم اس کے دشمن ہو اور وہ تمہارا دشمن ہو جاتا ہے۔ مگر نہیں! تمہارے نزدیک یہ سب کچھ ضروری نہیں ہے۔ ضروری تو یہ ہے کہ پائجامہ ایک خاص وضع کا ہو۔ کرتے کی کاٹ ایسی ہو۔ فلاں قسم کا کھانا کھائے۔ منہ پر چار انگل کی ڈاڑھی ہو۔ کبھی اپنے ملکی مدرسوں میں قدم نہ رکھے اس واسطے کہ وہاں مذہب کی زبان اور مذہب کا فن تم کو نہیں سکھایا جاتا"

جاپان کے بندرگاہ کوبے کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"دو گھنٹے تک میں کوبے میں پھرتا رہا۔ ایک بھیک مانگنے والا مجھ کو نہ ملا اور کوئی پھٹے پرانے کپڑوں میں بدحال ملا۔ یہ ہے اس قوم کی ترقی کا حال جو نہ مذہب کو جانتی ہے اور نہ خدا کو"

پھر وہ بقول خود "موعظہ حسنہ" شروع کرتے ہیں:۔

"یاد رکھو کہ احسان اصل دین ہے اور احسان کسی زبان اور فن کا محتاج نہیں۔ اس کا فطری مقصد یہ ہے کہ ہم آئندہ زندگی میں یا خود اس زندگی میں اپنے اعمال کے جواب دہ ہیں اور ہونگے یہی در اصل مذہب اسلام ہے۔ اس سے زیادہ جس چیز کا تم نے مذہب نام لے رکھا ہے وہ محض تمہارے نفس کا دھوکا یا تمہارے دماغ کا خلل ہے۔ جس روز ان دو ہی باتوں پر مذہب کو محدود کر دو گے اور اپنی ساری بیڑیاں شریعت کی توڑ ڈالو گے، تم بھی قوموں کے ساتھ بام ترقی پر پہنچو گے بلکہ یوں کہو کہ تم قوموں میں ضمیر پیدا کرو گے جن کے ہاتھ سے اگر دنیا نہیں گئی ہے تو آسمانی بادشاہت بھی نہ جائے گی۔ تم خود کوئی قوم نہیں ہو بلکہ قوموں کے مصلح ہو۔ مگر خدارا اس کا موقع تو نہ دو کہ

کوئی کہے کہ فلاں قوم برسرِ اقتدار ہے مگر جو اُس میں مسلمان ہیں ان کی حالت زبوں ہے، اور یقیناً اس زبوں حالی کا ذمہ داران کا عجیب و غریب مذہب ہے"

یہ تحریر ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل کی عام دماغی حالت کا ایک واضح نمونہ ہے۔ مسلمان کے گھر پیدا ہونے، مسلم سوسائٹی کے رکن کی حیثیت سے پلے بڑھنے، مسلمانوں کے ساتھ معاشرت و تمدن کی بندشوں میں بندھے، اس لیے اسلام کی محبت، مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی، اور مسلمان رہنے کی خواہش گویا ان کی گھٹی میں پڑی اور ان کے دلوں میں اس طور پر بیٹھ گئی کہ اس میں ان کے ارادے، اور ان کی اپنی عقلی و فکری قوتوں کا دخل نہ تھا۔ مگر قبل اس کے کہ اس اضطراری اور غیر شعوری اسلام کو تعلیم و تربیت کے ذریعے اختیاری اور شعوری اسلام بنایا جاتا، اور ان میں یہ صلاحیت پیدا کی جاتی کہ وہ اسلامی تعلیمات کو پوری طرح سمجھ کر مسلمان ہوتے اور عملی زندگی میں اس کے احکام و قوانین کو برت کر بھی دیکھ لیتے، انہیں انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں بھیج دیا گیا جہاں ان کے قوائے ذہنی و فکری کی پرورش بالکل غیر اسلامی تعلیم و تربیت میں ہوئی اور ان کے دماغوں پر مغربی افکار اور مغربی تہذیب کے اصول اس طرح چھا گئے کہ ہر چیز کو وہ مغرب کی نظر سے دیکھنے اور ہر مسئلہ پر مغرب ہی کے ذہن سے غور کرنے لگے، اور مغربیت کے اس استیلاء سے آزاد ہو کر سوچنا اور دیکھنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا۔ مغرب سے انھوں نے عقلیت RATIONALISM کا سبق ضرور سیکھا، مگر خود عقل ان کی اپنی نہ تھی بلکہ یورپ سے حاصل کی ہوئی تھی، اس لیے ان کی عقلیت دراصل فرنگیت ہو گئی۔ [illegible] انھوں نے مغرب سے تنقید CRITICISM کا بھی درس لیا، مگر یہ آزاد تنقید کا درس نہ تھا، بلکہ اس بات کا درس تھا کہ مغرب کے اصولوں کو برحق مان کر ان کے معیار پر ہر اس چیز کو جانچو جو مغربی نہیں ہے، لیکن خود مغرب کے اصولوں کو تنقید سے بالاتر سمجھو۔ اس تعلیم و تربیت کے بعد جب یہ لوگ کالجوں سے فارغ ہو کر نکلے، اور زندگی کے میدان عمل میں انھوں نے قدم رکھا تو ان کے دل اور دماغ میں بُعد المشرقین واقع ہو چکا تھا۔ دل مسلمان تھے اور دماغ غیر مسلم۔ رہتے مسلمانوں میں تھے۔ شب و روز کے معاملات مسلمانوں کے ساتھ تھے، تمدن و معاشرت کی بندشوں میں مسلمانوں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے،

یقیناً اشکا عقیدہ ایک سودائے خام ہے۔ لیکن یہ تو بتادو کہ اگر ایک شخص ایک ایسی ہستی کا فطرتاً قائل ہو جاتا ہے جو اس کو مارتا اور جلاتا ہے تو محض اس لیے کہ اسکی ماہیت اسکی سمجھ سے اتنی ہی باہر ہے جتنی ہماری سمجھ سے، یا وہ عربی کو خدا کی زبان نہیں سمجھتا، تم اس کے دشمن ہو اور وہ تمہارا دشمن ہو جاتا ہے۔ مگر نہیں! تمہارے نزدیک یہ سب کچھ ضروری نہیں ہے۔ ضروری تو یہ ہے کہ پائجامہ ایک خاص وضع کا ہو۔ کرتے کی کاٹ ایسی ہو۔ فلاں قسم کا کھانا کھائے۔ منہ پر چار انگل کی ڈاڑھی ہو۔ کبھی اپنے ملکی مدرسوں میں قدم نہ رکھے اس واسطے کہ وہاں مذہب کی زبان اور مذہب کا فن تم کو نہیں سکھایا جاتا۔"

جاپان کے بندرگاہ کوبے کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"دو گھنٹہ تک میں کوبے میں چکر مارتا رہا۔ ایک بھیک مانگنے والا مجھ کو نہ ملا اور نہ کوئی پھٹے پرانے کپڑوں میں بدحال ملا۔ یہ ہے اس قوم کی ترقی کا حال جو نہ مذہب کو جانتی ہے اور نہ خدا کو۔"

پھر وہ بقول خود "موعظۂ حسنہ" شروع کرتے ہیں:۔

"یاد رکھو کہ احسان اصل دین ہے اور احسان کسی زبان اور فن کا محتاج نہیں۔ اس کا فطری مقصد یہ ہے کہ ہم آئندہ زندگی میں یا خود اس زندگی میں اپنے اعمال کے جواب دہ ہیں اور ہونگے یہی دراصل مذہب اسلام ہے۔ اس سے زیادہ جس چیز کا تم نے مذہب نام لے رکھا ہے وہ محض تمہارے نفس کا دھوکا یا تمہارے دماغ کا خلل ہے۔ جس روز ان دونوں باتوں پر مذہب کو محدود کر دوگے اور اپنی ساری بیڑیاں شریعت کی توڑ ڈالوگے، تم بھی قوموں کے ساتھ بام ترقی پر پہنچوگے بلکہ یوں کہو کہ تم قوموں میں ضمیر پیدا کروگے جن کے ہاتھ سے اگر دنیا نہیں گئی ہے تو آسمانی بادشاہت بھی نہ جائے گی۔ تم خود کوئی قوم نہیں ہو بلکہ قوموں کے مصلح ہو۔ مگر خدارا اس کا موقع تو نہ دو کہ

کوئی کہے کہ فلاں قوم برسرِ ادبار ہے مگر جو اُن میں مسلمان ہیں ان کی حالت زبوں ہے، اور یقیناً اس زبونی کا ذمہ دار ان کا عجیب و غریب مذہب ہے"

یہ تحریر ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل کی عام دماغی حالت کا ایک واضح نمونہ ہے۔ مسلمان کے گھر پیدا ہونے، مسلم سوسائٹی کے رکن کی حیثیت سے پلے بڑھے، مسلمانوں کے ساتھ معاشرت و تمدن کی بندشوں میں بندھے، اس لیے اسلام کی محبت، مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی، اور مسلمان رہنے کی خواہش گویا ان کی گھٹی میں پڑی اور ان کے دلوں میں اس طور پر بیٹھ گئی کہ اس میں ان کے ارادے، اور ان کی اپنی عقلی و فکری قوتوں کا دخل نہ تھا۔ مگر قبل اس کے کہ اس اضطراری اور غیر شعوری اسلام کو تعلیم و تربیت کے ذریعے اختیاری اور شعوری اسلام بنایا جاتا، اور ان میں یہ صلاحیت پیدا کی جاتی کہ وہ اسلامی تعلیمات کو پوری طرح سمجھ کر مسلمان ہوتے اور عملی زندگی میں اس کے احکام و قوانین کو برت کر بھی دیکھ لیتے، انہیں انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں بھیج دیا گیا جہاں ان کے قوائے ذہنی و فکری کی پرورش بالکل غیر اسلامی تعلیم و تربیت میں ہوئی اور ان کے دماغوں پر مغربی افکار اور مغربی تہذیب کے اصول اس طرح چھا گئے کہ ہر چیز کو وہ مغرب کی نظر سے دیکھنے اور ہر مسئلہ پر مغرب ہی کے ذہن سے غور کرنے لگے، اور مغربیت کے اس استیلاء سے آزاد ہو کر سوچنا اور دیکھنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا۔ مغرب سے انھوں نے عقلیت RATIONALISM کا سبق ضرور سیکھا، مگر خود عقل ان کی اپنی نہ تھی بلکہ یورپ سے حاصل کی ہوئی تھی، اس لیے ان کی عقلیت درحقیقت فرنگی عقلیت ہو گئی، نہ کہ آزاد عقلیت۔ انھوں نے مغرب سے تنقید CRITICISM کا بھی درس لیا، مگر یہ آزاد تنقید کا درس نہ تھا، بلکہ اس بات کا درس تھا کہ مغرب کے اصولوں کو برحق مان کر ان کے معیار پر ہر اس چیز کو جانچو جو مغربی نہیں ہے، لیکن خود مغرب کے اصولوں کو تنقید سے بالاتر سمجھو۔ اس تعلیم و تربیت کے بعد جب یہ لوگ کالجوں سے بالغ ہو کر نکلے، اور زندگی کے میدان عمل میں انھوں نے قدم رکھا تو ان کے دل اور دماغ میں بُعد المشرقین واقع ہو چکا تھا۔ دل مسلمان تھے اور دماغ غیر مسلم۔ رہتے مسلمانوں میں تھے، شب و روز کے معاملات مسلمانوں کے ساتھ تھے، تمدن و معاشرت کی بندشوں میں مسلمانوں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے،

اپنے گرد و پیش مسلمانوں کی مذہبی و تمدنی زندگی کے اعمال دیکھ رہے تھے، ہمدردی و محبت کے رشتے مسلمانوں سے وابستہ تھے مگر سوچنے اور سمجھنے اور رائے قائم کرنے کی جتنی قوتیں تھیں وہ سب مغربی سانچوں میں ڈھلی ہوئی تھیں، جن سے نہ اسلام کا کوئی قاعدہ مطابقت رکھتا تھا اور نہ مسلمانوں کا کوئی عمل۔ اب انھوں نے مغربی معیار کے مطابق اسلام اور مسلمانوں کی ہر چیز پر تنقید شروع کی اور ہر اس چیز کو غلط اور قابلِ ترمیم سمجھا جسے اس معیار کے خلاف پایا، خواہ وہ اسلام کے اصول میں سے ہو یا فروع میں سے، یا محض مسلمانوں کا عمل ہو۔ ان میں سے بعض نے تحقیق چاہی کہ یہ کچھ اسلام کا مطالعہ بھی کیا مگر تنقید و تحقیق کا معیار وہی مغربی تھا۔ ان کی ذہنیت کے ٹیڑھے سوراخ میں اسلام کی سیدھی میخ آخر بیٹھتی تو کیونکر؟

مذہبی مسائل پر جب یہ حضرات اظہارِ خیال کرتے ہیں تو ان کی باتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بغیر سوچے سمجھے تقریر فرما رہے ہیں۔ نہ ان کے مقدمات درست ہوتے ہیں، نہ منطقی اسلوب پر ان کو ترتیب دیتے ہیں، اور نہ صحیح نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ کلام کرتے وقت خود اپنی پوزیشن بھی متعین نہیں کرتے۔ ایک ہی سلسلۂ کلام میں مختلف حیثیتیں اختیار کر جاتے ہیں، ابھی ایک حیثیت سے بول رہے تھے کہ دفعتہً ایک دوسری حیثیت اختیار کر لی اور اپنی پچھلی حیثیت کے خلاف بولنے لگے۔ سستی فکر ان کے مذہبی بیانات کی نمایاں خصوصیت ہے۔ مذہب کے علاوہ جس مسئلہ پر بولیں گے ہوشیار اور چوکنے ہو کر بولیں گے۔ کیونکہ وہاں اگر کسی قسم کی بے ضابطگی ہوگئی تو جانتے ہیں کہ اہلِ علم کی نگاہ میں کوئی وقعت باقی نہ رہے گی۔ لیکن مذہب چونکہ ان کی نگاہ میں کوئی ہیبت نہیں رکھتا، اور اس کو وہ اتنا وزن ہی نہیں دیتے کہ اس پر کلام کرتے وقت اپنے دماغ پر کچھ زور دینا ضروری سمجھیں، اس لیے یہاں وہ بالکل بے فکری کے ساتھ ڈھیلی ڈھالی گفتگو فرماتے ہیں، گویا کھانا کھا کر آرام کرسی پر دراز ہیں، اور محض تفریح کے طور پر بول رہے ہیں جس میں ضوابطِ کلام کو ملحوظ رکھنے کی کوئی حاجت ہی نہیں۔

دوسری بات جو ان کی تحریروں میں نمایاں نظر آتی ہے وہ خیالات کی سطحیت اور معلومات کی کمی ہے۔ مذہب کے سوا کسی اور مسئلے میں وہ اتنی کم معلومات اور اس قدر کم غور و فکر کے ساتھ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتے کیونکہ وہاں اگر تحقیق کے

بغیر ایک کلمہ منہ سے نکل جائے تو آبرو جاتی رہے۔ لیکن مذہب کے معاملہ میں وہ تحقیق اور مطالعہ اور غور و فکر کو ضروری نہیں سمجھتے۔ سرسری طور پر جو کچھ معلوم ہوگیا اسپر رائے قائم کرلی اور بے تکلف اس کو بیان کردیا۔ اس لیے کہ کسی گرفت کا یہاں خوف ہی نہیں۔ گرفت اگر کرے گا تو مولوی کرے گا۔ اور مولوی کے متعلق یہ بات پہلے ہی اصول موضوعہ کے طور پر داخل مسلمات ہو چکی ہے کہ وہ تاریک خیال، دقیانوسی، اور تنگ نظر ہوتا ہے۔

فاضل محترم جناب سید مقبول احمد صاحب کی تحریر ان دونوں خصوصیات کی حامل ہے۔ سب سے پہلے تو ان کے مضمون سے یہی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ مسلم کی حیثیت سے کلام کر رہے ہیں یا غیر مسلم کی حیثیت سے؟ اسلام کے متعلق گفتگو کرنے والے کی دو ہی حیثیتیں ہوسکتی ہیں۔ یا وہ مسلم ہوگا یا غیر مسلم۔ جو شخص مسلم کی حیثیت سے کلام کرے گا عام اس سے کہ وہ خوش عقیدہ ORTHODOX ہو یا آزاد خیال یا اصلاح طلب، بہرحال اس کے لیے لازم ہوگا کہ دائرۂ اسلام کے اندر رہ کر کلام کرے یعنی قرآن کو منتہائے کلام FINAL AUTHORITY سمجھے اور ان اصول دین و قوانین شریعت کو تسلیم کرے جو قرآن نے مقرر کئے ہیں، کیونکہ اگر وہ قرآن کی سند کو نہ مانے گا اور کسی ایسی بات میں کلام کی گنجائش سمجھے گا جو قرآن سے ثابت ہو، تو دائرہ اسلام سے باہر نکل آئے گا، اور اس دائرے سے نکلنے کے بعد اسکی مسلمانہ حیثیت باقی ہی نہ رہے گی کہ وہ اس میں کلام کر سکے۔ رہی دوسری حیثیت یعنی یہ کہ بولنے والا غیر مسلم ہو، تو اس حیثیت میں اسے پورا حق ہوگا کہ قرآن کے اصول اور اس کے احکام پر جیسی چاہے تنقید کرے، اسلیے کہ وہ اس کتاب کو منتہائے کلام نہیں مانتا۔ لیکن یہ حیثیت اختیار کرنے کے بعد اسے مسلم کی حیثیت سے گفتگو کرنے اور مسلمان بن کر مسلمانوں کو اسلام کے معنی سمجھانے اور اسلام کی ترقی کے وسائل بتانے کا کوئی حق نہ ہوگا۔ ایک صاحب عقل و شعور آدمی جب سوچ سمجھ کر اسلام کے متعلق گفتگو کرے گا تو وہ سب سے پہلے یہ فیصلہ کرے گا کہ وہ ان دونوں حیثیتوں میں سے کون سی حیثیت اختیار کر سکتا ہے، پھر وہ جو حیثیت بھی اختیار کرے گا اس کے عقلی شرائط کو ملحوظ رکھے گا۔ کیونکہ بیک وقت اپنے آپ کو مسلمان بھی کہنا اور قرآن کے مقرر کئے ہوئے اصول و قوانین پر نکتہ چینی کا حق بھی استعمال کرنا، قرآن کی سند میں کلام بھی کرنا اور مسلمانوں کو

موعظہ حسنہ بھی سنانا کسی عاقل کا فعل نہیں ہو سکتا۔ نقیضین کو جمع کرنا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک ہی شخص بیک وقت مسلم بھی ہو اور غیر مسلم بھی۔ دائرہ اسلام میں داخل بھی ہو اور اس سے خارج بھی۔

اگر سید صاحب اسلام کے سوا کسی دوسرے مسئلے پر کلام فرماتے تو ہم ان کے متعلق یہ بدگمانی نہیں کر سکتے کہ وہ اس طرح دو مختلف حیثیتیں بیک وقت اپنے اندر جمع کر لیتے۔ ہم ان سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ قیصر ہند کی عدالت میں بیٹھ کر قیصر ہند کے امضا کئے ہوئے قوانین پر نکتہ چینی کرنے کا حق استعمال فرمائیں گے۔ نہ ہم ان سے اس جرأت کی امید رکھتے ہیں کہ وہ کسی مذہب فکری SCHOOL OF THOUGHT کی پیروی کا دعویٰ کرنے کے بعد ان اصولوں پر مخالفانہ نکتہ چینی کریں گے جن پر وہ مذہب قائم ہے۔ لیکن یہ طرفہ ماجرا ہے کہ اسلام کے معاملہ میں انھوں نے دو بالکل متخالف حیثیتیں اختیار کی ہیں، اور یہ محسوس تک نہیں کیا کہ وہ بار بار اپنی پوزیشن بدل رہے ہیں۔ ایک طرف وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، مسلمانوں کا سا نام رکھتے ہیں، مسلمانوں کی زبوں حالی پر اظہار رنج فرماتے ہیں، اسلام کی ترقی کی خواہش ظاہر کرتے ہیں، مسلمانوں کو "احسان" یعنی "اصل دین" کا وعظ سناتے ہیں۔ دوسری طرف اس کتاب کے مقرر کئے ہوئے اصول اور قوانین پر نکتہ چینی بھی کرتے ہیں جس پر اسلام کی بنیاد قائم ہے اور جس کو آخری سند تسلیم کرنا مسلمان ہونے کی لازمی شرط ہے۔ قرآن ایک جگہ نہیں چار جگہ بالتصریح تمام مسلمانوں کے لیے سور کے گوشت کو حرام قرار دیتا ہے مگر آپ اس معاملہ میں ڈھیل دینا پسند فرماتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ "ترقی اسلام" کے لیے (خدا جانے قرآن سے باہر وہ کون سا اسلام ہے جس کی ترقی آپ چاہتے ہیں؟) قرآن فی الواقع انسان کے لیے کھانے کا مینو طیار کرتا ہے، کھانے کی چیزوں میں حرام و حلال، خبیث و طیب کا فرق قائم کرتا ہے اور صاف کہتا ہے کہ تم اپنے اختیار سے کسی شے کو حلال اور کسی کو حرام قرار دینے کا حق نہیں رکھتے۔ مگر آپ کو اپنے اس حق پر اصرار ہے اور خود قرآن کا یہ حق تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ وہ کھانے پینے میں مذہب کو دخل دے۔ قرآن مذہب کو ان حدود میں محدود نہیں رکھتا جن میں سینٹ پال (نہ کہ مسیح ؑ) کے متبعین نے اسکو محدود کیا ہے اور

لباس، اکل و شرب، نکاح و طلاق، وراثت، لین دین، سیاست، عدالت، تعزیرات وغیرہ کے قوانین وضع کرتا ہے، مگر آپ اس بہ سختی کے ساتھ اعتراض کرتے ہیں، اس کو "ترقی اسلام" میں مانع قرار دیتے ہیں، اس کو الزام دیتے ہیں کہ وہ انسان کو ایک لاشۂ بے جان اور بے بس بچہ بنا دیتا ہے، اور تجویز کرتے ہیں کہ مذہب بس اسی قدر ہونا چاہیے جس قدر عیسائیوں (درصل پولوسیوں) نے سمجھا ہے۔ قرآن نے خود قوانین شریعت بنائے ہیں اور ان کو حدود اللہ سے تعبیر کر کے ان کی پابندی کا حکم دیا ہے مگر آپ شریعت کی ان حدوں کو "بیڑیوں" سے تعبیر کرتے ہیں، اور سینٹ پال کی طرح مذہب کی توسیع و ترقی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ ان بیڑیوں کو توڑ ڈالا جائے۔ قرآن کے نزدیک ایمان نجات کی پہلی اور لازمی شرط ہے، اور جو لوگ خدا پر ایمان نہیں رکھتے ان کے متعلق وہ بالفاظ صریح کہتا ہے کہ وہ دوزخ کا ایندھن بنائے جائیں گے خواہ وہ بے شمار ہوں یا تھوڑے، خوش حال ہوں یا بدحال۔ مگر آپ کا حال یہ ہے کہ کافروں اور بت پرستوں کی بے شمار خلقت کو خوش و خرم و خوشحال دیکھ کر آپ کا دل گواہی نہیں دیتا کہ چند سال کے بعد وہ سب دوزخ کا ایندھن بنا دیے جائیں گے اور آپ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے خدا کی زمین کو معمور کر دینے کے سوا اور کون سا قصور کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن سے اتنا کھلا ہوا اختلاف رکھتے ہوئے آپ مسلمان کیسے رہ سکتے ہیں، اور مسلمان ہوتے ہوئے قرآن سے اختلاف کیونکر کر سکتے ہیں؟ اگر آپ مسلمان ہیں تو قرآن سے اختلاف نہ فرمائیے اور اگر قرآن سے اختلاف کرنا چاہتے ہیں تو دائرۂ اسلام سے باہر کھڑے ہو کر اختلاف کیجیے۔

جو شخص کسی مذہب کے اصول اور احکام و قوانین سے مطمئن نہ ہو، جس کا دل ان کی صداقت پر گواہی نہ دیتا ہو، جو ان کی علت و مصلحت کو سمجھنے سے عاجز ہو، اور جس کے نزدیک ان میں سے بعض یا اکثر باتیں قابل اعتراض ہوں، اس کے لیے دو راستے کھلے ہوئے ہیں۔ یا تو وہ اس مذہب سے نکل جائے۔ پھر اس کو حق ہے کہ اس مذہب کے جس قاعدے اور جس حکم پر چاہے نکتہ چینی کرے۔ یا اگر وہ اس عدم اطمینان کے باوجود اس مذہب میں رہنا چاہتا ہے تو اس کے خلاف مناظرہ کرنے سے احتراز کرے، اور مجتہدین کو اس کے قواعد و ضوابط پر تیشہ چلانے کے بجائے طالب علم بن کر

اپنے شکوک و شبہات حل کرنے کی کوشش کرے۔ عقل و دانش کی رو سے تو اس حالت میں یہی دو طریقے معقول ہو سکتے ہیں، اور ہر عاقل جب کبھی ایسی حالت میں مبتلا ہوگا تو انہی میں سے کسی ایک طریقے کو اختیار کرے گا۔ لیکن مقبول گل صاحب اور ان کی طرح بہت سے فرنگی تعلیم و تربیت پائے ہوئے حضرات کا حال یہ ہے کہ پہلا طریقہ اختیار کرنے کی اخلاقی جرأت ان میں نہیں، اور دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہوئے انہیں شرم آتی ہے۔ اس لیے انھوں نے بیچ کا ایک غیر معقول طریقہ اختیار کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک طرف مسلمانوں میں شامل بھی ہوتے ہیں، ترقی اسلام کے آرزومند بھی بنتے ہیں، اسلام اور مسلمانوں کے درد میں تڑپتے بھی ہیں، اور دوسری طرف اسلام کے خلاف وہ سب کچھ کہتے اور کرتے ہیں جو ایک غیر مسلم کہہ اور کر سکتا ہے، حدیث و فقہ تو درکنار قرآن تک پر نکتہ چینی کرنے سے باز نہیں رہتے، اور ان تمام بنیادوں پر ضرب لگا جاتے ہیں جن پر اسلام قائم ہے۔ ان حضرات کو دعویٰ ہے کہ ہم ارباب عقل (RATIONALISTS) ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم کوئی ایسی بات نہیں مان سکتے جو عقل کے خلاف ہو۔ ملاؤں پر ان کا سب سے بڑا الزام یہی ہے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔ مگر خود ان کا حال یہ ہے کہ مذہب کے معاملہ میں صریح تناقض کا ارتکاب کرتے ہیں، متضاد طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں، اور اپنی ایک بات کی تردید خود اپنی ہی دوسری بات سے کر جاتے ہیں۔ آخر یہ ریشنلزم کی کون سی قسم ہے جس کی ایجاد کا شرف ان روشن خیال محققین کو حاصل ہوا ہے؟

اب ذرا ان کی معلومات کی وسعت اور فکر کی گہرائی ملاحظہ فرمائیے :۔

اسلام کی ترقی کے لیے آپ ضروری سمجھتے ہیں کہ مسیحیت کی طرح اسلام سے بھی شرعی حدود اڑا دی جائیں، اور اسلام صرف ایک عقیدہ کی حیثیت میں رہ جائے۔ کیونکہ مسیحیت کی ترقی کا راز جو آپ نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں حرام و حلال کی قیود نہیں ہیں، اخلاقی پابندیاں نہیں ہیں، اس میں آدمی کے "حقوقِ انسانی سلب کر کے اس کو ایک لاشۂ بے جان اور بے بس بچہ" نہیں بنایا گیا ہے، بلکہ اس کو آزادی دی گئی ہے کہ مسیح پر ایمان رکھ کر جو چاہے کرے۔ مگر آپ نے یہ غور نہیں فرمایا کہ اسلام جس چیز کا نام ہے وہ قرآن میں ہے، اور قرآن نے

ایمان و عمل صالح کے مجموعہ کا نام اسلام رکھا ہے، عمل صالح کے لیے قیود مقرر کی ہیں، قوانین بنائے ہیں، اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے ایک مکمل نظام عمل مقرر کیا ہے جس کے بغیر اسلام بحیثیت ایک دین اور ایک تہذیب کے قائم نہیں ہو سکتا۔ اس نظام اور اسکی حدود کو منسوخ کرنے کا اختیار کسی مسلمان کو نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا نسخ قرآن کا نسخ ہے، اور قرآن کا نسخ اسلام کا نسخ ہے، اور جب اسلام خود ہی منسوخ ہو جائے تو اسکی "ترقی" کے کیا معنی؟ آپ خود کسی مذہب ایجاد کر کے اسکی اشاعت فرما سکتے ہیں، مگر جو چیز قرآن کے خلاف ہے اسکو اسلام کے نام سے موسوم کرنے، اور اس کی ترقی کو اسلام کی ترقی کہنے کا آپ کو کیا حق ہے؟

آپ اسلام صرف اس عقیدہ کا نام رکھتے ہیں کہ "ہم آیندہ زندگی میں یا خود اس زندگی میں اپنے اعمال کے جوابدہ ہیں اور ہونگے"۔ یہ بات غالباً آپ نے اس امید پر فرمائی ہے کہ اگر اسلام اس حد میں محدود ہو جائے گا تو بالکل نرم اور آسان ہو جائے گا، اور خوب پھیلتا چلا جائے گا۔ لیکن اگر آپ اس عقیدہ کے معنی پر غور فرماتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ اس حد میں محدود ہونے کے بعد بھی اسلام آپ کی مرضی کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ اس عقیدے کو مذہب قرار دینے کے لیے سب سے پہلے تو حیات اخروی پر ایمان لانا ضروری ہے۔ پھر جوابدہی کا مفہوم تین باتوں کا متقاضی ہے ایک یہ کہ جس کے سامنے جوابدہی کرنی ہے اسکو متعین کیا جائے، اور اسکی بالادستی کو تسلیم کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ جوابدہی کی نوعیت متعین کی جائے اور زندگی کے اعمال میں اس لحاظ سے امتیاز کیا جائے کہ کن اعمال سے اس جوابدہی میں کامیابی نصیب ہوگی اور کون سے اعمال ناکامی کے موجب ہونگے۔ تیسرے یہ کہ جوابدہی میں کامیابی اور ناکامی کے جدا جدا نتائج متعین کئے جائیں، کیونکہ اگر ناکامی کا نتیجہ بھی وہی ہو جو کامیابی کا ہے، یا سرے سے دونوں کا کوئی نتیجہ ہی نہ ہو تو جوابدہی بالکل بے معنی ہے۔ یہ اس عقیدہ کے عقلی لوازم ہیں جس کو آپ اصل دین قرار دے رہے ہیں۔ اگر آپ کی تجویز کے مطابق اسی عقیدہ پر اسلام کو قائم کر دیا جائے تب بھی وہی مصیبت پیش آئے گی جس سے آپ بچنا چاہتے تھے۔ پھر وہی خدا کو ماننا لازم آئے گا جس کے بغیر جا بجا آپ کو ترقی کے بام پر چڑھنا دشوار نظر آیا تھا۔

پھر وہی شریعت کی بیڑیاں اور اخلاق کی حدیں بن جائیں گی جن کو آپ توڑنا چاہتے ہیں اور جن کے وجود میں آپ کے نزدیک اسلام کے ترقی نہ کرنے کا راز پوشیدہ ہے۔ پھر وہی عذاب و ثواب کا جھگڑا نکل آئے گا اور خدا کی بے شمار خلقت کو اس عقیدے کے بغیر خوش و خرم و خوش حال دیکھ کر آپ کا دل پھر اس بات پر گواہی دینے سے انکار کرے گا کہ چند سال بعد یہ سب عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

براہ کرم اب ذرا غور کر کے کسی ایسی چیز کا نام اسلام رکھیے جس میں کسی قسم کی قید و بند نہ ہو، جس کو ماننے اور نہ ماننے کا نتیجہ یکساں ہو، جس میں صرف خدا کی زمین کو معمور کر دینا دنیا و آخرت کی کامیابی کے لیے کافی ہو، اور جس پر ایمان نہ لانے والی بے شمار خلقت کو خوش و خرم و خوش حال دیکھ کر آپ کا دل گواہی دے سکے کہ وہ سب جنت کی بلبلیں بنائی جائیں گی۔"

قرآن کی رو سے سور کے گوشت کا قطعی حرام ہونا آپ کے نزدیک مسلم نہیں ہے۔ آپ شک فرماتے ہیں کہ شاید یہ اہل عرب کے لیے کسی خاص وجہ سے حرام کر دیا گیا ہو۔ لیکن اگر آپ اس رائے کو ظاہر کرنے سے پہلے قرآن کھول کر پڑھ لیتے تو اس شک کی تحقیق ہو جاتی۔ اس کتاب میں صاف لکھا ہوا ہے کہ:-

قُلْ لَّا اَجِدُ فِيْ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (۱۸۱۶)

اے پیغمبر! کہو کہ میری طرف جو وحی بھیجی گئی ہے اس میں کسی چیز کو جسے کھانے والا کھائے، میں حرام نہیں پاتا الّا یہ کہ وہ مردار ہو یا بہا ہوا خون ہو یا سور کا گوشت ہو، کیونکہ وہ بتحقیق ناپاک ہے، یا نافرمانی کے طور پر اللہ کے سوا کسی اور کے نام سے ذبح کیا گیا ہو۔ پھر جو شخص مجبور ہو گیا بغیر اس کے کہ وہ نافرمان اور حد ضرورت سے تجاوز کرنے والا ہو، تو تیرا رب بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت میں سور کے گوشت کو ہر "طاعم" یعنی کھانے والے کے لیے حرام قرار دیا گیا ہے، اور حرمت

کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ "رجس" (ناپاک) ہے۔ کیا یہاں طاعم سے مراد عرب کا طاعم ہے؟ اور کیا ایک ہی چیز عرب کے لیے رجس اور غیر عرب کے لیے طیب و طاہر ہو سکتی ہے؟ اور کیا اسی طریقہ سے آپ مردار کھانے والوں کے لیے بھی ذرا ڈھیل دینا پسند فرمائیں گے؟ آپ سور کے معاملہ میں ڈھیل دینا چاہتے ہیں تو اپنے اختیار سے دیجئے۔ مگر قرآن کے صریح الفاظ کے خلاف آپ کو یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ قرآن سے اس کی قطعی ممانعت مشکوک ہے؟

آج کل کے نئے مجتہدین نے اجتہاد کے جو اصول وضع کیے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسلام کے جس حکم کی خلاف ورزی کرنا چاہتے ہیں اس کے متعلق بلا تکلف کہہ دیتے ہیں کہ یہ حکم خاص اہل عرب کے لیے تھا، خواہ قرآن میں اس تخصیص کی طرف کوئی ادنیٰ سا اشارہ بھی نہ ہو، اور تخصیص کے لیے وہ کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہ رکھتے ہوں۔ اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو بعید نہیں کہ ایک روز قرآن ہی کو اہل عرب کے لیے مخصوص نہ کر دیا جائے۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ سے استدلال اتنا لطیف ہے کہ صاحب سفرنامہ کے علم و فضل کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ غالباً اس آیت کا ترجمہ انھوں نے یہ کیا ہوگا کہ "جب سور کا گوشت کھانے کو بے اختیار جی چاہے تو کھا لو، مگر باغ میں بیٹھ کر کھانا اور نہ اس کی عادت ڈال لینا"۔

سور کے گوشت کے معاملہ میں اہل یورپ اور اہل چین کے لیے ڈھیل دینے کی گنجائش اس آیت سے وہی شخص نکال سکتا ہے جو نہ اضطرار کے معنی جانتا ہو، نہ باغی کا مفہوم سمجھتا ہو اور نہ عاد کا۔ ورنہ جاننے والے کے لیے تو اتنی جرأت کرنا بہت مشکل ہے۔ آیت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ جن لوگوں کو مردار خواری یا خون آشامی کا چسکا لگا ہوا ہو، یا جو لوگ سور کے گوشت پر جان دیتے ہوں، یا جن کے ہاں مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے کھانے کا عام دستور ہو وہ سب مضطرین میں داخل ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو تحریم کا حکم ہی بے معنی ہو جاتا کیونکہ اگر تحریم ان لوگوں کے لیے تھی جو ان چیزوں کے خوگر تھے، تو استثناء سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنی عادت کے مطابق انھیں کھاتے رہتے، اور اگر تحریم ان لوگوں کے لیے تھی جو خود ہی ان سے مجتنب تھے تو ان کے لیے اس حکم کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اضطرار کے ساتھ غیر باغ ولا عاد کی شرط لگا کر جو استثناء کیا گیا ہے اس

مفہوم تو یہ ہے کہ جو شخص بھوک سے مر رہا ہو، اور حرام چیز کے سوا کوئی چیز اس کو نہ ملتی ہو، وہ محض جان بچانے کے لیے حرام چیز کھا سکتا ہے، بشرطیکہ حدِ رخصت سے تجاوز نہ کرے، یعنی جان بچانے کے لیے جتنی مقدار ناگزیر ہو اس سے زیادہ نہ کھائے، اور حدود اللہ کو توڑنے کی اس میں خواہش نہ ہو۔ اس بات کو ایک دوسری جگہ سود اور مردار وغیرہ چیزوں کی تحریم کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح بیان کیا گیا ہے فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ۔ یعنی جو شخص بھوک کی شدت سے مجبور ہو جائے بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف کوئی میلان ہو، وہ اس حالت میں حرام چیز کھا سکتا ہے۔ کہاں یہ بات اور کہاں وہ کہ اہلِ یورپ اور اہلِ چین چونکہ سور کے گوشت پر جان دیتے ہیں لہٰذا فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ سے فائدہ اٹھا کر ان کے لیے سور کو جائز کر دیا جائے، اور وہ بھی اس لیے کہ وہ اسلام میں داخل ہو سکیں۔ اگر اسی طریقہ سے ہر قوم کی رغبتوں اور خواہشوں کا لحاظ کر کے اسلام کے قوانین میں ڈھیل دینے کا سلسلہ شروع ہوا تو شراب، جوا، زنا، سود اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو بھی ایک ایک کر کے حلال کرنا پڑے گا۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ خدا کے احکام کو ماننے اور اس کے قائم کئے ہوئے حدود کی پابندی کرنے اور اس کے حرام کو حرام سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں ان کو اسلام میں داخل کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اسلام ان کا محتاج کب ہے کہ وہ ان کو راضی کرنے کے لیے کم و بیش پر سودا کرے؟

پہلے تو صرف سور کے گوشت کی علتِ حرمت آپ کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ مگر پھر جو آپ نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اصولِ معدہ اور محرکاتِ اخلاق میں بُعدِ بعید ہے، لہٰذا آپ نے یہ رائے قائم فرمائی کہ مذہب کو سرے سے حرام و حلال کا امتیاز ہی قائم کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اس ارشاد سے یہ راز فاش ہو گیا کہ آپ جو کچھ قرآن کے متعلق جانتے ہیں، حکمتِ طبیعی PHYSICAL SCIENCE کے متعلق اس سے کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ قرآن سے ناواقف ہونا تو خیر ایک روشن خیال تعلیم یافتہ آدمی کے لیے شرمناک نہیں ہے، مگر سائنس سے اتنی بے خبری البتہ بہت شرمناک ہے۔ آپ کو اب تک یہ بھی نہیں معلوم ہوا کہ انسان کے نفس اور اس کی ترکیب جسمانی کے درمیان

کیا تعلق ہے، اور اس کی ترکیب جسمانی غذا سے کیا تعلق رکھتی ہے۔ مذہبی نظریہ کی رو سے تو خیر نفس اور جسم دو علیحدہ چیزیں ہیں اور ان کے درمیان صرف تعامل ہوتا ہے، لیکن سائنس تو نفس کو سراسر جسم ہی کی مخصوص ترکیب کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اس لحاظ سے جو چیز جسم کو اس کے اجزائے ترکیبی فراہم کرتی ہے اس کا اثر نفس کے خصائص پر مترتب ہونا بالکل ناقابل انکار ہے۔ جس طرح سور کے نفسانی خصائص میں اسکی ترکیب جسمانی کا یقینی دخل ہے، اسی طرح جسم کے واسطے سے انسان کے نفس پر سور کے گوشت کا اثر پڑنا بھی یقینی ہے۔ اگر آپ غذا کے متعلق سائنس کی جدید ترین تحقیقات کا مطالعہ فرماتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ اخلاق پر غذا کا اثر اب عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے، اور حکماء اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں کہ مختلف قسم کی غذاؤں سے ہمارے اخلاق اور ہماری ذہنی قوتوں پر کیا اثرات پڑتے ہیں۔

مقالات

اسلامی تہذیب اور اُس کے اصول و مبادی

(۱۸)

ایمان

ایمانیات پر مجموعی نظر ایمان کے پانچوں شعبوں پر تفصیل کے ساتھ کلام کیا جا چکا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے متعلق اسلام کا تفصیلی عقیدہ، نقد صحیح کے لحاظ سے اس کا عقلی مرتبہ، انسانی سیرت پر اس کے اثرات، اور تہذیب کی تاسیس و تشکیل میں اس کا حصہ آپ معلوم کر چکے ہیں۔ اب ایک مرتبہ مجموعی حیثیت سے ان سب پر نظر ڈال کر دیکھنا چاہیے کہ یہ ایمانیات مل جل کر کس قسم کی تہذیب پیدا کرتے ہیں۔

اس مضمون کے ابتدائی ابواب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلامی تہذیب کا سنگ بنیاد، حیات دنیا کا یہ تصور ہے کہ انسان کی حیثیت اس کرۂ خاکی میں عام موجودات کی سی نہیں ہے، بلکہ وہ خداوند عالم کی طرف سے یہاں خلیفہ بنا کر اُتارا گیا ہے۔ اس تصور سے، بطور ایک عقلی نتیجہ کے، انسان کی زندگی کا یہ نصب العین قرار پایا کہ وہ اپنے خالق اور اپنے آقا کی خوشنودی حاصل کرے، اور اس نصب العین کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہو گیا کہ

اولاً وہ خدا کی صحیح معرفت حاصل کرے،

ثانیاً، وہ صرف خدا کو آمر اور ناہی، حاکم اور مطاع سمجھے اور اپنے اختیار کو احکام خداوندی کے تابع کر دے،

ثالثاً، وہ ان طریقوں کو معلوم کرے، جن سے خدا کی خوشنودی حاصل ہو سکتی ہے، اور جب وہ طریقے

معلوم ہو جائیں تو انہی کے مطابق زندگی بسر کرے،

رابعاً، وہ خدا کی خوشنودی کے ثمرات اور اس کی ناخوشی کے نتائج سے واقف ہو، تاکہ حیات دنیا کے ناکمل نتائج سے دھوکہ نہ کھائے۔

وہ پانچ عقیدے جن کی تفصیل آپ کو اوپر معلوم ہو چکی ہے، اسی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔

خدا کی ذات و صفات کے متعلق جو کچھ قرآن میں بیان کیا گیا ہے وہ سب اس لیے ہے کہ انسان کو اُس ہستی کی صحیح معرفت حاصل ہو جس کی طرف سے وہ خلیفہ بنا کر زمین پر بھیجا گیا ہے، وہ جس کی خوشنودی حاصل کرنا اس کی زندگی کا نصب العین ہے۔ ملائکہ کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس لیے ہے کہ انسان کائنات کی کارکن طاقتوں میں سے کسی کو کارفرما نہ سمجھ بیٹھے، اور کارفرمائی میں خدا کے سوا کسی کو شریک نہ ٹھیرا دے۔ اس علم صحیح کے بعد خدا پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح تمام کائنات اور خود انسان کی زندگی کے غیر اختیاری شعبے پر خدا کی حکومت ہے، اسی طرح انسان اپنی زندگی کے اختیاری شعبے میں بھی خدا کی حکومت تسلیم کرے، ہر معاملہ میں خدا کو واضع قانون اور اپنے آپ کو صرف متبع قانون سمجھے، اور اپنے اختیارات کو ان حدود کے اندر محدود کر دے جو خدا نے مقرر کیے ہیں۔ یہی ایمان اپنے اندر وہ قوت رکھتا ہے جو انسان کو خدا کی فرماں روائی کے آگے بطوع و رغبت سر تسلیم خم کر دینے کے لیے آمادہ کرتی ہے۔ اس سے ہر مومن کے اندر ایک خاص نوعیت کا ضمیر پیدا ہوتا ہے، اور ایک خاص قسم کی سیرت بنتی ہے جو قانون اور حدود کے مجبورانہ نہیں بلکہ رضاکارانہ اتباع کے لیے ضروری ہے۔

رسالت اور کتاب کا عقیدہ تیسری ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ انہی دونوں کے ذریعہ سے انسان کو اُن قوانین اور اُن طریقوں کا تفصیلی علم حاصل ہوتا ہے جن کو خدا نے انسان کے لیے مقرر کیا ہے۔ اور ان حدود کی شناخت میسر ہوتی ہے جن سے خدا نے انسان کے اختیارات کو محدود فرمایا ہے۔ رسول کی تعلیم کو خدا کی تعلیم، اور اس کی پیش کی ہوئی کتاب کو خدا کی کتاب سمجھنا ہی ایمان بالرسالت اور ایمان بالکتاب ہے اور اس ایمان ہی سے انسان میں یہ قابلیت پیدا ہوتی ہے کہ یقین و اذعان کے ساتھ اُن قوانین اور طریقوں اور حدود کی

پابندی کرے جو خدا نے اپنے رسول اور اپنی کتاب کے واسطے سے اس کو بتائے ہیں۔

آخری ضرورت کو پورا کرنے کے لیے معاد کا علم ہے۔ اس سے انسان کی نظر اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ وہ ظاہر حیات دنیا کے پیچھے ایک دوسرے عالم کو دیکھنے لگتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا کی خوش حالی و بدحالی اور منفعت و مضرت، خدا کی خوشنودی و ناخوشی کا معیار نہیں ہے، اور خدا کی جانب سے اعمال کی جزا و سزا اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ آخری فیصلہ ایک دوسرے عالم میں ہونے والا ہے۔ وہی فیصلہ معتبر ہے، اور اس فیصلے میں کامیابی کا راہ ذریعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں خدا کے قانون کی صحیح پیروی اور اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پوری پابندی کی جائے۔ اسی عقیدے پر جزم و یقین کا نام ایمان بالیوم الآخر ہے اور ایمان باللہ کے بعد یہ دوسری زبردست قوت ہے جو انسان کو قوانین اسلامی کے اتباع پر ابھارتی ہے۔ تہذیب اسلامی کے لیے انسان کو ذہنی اعتبار سے مستعد کرنے میں اس اعتقاد کا بڑا حصہ ہے۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ اساسی اعتقادات انہی خطوط پر تہذیب کی تاسیس و تشکیل کرتے ہیں جو حیات دنیا کے اس مخصوص تصور، اور اس خاص نصب العین نے کھینچ دیے تھے۔ ایسی تہذیب کے لیے عقلاً جس اساسی عقیدہ کی ضرورت ہے، وہ انہی پانچ امور پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ ان کے سوا کسی دوسرے اعتقاد میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ اس مخصوص طرز کی تہذیب کے لیے اساس بن سکے، کیونکہ کوئی دوسرا عقیدہ اس خاص تصور حیات اور نصب العین کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا۔

تہذیب اسلامی کا خاکہ ایمانیات کی جو تفصیلات اوپر بیان ہوئی ہیں، ان پر نظر ڈالنے سے اُس تہذیب کا پورا خاکہ ہمارے سامنے آجاتا ہے جس کی تاسیس ان کے ذریعہ سے کی گئی ہے۔ اس خاکہ کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

(۱) اس تہذیب کا نظام ایک سلطنت کا سا نظام ہے اس میں خدا کی حیثیت عام مذہبی تصور کے لحاظ سے محض ایک "معبود" کی سی نہیں ہے، بلکہ دنیوی تصور کے لحاظ سے وہی حاکم مطلق بھی ہے۔ وہ دراصل اس سلطنت کا شہنشاہ ہے، رسول اس کا نمایندہ ہے، قرآن اس کی کتاب آئین ہے، اور ہر وہ شخص جو اسکے

شہنشاہی کو تسلیم کرکے اس کے نمایندے کی اطاعت اور اسکی کتاب آئین کا اتباع کرنا قبول کرے، اس سلطنت کی رعیت ہے۔ مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس شہنشاہ نے اپنے نمایندے اور اپنی کتاب آئین کے ذریعہ سے جو قوانین مقرر کردیے ہیں ان کو بے چون و چرا تسلیم کیا جائے خواہ ان کی علت و مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ جو شخص خدا کے اس اختیار مطلق اور اس کے قانون کا شخصی یا اجتماعی رائے سے بالاتر ہونا تسلیم نہیں کرتا، اور اس کے فرمان کو ماننے یا نہ ماننے کا حق اپنے لیے محفوظ رکھتا ہے، اس کے لیے اس سلطنت میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(۲) چونکہ اس تہذیب کا اصل مقصد انسان کو آخری کامیابی (یعنی آخرت کے فیصلہ میں خداوند عالم کی خوشنودی سے سرفراز ہونے) کے لیے تیار کرنا ہے، اور اس کامیابی کا حصول اس کے نزدیک موجودہ زندگی میں انسان کے صحیح عمل پر موقوف ہے، اور یہ جاننا کہ آخری نتیجہ کے اعتبار سے کون سا عمل مفید ہے اور کون سا مضر انسان کے بس کا کام نہیں۔ بلکہ وہی خدا اس کو بہتر جانتا ہے جو آخرت میں فیصلہ کرنے والا ہے، اس لیے یہ تہذیب انسان سے مطالبہ کرتی ہے کہ اپنی زندگی کے تمام معاملات میں خدا کے بتائے ہوئے طریقوں کی پیروی کرے اور اپنی آزادی عمل کو شریعت الٰہی کی قیود سے مقید کردے۔ اس طرح یہ تہذیب دین اور دنیا دونوں کی جامع ہے۔ اس کو عام محدود معنوں میں "مذہب" کے لفظ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، بلکہ یہ ایک ایسا وسیع نظام ہے جو انسان کے افکار و خیالات، اس کے شخصی کردار و اخلاق، اس کے انفرادی عمل، اس کے خانگی معاملات، اس کی معاشرت، اس کے تمدن، اس کی سیاست، سب پر حاوی ہے اور ان تمام معاملات میں جو طریقے اور قوانین خدا نے مقرر کیے ہیں ان کے مجموعہ کا نام دین اسلام یا تہذیب اسلامی ہے۔

(۳) یہ تہذیب کوئی قومی یا ملکی یا نسلی تہذیب نہیں ہے، بلکہ صحیح معنوں میں انسانی تہذیب ہے۔ یہ انسان کو بحیثیت انسان کے خطاب کرتی ہے، اور ہر اس شخص کو اپنے دائرے میں لے لیتی ہے جو توحید، رسالت، کتاب اور یوم آخر پر ایمان لائے۔ اس طرح اس تہذیب نے ایک ایسی قومیت بنائی ہے جس میں بلا امتیاز

رنگ ونسل وزبان ہر انسان داخل ہوسکتا ہے، جس کے اندر تمام روئے زمین پر پھیل جانے کی استعداد موجود ہے، اور جو تمام بنی آدم کو ایک نظم ملت میں پیوستہ کر دینے، اور ان سب کو ایک تہذیب کا متبع بنا دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن یہ عالمگیر انسانی برادری قائم کرنے سے اس کا اصل مقصد اپنے متبعین کی مردم شماری بڑھانا نہیں ہے، بلکہ تمام انسانوں کو اس علم صحیح اور عمل صحیح کے فیض میں شریک کرنا ہے جو ان سب کے خدا نے ان سب کی بھلائی کے لیے عطا فرمایا ہے، اس لیے وہ اس برادری میں شامل ہونے کے لیے ایمان کی قید لگا کر صرف ان لوگوں کو چن لینا چاہتی ہے جو خدا کی حکومت مطلقہ کے آگے تسلیم خم کرنے کے لیے آمادہ ہوں، اور ان حدود اور قوانین کی پابندی قبول کریں جو خدا نے اپنے رسول اور اپنی کتاب کے ذریعہ سے مقرر کیے ہیں کیونکہ صرف ایسے ہی لوگ (خواہ وہ کتنے ہی کم ہوں) اس تہذیب کے نظام میں کھپ سکتے ہیں، اور انہی سے ایک صحیح اور مضبوط نظام قائم ہوسکتا ہے۔ منکرین یا منافقین یا ضعیف الایمان لوگوں کا گھس آنا اس نظام کے لیے سبب قوت نہیں بلکہ موجب ضعف ہے۔

(۴) ہمہ گیری اور آفاقیت کے ساتھ اس تہذیب کی نمایاں خصوصیت اس کا زبردست ڈسپلن اور اس کی طاقت ور گرفت ہے جس سے وہ اپنے متبعین کو شخصی و اجتماعی حیثیت سے اپنے آئین کا پابند بناتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قوانین بنانے، اور حدود مقرر کرنے سے پہلے قوانین کا اتباع اور حدود کی پابندی کرانے کا بندوبست کرتی ہے۔ حکم دینے سے پہلے اس کا انتظام کرتی ہے کہ اس کا حکم نافذ ہو۔ وہ سب سے پہلے انسان سے خدا کی فرمانروائی تسلیم کراتی ہے، پھر اس کو یقین دلاتی ہے کہ رسول اور کتاب کے ذریعہ سے جو احکام دیے گئے ہیں وہ خدا کے احکام ہیں، اور ان کی اطاعت عین خدا کی اطاعت ہے، پھر وہ اس کے نفس میں ایک ایسی پولیس متعین کر دیتی ہے جو ہر وقت اور ہر حال میں اس کو احکام کی اطاعت پر ابھارتی، خلاف ورزی پر سرزنش کرتی، اور عذاب یوم عظیم کا خوف دلاتی رہتی ہے۔ اس طرح جب وہ اس قوت نافذہ کو ہر شخص کے نفس و ضمیر میں متمکن کر کے اپنے پیرووں میں یہ صلاحیت پیدا کر دیتی ہے کہ خود اپنی دلی رغبت

سے قوانین کے اتباع اور حدود کی پابندی اور اخلاق حسنہ سے متخلق ہونے کے لیے آمادہ ہوں، تب وہ ان کے سامنے اپنے قوانین پیش کرتی ہے، ان کو احکام دیتی ہے، ان کے لیے حدود مقرر کرتی ہے، ان کے لیے زندگی بسر کرنے کے طریقے وضع کرتی ہے، اور اپنے مصالح کے لیے ان سے سخت سے سخت قربانیوں کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ ایسا طریقہ ہے جس سے زیادہ حکیمانہ طریقہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ اس طریقہ سے اسلامی تہذیب کو جو زبردست نفوذ و اثر حاصل ہوا ہے وہ کسی دوسری تہذیب کو نصیب نہیں ہوا۔

(۵) دنیوی نقطۂ نظر سے اس تہذیب کا اصل مقصد ایک صحیح اجتماعی نظام قائم کرنا اور ایک صالح اور پاکیزہ سوسائٹی کو وجود میں لانا ہے۔ مگر ایسی سوسائٹی کا وجود میں آنا ممکن نہیں ہے جب تک کہ اس کے ہر ہر فرد کو اخلاق فاضلہ و صفات حسنہ سے متصف نہ کردیا جائے، اور اس کے لیے ضروری ہے کہ افراد کے نفوس کا تزکیہ کیا جائے تاکہ وہ ردی اور منتشر افکار کی آماجگاہ نہ رہیں، صحیح اور پاکیزہ خیالات ان میں راسخ ہوجائیں، اور ایک ایسی مضبوط سیرت ان کے اندر پیدا ہوجائے جس سے اعمال صالحہ کا صدور بالطبع ہونے لگے۔ اسلام نے اپنی تہذیب میں اس قاعدہ کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ وہ سوسائٹی کے لیے بہترین افراد مہیا کرنا چاہتا ہے، اور ایسے افراد کی تربیت کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ سب سے پہلے ان میں ایمان کو راسخ کردے، جو ایک اعلیٰ درجہ کی مضبوط سیرت پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ یہی ایمان ہے جس کے ذریعہ سے وہ افراد میں صداقت، امانت، نیک نفسی، احتساب، حق پسندی، ضبط نفس، تنظیم، فیاضی، وسعت نظر، خودداری، انکسار و فروتنی، فراخ حوصلگی، بلند ہمتی، ایثار و قربانی، فرض شناسی، صبر و استقامت، شجاعت و بسالت، قناعت و استغنا، اطاعت امر اور اتباع قانون کے عمدہ اوصاف پیدا کرتا ہے، اور ان کو اس قابل بناتا ہے کہ ان کے اجتماع سے ایک بہترین سوسائٹی وجود میں آئے۔

(۶) اس تہذیب کے ایمانیات میں ایک طرف وہ تمام قوتیں موجود ہیں جو انسان کے اندر اخلاق حسنہ و ملکات فاضلہ پیدا کرنے اور ان کی پرورش اور حفاظت کرنے والی ہیں۔ دوسری طرف ان میں یہ بھی قوت ہے کہ

وہ انسان کو دنیوی ترقی کے لیے ابھارتے ہیں، اس کو اس قابل بناتے ہیں کہ دنیا کے اسباب و وسایل کو بہترین طریقہ پر برتے اور ان تمام قوتوں کو اعتدال کے ساتھ استعمال کرے جو خدا نے اسے عطا کی ہیں، اور اس میں وہ تمام عمدہ صفات پیدا کرتے ہیں جو دنیا میں حقیقی ترقی کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ ان ایمانیات میں انسان کی عملی قوتوں کو منتظم کرنے اور تنظیم کے ساتھ حرکت دینے کی زبردست طاقت موجود ہے، اور اس کے ساتھ ہی ایمانیات یہ طاقت بھی رکھتے ہیں کہ اس حرکت کو حد سے تجاوز نہ کرنے دیں، اور ان راستوں سے منحرف نہ ہونے دیں جن سے ہٹ جانا تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ اس طرح یہ ایمانیات اپنے اندر وہ تمام خوبیاں مع شئی زائد رکھتے ہیں جو مذہبی اور دنیوی ایمانیات میں جدا جدا پائی جاتی ہیں، اور ان تمام خرابیوں سے پاک ہیں جو مختلف مذہبی اور دنیوی ایمانیات میں موجود ہیں۔

تہذیب اسلامی میں ایمان کی اہمیت | یہ اس تہذیب کا ایک مجمل خاکہ ہے جس کو اسلام نے قائم کیا ہے۔ اگر ہم تمثیل کے پیرایہ میں اس کو ایک عمارت فرض کریں، تو یہ ایک ایسی عمارت ہے جس کو مستحکم کرنے کے لیے نہایت گہری نیو کھودی گئی، پھر چھانٹ چھانٹ کر پختہ سے پختہ اینٹیں مہیا کی گئیں، اور ان کو بہترین چونے سے پیوستہ کر دیا گیا، پھر عمارت اس شان کے ساتھ بنائی گئی کہ بلندی میں آسمان تک اٹھتی چلی جائے۔ وسعت میں آفاق پر پھیلتی چلی جائے، مگر اس وسعت و رفعت کے باوجود اس کے ارکان میں ذرا تزلزل واقع نہ ہو، اس کی دیواریں اور اس کے ستون چٹان کی سی مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں۔ اس عمارت کے دروازے اور روشن دان اس طرز پر بنائے گئے ہیں کہ باہر کی روشنی اور صاف ہوا کو بخوبی داخل ہونے دیتے ہیں، مگر گرد و غبار اور خس و خاشاک اور باد و باران کو داخل ہونے سے روک دیتے ہیں۔ یہ تمام خوبیاں جو اس عمارت میں پیدا ہوئی ہیں ایک ہی چیز کی بدولت ہیں، اور وہ ایمان ہے۔ وہی اس کی بنیادیں استوار کرتا ہے، وہی ردی اور ناکارہ مواد کو چھانٹ کر عمدہ مواد اخذ کرتا ہے، وہی مواد خام کو پکا کر پختہ اینٹیں طیار کرتا ہے، پھر یہی وہ مسالہ ہے جو ان اینٹوں کو پیوستہ کر کے ایک بنیان مرصوص بناتا ہے، اسی پر اس عمارت کی وسعت اور رفعت، اور استحکام کا انحصار ہے، یہی

اس کو پھیلاتا بھی ہے، بلند بھی کرتا ہے، مضبوط بھی کرتا ہے، بیرونی مفسدات سے اس کی حفاظت بھی کرتا ہے، اور پاکیزہ چیزوں کو اس میں داخل ہونے کا موقع بھی دیتا ہے۔ پس ایمان اس عمارت کی جان ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو اس کا قائم رہنا کیسا، وجود میں آنا محال ہے۔ اور اگر یہ ضعیف ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عمارت کی بنیادیں کمزور، اس کی اینٹیں بودی، اس کا چونا خراب، اس کے ارکان متزلزل ہیں، اس کے اجزاء میں پیوستگی نہیں، اس میں پھیلنے اور بلند ہونے کی صلاحیت نہیں، اس میں بیرونی مفسدات کو روکنے اور اپنی پاکیزگی و نظافت کو محفوظ رکھنے کی قوت نہیں۔

غرض ایمان کا عدم اسلام کا عدم ہے، ایمان کا ضعف اس کا ضعف ہے، ایمان قوت اس کی قوت ہے۔ پھر چونکہ اسلام محض ایک مذہب ہی نہیں بلکہ اخلاق، تہذیب، معاشرت، تمدن، سیاست سب کچھ ہے اس لیے ایمان کی حیثیت اس نظام میں محض مذہبی عقیدہ ہی کی نہیں بلکہ اسی پر افراد کے اخلاق اور ان کی سیرت کا بھی انحصار ہے، وہی ان کے معاملات کی درستی کا بھی ذمہ دار ہے، وہی ان کو جوڑ کر ایک قوم بھی بناتا ہے، وہی ان کی قومیت اور ان کی تہذیب کی محافظت بھی کرتا ہے، وہی ان کے تمدن، ان کی معاشرت، اور ان کی سیاست کا مایۂ خمیر بھی ہے۔ ایمان کے بغیر اسلام نہ صرف ایک مذہب کی حیثیت سے قائم نہیں ہو سکتا، بلکہ بحیثیت ایک تہذیب اور تمدن اور نظام سیاسی کے بھی قائم نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ایمان ضعیف ہو تو یہ محض مذہبی عقیدہ کا ضعف نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے اخلاق خراب ہو جائیں، ان کی سیرتیں کمزور ہو جائیں، ان کے معاملات بگڑ جائیں، ان کی معاشرت اور ان کے تمدن کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ ان کے درمیان قومیت کا رشتہ ٹوٹ جائے، اور وہ ایک آزاد اور باعزت اور طاقتور قوم کی حیثیت سے زندہ نہ رہ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ایمان ہی پر اسلام و کفر کا مدار رکھا گیا ہے اور وہی نظام اسلامی میں داخل ہونے کی اولین شرط ہے۔ سب سے پہلے انسان کے سامنے ایمان ہی پیش کیا جاتا ہے۔ اگر اس نے ایمان کو قبول کر لیا تو امت مسلمہ میں داخل ہو گیا، مسلمانوں کی معاشرت، تمدن، سیاست سب میں برابر کا شریک ہو گیا اور تمام احکام، حدود اور قوانین اس سے متعلق ہو گئے۔ لیکن اگر اس نے ایمان کو قبول نہیں کیا تو دائرہ اسلامی

میں کسی حیثیت سے داخل نہیں ہو سکتا۔ اسلام کا کوئی حکم اور کوئی قانون اس پر نافذ نہ ہوگا، اور مسلمانوں کی جماعت میں وہ کسی طرح شریک نہ ہو سکے گا، کیونکہ اس نظام میں اسکی کھپت قطعاً محال ہے، اور اس کے قوانین وحدود کی پابندی وہ کر ہی نہیں سکتا۔

نفاق کا خطرہ جو لوگ دعوت ایمان کو علانیہ دو کر دیں۔ ان کا معاملہ تو صاف ہے۔ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان کفر و ایمان کی سرحد اتنی واضح اور نمایاں ہے کہ وہ دائرۂ اسلامی میں داخل ہو کر کوئی خلل برپا نہیں کر سکتے۔ مگر وہ لوگ جو مومن نہیں ہیں اور ایمان کا اظہار کر کے مسلمانوں کی جماعت میں گھس جاتے ہیں، اور وہ جن کے دلوں میں شک کی بیماری ہے، اور وہ جو ضعیف الایمان ہیں، ان کا وجود نظام اسلامی کے لیے نہایت خطرناک ہے، کیونکہ وہ اسلام کے دائرے میں تو داخل ہو جاتے ہیں، مگر اسلامی اخلاق اور اسلامی سیرت اختیار نہیں کرتے، اسلامی قوانین کا اتباع اور حدود الٰہی کی پابندی نہیں کرتے، اپنے خراب اخلاق و اعمال سے مسلمانوں کے تمدن و تہذیب کو خراب کر دیتے ہیں، اپنے دلوں کے کھوٹ سے مسلمانوں کی قومیت اور سیاسی حرمت کی جڑیں کھوکھلی کر دیتے ہیں، اور ہر اس فتنے کے اٹھانے اور بھڑکانے میں حصہ لیتے ہیں جو اسلام کے خلاف اندر یا باہر سے برپا ہوتا ہے قرآن مجید میں ایسے لوگوں کو "منافق" کہا گیا ہے، اور وہ تمام خطرات ایک ایک کر کے بیان کیے گئے ہیں، جو اسلامی جماعت میں ان کے داخل ہو جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔

ان کی صفت یہ ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر حقیقت میں مومن نہیں ہوتے:-

مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (۲ : ۲)

جو کہتا ہے کہ ہم اللہ اور یوم آخر پر ایمان لائے، حالانکہ وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

وہ مسلمانوں سے مسلمانوں کی سی باتیں کرتے ہیں اور کافروں سے کفار کی سی:-

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ (۲ : ۲)

جب وہ ایمان لانے والوں سے ملے تو کہا کہ ہم ایمان لے آئے۔ اور جب اپنے شیاطین کے پاس گئے تو بولے کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔

(۲) آیات الٰہی کا مذاق اڑاتے اور ان میں شکوک کا اظہار کرتے ہیں :-

اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ یُکْفَرُ بِھَا وَیُسْتَھْزَأُ بِھَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَھُمْ (۴ : ۲)	جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا انکار کیا جاتا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے تو انکے ساتھ نہ بیٹھو۔

وہ مذہبی فرائض سے جی چراتے ہیں، اگر ادا کرتے بھی ہیں تو مجبوراً محض مسلمانوں کو دکھانے کے لیے ورنہ حقیقۃً ان کے دل احکام الٰہی کی اطاعت سے منحرف ہوتے ہیں :-

وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَاۗءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ (۴ : ۲۱)	اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو با دل ناخواستہ کھڑے ہوتے ہیں محض لوگوں کو دکھاتے ہیں، خدا کو یاد نہیں کرتے، اور اگر کرتے بھی ہیں تو کم۔ وہ بیچ میں مذبذب ہیں، نہ پورے ادھر ہیں نہ پورے ادھر۔
وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ (۹ : ۷)	وہ نماز کے لیے نہیں آتے مگر با دل ناخواستہ اور راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے مگر کراہت کے ساتھ۔
وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا (۹ : ۱۲)	اعراب میں سے بعض ایسے ہیں کہ جو کچھ راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں اسکو زبردستی کا جرمانہ سمجھتے ہیں۔

وہ اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں مگر اسلامی قوانین کا اتباع نہیں کرتے بلکہ اپنے معاملات میں کفار کے قوانین کی پیروی کرتے ہیں :-

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ (۴ : ۹)	کیا تو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے اس کتاب پر جو تیری طرف اتاری گئی ہے اور ان پر جو تجھ سے پہلے اتاری گئی تھیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات شیطانی حاکم کے پاس لے جائیں حالانکہ ان کو حکم دیا جا چکا ہے کہ اس کا حکم نہ مانیں۔

ان کے اعمال خود خراب ہوتے ہیں اور وہ مسلمانوں کے عقائد و اعمال بھی خراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں:۔

يَأْمُرُونَ بِالْمُنكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ (۹: ۹)

وہ برائی کا حکم دیتے اور بھلائی سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھ نیک کاموں سے کھینچے رہتے ہیں وہ خدا کو بھول گئے اسلیے خدا نے بھی انکو بھلا دیا

وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً (۴: ۱۲)

وہ چاہتے ہیں کاش تم بھی کفر کرو جیسا انھوں نے کفر کیا تاکہ تم اور وہ برابر ہو جائیں۔

وہ مسلمانوں کے ساتھ اسی وقت تک ہیں جب تک ان کا فائدہ ہے۔ جہاں فائدہ گم ہوا اور انھوں نے قوم کا ساتھ چھوڑا

وَمِنْهُم مَّن يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِن لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ

انمیں سے بعض صدقات کی تقسیم میں تجھ پر طعنہ زنی کرتے ہیں اگر انکو صدقات سے دیا گیا تو خوش ہو گئے اور اگر نہ دیا گیا تو بگڑ گئے

جب اسلام اور مسلمانوں پر مصیبت کا وقت آتا ہے تو وہ جنگ سے انکار کر دیتے ہیں کیونکہ حقیقت میں تو انکو اسلام سے محبت ہی نہیں ہے کہ اسکے لیے کوئی قربانی کریں، نہ وہ اس قربانی پر کسی اجر کے قائل ہوتے ہیں نہ انکو اسلام کی حقانیت کا یقین ہوتا ہے کہ اسکی تائید میں جانیں لڑانے پر آمادہ ہوں۔ وہ طرح طرح سے اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے ہیں، اور اگر جنگ میں شریک بھی ہوتے ہیں تو بادل ناخواستہ بلکہ انکی شرکت مسلمانوں کے لیے قوت کے بجائے ضعف کا سبب بن جاتی ہے۔ انکی اس کیفیت کو سورۂ آل عمران رکوع ۱۲ - ۱۷، سورۂ نساء رکوع ۱۰ - ۱۱ - ۱۲ - ۲۰، سورۂ توبہ رکوع ۷ - ۱۱ - ۱۲ اور سورۂ احزاب رکوع ۲ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

انکی سب سے زیادہ خطرناک صفت یہ ہے کہ جب مسلمانوں پر مصیبت آتی ہے تو کفار سے مل جاتے ہیں ان کو خبریں پہونچاتے ہیں ان سے ہمدردی کرتے ہیں، مسلمانوں کی مصیبت پر خوش ہوتے ہیں، اپنی قوم سے غداری کرکے کفار سے اعزاز اور مناصب حاصل کرتے ہیں، ہر فتنہ جو اسلام کے خلاف اٹھتا ہے اسمیں سب سے آگے بڑھ کر حصہ لیتے ہیں، اور مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ ڈالنے کے لیے سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ ان صفات کو بھی آل عمران، نساء، توبہ، احزاب، اور منافقون میں مفصلاً بیان کیا گیا ہے۔

اس سے اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نظام اسلامی کے قیام و بقاء و استحکام کے لیے صحیح اور خالص ایمان ناگزیر ہے۔ ایمان کی کمزوری اس نظام کو جڑ سے لیکر آخری شاخ تک کھوکھلا کر دیتی ہے اور اسکے خطرناک اثرات سے اخلاق، معاشرت، تمدن، تہذیب، سیاست کوئی چیز نہیں بچ سکتی۔

کتب سماوی پر ایک نظر

(۹)

عہد جدید (اناجیل وغیرہم)

(از جناب دوتی شاہ صاحب)

عقیدۂ تثلیث کے اسباب اور اُن پر ناقدانہ نظر

کتب عہد جدید کے تعلیم تثلیث سے معرا ہونے کی بابت پہلے بحث کی جا چکی ہے۔ آیئے اب عیسائی علماء کے اقوال پر نظر ڈالکر یہ معلوم کریں کہ ان لوگوں کو الوہیت مسیح کا مغالطہ کن اسباب سے ہوا اور وہ اسباب معقول پسند نگاہوں میں کیا وقعت رکھتے ہیں۔

اگر مغالطہ کا باعث یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام روح القدس کے وسیلہ سے پیدا ہوئے (متی ۱: ۱۸) تو حضرت سارہ اور حضرت ربقہ دونوں بانجھ تھیں اور قوائے انسانی کے ذریعہ توالد و تناسل کی امید دونوں سے مفقود ہو چکی تھی۔ صرف خدا کے حکم سے اسحٰق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام پیدا ہوئے (پیدائش ۸۱: ۱۱-۲۵، ۲۱) حضرت یحییٰ کے پیدا ہونے کی بھی یہی شان ہے (لوقا ۱)

بظلی ایل بن اوری کو بھی خدا روح اللہ فرما چکا ہے (خروج ۳۱: ۲ و ۳) پھر عیسیٰ علیہ السلام کے لیے اس معاملہ میں کیا خصوصیت رہی؟

اگر مغالطہ کا باعث یہ ہے کہ مسیح بے باپ کے پیدا ہوئے تو ثبوت الوہیت کے لیے یہ بات کافی نہیں اگر ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا الوہیت کے منافی نہیں تو ماں اور باپ دونوں سے پیدا ہونا بھی الوہیت کے منافی نہیں ہو سکتا۔ عیسائی علماء، حضرت عیسیٰ کو پورا خدا بھی کہتے ہیں اور پورا انسان بھی۔ لیکن از روئے عقل وہ پورے

انسان اسی صورت میں ہو سکتے ہیں جبکہ اوصاف انسانی سے پورے طور پر متصف ہوں اور ماں اور باپ دونوں سے پیدا ہوئے ہوں علاوہ بریں عیسائی عقیدہ کے مطابق پورے انسان کے لیے ضروری ہے کہ سب انسانوں کی طرح وہ بھی گنہگار ہو (رومیوں ۳: ۹ تا ۱۲) اگر مسیح پورے انسان نہ تھے جو کہ ایک آسان تر کام ہے تو وہ پورے خدا کیسے ہو سکتے تھے جو کہ مشکل تر کام ہے، پھر یہ بھی غور طلب مسئلہ ہے کہ جب مسیح کے بے باپ کے پیدا ہونے پر الوہیت کا ان پر گمان ہو سکتا ہے تو آدم علیہ السلام پر یہ گمان کیوں نہ ہوا جو کہ بے ماں اور بے باپ کے پیدا ہوئے اور جنہیں خدا نے اپنی صورت پر پیدا کیا (پیدائش ۱: ۲۷) حوا علیہا السلام کا پیدا ہونا بھی کچھ کم تعجب خیز نہیں کیونکہ وہ بغیر ماں کے پیدا ہوئیں۔ ملک صدق کا حال بھی عجیب و غریب ہے جو توریت اور انجیل دونوں میں موجود ہے۔ عبرانیوں کے باب ۷، آیہ ۳ میں ہے کہ

"یہ (یعنی ملک صدق) بے باپ بے ماں، بے نسب نامہ جس کے نہ دنوں کا شروع نہ زندگی کا آخر مگر خدا کے بیٹے سے مشابہ ٹھہر کے ہمیشہ کاہن رہتا ہے"

توریت میں (پیدائش ۱۴: ۱۸ تا ۲۰) اور زبور (۱۱۰: ۴) میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ علمائے اہل کتاب کے بیانات اسکے احوال میں بہت مختلف ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ ایک فرشتہ تھا اور بعض کہتے ہیں کہ وہ خود مسیح ہی تھا جو اسوقت بھی ظاہر ہوا۔ مگر یہ دونوں گمان غلط ہیں کیونکہ اگر وہ فرشتہ ہوتا تو کہانت سے اوسکو کیا تعلق اور خود اپنی ذات سے مسیح ہوتا تو مسیح کے مشابہ یا مسیح کے مانند ہونے کے کیا معنی؟ علمائے یہود کہتے ہیں کہ وہ نوح علیہ السلام کا دوسرا بیٹا سام تھا مگر عبرانیوں کے خط کی رو سے یہ بھی غلط ہے کیونکہ اس خط میں تو ملک صدق کا بے باپ بے ماں اور بے نسب نامہ کے ہونا لکھا ہے مگر سام کے باپ کا نام نوح تھا اور اس کا نسب نامہ توریت میں درج ہے۔ بہرحال ملک صدق فرشتہ نہ تھا بلکہ ایک انسان تھا اور بقول انجیل کے اوس کے نہ باپ تھا نہ ماں نہ نسب نامہ حالانکہ عیسیٰ علیہ السلام کے ماں تھیں اور آپ کا نسب نامہ اناجیل میں دو موقعوں پر درج ہے۔

اگر مغالطہ کا باعث یہ ہے کہ انجیل میں جابجا عیسیٰ علیہ السلام کے لیے خدا کا لفظ آیا ہے تو اول تو اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ جہاں یہ لفظ آیا ہے وہاں اصلی عبرانی یا یونانی قدیم نسخوں میں بھی اسی طرح وارد ہوا ہے چنانچہ

اول **مقطاؤس** باب ۳ آیہ ۱۶ میں یہ وارد ہوا ہے کہ "خدا جسم میں ظاہر کیا گیا" اس کے متعلق گریسباخ کی تحقیقات یہ ہے کہ اس آیت میں لفظ "خدا" کی جگہ "وہ" کا لفظ اصلی نسخوں میں ہے یعنی یوں ہونا چاہیئے کہ "وہ کہ جسم میں ظاہر کیا گیا" جس طرح یہاں کسی خدا ترس نے "خدا" کا لفظ الحاق کر دیا اسی طرح دوسرے مقامات پر بھی الحاق واقع ہوا ہو تو اب کوئی کیسے جان سکتا ہے۔ دوسرے یہ امر بھی قابل غور ہے کہ عبرانی محاورہ میں اس زمانہ میں قاضیوں اور مفتیوں کو بھی خدا کہتے تھے۔ اسکاٹ صاحب بھی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ کلام الٰہی میں مجسٹریٹ خدا کہلاتے تھے اور یہ لقب انھیں اس لیے دیا گیا تھا کہ وہ لوگوں میں خدا کے نائب تھے چنانچہ کتب مقدسہ قدیم و جدید میں خدا کے لقب سے بندے متعدد جگہ مخاطب کئے گئے ہیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

"خدا کی جماعت میں خدا کھڑا ہے انہوں کے درمیان وہ عدالت کرتا ہے" (زبور ۸۲:۱)

"میں نے تو کہا کہ تم سب الٰہ ہو اور تم سب حق تعالیٰ کے فرزند ہو" (زبور ۸۲:۶)

"میں نے تو کہا تم سب خدا ہو" (یوحنا ۱۰:۳۴)

"جبکہ اس نے انہیں جن کے پاس خدا کا کلام آیا خدا کہا" (یوحنا ۱۰:۳۵)

"پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا دیکھ میں نے تجھے فرعون کے لیے خدا سا بنایا اور تیرا بھائی ہارون تیرا پیغمبر ہوگا" (خروج ۷:۱)

"اور تو (اے موسیٰ) اُس کے لیے (یعنی ہارون کے لیے) خدا کی جگہ ہوگا" (خروج ۴:۱۶)

"سارہ ابراہام کی فرمانبرداری کرتی اور اسے خداوند کہتی تھی" (۱۔ پطرس ۳:۶)

یوسف علیہ السلام نے اپنی بابت فرمایا کہ :۔

"خدا نے مجھ کو سارے مصر کا خداوند کیا" (پیدائش ۴۵:۹)

ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ توریت و انجیل میں "خدا" اور "خداوند" کے الفاظ عبد اور معبود دونوں کے

حق میں استعمال ہوئے ہیں اور یہ الفاظ صرف عیسیٰ علیہ السلام ہی کے لئے مخصوص نہ تھے بلکہ دیگر بندگان خدا کے حق میں بھی استعمال ہوئے ہیں اور ان الفاظ کے استعمال سے اُن لوگوں کی عبدیت میں فرق نہیں آتا اور اُن میں الوہیت ثابت نہیں ہوتی۔

اگر اس مغالطہ کا باعث یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے کو خدا کا بیٹا کہا ہے (یوحنا ۱۰: ۳۶، متی ۲۷: ۴۳) تو انجیل میں ساٹھ (۶۰) مقامات پر آپ اپنے کو ابن آدم بھی فرما چکے ہیں۔ جبکہ انجیلی اصطلاح میں (جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے) ہر شخص خدا ہے تو ہر انسان کا بیٹا بھی اس اصطلاح کے مطابق خدا کا بیٹا قرار پانا چاہئے۔ غالباً عیسیٰ علیہ السلام کو یہ اندیشہ پیدا ہوا ہوگا کہ لوگ آپ کو بجائے خدا کا اصطلاحی بیٹا ہونے کے حقیقی بیٹا نہ سمجھنے لگیں اس لیے آپ نے اپنے آپ کو بار بار ابن آدم کہا تاکہ لوگ متنبہ رہیں اور آپ کو الوہیت سے متصف نہ کرنے لگیں۔ بائبل میں جہاں عام طور پر لوگوں کو خدا کا بیٹا کہا گیا ہے وہاں خاص خاص بندوں کے لیے بھی یہ پیار کا خطاب خاص طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ایوب (۱: ۶ اور ۲: ۱) کی تفسیر میں اسکاٹ صاحب لکھتے ہیں کہ یہاں "خدا کے بیٹوں" سے مراد پاک فرشتے ہیں۔ اور ایوب (۳۸: ۷) کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ مفسرین کے نزدیک یہاں "خدا کے بیٹوں" سے مراد انبیاء ہیں۔ عبرانیوں کے خط (۱: ۶) میں آدم علیہ السلام کو "خدا کا پہلوٹھا" بیان کیا گیا ہے۔ لوقا کے باب ۳ میں جو نسب نامہ درج ہے اس کے آخر میں جہاں آدم کا نام آیا ہے وہاں آدم علیہ السلام کو خدا کا بیٹا لکھا ہے۔ پیدائش (۶: ۲) میں آدم علیہ السلام کے بیٹوں کو خدا کے بیٹے کہا گیا ہے۔ گلتیون کے خط (۴: ۲۸) میں اسحٰق علیہ السلام "وعدے کے فرزند" بیان کئے گئے ہیں۔ خروج (۴: ۲۲) کی رو سے اسرائیل خدا کا پہلوٹھا اور پیارا بیٹا ہے۔ یرمیاہ (۳۱: ۹ و ۲۰) کے مطابق افرائیم خدا کا پہلوٹھا اور پیارا بیٹا ہے۔ زبور (۸۹: ۲۶ تا ۲۷) میں حضرت داؤد علیہ السلام کو بھی خدا کا بڑا بیٹا کہا گیا ہے۔ اول تواریخ (۲۲: ۱۰ اور ۲۸: ۶) اور ۲ سموئیل (۷: ۱۴) کی رو سے سلیمان علیہ السلام خدا کے فرزند ہیں۔ استثناء (۱۴: ۱) اور رومیوں کے خط (۹: ۴) کے بموجب جملہ اسرائیلی فرزندان خدا ہیں۔ رومیوں کے خط (۸: ۱۴) کی سند پر جملہ عیسائی فرزندان الٰہی ہیں۔ متی (۵: ۹ و ۴۵ اور

۷ : ۱۱) میں ہر خاص و عام کو خدا کا فرزند قرار دیا گیا ہے ۔ اور یسعیاہ (۳۰ : ۱) کی عبارت گنہگار لوگوں کو بھی خدا کا فرزند ظاہر کرتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ ایسی فرزندی سے الوہیت کو کیا تعلق ہو سکتا ہے عیسیٰ علیہ السلام کے ابو ابنیت کا خطاب مختص نہ تھا اور اس سے آپکی الوہیت ثابت نہیں ہوتی ۔

اگر اس مغالطہ کا باعث یہ ہے کہ یسوع کے لفظی معنی نجات دہندہ کے ہیں تو موسیٰ علیہ السلام کے جانشین حضرت یشوع علیہ السلام کے نام کے بھی یہی معنی ہیں اور حضرت یسعیاہ کے نام کے معنی خدا کی نجات کے ہیں تو گویا معنی کے لحاظ سے اس نام میں بھی کوئی خصوصیت نہ رہی ۔

اگر مغالطہ کا باعث یہ ہے کہ آپ کا شفیع ہونا دلیل الوہیت سمجھ لیا گیا ہے تو زبور (۹۹ : ۶) اور یرمیاہ (۱۵ : ۱) میں حضرت موسیٰ اور حضرت سموئیل کو اور حزقی ایل (۱۴ : ۲۰) میں حضرت نوح حضرت دانیال اور حضرت ایوب کو بھی شفیع کہا گیا ہے ۔ اور پیدایش (۱۸ : ۲۳ تا ۳۳) میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھی شفاعت کرنے کا ذکر موجود ہے ۔

اگر الوہیت مسیح کا گمان اس امر پر مبنی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے مردے زندہ کر دیئے تو بائیبل ہی میں اول سلاطین (۱۷ : ۲۲) میں ملاحظہ فرما لیجئے کہ حضرت الیاس نے بھی ایک مردہ لڑکے کو زندہ کر دیا تھا دوم سلاطین کے باب ۴ میں حضرت الیشع کا یہ عجیب و غریب واقعہ درج ہے کہ آپ نے ایک عورت سے جس کا شوہر بوڑھا تھا فرمایا کہ تو اسی وقت سے حساب شمار کرنا شروع کر دے اور جب دن پورے ہو جائیں گے تو ایک بیٹا تو گود میں لے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ اس معجزۂ عجیبہ کی برکت سے وہ عورت اپنے بوڑھے شوہر کے پاس گئی بھی نہ تھی کہ حمل شروع ہو گیا اس لڑکے کا شمار بھی ان ہی لڑکوں میں کرنا چاہیئے جو بے باپ کے پیدا ہوئے پھر جب جوان ہو کر یہ لڑکا مر گیا تو حضرت الیشع نے اسے زندہ بھی کر دیا ۔ اسی کتاب یعنی دوم سلاطین کے ابواب ۴ و ۵ و ۶ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ الیشع علیہ السلام نے اور بھی عجیب و غریب معجزات کا اظہار فرمایا مثلاً بیس جَو کی روٹیوں اور ایک ٹوکری بھر اناج کی بالوں سے سَو انبیا زادوں کو پیٹ بھر کے کھانا کھلا دیا اور بچ رہا

ایک مبروص کو برص کی بیماری سے صحت دیدی۔ ایک تندرست شخص کو مبروص بنا دیا۔ لوہے کو پانی پر تیرا دیا۔ عیسیٰ علیہ السلام نے تو اپنی اس دنیا ہی کی زندگی میں مردوں کو زندہ کیا تھا مگر دوم سلاطین (۱۳ : ۲۱) کے بموجب حضرت الیشع کی مدفون لاش اور مردہ ہڈیوں نے ایک مردہ کو زندہ کر دیا۔ اعمال (۹ : ۳۶ تا ۴۳) میں درج ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے حواری پطرس نے بھی ایک مردہ عورت کو جس کا نام تابیتھا تھا۔ زندہ کر دیا۔ اعمال (۲۰ : ۹ تا ۱۲) میں ایک واقعہ درج ہے کہ ایک لڑکا کوٹھے پر سے گر کے مر گیا تھا جس کا نام یوتخس تھا۔ اسے پولوس نے زندہ کر دیا۔ جب بائیبل ہی نے مُردوں کے زندہ کرنے کا سہرا اتنے بہت سے سروں پر باندھ دیا تو یہ صفت کسی کے لیے الوہیت کی دلیل کیسے ہو سکتی ہے۔ عیسائیوں کا کہنا ہے کہ مسیح نے جو معجزے دکھلائے وہ اپنی قدرت سے دکھلائے اور دوسرے نبیوں نے جو معجزے دکھلائے وہ مسیح کی طرح یعنی مسیح کی بخشی ہوئی قدرت سے دکھلائے مگر یہ لوگ اپنے اس قول کی تائید میں کوئی معقول دلیل پیش نہیں کرتے۔ یہ صرف اُن کا خیال ہی خیال ہے اور موجودہ محرف شدہ بائیبل میں بھی اُن کے اِس خیال کی تائید میں ایک لفظ تک نہیں ملتا۔ نبیوں کے ہاتھ پر اللہ کی قدرت سے معجزات کا ظہور ہوتا رہتا ہے مگر اظہار معجزہ اظہار نبوت کے لیے لازمی نہیں۔ جب معجزات دلیل نبوت نہیں تو دلیل الوہیت کیونکر ہو سکتے ہیں؟

اگر اس مغالطہ الوہیت کا باعث یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح کہتے ہیں تو اس معاملہ میں بھی آپ تنہا نہیں۔ کیونکہ توریت کے بکثرت مقامات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر نبی اور بنی اسرائیل کا ہر بادشاہ اور کاہن کا سردار ممسوح ہوتا تھا اور مسح کیا جاتا تھا۔ چنانچہ دوم سموئیل (۱ : ۱۴) میں ساؤل کو مسیح کہا گیا۔ اول سموئیل (۱۶ : ۱۳) اور دوم سموئیل (۲۳ : ۱) میں داؤد علیہ السلام کو مسیح لکھا گیا۔ یسعیاہ (۴۵ : ۱) میں کیخسرو بادشاہ فارس کو خدا کا مسیح بیان کیا گیا۔ حضرت یسعیاہ نبی نے اپنی کتاب (۶۱ : ۱) میں خود اپنی بابت تحریر فرمایا ہے کہ "خدا نے مجھے مسیح کیا"۔ دوم سلاطین (۹ : ۱ تا ۶) میں یاہو کو اور (۲۳ : ۳۰) میں یہواخز کو مسیح لکھا گیا۔ دوم قرنتیوں کے خط (۱ : ۲۱) میں حضرت پولوس بھی اپنی شان میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"جس نے ہم کو ممسوح کیا سو خدا ہے"

اگر مغالطہ کا باعث یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ اٹھا لیے گئے تو پیدائش (۵ : ۲۴) سے حنوک کا اور دوم سلاطین (۲ : ۱۱) سے حضرت الیاس کا آسمان پر زندہ اٹھا لیا جانا بھی ثابت ہے۔ "قرنتیون کے دوسرے خط (۱۲ : ۲ تا ۴) میں پولوس بھی تیسرے آسمان تک اور فردوس بریں تک اپنی اسی دنیا کی زندگی میں پہونچایا جانا بیان فرماتے ہیں۔ رومن کیتھولک فرقہ کے نزدیک حضرت مریم بھی آسمان پر اٹھائی گئیں۔ یہ لوگ حضرت مریم سے بھی دعائیں مانگتے ہیں اور انہیں بہشت کی ملکہ کہتے ہیں۔

عیسائی یہ بھی کہتے ہیں کہ جب زبدی کے بیٹوں کی ماں نے عیسیٰ علیہ السلام کو سجدہ کیا (متی ۲۰ : ۲۰) تو آپ نے اُسے سجدہ کرنے سے منع نہ فرمایا اور یہ آپ کی الوہیت کی دلیل ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ انجیلی محاورہ میں سجدہ سے اکثر خوشامد یا فرمانبرداری مراد ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں مکاشفات (۳ : ۷ تا ۹) میں آیا ہے کہ یہودی فلادلفیا کے کلیسہ کے پادریوں کے پاؤں پر آکر سجدہ کریں گے۔ جب اس سجدہ سے پادریوں میں الوہیت ثابت نہیں ہوتی تو زبدی کے بیٹوں کی ماں کے سجدہ کرنے سے مسیح کی الوہیت کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟ بنت سبع نے داؤد علیہ السلام کو سجدہ کیا (اول سلاطین ۱ : ۱۶) ساؤل کے پوتے مفیبوست نے داؤد علیہ السلام کو سجدہ کیا (۲ سموائیل ۹ : ۶ و ۸) کوشی نے داؤد علیہ السلام کے سپہ سالار یوآب کو سجدہ کیا (۲ سموائیل ۱۸ : ۲۱) اخیمعص نے بادشاہ داؤد کے آگے سجدہ کیا (۲ سموائیل ۱۸ : ۲۸) شاہ بنوکد نضر یعنی بخت نصر اوندھے منہ گرا اور دانیال کے آگے اس نے سجدہ کیا (دانیال ۲ : ۴۶) روت جو کہ مسیح کی پردادیوں میں سے تھیں بوعز کے سامنے زمین پر سجدہ میں گریں (روت ۲ : ۱۰) بائبل میں اس قسم کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ کیا یہ سب لوگ جن کے آگے سجدے ہوئے مستحق الوہیت ہو گئے؟۔ ایک اور مثال سن لیجئے جہاں ایسے شخص کے آگے سجدہ کرایا جاتا ہے جو بت پرست تھا اور خدا سے ناواقف تھا۔ ایسے شخص کے متعلق الوہیت کا گمان کسی صورت سے ہو ہی نہیں سکتا۔ کورس بادشاہ یعنی کیخسرو کی بابت یسعیاہ (۴۵ : ۴) میں خدا فرماتا ہے کہ تو مجھ کو

نہیں جانتا۔ پھر اگلی آیت میں فرماتا ہے کہ میں نے تیری کمر باندھی اگرچہ تو نے مجھے نہ پہچانا۔ اسی کورس یعنی کیخسرو سے یسعیاہ کے باب ۴۵ ہی کی آیہ ۱۴ میں یہ خطاب ہوتا ہے کہ :-

"خداوند یوں فرماتا ہے کہ مصر کی دولت اور کوش کا منافع اور سبا کے قد آور لوگ تیرے پاس آویں گے اور تیرے ہوویں گے اور تیری پیروی کریں گے۔ وے بیڑیاں پہنے ہوئے اپنا ملک چھوڑ کے آویں گے اور تیرے آگے سجدہ کریں گے وے تیرے آگے منت کرینگے"

صاف ظاہر ہے کہ یہاں سجدہ سے مراد منت و خوشامد ہے۔ عبرانی انداز بیان اسی طور پر واقع ہوا ہے کہ ایک ہی مضمون کو دو مختلف طور پر بیان کیا جاتا ہے حالانکہ مقصد دونوں بیانوں کا ایک ہی ہوتا ہے۔ مثلاً اقتباس بالا میں "تیرے آگے سجدہ کریں گے وے تیرے آگے منت کریں گے"۔ یہاں عبرانی محاورہ کے مطابق سجدہ کرنے اور منت کرنے کے ایک ہی معنی ہیں اس طرح سے یہاں سجدہ کے معنی کو سمجھایا ہے۔

بعض عیسائی علماء کی جسارت آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ اب ذرا مسیح علیہ السلام کے انکسار و عبدیت کی بھی سیر کیجئے۔ آپ فرماتے ہیں کہ :-

"میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ نوکر اپنے آقا سے بڑا نہیں اور نہ وہ جو بھیجا گیا ہے اپنے بھیجنے والے سے اگر تم یہ باتیں سمجھتے اور ان پر عمل کرتے ہو تو مبارک ہو" (یوحنا ۱۳: ۱۵ و ۱۶ و ۱۷)

مسیح نے شمعون سے فرمایا کہ :-

"میں نے تیرے لیے دعا مانگی کہ تیرا ایمان جاتا نہ رہے"۔ (لوقا ۲۲: ۳۲)

اللہ سے دعا مانگنا عین عبدیت ہے۔

آسمان پر جانے سے قبل مسیح نے مریم سے کہا :-

"مجھ کو مت چھو کیونکہ میں ہنوز اوپر اپنے باپ کے پاس نہیں گیا پر میرے بھائیوں (یعنی حواریوں) پاس جا اور ان سے کہہ کہ میں اوپر اپنے باپ اور تمہارے باپ پاس اور

اپنے خدا اور تمہارے خدا پاس جاتا ہوں "۔ (یوحنا ۲۰ : ۱۷)

مسیح علیہ السلام کے اس قول سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ خدا کی نسبت باپ کے لفظ کا استعمال اس زمانہ کا علم محاورہ تھا۔

"میں نے تو آپ سے نہیں کہا بلکہ باپ نے جس نے مجھے بھیجا فرمادیا کہ میں کیا بولوں اور کیا کہوں"

(یوحنا ۱۲ : ۴۹)

حاصل یہ ہے کہ اناجیل مروجہ سے بھی ثابت نہیں ہوتا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی الوہیت کا دعویٰ کیا ہو اور تثلیث کی تعلیم دی ہو بلکہ خالص توحید ہی کی تعلیم آپ دیتے رہے اور اپنے کو (اللہ کا بندہ اور پیغمبر) کہتے رہے آپکے حواریوں نے بھی آپ کو صرف نبی ہی سمجھا اور نبی ہی مانا۔ آپکے زمانہ کے لوگوں نے بھی آپ کو نہ الوہیت سے موصوف کیا نہ الوہیت سے آپ کو موصوف کرتے ہوئے کسی کو دیکھا یا سنا۔ آپکے دشمنوں تک نے آپ پر یہ الزام اُس زمانہ میں نہ لگایا کہ آپ نے کبھی الوہیت کا دعویٰ کیا۔ تثلیث کو آپ کی تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ بہت بعد کی بدعت ہے۔ ۳۲۵ء میں اس عقیدہ کی بنیاد مندرجہ ذیل صورت سے ڈالی گئی :۔

جارج سیل اپنے ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ ۳۲۵ء میں کونسل نیس منعقد ہوئی اور اُس میں مسیح کی الوہیت کا جس کی مدت سے گفتگو درپیش تھی، تصفیہ ہوا۔ اس کونسل کے انعقاد کی وجہ یہ تھی کہ جب آریوس نے جو مسیح کی الوہیت کا منکر تھا اپنے مسئلہ کو دونوں یوسی بیوسیوں اور دیگر علماء کی مدد سے خوب پھیلانا شروع کیا اور اتھانیشیس اس کے مقابلہ پر کھڑا ہوا تب قسطنطین نے اس نزاع کو دیکھ کر اس کونسل کے انعقاد کا حکم دیا۔ اس کونسل میں تیرہ (۱۳) بشپ اور بہت سے پادریوں نے تثلیث سے انکار کیا۔ بعض لوگ تثلیث کے تو قائل ہوگئے مگر بجائے روح القدس کے حضرت مریم کو تثلیث میں داخل کرتے تھے۔ جب بادشاہ نے علانیہ حکم دے دیا کہ جو شخص تثلیث سے انکار کرے گا اس کا مال ضبط اور وہ خود جلاوطن کیا جائے گا۔ تب اکثر اراکین کونسل نے بادشاہ کے خوف سے تثلیث کے عقیدہ پر دستخط کر دیئے۔ بس اُس وقت سے تثلیث قائم ہوئی اور

اتھانیشیس کا عقیدہ پھیلنا شروع ہوا۔

"مین تواریخ کلیسہ کے باب ۵ میں کونسل آف نیس کے متعلق لکھا ہے کہ اس دینی مباحثہ کے سبب بہت لوگ ستائے گئے بلکہ جان سے مارے گئے اور بڑی خونریزی کی لڑائیاں ہوئیں۔

جان ڈیون پورٹ اپنی کتاب کے صفحہ ۱۶۰ پر لکھتے ہیں کہ:۔

"قسطنطین اعظم نے صرف اپنے ملک کے استحکام کے لیے مذہب عیسائی اختیار کیا تھا اور شخص ایسا ظالم تھا کہ لوگ اسے نیرو ثانی کہتے تھے۔ اس کے ہاں ایک مشہور انجمن تھی جسکو نیس کہتے تھے۔ اس مجلس نے پہلے پہل ۳۲۴ء میں حضرت مسیح کی خدائی کا مسئلہ نکالا"

سینٹ ہلیری جو چوتھی صدی کا ایک بشپ اور اگلے زمانہ کے پادریوں میں سے تھا ان مذہبی مناقشات کو بہت ناپسند کرتا تھا جن کے باعث ہزارہا عیسائی جان سے مارے گئے اور جن لوگوں کو آپس میں بھائی بنکر رہنا چاہیے تھا انھوں نے آپس میں ایک دوسرے پر ظلم کیا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ:۔

"بڑے افسوس کی اور خوف کی بات ہے کہ ہم لوگوں میں جس قدر رائیں ہیں اسیقدر مسائل اور جیسا جس کا میلان ہے ویسا ہی اس کا مذہب اور جتنی ہم میں کوتاہیاں ہیں اتنی ہی ہماری کفر گوئی اور بے ادبی ہے کیونکہ ہم لوگ اپنے دل کی خواہش کے مطابق مسائل بنا لیتے ہیں پھر ان مسائل کو اسی طرح بناوٹ سے بیان کرتے پھرتے ہیں۔ ہر سال نہیں بلکہ ہر مہینہ ہم جدید مذاہب تراشتے ہیں اور ان کی اشاعت کرتے ہیں"

فلش صاحب کا قول ہے کہ:۔

"قسطنطین کے زمانہ سے بہت پہلے اکثر عیسائی خراب ہو گئے تھے اور اصول مذہب میں فتور آگیا تھا مگر بعد ازاں جب اس نے علمائے مذہب کی بہت قدر کی اور انہیں اعلیٰ اعلیٰ مرتبوں پر پہنچایا تو یہ لوگ دولت کے خواہشمند اور اختیارات ملکی کے شائق ہو گئے اور انھوں نے

مذہب عیسوی کو خراب کر دیا"

قسطنطین کے فیصلۂ تثلیث کے باوجود اور باوجود دردناک خونریزیوں کے **آریوس** اپنے ہی عقیدہ توحید پر جما رہا اور اپنے عقیدہ کی لوگوں کو تعلیم بھی دیتا رہا۔ اس کے بعد بھی عرصہ تک یہ تعلیم جاری رہی اور اب بھی عیسائیوں میں **یونی ٹیرین** فرقہ موجود ہے جو تثلیث کا قائل نہیں، الوہیت صرف خدا کے لیے قرار دیتا ہے اور مسیح کو ایک الہام یافتہ انسان سمجھتا ہے۔ ایام گزشتہ میں عیسائیوں میں ایک **آبیونی** فرقہ تھا جس کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ محض ایک انسان تھے۔ سنہ ۲۰۰ء میں **آرٹمن** فرقہ پیدا ہوا اس کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ مسیح انسان ہیں۔ **ساسینین** فرقہ والے بھی مسیح کو صرف انسان اور الہام یافتہ سمجھتے تھے۔

مراتب ثلاثہ عیسائی علماء یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ جس طرح مسیح اقانیم ثلاثہ میں سے ایک اقنوم ہیں اسی طرح اس ایک اقنوم میں بھی تین مرتبے شامل ہیں یعنی نبوت بادشاہت اور کاہنوں کی سرداری۔ مگر انجیل سے سوا مرتبۂ نبوت کے اور کوئی مرتبہ عیسیٰ علیہ السلام میں ثابت نہیں ہوتا چنانچہ **یوحنا** (۱۸: ۳۶) میں ہے کہ:-

"یسوع نے جواب دیا کہ میری بادشاہت اس جہان کی نہیں اگر میری بادشاہت اس جہان کی ہوتی تو میرے نوکر لڑائی کرتے تاکہ میں یہودیوں کے حوالہ نہ کیا جاتا پر میری بادشاہت یہاں کی نہیں ہے"

کاہن کے عہدہ یا کاہنوں کی سرداری پر آپ کا مقرر نہ ہونا جملہ اناجیل وحالات مسیح سے ثابت ہے۔ صرف مرتبۂ نبوت کا ثبوت اناجیل موجودہ میں بھی بکثرت پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مسیح علیہ السلام خود اپنی بابت **مرقس** (۶: ۴) میں فرماتے ہیں کہ:-

"نبی بے عزت نہیں مگر اپنے وطن میں"

آپ کے اس قسم کے الفاظ جن سے آپ کی نبوت کا آپ ہی کی زبان سے اقرار پایا جاتا ہے **متی** (۱۳: ۵۷) اور **لوقا** (۴: ۲۴) اور **یوحنا** (۴: ۴۴) میں بھی موجود ہیں۔ حواریوں نے قصہ صلیب کے بعد بھی آپ کو نبی ہی کہا۔

(لوقا ۲۴ : ۱۹)، جب آپ نے ایک بیوہ کے مردہ لڑکے کو زندہ کر دیا تو سب ڈر گئے اور خدا کی تعریف کر کے بولے کہ :-

" بڑا نبی ہم میں اٹھا "، (لوقا ۷ : ۱۱-۱۶)

جب آپ نے پانچ ہزار آدمیوں کو پانچ روٹیوں سے سیر کر دیا تو ان لوگوں نے کہا کہ :-

" فی الحقیقت وہ نبی جو جہان میں آنے والا تھا یہی ہے " (یوحنا ۶ : ۱۴)

غرضکہ آپ نے خود اپنے آپ کو صرف نبی ہی فرمایا - آپ کے حواریوں نے آپ کے اٹھ جانے کے بعد بھی آپ کو نبی ہی جانا - اور عوام الناس میں سے جن جن سے آپ کو سابقہ پڑا انھوں نے آپ کو نبی ہی سمجھا - جس طرح توحید الٰہی میں اقانیم ثلاثہ ثابت نہیں ہوتے - اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام میں مرتبہ نبوت کے ساتھ بادشاہت اور کہانت کا اجتماع بھی ثابت نہیں ہوتا " -

(باقی)

تنزیل و تاویل

سورۂ فاتحہ

(۲)

(از جناب مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی)

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں

(۱) انتہائی عظمت وجلال کی وجہ سے انتہائی تذلل اختیار کرنا عبادت کہلاتا ہے اِس وجہ سے کہ عبادت اختیاری تذلل کا نام ہے۔ فقہاء کرام نے عبادت کے لیے نیت وارادہ کا ہونا بالاجماع شرط قرار دیا ہے۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کمال محبت کے ساتھ کمال خضوع اور غایت انقیاد واطاعت کا نام عبادت ہے۔ کمال محبت کے یہ معنی ہیں کہ قلب اُس رب العالمین کی محبت سے لبریز ہو۔ اُس کی محبت نے باقی تمام محبتوں کو قلب سے منسوخ کر دیا ہو قلب میں اس کے سوا کسی کی محبت کے لئے گنجائش نہ رہے۔

مَاجَعَلَ اللهُ لِرَجُلٍ مِّن قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهٖ اللہ نے کسی شخص کے سینہ میں دو دل نہیں رکھے ہیں۔

قلب میں جس قدر غیر اللہ کی محبت آتی ہے اسی قدر وہ اللہ کی محبت سے خالی ہوجاتا ہے، جیسے برتن میں جب کوئی دوسری شئی داخل کی جاتی ہے تو اسی قدر وہ پہلی چیز سے خالی ہوجاتا ہے۔ اور کمال خضوع اور غایت اطاعت کے یہ معنی ہیں کہ اپنی تمام خواہشوں اور ارادوں کو اسکی رضا میں فنا کردے۔

اِيَّاكَ جو نَعْبُدُ کا مفعول ہے، اس کی تقدیم حصر کے لیے ہے، یعنی خاص تیری ہی بندگی کرتے ہیں کسی اور کی نہیں۔ نیز اس تقدیم میں یہ اشارہ ہے کہ عبادت کرنے والے کی نظر صرف معبود حقیقی اور خاص اوس ذوالجلال والاکرام پر ہونی چاہیے۔ اپنی عبادت پر نہ ہو۔ سادات صوفیہ و ارباب طریقت کے نزدیک اصل عبادت وہی ہے جو محض اُس ذوالجلال والاکرام کے لیے ہو۔ کسی رغبت یا رہبت کی بنا پر نہ ہو۔ عبادت سے فقط اس کی رضا اور خوشنودی مقصود و مطلوب ہے ؎

خلاف طریقت بود کاولیا تمنا کنند از خدا جز خدا

گر از دوست چشمت بر احسان اوست تو در بند خویشی نہ در بند دوست

اَعْبُدُ (میں بندگی کرتا ہوں) کے بجائے نَعْبُدُ۔ (ہم سب بندگی کرتے ہیں) لانے میں التزام جماعت کی طرف اشارہ ہے۔ نیز یہ بھی کہ اگر نفس کو اپنی اس عبادت پر، جو محض اُسی کی توفیق اور اعانت سے کی ہے کسی قسم کا عجب پیدا ہو تو اس کے لیے تنبیہ ہے کہ بندگی کرنے والا صرف میں ہی نہیں ہوں، بلکہ بیشمار بندگی کرنے والوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔

(۲) چونکہ ابتدا سورت میں حمد و ثنا تھی، اس لیے اس کا ذکر غائبانہ انداز میں کیا گیا۔ کیونکہ محبوب کی یاد اور اوس کا تذکرہ غائبانہ ہی ہو کرتا ہے اور غیاب ہی میں یاد کرنا اخلاص کی علامت ہے۔ بخلاف اس کے عبادت کا حاصل چونکہ خدمت اور تعظیم ہے اور وہ حضوری ہی میں زیادہ مکمل ہوتی ہے، اس لیے حمد اور ثنا کے غائبانہ طرز کلام کو چھوڑ کر اِيَّاكَ نَعْبُدُ الخ میں مخاطبانہ اور حاضرانہ طرز کلام اختیار کیا گیا۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ میں فرقہ جبریہ کے رد کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جبریہ بندے کو جماد کی طرح مجبور محض بتلاتے ہیں اِيَّاكَ نَعْبُدُ سے اس کا رد ہو جاتا ہے کیونکہ عبادت کے معنی اختیاری تذلل کے ہیں۔

اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں فرقہ معتزلہ کے رد کی طرف اشارہ ہے ارباب اعتزال بندے کو اپنے افعال کا خالق اور فاعل مستقل قرار دیتے ہیں۔ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ سے اس کا رد ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اگرچہ عبادت اور بندگی

اپنے اختیار سے کرتا ہے۔ جمادکی طرح مجبور محض اور عاری من الاختیار نہیں، مگر ایسا فاعل مستقل بھی نہیں کہ اُس کی اعانت سے مستغنی ہوجائے۔ فاعل مختار ضرور ہے مگر اپنے اس خداداد اختیار میں مختار نہیں ہر لمحہ اور ہر لحظہ اسکی اعانت اور امداد کا محتاج ہے۔ فافهم ذلك فانه دقيق وسيأتي تفصيل ذلك انشاء الله تعالیٰ۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ

ہم کو راہ راست کی طرف ہدایت فرما

(۱) ہدایت کے معنی لطف اور مہربانی کے ساتھ رہنمائی کرنے کے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس لفظ کا استعمال ہمیشہ خیر ہی کے موقع پر ہوتا ہے۔

(۲) صراط اس راستہ کو کہتے ہیں جو مستقیم (یعنی سیدھا)، اور موصل الی المقصود، اور قریب اور وسیع ہو اور مقصود تک پہنچانے کیلئے مخصوص اور معین ہو۔ یعنی مقصد تک پہونچنے کا اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ ہو۔ جب تک یہ صفات خمسہ نہ پائی جائیں اسوقت تک صراط کا اطلاق نہ ہوگا اور صراط کی صفت میں جو لفظ مستقیم کہا گیا، تو وہ اشارہ ہے اس طرف کہ وہ راستہ مقصود تک پہنچنے کا قریب ترین راستہ ہے، اس لئے کہ خطوط واصلہ بین النقطتین میں سب سے مختصر اور قریب ترین خط، خط مستقیم ہی ہوتا ہے کما برهن ذلك في اقليدس، اور سیدھا ہی راستہ مقصد تک پہونچاتا ہے اور اسی ایک راستہ کا تمام عالم کے ہر دور کے لیے تا قیام قیامت کافی اور وافی ہونا اس کے وسیع ہونے کی دلیل ہے، اور خدا تک پہونچنے کے لیے یہی ایک راستہ ہے اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں۔ کما قال تعالیٰ:-

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ

اور یہ کہ یہ میرا سیدھا راستہ ہے، لہذا تم اس پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تم کو اس کے راستہ سے بھٹکا کر پراگندہ کر دیں گے۔

صِرَاطَ کو اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی طرف مضاف کرنے میں اسی طرف اشارہ ہے کہ مقصد تک پہونچانے والا صرف یہی ایک راستہ ہے، جن جن پر اللہ کا انعام ہوا ہے وہ سب اسی راستہ پر چلے ہیں، اور یہ اہل غضب

اور اہل ضلال کے راستوں سے بالکل مغایر ہے عبد اللہ بن مسعود اور عبد اللہ بن عباس اور دیگر حضرات صحابہ نے صراط مستقیم کی تفسیر دین اسلام ہی کی ہے اور یہی بعض روایات مرفوعہ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے۔ جابر بن عبد اللہ سے منقول ہے کہ صراط مستقیم سے اسلام مراد ہے جو کہ ما بین السماء والارض سے بدرجہا زیادہ وسیع ہے۔ محمد بن الحنفیہ فرماتے ہیں کہ صراط مستقیم سے مراد اللہ کا دین ہے جس کے سوا اور کوئی دین مقبول نہیں۔ (ابن کثیر) کما قال تعالیٰ:۔ وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ۔

اس آیت میں صراط کو الذین انعمت علیہم کی طرف اس لیے مضاف فرمایا کہ وہی لوگ اس پر چلنے والے ہیں جن پر اللہ کا انعام ہوا ہے اور آیت وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا، اور آیت وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ صِرَاطِ اللَّهِ میں صراط کو اللہ کی طرف اس لیے مضاف کیا گیا کہ صراط مستقیم اسی کا قائم کیا ہوا راستہ ہے۔

چونکہ ہدایت اور استقامت کے مراتب نہایت مختلف اور متفاوت ہیں، کوئی مرتبہ ہدایت اور استقامت کا ایسا نہیں کہ اس سے اعلیٰ اور افضل مرتبہ متصور نہ ہو سکتا ہو، اور صراط مستقیم یعنی سیدھا راستہ اگرچہ ایک ہی ہے لیکن قرب اور بعد کے اعتبار سے اس میں بھی تفاوت ہو سکتا ہے اس لیے طلب ہدایت پر ہر شخص مامور ہے۔ طالب کو اگر ہدایت و استقامت کے بعض مراتب حاصل بھی ہوں تب بھی وہ اس سے اعلیٰ اور بہتر مراتب سے کسی طرح مستغنی نہیں ہو سکتا ہے

اے برادر بے نہایت درگہیست ہرچہ بروی میرسی بروے مائستیت

علاوہ بریں ہدایت پر قائم اور ثابت رہنے کے لیے ہر لمحہ اور ہر لحظہ اسی کی اعانت اور توفیق کی حاجت ہے جیسا کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا (اے ایمان والو ایمان لاؤ) میں ایمان والوں کو پھر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اس سے اسلام پر ثابت اور مستمر رہنا مقصود ہے جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے وصیت فرمائی تھی:۔

يَا بَنِيَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ اے میرے بچو اللہ نے تمہارے لیے اس دین کو پسند فرمایا ہے

الّا و انتم مسلمون۔ — لہذا تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔

اور اسی وجہ سے عباد مومنین کو اس دعا کی تلقین کی گئی :-

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا و ھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب۔

اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو کجروی کی طرف مائل نہ ہونے دینا اور ہم کو اپنی طرف سے رحمت عطا کر تو ہی عطا کرنے والا ہے۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ

ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا ہے، نہ کہ ان کا جن پر غضب ہے۔ اور نہ ان کا جو گمراہ ہیں

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے ملائکہ اور انبیاء، اور صدیقین اور شہداء اور صالحین مراد ہیں جن کو حق تعالیٰ نے اپنی طاعت اور عبادت کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ (ابن کثیر) اہل انعام کی کسی خاص نوع اور خاص قسم کو نہ ذکر کرنا بلکہ مطلق اہل انعام کے راستہ کی طرف ہدایت چاہنا۔ ایسی جامع دعا ہے کہ دنیا اور آخرت کی ہر قسم کی خیر اور فلاح کو شامل ہے۔ اس دعا کے معنی یہ ہیں کہ اے اللہ ہم کو اس راستہ کی طرف رہنمائی فرما جس پر تیرے تمام انعام پانے والے بندے گزرے ہیں۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ وہ الطاف و کرم اور وہ آلاء و نعم جو تو نے اپنے تمام انعام پانے والے بندوں پر متفرقاً نازل فرمائے۔ وہ ہم پر مجتمعاً نازل فرما۔

نیز لفظ صراط کو الذین انعمت علیھم کی طرف مضاف کرنے میں سالکین راہ حق اور رہروان منزل آخرت کے لیے ایک عظیم الشان تسلیہ ہے، کہ وہ سفر اور راستہ کی تنہائی سے ہرگز نہ ڈریں۔ نبیین اور صدیقین اور شہداء اور صالحین ان کے رفیق سفر ہیں وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔

نیز مقام سوال میں منعم کے انعامات و احسانات کا تذکرہ۔ اجابت اور قبول میں خاص اثر رکھتا ہے اسی طرح

سوال ہدایت کے وقت حق جل وعلا کے انعام عام کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اے رب العالمین اور اے ارحم الراحمین تو نے اپنی رحمت واسعہ سے بہت سے بندوں پر ہدایت کا انعام فرمایا ہم کو بھی اس نعمت عظمیٰ سے سرفراز اور اس پہ استقامت نصیب فرما اور ہم گنہگاروں کو بھی اپنے لطف عمیم سے اہل انعام کے زمرہ میں داخل فرما۔ آمین۔

مغضوب علیہم سے وہ فریق مراد ہے جو دیدہ و دانستہ راہ راست کو چھوڑ دے اور علم صحیح کے باوجود ہوائے نفس کی پیروی میں غلط راستہ اختیار کرے۔ اس نوع کے کامل ترین افراد یہود بے بہبود ہیں کہ باوجود تورات کے عالم ہونے کے کتمان حق اور استکبار اور اتباع ہویٰ جیسے امراض میں مبتلا رہے۔ ....

...... انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے ہمیشہ معاندانہ رویہ رکھا، جان بوجھ کر قتل انبیاء اللہ کے مرتکب ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر ابد تک ذلت و مسکنت کی مہر لگا دی گئی، غضب اور لعنت کا طوق ان کی گردن میں ڈال دیا گیا۔

من لعنہ اللہ وغضب علیہ۔

ضالین سے وہ گروہ مراد ہے جو سواء السبیل سے بھٹک کر غلط راستہ پہ جا پڑا۔ اس نوع کے کامل ترین افراد نصاریٰ ہیں۔ کما قال تعالیٰ

وَاَضَلُّوْا کَثِیْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَاءِ السَّبِیْلِ بہتوں کو گمراہ کیا اور خود سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔

یہود اور نصاریٰ کے کامل ترین افراد ہونے ہی کی وجہ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مغضوب علیہم کی تفسیر یہود سے اور ضالین کی تفسیر نصاریٰ سے فرمائی۔ اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ مغضوب علیہم اور ضالین کے مصداق صرف یہود اور نصاریٰ ہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان دو قسموں کے تحت میں ہر قسم کے گمراہ اور کافر اور فاسق فاجر، عاصی اور مبتدع علی اختلاف المراتب داخل ہیں۔

سلف صالحین یہ فرمایا کرتے تھے کہ اس امت کے علماء میں سے جو بگڑا وہ یہود کے مشابہ ہوا، اس لیے کہ وہ اپنی اغراض کی وجہ سے کلمات الٰہیہ کی تحریف، اور کتمان ما انزل اللہ، اور تلبیس الحق بالباطل۔ اور اہل علم و فضل کے حسد میں گرفتار ہوا، جو کہ یہود کے اخلاق ہیں۔ اور اس امت کے عباد و زہاد میں سے جو بگڑا وہ نصاریٰ کے مشابہ

ہوا اس لیے کہ اس نے اپنی عبادت میں بجائے شریعت غرا، اور سنت بیضا کے ہوائی نفس کا اتباع کیا اور نصاریٰ کی طرح تعظیم مشائخ میں اس درجہ غلو کیا کہ اعتقاداً نہ سہی عملاً تو ضرور ان کو رب اور ان کی قبور کو مساجد بنا لیا۔

بعض مرتبہ چونکہ نعمت ہی علم و عمل کے فساد کا باعث ہوتی ہے، اکثر عیش و تنعم ہی میں پڑ کر انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے، احکام الٰہی کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ اس لیے اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کے بعد غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کا اضافہ مناسب ہوا کہ اے رب العالمین اپنی نعمتوں پر حمد اور شکر کی توفیق عطا فرما۔ خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ تیرے انعام کے غرور اور تکبر میں مبتلا ہو کر سیدھے راستہ سے بھٹک جائیں اور تیری لعنت اور غضب کے مستحق بنیں۔

آیت موصوفہ میں صرف انعام کو اپنی جانب منسوب فرمایا، غضب اور ضلال کو اپنی جانب منسوب نہیں کیا۔ اس میں ایک لطیف اشارہ ہے۔ وہ یہ کہ انعام محض اس کا فضل ہے۔ بلا کسی استحقاق کے بندوں پر مبذول فرماتا ہے۔ مگر غضب ابتداءً نازل نہیں فرماتا بلکہ ان کی نافرمانی اور دیدہ و دانستہ عدول حکمی کے بعد۔ اور علیٰ ہذا گمراہ جب ہوتے ہیں کہ صراط مستقیم کو چھوڑ کر غلط راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ نیز ادب الٰہی کا اقتضا یہ ہے کہ جب افعال احسان و رحمت کا ذکر ہو تو صراحۃً اللہ جل جلالہ کی طرف اس کی اسناد ہونی چاہیئے، اور جب افعال جزا، اور عقوبت کا ذکر ہو تو فاعل کا حذف اور فعل کا مبنی للمفعول لانا مناسب ہے۔ مثلاً ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ۙ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِ ۙ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ۔

وہ جس نے مجھے پیدا کیا پھر وہی مجھے ہدایت بخشتا ہے اور وہ جو مجھ کو کھلاتا ہے اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا بخشتا ہے۔

خلق اور ہدایت اور اطعام اور اسقاء، اور شفاء ان تمام افعال کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا مگر مرض کو شئے مکروہ ہونے کی وجہ سے ادباً اپنی جانب منسوب کیا۔ اور یہ کہا:

وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ

جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا بخشتا ہے۔

یہ نہیں کہا کہ :۔

وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۔ اور جب وہ مجھے بیمار ڈالتا ہے تو وہی مجھے شفا بخشتا ہے

اسی طرح مؤمنین جن نے وَاَنَّا لَا نَدْرِيْ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ میں ارادہ شر کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا اور یہ نہیں کہا کہ اَرَادَهٗ رَبُّهُمْ مگر جب اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا کہا تو ارادۂ رشد کو رب العزت کی جانب منسوب کیا ۔

علیٰ ہذا خضر علیہ السلام نے فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا (میں نے ارادہ کیا کہ کشتی کو عیب دار کر دوں) میں عیب اور ارادۂ عیب دونوں کو اپنی جانب منسوب کیا مگر جب یہ کہا کہ :۔

فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ پھر تیرے رب نے ارادہ کیا کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنے رب کی رحمت سے اپنے خزانہ کو نکالیں ۔

تو ارادۂ رحمت کو رب العالمین کی جانب منسوب کیا اور وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ (میں نے اس کو اپنی طرف سے نہیں کیا) کہہ کر اس کو اور مؤکد کر دیا اور اسی طرح اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ اور اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ میں اس خاص احلال کو چونکہ اللہ جل جلالہ کی طرف منسوب کرنا خلاف ادب تھا اس لیے دونوں جگہ اُحِلَّ کو مبنی للمفعول ذکر کیا گیا اور وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا میں ادب مانع نہ تھا اس لئے اس احلال اور تحریم کی صراحۃً اللہ کی طرف اسناد کی گئی ۔

نیز منعم حقیقی صرف وہی تبارک وتعالیٰ ہے ۔ كَمَا قَالَ تَعَالٰى

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۔ تمہارے پاس جو نعمت بھی ہے خدا کی طرف سے ہے

اس لیے انعام کو اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ۔ مگر غضب خدا کے ساتھ مخصوص نہیں ۔ ملائکہ اور انبیاء اور عباد صالحین کی طرف سے بھی خدا کے نافرمان اور سرکش بندوں پر ہو سکتا ہے اس لئے اس کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا گیا ۔

نیز مغضوب علیہم کے فاعل کا حذف اہل غضب کی تحقیر اور تذلیل کی طرف مشیر ہے اور فاعل انعام کی تصریح اہل انعام کی تشریف تکریم کی طرف اشارہ کرتی ہے مثلاً کسی شخص کی نسبت یہ کہنا۔ ھذا الذی اکرمہ السلطان وخلع علیہ (یہ وہ شخص ہے جس کو بادشاہ نے عزت دی ہے اور اسے خلعت سے سرفراز فرمایا ہے) بہ نسبت ھٰذَا الَّذِیْ اُکْرِمَ وَخُلِعَ عَلَیْہِ (یہ وہ شخص ہے جس کو عزت دی گئی اور خلعت سے سرفراز کیا گیا) کے بدرجہا بلیغ ہے، اور ذکر فاعل کی وجہ سے پہلا کلام جس قدر ممدوح کی مدح وثنا اور تشریف وتکریم پر دلالت کرتا ہے، دوسرا کلام اس دلالت میں اُس کے پاسنگ بھی نہیں۔ نیز حذف فاعل کچھ اعراض اور ترک التفات پر دلالت کرتا ہے جو اہل غضب کے مناسب ہے اہل انعام کے مناسب نہیں، اس لیے انعام کا فاعل ذکر کیا گیا اور غضب کا فاعل حذف کیا گیا۔ اور چونکہ انعام کی ضد غضب ہے، ضلال انعام کا مقابل نہیں بلکہ رشد اور ہدایت کا مقابل ہے، اس لیے اہل انعام یعنی اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ کے بعد متصلاً ہی اہل غضب یعنی غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ کا ذکر فرمایا اور اہل ضلال کو بعد میں ذکر کیا کیونکہ ایک ضد کے بعد دوسری ضد کا ذکر کلام میں ایک خاص شان اور خاص تناسب پیدا کر دیتا ہے اور اہل غضب کی تقدیم کی ایک یہ بھی وجہ ہے کہ یہود بہ نسبت نصاریٰ کے اسلام سے زیادہ دور ہیں۔ اس لیے کہ نصاریٰ نے صرف ایک نبی یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی اور یہود نے دو پیغمبروں کی یعنی مسیح بن مریم اور محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی۔ حق تعالیٰ شانہ نے غیر المغضوب علیھم کو لفظ غیر کے ساتھ ذکر فرمایا اور حرف لا کے ساتھ لا المغضوب علیھم نہیں فرمایا اس لیے کہ حرف لا فقط ماقبل کی نفی کے لیے آتا ہے اس صورت میں کلام کے یہ معنی ہوتے کہ اے اللہ ہم کو اہل انعام کا راستہ بتلا نہ کہ اہل غضب کا۔ اور لفظ غیر ماقبل کی نفی اور مغایرت دونوں پر دلالت کرتا ہے فرق اتنا ہے کہ مغایرت پر صراحۃً اور نفی ماقبل پر ضمناً اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ اے اللہ ہم کو اہل انعام کا راستہ بتلا جن کا راستہ اہل غضب اور اہل ضلال کے راستہ سے بالکل جدا اور مباین ہے یعنی خود اہل انعام اور ان کا راستہ غضب اور ضلال کے شائبہ سے بالکلیہ پاک ہے اہل فہم غور کریں کہ یہ معنی بہ نسبت پہلے معنی کے کس قدر لطیف ہیں اور کیا یہ لطافت بجائے لفظ غیر کے حرف لا لانے

سے حاصل ہوسکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔

نیز لفظ غیر کے لانے میں ایک یہ بھی اشارہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کا یہ زعم کہ ہم ہی اہل انعام ہیں جیسا کہ وہ کہتے تھے کہ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ غلط ہے بلکہ اہل انعام ان کے سوا دوسرے ہیں۔ کما قال تعالیٰ

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔

اور وَلَا الضَّآلِّيْنَ میں حرف عاطف یعنی واو کے ہوتے ہوئے حرف لَا کا اس لیے اضافہ فرمایا کہ اہل انعام کے راستہ کا اہل غضب اور اہل ضلال کے راستہ سے فرداً فرداً علیحدہ علیحدہ مغایر ہونا معلوم ہو جائے۔ وَلَا الضَّآلِّيْنَ سے اگر حرف لَا کو حذف کر کے غیر المغضوب علیہم و الضالین کہا جاتا تو مجموعہ فریقین کے راستہ سے اہل انعام کے راستہ کا مغایر ہونا مفہوم ہوگا۔ اہل انعام کے راستہ کا ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ مغایر ہونا معلوم نہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ مجموع من حیث المجموع کی مغایرت ہر واحد کی مغایرت کو مستلزم نہیں۔ ہاں ہر واحد کی مغایرت مجموع من حیث المجموع کی مغایرت کو بالا ولویت مستلزم ہے۔ فافهم۔

صلوٰۃ مسلمین اور صلوٰۃ نصاریٰ کا تقابل :۔

کلام الٰہی کے دقائق و اسرار کا تو کون احاطہ کر سکتا ہے بڑے سے بڑے فہیم اور ذکی اور صاحب فہم ثاقب کی بھی وہاں رسائی نہیں۔ یہ مختصر سورت یعنی سورۂ فاتحہ جس کے معارف و لطائف کا ایک نمونہ ہدیۂ ناظرین کیا گیا ہے اس کے وہ اسرار و معارف جو اللہ رب العزت کے علم میں ہیں وہ تو در کنار، علماء اسلام اور حضرات مفسرین نے جو اس مختصر سورت کے حقائق و معارف بیان فرمائے ہیں۔ ہم انہیں کے استیعاب اور استقصاء سے عاجز و درماندہ ہیں جس کی تصدیق علماء اسلام کی تفاسیر سے بخوبی ہو سکتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات پاک کی کہ جس کے ہاتھ میں میری جان ہے سورۂ فاتحہ

جیسی نہ توریت میں اتاری گئی اور نہ زبور میں اور نہ انجیل میں " (اخرجہ الترمذی وصححہ) اسی وجہ سے ہر نماز میں اس صورت کا پڑھنا لازم قرار دیا گیا۔

اسوقت ہم انجیل کی وہ عبارت ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جس کو نصاریٰ نمازوں میں پڑھتے ہیں۔ تاکہ وہ دونوں کے موازنہ اور مقابلہ سے اہل اسلام کے ایمان اور ایقان میں اضافہ ہو اور نصاریٰ کے لیے اگر وہ خدا سے ڈریں اور غور اور فکر سے کام لیں تو اُن کے لیے موجب ہدایت ہو۔

انجیل متی باب ششم آیت نہم میں ہے کہ اس طرح نماز پڑھا کرو :۔

اَبُوْنَا الَّذِیْ فِی السَّمٰوٰتِ لِیَتَقَدَّسِ اِسْمُکَ لِیَاْتِ مَلَکُوْتُکَ لِتَکُنْ مَشِیَّتُکَ

اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک ہو تیری بادشاہت آئے تیری مشیت جیسے

کَمَا فِی السَّمَاءِ عَلَی الْاَرْضِ خُبْزَنَا کَفَافَنَا اَعْطِنَا الْیَوْمَ۔ وَ اغْفِرْ لَنَا۔

آسمانوں پر پوری ہوتی ہے ایسے ہی زمین پر بھی ہو ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور ہماری خطاؤں کو

خَطَایَانَا کَمَا نَغْفِرُ نَحْنُ لِمَنْ اَخْطَاءَ اِلَیْنَا۔ وَلَا تُدْخِلْنَا فِی التَّجَارِبِ لٰکِنْ

معاف کر جیسا کہ ہم اپنے خطاکاروں کی خطائیں معاف کرتے ہیں اور ہم کو آزمائش میں نہ لا بلکہ برائی

نَجِّنَا مِنَ الشِّرِّیْرِ۔ اٰمِیْنَ ۔

سے بچا۔ آمین۔ یعنی قبول فرما۔

ارباب فہم و بصیرت اگر سورۂ فاتحہ کے بعد اس عبارت پر ایک نظر ڈالیں تو ان کو بخوبی منکشف ہو جائے گا کہ اس عبارت کو سورۂ فاتحہ کے ساتھ وہ نسبت بھی نہیں جو ثریٰ (خاک) کو ثریا سے ہے صیغۂ امر سے تقدیس امر اور ایتان ملکوت کو طلب کرنا محض لاطائل اور تحصیل حاصل ہے۔ وہ ہمیشہ سے قدوس اور سلام اور ملیک مقتدر اور عزیز و حکیم ہے اس مالک الملکوت اور قدوس حکیم کی شان میں یہ لفظ کہنا کہ چاہیے کہ تیرا نام پاک ہو اور تیری بادشاہت آئے سراسر خلاف ادب ہے۔ اور علیٰ ہذا یہ کہنا کہ (لتکن مشیتک کما فی السماء علی الارض)

"چاہیئے کہ تیری مشیت جیسے آسمان میں ہے ویسے ہی زمین میں بھی ہو" یہ بھی سراسر خلاف ادب ہے کیا اُس کی مشیت سبع سموات اور سبع ارضین میں جاری اور ساری نہیں ؟ اور کیا کوئی ذرہ اُس کی قدرت اور مشیت سے مستثنیٰ ہے ؟ حاشا وکلا - بَلٰی اِنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ - وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ -

اور علاوہ آج کی روٹی کے سوال کو ہدایت اور صراط مستقیم کے سوال سے جو دنیا اور آخرت کی صلاح اور فلاح اور سعادت دارین کو علی وجہ الاتم شامل ہے، کیا نسبت ؟ اور پھر اُس غفور رحیم اور لیس کمثلہ شیٔ سے یہ سوال کرنا کہ ایسی مغفرت عطا فرما کہ جیسی ہم اپنے گنہ گاروں اور خطا کاروں کی مغفرت کرتے ہیں، کھلی ہوئی سفاہت اور صریح گستاخی ہے - اُس کی کامل عظیم اور وسیع عمیم مغفرت کو اپنی ناقص اور محدود اور برائے نام مغفرت کے ساتھ تشبیہ دینا اور در پردہ اپنے خطا کاروں کو خدا کے خطا کاروں کے مماثل اور ضمناً اپنی نافرمانی کو خدا کی نافرمانی کے ہم پلہ قرار دینا کیا یہ کھلی ہوئی گستاخی نہیں - اُس رب العالمین اور اُس حنّان منّان کے تمام آلاء و نعم میں سے صرف آج کی روٹی کا سوال کرنا اور اُس رب غفور اور ارحم الراحمین سے اپنی ناقص اور محدود مغفرت کے مماثل مغفرت طلب کرنا نصاریٰ کے فہم و فراست کو خوب واضح کرتا ہے -

حاملان قرآن

شیخ محمد افضل عمادی

(۴)

(از مولوی محمد عثمان صاحب عمادی بی ایس سی، علیگ)

مَا خُصِصْتُ بِشَيْءٍ إِلَّا الْفَهْمَ فِي الْقُرْآنِ

(مجھے صرف یہ خاص نعمت حاصل ہوئی کہ میں کلام اللہ کو سمجھ سکوں)

(حضرت علی رضی اللہ عنہ)

عذاب آخرت سے کیا فائدہ ہے؟ یہ مسئلہ رد و قبول و ایراد و اصرار کا موضوع بنا ہوا تھا کہ دوزخ میں عاصیوں کو مبتلائے عذاب جاوید رکھنے سے مصالح کا کیا پہلو نکلتا ہے؟

فرمایا:۔

متاخرین فلاسفہ اسلام کی تحقیق و تنقیب کی بہترین جامع تالیف "اسفار" یہ ہے کہ ہمارے درس میں بھی داخل ہے۔ حکمائے ملت اسلامیہ نے اپنے مخصوص فلسفہ میں جہاں تک ترقی کی تھی یہ کتاب اس کے مراحل ارتقاء کی منزل ہے۔ آخوند ملا علی دامغانی کے اہتمام سے ۱۲۸۲ھ میں شائع ہوئی۔ فلسفۂ الٰہیات میں صاحب کتاب پر فوق تصوف غالب ہے۔ صفویوں کے عہد میں ایران سے تصوف کی بیخ کنی ہو گئی، کسی کو صوفی کہنا اس کو مطعون بنانا تھا، لیکن خدا کے نقارہ کی آواز کو کون روک سکتا ہے؟ زبان خلق نے ان کو صوفی مشہور کر دیا۔ ہنوز تین پشتیں گزرنے نہ پائی

تھیں کہ اصفہان سے نکل کے اس شہرت کے چرچے لکھنؤ میں ہونے لگے کہ وہ بھی ہندوستان کا اصفہان تھا۔ زوال دولت اودھ سے قبل طلب علم کے لیے جب میں مقیم لکھنؤ تھا تو صاحب اسفار کے حفید سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ وہ بھی عالم تھے مگر عالم نہ تھے۔ نسبت صوفیت سے ان کو شدید انکار تھا اور اس باب میں انھوں نے ایک عربی رسالہ بھی لکھا تھا جس کا ایک نسخہ مطبوعہ مجھے بھی دیا تھا۔ رسالہ کا موضوع مغلّظات مبین و کیا نرعلف کے سہارے اتنا ہی تھا کہ صاحب اسفار صوفی نہ تھے، شیعی امامی تھے، نہ کرنی تھے نہ شامی تھے۔

یہ ایک ضمنی بات تھی۔ اب اصل سوال پر نظر کرنے کی ضرورت ہے۔

اسفار کی چوتھی جلد کے اواخر میں ایک عنوان ہے "ذکر تنبیہی" اس ذیل میں اس آیہ کریمہ کی تحقیق کرتے ہیں :-

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اس آگ سے بچو کہ آدمی اور پتھر اسکے ایندھن ہونگے۔

یہ تحقیق عارفانِ طریقت کی سند سے تمام تر مستند ہے قال بعض العرفاء سے اسکی ابتدا کی ہے جس سے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اندلسی مراد ہیں کہ صاحب اسفار ان کے بہت ہی معتقد ہیں اور ان سے جا بجا سند لیتے ہیں

عذاب بھی ایک علاج ہے

اسفار میں اسکی مبسوط و مشرح بحث موجود ہے اور جا بجا اس پر کلام کیا ہے مقدمات فلسفیہ سے قطع نظر کرتے ہوئے ایک مقام کے خاص فقرے یہ ہیں :-

ان النار قد تتخذ دواءً لبعض الامراض و	بعض بیماریوں میں آگ سے علاج کرتے ہیں، ایسی بیماری
هو الداء الذي لا يتقى الا بالكيّ من النار	کی دوا آگ ہی ہے، اس بیماری سے بچنے کی بجز اس
لقوله تعالى "فتكوى بها جباههم وجنوبهم"	کے کوئی صورت نہیں کہ آگ سے داغ دیں، اللہ تو
الآية، فقد جعل الله النار وقاية في	فرماتا ہے "آگ سے ان کی پیشانیوں اور پہلوؤں کو
هذا الموطن من داءٍ هو اشدّ من النار	داغ دیا جائے گا" اللہ تعالیٰ نے اس جگہ آگ کو
في حق المبتلى به دائٌ داءٍ اكبر من الكبائر	اس بیماری سے بچنے کا ذریعہ قرار دیا ہے جو اُن مبتلا کے

فقد جعل الله لهم النار يوم القيامة دواءً كالكي بالنار فدفع بدخولهم النار يوم القيامة داءً عظيمًا اعظم من النار وهو غضب الله ولهذا يخرجون بعد ذلك من النار الى الجنة كما جعل الله في الحدود والديات في الدنيا وقاية من عذاب الآخرة۔

حق میں آگ سے کہیں زیادہ سخت ہے، کبائر گناہ سے بڑھ کے اور کون سی بیماری ہو سکتی ہے، ایسے بیماران معصیت کے لیئے اللہ تعالیٰ نے وہ دوا تجویز کی ہے جو آگ سے داغنے کی سزا ہے، اس علاج کے ذریعہ سے ان کو آگ میں ڈال کر اس بڑی بیماری سے بچا لیا جو آگ سے بہت ہی بڑھی چڑھی ہے یہ بہت بڑی بیماری اللہ کے غضب کی تھی جس سے آتش دوزخ میں عذاب پانے والے بچ گئے، یہی وجہ ہے کہ اس عذاب کے بعد یہ لوگ دوزخ سے نکال کر جنت میں لائے جائیں گے، اسکی مثال دنیاوی معاملات میں حدود شرعی ہیں کہ اگرچہ ان حدود میں تعزیر و سزا ہوتی ہے مگر اس تعزیر کو برداشت کر لینے کے بعد عذاب آخرت سے نجات ہے۔

دوزخ کا وجود حقیقی | فرمایا:۔

ان جهنم ليست من حيث كونها دار العذاب لها وجود حقيقي بل منشأ وجودها الضلال والعصيان في النفوس حتى انه لو لم يكن معصية بني آدم لما خلق الله النار۔

دوزخ اپنی ہستی میں درحقیقت عذاب کا ایسا مقام نہیں کہ کوئی حقیقی وجود رکھتا ہو، طبیعتوں میں گمراہی و نافرمانی کا موجود ہونا ہی منشائے وجود دوزخ ہے، حتیٰ کہ انسان میں اگر معصیت کی خاصیت نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ دوزخ کو پیدا ہی نہ کرتا۔

استعداد نفوس | فرمایا:۔

ان اهل العذاب هم الذين نفوسهم كانت مستعدة لدرجة من درجات الجنان ثم بطل استعدادهم بارتكاب المعاصي

اہل عذاب وہی ہیں جن کے نفس بہشت کا کوئی نہ کوئی درجہ حاصل کرنے کے لیئے آمادہ تھے معصیت کے ارتکاب سے یہ استعداد جاتی رہی۔ اب ان کی حالت اس شخص کی سی

فحالهم كحال من انحرف عن الاعتدال اللائق به والصحة التي لجسمه فيكون في المرض حتى يرجع الى الاعتدال الذي كان له او بطل استعداده بالكلية وانتقل مزاجه الى مزاج وافقه تلك الحالة التي كانت مخالفة لمزاجه الاول وكان مرضا في حقه فصار المرض صحة له والالم راحة له وانقلب العذاب عذوبة في حقه لانقلاب جوهره الى جوهر ادنى

ہوگی جس کا مزاج حد اعتدال سے منحرف ہوگیا ہو، یعنی جو اعتدال اور صحت اس کے لائق تھی وہ نہ رہی، ایسا شخص اس وقت تک شدید الم میں مبتلا رہے گا جب تک کہ پھر وہی اعتدال مزاج اسکو حاصل نہ ہوجائے یا پھر یہ صورت ہو کہ اسکی استعداد بالکل ہی باطل ہوجائے اور اس کا مزاج منتقل ہوکر ایسا ہوجائے کہ اس حالت کے موافق اور پہلے مزاج کے مخالف ہو۔ پہلے مزاج کی بنا پر جو حالت تھی وہ اس کے حق میں بیماری کا حکم رکھتی تھی، اب دوسرے مزاج کی رو سے وہی بیماری صحت، وہی الم راحت، وہی عذاب عذوبت، اس کے حق میں بن گیا سبب یہ ہے کہ اس کے جوہر میں انقلاب آگیا اور اب وہ ایک ادنی درجہ کا جوہر ہو رہا۔

معذبین فی النار فرمایا :۔

فكذلك حال من يدخل في النار فيتعذب بها مدة لاجل الاعمال السيئة فان بقي في قلبه نور الايمان فيمنع ان ينفذ ظلمة المعاصي في باطن قلبه ويحيط به السيئات فلا محالة يخرج من النار ويبرء من العذاب واما من اسود قلبه بالكلية وغاص في باطن قلبه ظلمة المعاصي لاجل الكفر فلا يخرج من النار ابدا مخلدا۔

یہی حال ان لوگوں کا ہے جو آگ میں داخل ہوں اور اپنے اعمال بد کے باعث ایک مدت تک آگ کے عذاب میں مبتلا رہیں، ایسے شخص کے دل میں اگر نور ایمان باقی ہے تو نہ معصیت کی تاریکی اس کے قلب کے اندر گھر کر سکتی ہے اور نہ گناہ اس کو ہر طرف سے گھیر سکتے ہیں، ایسا شخص لامحالہ آگ سے نکالا جائے گا اور عذاب سے بچے گا، لیکن وہ شخص جس کا قلب بالکل تاریک ہوگیا ہو اور کفر کے باعث معصیت کی تاریکی نے اس کے قلب کے اندر گھر بنا لیا ہو ایسا شخص ہمیشہ آگ ہی میں جلتا رہے گا اور کبھی اس عذاب سے رہائی نہ پائے گا۔

فرمایا۔ حیف ہے کہ ان حالات میں بھی نفس کافر ایمان نہ لائے اور حق مطلق سے رجوع نہ کرے جو ادعونی (مجھ سے دعا کرو) کی دعوت دیتا ہے اور "استجب لکم" (میں تمہارے حق میں تمہاری دعا قبول کرونگا) کا مژدہ بھی سناتا ہے ؎

صبح بنال راہ فلک بربستہ اند! ہر چند دیر آمدۂ در نبستہ اند!
جانِ تو زہمت کوتاہ بیں تست ہرگز در کریم بکافر نبستہ اند
سرمایۂ شناخت چرا غیبت دادہ اند آمادہ چراغ ز صرصر نبستہ اند
بر تشنگان بہار بخیلی برائے چیست دریا کریم و ظرف ترا سر نبستہ اند

رَبنا اھدنا الصراط المستقیم، صراط الذین انعمت علیھم، غیر المغضوب علیھم
وَلَا الضَّالین، آمین،

شفاعت | شفاعت کیا ہے اور کیوں اسکی ضرورت ہے؟ سلسلہ کلام دراز ہو رہا تھا۔ ورحلقے تنگ سے تنگ تر ہوتے جاتے تھے۔

فرمایا۔ شفاعت کا مادہ شفع ہے جس کے معنی زوج (جفت) کے ہیں، شفاعت کرنے والے کو شفیع اسی لیے کہتے ہیں کہ صاحب حاجت کے ساتھ وہ بھی طلب حاجت میں شریک ہوجاتا ہے، ادنٰی کو بھی بعض حالتوں میں شفیع اور شفوع کہتے ہیں۔

فالشفاعۃ ضم غیرک الی جاھک و	شفاعت کے معنی یہ ہیں کہ کسی دوسرے کو تم اپنی جاہ و
وسیلتک فھی علی التحقیق اظھار لمنزلۃ	مرتبہ کے حصول میں ساتھ ملالو اور اسکو وسیلہ بنالو تحقیق
الشفیع عند المشفع و ایصال منفعۃ	یہ ہے کہ شفاعت اصل میں شفاعت کرنے والے کی منزلت
الی المشفوع لہ،	کا اس شخص کے سامنے ظاہر کرنا ہے جس کے پاس شفاعت

کی جائے اسکے ساتھ ایک ضمنی مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ جن کی شفاعت کریں اسے کچھ نفع بھی ہو۔

علما نے شفاعت کو صرف خیر تک محدود رکھا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے شفاعت شر کی بھی تصریح کی ہے جس سے نمیمہ وغیبت یعنی کلام بغرض القائے عداوت مراد لیتے ہیں۔

مَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِنْهَا وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِنْهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُقِيتًا

جس نے کوئی اچھی شفاعت کی تو اس شفاعت میں سے کچھ حصہ اس کا بھی ہو گا، اور جس نے کوئی بری شفاعت کی تو اس شفاعت کا کچھ بار اس پر بھی پڑے گا، اور اللہ ہر چیز پر مقتدر ہے۔

شفاعت سیئہ کی یہ بھی تاویل کی گئی ہے کہ "یشفع کفرہ لقتال المومنین"، یعنی مومنین کے ساتھ جنگ کرنے میں کفر کا ساتھ دے۔ اس کی تائید ابو موسیٰ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کے امام بخاری و امام مسلم دونوں ہی راوی ہیں:-

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم جالسا فجاء رجل يسأل فاقبل علينا بوجهه وقال اشفعوا تؤجروا ويقضي الله على لسان رسوله ما شاء

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے تھے کہ ایک شخص آ کے سوال کرنے لگا۔ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہم لوگوں کی جانب رخ کر کے فرمایا، "شفاعت کرو"، یعنی کار برآری میں تم لوگ بھی اس کا ساتھ دو اور اس کی حاجت میں شریک ہو جاؤ، "تمہیں اس کا اجر ملے گا"، اللہ جو چاہتا ہے وہی اپنے پیغمبر کی زبان سے پورا کراتا ہے۔

اس حقیقت کو ذہن نشین رکھنے کے بعد شفاعت پر کیا اعتراض رہ گیا؟ جو لوگ اس کو ایک طرح کی سخن سازی سمجھتے ہیں کہ کسی کے کہنے یا زور ڈالنے سے اللہ تعالیٰ انسان کی بدکرداریوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے اس کو بخش دے گا۔ ایسے نادان یقیناً کلام عرب سے انجان اور مفہوم شفاعت سے قطعاً بے خبر ہیں ؎

رحیل عمر روان است و محشرے در پیش
بیا و رو بسوئے شفیع محشر کن!

رسائل و مسائل

ایمان بالرسالۃ

جمادی الاولیٰ کے رسالہ ترجمان القرآن کے صفحہ ۵۵ پر ایمان بالرسالت کے متعلق عالمانہ تبصرہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ بمیرے ناقص خیال میں ایک دو پہلو ابھی حل طلب ہیں جو مختصراً معروض ذیل ہیں کیا ہی اچھا ہو جو ایسے مضامین پر ترجمان القرآن میں بصورت مذاکرہ علمیہ اظہار خیال ہوتا رہے۔

(۱) آپ فرماتے ہیں کہ "انسان کی فطرت میں خدا کی معرفت اور اس کے لیے بندگی کے خلوص کی استعداد موجود ہے .... لیکن اس فطری استعداد کے قوت سے فعل میں آنے کے لیے چند شرائط ہیں اور بادنیٰ تامل یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ شرائط ہر شخص میں پوری نہیں ہوتیں"۔ اس کے بعد ان شرائط کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ فرمودہ الٰہی لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کے مطابق ہر شخص اپنی وسعت علم اور فکر تک مکلف ہو جیسا کہ شروع سوال میں مذکور ہے۔ اگر تربیت ماحول اور استعداد ذاتی تکمیل شرائط میں حائل ہیں تو اس کی ذمہ داری اس شخص پر کیوں عاید ہو؟ انتخاب طریقت میں اس نے اپنی لیاقت کے مطابق تفکر اور تعقل سے کام لیا اور اسی قدر کا وہ مکلف تھا۔ اسکو مورد الزام و عذاب کرنا بظاہر تکلیف مالایطاق ہے۔

(ب) جناب فرماتے ہیں کہ "قرآن مجید کوئی مسلسل تصنیف نہیں جس میں ترتیب کے ساتھ ہر مسئلے کو ایک ایک جگہ مفصل بیان کیا گیا ہو۔ بلکہ یہ مجموعہ ہے ان آیات کا جو ۲۳ سال کی طویل مدت میں موقع اور ضرورت کے لحاظ سے نجماً نجماً نازل ہوتی رہی ہیں"، مگر پھر بھی ارشاد ہوتا ہے کہ سورۂ آل عمران کو چھٹے رکوع سے لے کر بارہویں رکوع تک مسلسل پڑھا جائے تاکہ تناقض کا شائبہ تک نہ رہے۔ سوال بھیجنے سے پہلے بھی پڑھا تھا اور دوبارہ بھی ان سب آیات کو پڑھا ہے مگر مشکل رفع نہیں ہوتی۔ اہل کتاب کے مجادلوں، ضد، بتر‌ک، کفر وغیرہ کو دیکھ کر ایک متفق روش کی طرف دعوت دی گئی تھی کہ "تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الخ"۔ ان کلمات اور اس دعوت کا کیا مفہوم اور مقصد تھا؟ بظاہر تو یہی ہے کہ تم اگر اپنی سچی تعلیم پر عمل کرو گے اور شرک چھوڑ دو گے تو دعوت الی اللہ کے مشترک کام میں تم اور ہم یکساں ہوں گے۔ دل نہیں مانتا کہ یہ الفاظ یونہی رسمی طور پر دفع الوقتی یا رفع الزام کے لیے کہے گئے اور کہ فی الحقیقت اشتراک فی العمل دعوت مقصود نہ تھا۔

(ج) سوال لکھتے وقت فی الذہن اہل کتاب ہی تھے اور آیات مرقومہ اسی لیے استشہاداً پیش کی گئی تھیں۔ جہاں کہیں اہل کتاب کے اس گروہ کی تعریف کی گئی ہے جو دیانت دار تھے۔ خدا ترس تھے۔ امین تھے شب گزار تھے بعض مفسرین نے اسکی وہی تفسیر کی ہے جس کی طرف آپ گئے ہیں کہ یہ وہ گروہ ہے جو مسلمان ہو چکا تھا۔ جیسے کہ عبداللہ بن سلام، ثعلبہ النصرانی، جبران وغیرہم۔ مگر افسوس کہ اس سے تسلی نہیں ہوتی اور نہ ہی الفاظ قرآن اس کے حامی ہیں مثلاً آیت وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ کے ترجمہ میں آپ یہ فرماتے ہیں کہ "ان میں تھوڑے ایمان لائے اور اکثر نافرمان ہیں"، مومنون اور فاسقون دونوں ساتھ ساتھ مذکور ہیں

اور دونوں اسم فاعل کے صیغے ہیں ان میں سے ایک کے معنی ماضی کے لیئے اور دوسرے کے حال کے اور پھر الفاظ منہم او اکثرہم کے مفہوم کو متعین نہ کرنا کسی طرح ٹھیک نہیں کما لا یخفی علی المتامل - مگر دوسری آیت واضح ترین ہے جس میں ایسی تاویل کی گنجائش ہی نہیں اور جس کا ترجمہ جناب نے نہیں فرمایا یعنی لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ - يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ - وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ - (سب کے سب برابر نہیں اہل کتاب میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ کی آیتیں راتوں کو کھڑے پڑھتے رہتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور روز آخرت پر، نیک کاموں کا حکم کرتے ہیں اور برے کاموں سے منع کرتے ہیں اور نیک کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور یہی لوگ صالحین میں سے ہیں وہ کسی طرح کی بھی نیکی کریں گے اسکی ہرگز ناقدری نہ ہوگی اور اللہ متقین کو خوب جانتا ہے) اسکی تائید قرآن شریف کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں نصاریٰ کی تعریف کی ہے کہ ان میں دیندار طبقہ ہے اور وہ متکبر نہیں ہیں. اگر آیات مذکورہ سے مراد وہی ہیں جو جناب لے رہے ہیں تو فصاحت اور بلاغت قرآنی کو مد نظر رکھتے ہوئے الفاظ مختلف ہوتے

(د) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهِ کے متعلق جناب فرماتے ہیں کہ "اس میں ان تمام لوگوں کو جو پچھلے انبیاء پر ایمان لا چکے ہیں دو چیزوں کی دعوت دی گئی ہے ایک یہ کہ خدا سے ڈریں اور تقویٰ اختیار کریں - دوسرے یہ کہ خدا کے رسول یعنی محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں پھر فرمایا کہ اگر تم

دونوں باتیں اختیار کرو گے تو تم کو خدا کی رحمت سے دو حصے ملیں گے یعنی ایک حصہ انبیاء سابقین پر ایمان، ورتقوے کے اجر میں اور دوسرا حصہ ایمان بر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اجر میں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ تقویٰ اور پرہیزگاری کے ساتھ پچھلے انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں اور انکی دی ہوئی تعلیم پر ٹھیک ٹھیک عامل ہیں ان کو بھی خدا کی رحمت کا ایک حصہ ملیگا، اس کی تائید دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے مثلاً وَالَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِالْكِتَابِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ، مگر ان سب آیات کو ملاکر جو نتیجہ آپنے آخر مضمون میں نکالا ہے تعجب انگیز ہے یعنی ،، ان کو اللہ کی رحمت کا صرف اتنا حصہ ملیگا کہ ان پر عذاب میں تخفیف ہوگی ،، تیلی بھی دیا اور دکھا کھایا۔

کم علمی کی وجہ سے یہ شکوک سوجھے میں اگر جناب و دیگر علمائے کرام مزید توجہ فرماکر ان کو رفع کریں گے تو انشاء اللہ عند الناس مشکور اور عند اللہ ماجور ہوں گے۔ ایک مسلمان

ترجمان القرآن - آپنے جو اعتراضات پیش فرمائے ہیں ان کے جوابات مختصراً درج ذیل ہیں:-

(۱) آپ کا استدلال اگر صحیح مان لیا جائے تو اس سے نہ صرف منکر رسالت کو برسر حق تسلیم کرنا لازم آئے گا بلکہ ہر شخص کے مسلک کو اسکی حد تک صحیح مان لینا لازم آجائے گا خواہ وہ مشرک ہو، یا دہریہ یا کوئی اور۔ کیونکہ جب ہر شخص اپنی وسعت علم و فکر کی حد تک مکلف ہے، اور تلاش حق میں غلطی یا کوتاہی کی ذمہ داری اس پر کچھ نہیں ہے، تو جس طرح وہ موحد مورد الزام و مستحق عذاب نہیں ہے جو غور و فکر کے باوجود رسالت میں نیک نیتی کے ساتھ شک رکھتا ہے، اسی طرح وہ مشرک بھی کسی عقوبت کا مستحق نہ ہونا چاہئے جو ،، نیک نیتی ،، کے ساتھ کسی پتھر یا درخت یا جانور کو خدا سمجھتا ہو اور وہ دہریہ بھی کسی سزا کا مستوجب نہ ہونا چاہئے جو سرے سے خدا ہی کے وجود میں ،، نیک نیتی ،، کے ساتھ شکوک رکھتا ہے کیونکہ یہ سب بھی اپنی وسعت علم و فکر تک مکلف ہیں اور ان کے علم و فکر کی رسائی بھی وہیں تک ہے جہاں تک وہ پہنچے ہیں۔ اس قاعدہ کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو مومن اور کافر اور مشرک کا امتیاز سراسر لغو قرار پائے گا، اور تبلیغ دین کے لیے

سرے سے کوئی عقلی بنیاد ہی باقی نہ رہے گی، کیونکہ دین جن باتوں کی طرف بلاتا ہے ان کو اگر کوئی شخص اپنی کوتاہی نظر کی بنا پر مگر نیک نیتی کے ساتھ رد کردے، تب بھی وہ برسرِ حق ہی رہے گا، اور اپنے اس فعل کے لیے کسی الزام یا کسی سزا کا مستحق نہ ہوگا۔

آپ اس قاعدہ کی بنا آیت لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا پر رکھتے ہیں۔ لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ اگر اس آیت کا وہی مفہوم ہے جو آپ نے سمجھا ہے تو یہ آیت قرآن مجید کی پوری تعلیم کے خلاف ہے، اور اس صورت میں یہ تسلیم کرنا لازم آتا ہے کہ قرآن نے دو بالکل متعارض اصول پیش کیے ہیں۔ ایک طرف تو وہ انسان کو خدا اور اس کے ملائکہ اور کتابوں اور رسولوں اور آخرت پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے، اور کہتا ہے کہ اگر تم ان چیزوں کو نہ مانوگے تو کافر ہوگے اور تم کو آخرت میں سخت سزا دی جائے گی۔ دوسری طرف وہی قرآن (آپ کے زعم کے مطابق) کہتا ہے کہ تم صرف اپنی وسعت علم و فکر تک مکلف ہو، اور اگر تمہاری فکر کی رسائی ان پانچوں ایمانیات یا ان میں سے کسی ایک تک نہ ہو، اور اس نارسائی فکر کی بنا پر تم ایک کو یا سب کو ماننے سے انکار بھی کردو، اور ان کے خلاف کوئی عقیدہ رکھو تب بھی تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اور تم کسی الزام و سزا کے مستحق نہیں ہو۔ یقین مانیے کہ اگر قرآن مجید کی تعلیم میں حقیقتاً اتنا صریح تناقض موجود ہوتا تو کوئی صاحب عقل انسان اس کو خدا کی کتاب نہ مانتا۔

اس اشکال کا حل وہی ہے جو میں اپنے سابق مضمون میں بیان کر چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ تکلیف ہی نہیں دی ہے کہ وہ خود اپنی محدود قوتوں سے اس کی معرفت تک پہونچے اور اس کی بندگی کا صحیح طریقہ دریافت کرنے کی کوشش کرے۔ خالق کائنات خوب جانتا تھا کہ انسان کی وسعت علم و فکر کہاں تک ہے۔ اس کو معلوم تھا کہ عام انسانوں کی قوت فکر اور صلاحیت اکتساب علم اتنی ہے ہی نہیں کہ وہ اس بلند مقام تک پرواز کرسکیں جہاں اس ماورائے سرحد ادراک ہستی کی معرفت حاصل ہوتی ہے، اور نہ وہ اپنی فطری اور خارجی کمزوریوں سے اتنے پاک اور منزہ ہوسکتے ہیں کہ محض اپنے اجتہاد سے اس ذات کے لیے اپنی بندگی کو خالص کردیں۔ اس لیے اس نے ان کی وسعت و طاقت سے زیادہ ان پر تکلیف کا بار ڈالا ہی نہیں۔ اس نے تو ان میں سے خاص بندوں کا انتخاب کرکے ان کو ہدایت کا راستہ دکھا دیا اور ان کو اس بات پر مامور کیا کہ اپنے ابنائے نوع کو اس کی نشانیاں کھول کھول کر بتائیں، اور ان کی عقل و فہم

کے مطابق انہیں تعلیم دیں۔ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ فَمَنِ اتَّقٰی وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۷ : ۳۵) پس تکلیف جو کچھ بھی دی گئی ہے وہ اس امر کی ہے کہ انسان خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں کی سیرت اور ان کی تعلیم پر غور کرے، اور جب دیکھے کہ وہ جس راستے کی طرف بلا رہے ہیں اس میں انکی کوئی ذاتی غرض نہیں ہے، نہ وہ جھوٹ بولنے اور دھوکا دینے والے ہیں، نہ کسی ایسی بات کی طرف بلا رہے ہیں جو تقویٰ اور صلاح کے خلاف ہو، تو ان پر ایمان لائے اور انکی پیروی کرے۔ اس تکلیف کو تکلیف مالا یطاق نہیں کہا جا سکتا۔ اگر ہدایت کو انسان کے علم و عقل سے اتنا قریب کر دینے کے باوجود کوئی شخص نیک نیتی یا بدنیتی کے ساتھ اسکو قبول نہیں کر سکتا، اور اس کے خلاف چلتا ہے تو اسکو اپنی اس کوتاہی کا انجام ضرور دیکھنا پڑے گا۔

آپ پھر پلٹ کر کہیں گے کہ اگر کوئی شخص اپنی وسعت علم و فکر کی حد تک رسولوں کی سیرت اور انکی تعلیم پر غور کرلینے کے باوجود انکی رسالت پر مطمئن نہ ہو سکے تو اس کوتاہی فہم و نارسائی فکر کی اس پر کوئی ذمہ داری نہیں اور اس کو مورد الزام و مستحق عذاب نہ ہونا چاہیئے۔ میں عرض کروں گا کہ جب کوئی شے انسان بحیثیت انسان کی حد عقل و فہم کے باہر ہو، اور کوئی انسان اس تک نہ پہونچے تو البتہ وہ معذور ہے۔ کیونکہ اس شے کی یہ شان ہی نہیں ہے کہ انسان اس تک پہنچ سکے لیکن اگر کوئی چیز اس حد کے اندر ہو، اور اس کی شان یہ ہو کہ انسان بحیثیت انسان ہونے کے، اپنی عام بشری قوتوں کے ساتھ اس حد تک پہنچ سکتا ہو، اور پھر کوئی شخص اس تک نہ پہونچے تو یہ دو حال سے خالی نہ ہوگا۔ یا تو اس نارسائی میں اس کی ہوائے نفس کا دخل ہوگا، یا یہ نارسائی خالصۃً اسکی کوتاہی فہم پر مبنی ہوگی۔ پہلی صورت میں تو اس کے مجرم ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ رہی دوسری صورت تو آپ کو خواہ اس کم عقل انسان پر کتنا ہی رحم آئے، بہرحال اس سے آپ انکار نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی کوتاہ فہمی سے جس نتیجہ پر پہونچا ہے وہ حق نہیں ہے، اور یہ کسی طرح بھی قرین انصاف نہیں کہ جو حق تک نہیں پہونچا ہے وہ انجام کار میں ان لوگوں کے برابر ہو جو حق تک پہونچ گئے ہیں۔

اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ ہر شخص جو کچھ سوچے اور سمجھے گا اپنی وسعت علم و فکر کی حد تک ہی سوچے اور سمجھے گا۔ اس حد سے آگے جانا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آیا حق اور صداقت ہر شخص کی انفرادی

سمجھ بوجھ کے مطابق بدلنے والی چیز ہے یا ایک امر متعین ہے خواہ کوئی شخص اسکو سمجھے یا نہ سمجھے؟ اگر آپ پہلی بات کے قائل ہیں تو گویا آپ یہ کہتے ہیں کہ مثلاً ۳۰ اور ۵۰ کا مجموعہ کوئی مخصوص عدد نہیں ہے، بلکہ ہر شخص اپنی حد تک غور و فکر کے بعد نیک نیتی کے ساتھ جس عدد پر بھی پہنچ جائے وہی صحیح مجموعہ ہے خواہ وہ ۷۹، ہو یا ۸۱ یا ۸۰ مگر یہ ایسی غیر معقول بات ہے کہ آپ اس کے قائل نہیں ہو سکتے۔ لہذا آپ کو لامحالہ دوسری شق ماننی پڑے گی یعنی یہ کہ ۳۰ اور ۵۰ کا مجموعہ بالکل ۸۰ ہے خواہ کسی کی حد علم و فکر وہاں تک پہنچے یا نہ پہنچے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو شخص ۳۰ اور ۵۰ کے مجموعہ کو ۷۹ یا ۸۱ یا کچھ اور کہتا ہے، خواہ کوتاہ فہمی کی بنا پر نیک نیتی کے ساتھ ایسا کہے یا جان بوجھ کر بدنیتی کے ساتھ دونوں صورتوں میں اس کا حساب غلط ہوگا۔ اسکی فرد حساب غلط ہوگی کیونکہ آخر غلط ہوجائیگی اور تمام محنت جو اس نے فرد تیار کرنے میں صرف کی ہے ضائع ہو جائے گی۔ نیک نیتی اور بدنیتی کا کوئی دخل حساب کی صحت و عدم صحت میں نہیں ہے۔ نہ یہ ہو سکتا ہے کہ نیک نیتی کے ساتھ غلط حساب لگانے والے کو اس شخص کے برابر کر دیا جائے جس نے صحیح حساب لگایا ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہوگا کہ نیک نیت احمق کو اتنی سزا نہ دی جائے گی جتنی بدنیت شریر کو دی جائے گی۔

(۲) قرآن مجید کی ترتیب کے بارے میں جو کچھ عرض کیا گیا تھا اس سے یہ کہنا مقصود نہ تھا کہ آیات قرآنی میں کوئی ربط نہیں ہے، بلکہ اس بات کی طرف اشارہ مقصود تھا کہ قرآن مجید میں ایک مسئلہ پر تسلسل کے ساتھ یکجا بحث نہیں کی گئی ہے، بلکہ جہاں جیسا موقع پیش آیا ہے مسائل کے اطراف میں سے ایک طرف یا چند اطراف کو بیان کر دیا گیا ہے اس لئے قرآن مجید کے مطالعہ کرنے والے کو لازم ہے کہ جب وہ کسی مسئلہ پر کوئی رائے قائم کرنا چاہے تو ان تمام اطراف پر نگاہ ڈالے جو مختلف آیات میں بیان ہوئے ہیں۔ اگر صرف ایک آیت یا چند آیات پر حصر کرے گا اور دوسری آیات کو جو اس مسئلہ سے تعلق رکھتی ہیں، نظر انداز کر دے گا تو صحیح رائے قائم نہ کر سکے گا۔

(۳) تعجب ہے کہ آپ نے سورۂ آل عمران کو چھٹے رکوع سے لے کر بارھویں رکوع تک بار بار پڑھا اور پھر بھی مشکل رفع نہ ہوئی۔ حالانکہ چھٹے رکوع کے آغاز ہی میں آپ دیکھ سکتے تھے کہ جو لوگ حضرت ابراہیم اور یعقوب اور یوسف اور موسیٰ اور دوسرے انبیائے بنی اسرائیل علیہم السلام پر ایمان رکھتے تھے ان کو بھی اس بنا پر

دنیا اور آخرت میں عذاب شدید کی دھمکی دی گئی ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ پر ایمان نہ لائے تھے؟ غور کیجیے کہ یہ لوگ مطلقاً رسالت کے منکر نہ تھے۔ صرف ایک رسول کا دعوائے رسالت سن کر انھوں نے اپنی وسعت علم و فکر کم غور کیا اور جب ان کا دل اس پر نہ ٹھکا تو انھوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ مگر اس پر لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کا یہ قاعدہ جواب تجویز فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جاری ہی نہ کیا بلکہ فرمایا تو یہ فرمایا کہ فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ نہ صرف اس مقام پر بلکہ قرآن میں کسی دوسری جگہ بھی کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ اس عذاب کی وعید سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو شرک سے مجتنب اور توحید و تقویٰ کے طریقہ پر قائم ہیں مگر حضرت عیسیٰ کی رسالت میں نیک نیتی کے ساتھ شک رکھتے ہیں۔

(۴) الجھن کی بڑی وجہ وہ آیت ہے جس میں اہل کتاب کو ایک کلمۂ سواء کی طرف بلایا گیا ہے، اور اس میں رسالت محمدی پر ایمان لانے کا ذکر نہیں ہے۔ قبل اس کے کہ اس آیت پر بحث کی جائے، آیت کے اصل الفاظ سن لیجیے:۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۗءٍۢ	اے محمد کہدو کہ اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسے کلمہ کی
بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا	طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔
نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا	یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس
اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا	کے ساتھ کسی شی کو شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی کو
اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ	خدا کے سوا ارباب نہ بنالے۔ پھر اگر وہ اس دعوت سے
(۳ : ۱۳)	روگردانی کریں تو کہدو کہ گواہ رہو، ہم مسلم ہیں۔

اس آیت میں کون سا لفظ ہے جس سے آپ نے یہ معنی نکالے کہ اس کلام سے مقصود یہود و نصاریٰ کو دعوت الی اللہ کے کام میں مسلمانوں کے ساتھ شرکت عمل کی دعوت دینا تھا؟ اور یہ کہاں کہا گیا ہے کہ "اگر تم اپنی صحیح تعلیم پر عمل کرو گے اور شرک چھوڑ دو گے تو دعوت الی اللہ کے مشترک کام میں ہم اور تم یکساں ہونگے؟ اور اس معنی کی طرف

کون سا اشارہ ہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان نہ لانے والے ایمان لانے والوں کی طرح حق پر ہیں اور ان کے برابر درجہ رکھتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے سامنے اپنا دعوائے رسالت پیش کیا اور وہ آپ سے جھگڑا کرنے لگے (جیسا کہ آیت مباہلہ میں اس آیت سے اوپر ہی بیان کیا گیا ہے) تو اللہ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ تم ان کو اس بات کی طرف دعوت دو جو تمہارے اور ان کے درمیان مشترک ہے، یعنی یہ کہ

اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب اور اپنا الٰہ اور حقیقی متبوع نہ بناؤ۔

یہ تینوں باتیں وہ تھیں جو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی اصل تعلیمات میں موجود تھیں مگر یہود و نصاریٰ ان کو چھوڑ بیٹھے تھے۔ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ اور مریم علیہما السلام کو معبود بنا لیا تھا۔ یہودی اور نصرانی دونوں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنے لگے (وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ۔ (۹ : ۰) یہود و نصاریٰ دونوں نے اپنے احبار و رہبان اور مسیح کو ارباب بنا لیا تھا (اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا (۹ : ۵) چونکہ یہود و نصاریٰ کی گمراہی کا آغاز اسی سبب سے ہوا تھا کہ انھوں نے اصل موسوی اور مسیحی مذہب کی اس بنیادی تعلیم کو چھوڑ دیا تھا، اس لیے حکم ہوا کہ پہلے ان کو اس چیز کی طرف بلاؤ جو ان کے اصل مذہب کی بھی تعلیم ہے اور تمہارے دین کی بھی بنیاد ہے۔ اس دعوت سے دو فائدے مقصود تھے۔ ایک یہ کہ اہل کتاب میں سے جو آدمی حق پسند اور سلیم الطبع ہوگا کہ اپنے مذہب کے صدیوں سے متوارث عقائد باطلہ کو چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جائے گا اس کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت تسلیم کر لینے میں پھر کوئی مشکل حائل نہ رہے گی۔ دوسرے یہ کہ اس کلمۂ سواء کی دعوت سے یہود اور نصاریٰ دونوں کو معلوم ہو جائے گا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی چیز کی طرف بلانے والے ہیں جس کی طرف عیسیٰ اور موسیٰ اور دوسرے

انبیاء علیہم السلام بلاتے تھے۔ پھر اُن کی تصدیق کرنے والے کے لیے اِن کی تکذیب کرنے کی کونسی معقول وجہ ہے۔

یہ اس آیت کا صاف اور واضح مفہوم ہے۔ اس سے یہ بات کہاں نکلتی ہے کہ اہل کتاب سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا مطالبہ نہ تھا؟ اور اس سے یہ بات کیسے نکالی جا سکتی ہے کہ اگر اہل کتاب صرف "اپنی سچی تعلیم" پر عمل کریں اور شرک چھوڑ دیں تو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرنے یا آپ کی رسالت میں شک رکھنے کے باوجود ہدایت یافتہ اور مستحق نجات ہوں گے؟ کیا یہ آیت اس آیت کو منسوخ کرتی ہے جس میں تمام نوع انسانی کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ قُلْ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا ...... فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ ...... لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ (۷: ۲۰) اور کیا یہ آیت اس آیت کی بھی ناسخ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جو اس نبی کی نبوت اور اس کے لائے ہوئے پیغام کو نہ مانے گا وہ خسران میں رہے گا۔ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲: ۱۴) اور کیا یہ آیت ان آیات کی بھی ناسخ ہے جن میں خاص طور پر اہل کتاب سے کہا گیا ہے کہ ہمارا رسول تمہارے پاس آیا ہے (مائدہ ۳۔ اعراف ۱۹) کیا قرآن میں کوئی مثال ایسی ملتی ہے کہ کسی قوم کے پاس رسول بھیجا جائے اور وہ اسکو نہ مانے اور پھر بھی ہدایت یافتہ اور مستحق نجات ہی رہے؟ اگر خدا کی طرف سے آئے ہوئے رسول کو ماننا اور نہ ماننا دونوں یکساں ہوں، اور نہ ماننے کی صورت میں بھی اسی طرح نجات نصیب ہو سکے جس طرح ماننے کی صورت میں ہوتی ہے، تو ارسال رُسل سے بڑھ کر لغو اور عبث فعل اور کیا ہوگا؟ بظاہر ایسا خیال کرنے میں بڑی رواداری نظر آتی ہے۔ مگر حقیقت میں غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی طرف اس بات کو منسوب کرنا خدا کو حکمت سے عاری ثابت کرنا ہے۔

(۵) ضمن ج کے تحت آپنے جو کچھ فرمایا ہے اس کے جواب میں وہ بات کافی ہے جو میں ابھی عرض کر چکا ہوں مگر جن دو آیتوں کی طرف آپنے اشارہ فرمایا ہے ان کی مزید تشریح ضروری ہے۔ وَلَوْ اٰمَنَ اَھْلُ الْکِتٰبِ میں اٰمَنَ سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جن کا ذکر اہل کتاب کے لفظ سے کیا گیا ہے ان کا اہل کتاب ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اللہ پر، اپنی کتاب پر، اپنے رسول یا رسولوں پر ملائکہ

اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں۔ اب آپ ہی فرمائیے کہ کس پر ایمان لانے کی کسر باقی رہ گئی؟ اسی طرح (مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ) یعنی انہی اہل کتاب میں سے بعض کو جب مومن کہا گیا ہے تو اس کا مفہوم بھی بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ مومنین وہ اہل کتاب ہیں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے؟ اور معلوم ہے کہ وہ چند ہی تھے ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائے اور انہی کو "فاسق" کہا گیا ہے۔ میں نے ترجمے میں ماضی اور حال کا فرق محض مفہوم کو واضح کرنے کے لئے کر دیا تھا۔ ورنہ اگر آیت کا ترجمہ اس طرح کیا جائے کہ "ان میں سے بعض مومن ہیں اور بعض فاسق" تو اس سے بھی مفہوم نہیں بدلتا۔

رہی دوسری آیت تو اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اہل کتاب میں بھی مدارج کا فرق ہے۔ ان میں سے جو گروہ راتوں کو عبادت کرتا اور کتاب پڑھتا ہے اور خدا اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہے، اور پرہیزگاری کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے، اور نہ صرف خود نیکوکار ہے بلکہ دوسروں کو بھی نیکی کا حکم دیتا اور بدی سے روکتا ہے، وہ اس گروہ سے تو بہر حال بہتر اور بلند تر درجہ میں ہے جو آیات الٰہی کا منکر اور حق سے تجاوز کرنے والا، اور بدکار و نافرمان ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان دونوں گروہوں کو یکساں سمجھا جائے اور ان کا انجام ایک ہی سا ہو تو یہ عدل کے خلاف ہوگا ان بدکاروں کے مقابلہ میں ان نیکوکاروں کی قدر یقیناً ہونی چاہئے اور ہوگی بھی مگر یہ پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ ان متقی اور نیک اہل کتاب کے حق میں بھی بہتر یہی تھا کہ وہ نبی امی پر ایمان لے آتے (وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ) کیونکہ خدا نے جس نبی کو بھی بھیجا ہے، اسی لئے بھیجا ہے کہ اس کی بات مانی جائے (وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ) اور جو شخص خدا کے رسول کی بات نہیں مانتا، دراصل خدا کی بات نہیں مانتا (مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ) اسی کا نام "فسق" ہے (مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ) اور فسق کرنے والے کو دار الفاسقین ضرور دکھایا جائے گا۔

(۶) آیت يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ کی تفسیر میں جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ کلمۂ شک کے ساتھ ہے میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ پرہیزگار اور صالح اہل کتاب کو اللہ کی رحمت میں سے کتنا حصہ

ملیگا اور ان کے اعمال کی قدر کس صورت میں ہوگی ؟ اس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، اور اللہ نے اپنی کتاب میں جب اس کی کوئی تصریح نہیں کی ہے تو مجھے اور کسی کو بھی اپنی رائے سے اسکی تعیین کرنے کا کوئی حق نہیں۔ میں یقین کے ساتھ جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ بس اسی قدر ہے کہ نہ تو وہ اس ادنیٰ درجہ میں رکھے جائیں گے جو بدکار کافروں کے لیے ہے، اور ان کامل الایمان لوگوں کے ہم مرتبہ دیئے جائیں گے جو تمام رسولوں کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور تمام کتابوں کے ساتھ قرآن مجید پر ایمان لائے ہیں۔

قرآن اور سنتِ رسول ﷺ

حضرت محترم ادام اللہ فضلکم۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ! میں متواتر ضرورت حدیث کے سلسلہ میں آپ کا سلسلہ مضامین دیکھ چکا ہوں۔ میں نہ تو آں غالی مخالفین احادیث سے ہوں کہ کسی قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھکرا دوں اور نہ کورانہ روایات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوں آپ سے ان دو اصولوں کے ماتحت ارسال کے ماہ نامہ اول کے اشارات کی دی ہوئی اجازت کی رو سے کہ صرف تحقیق کے زاویہ نگاہ سے ہے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میری اور میرے احباب کی تسلی فرمائیں۔

اصول نمبر (۱) آیا قرآن حکیم نجات کے لیے کافی ہے یا نہیں ؟ اگر کافی ہے تو تفصیلات نماز وغیرہ جو غیر از قرآن ہیں کیوں فریضہ اولین قرار دی جائیں ؟

مزید قابل غور امر یہ ہے کہ باقی ارکان اسلام مثلاً زکوۃ۔ حج (جو سال میں یا عمر بھر میں ایک دفعہ ادا کرنے ضروری ہیں) کی تفصیلات تو قرآن بیان کرتا ہے لیکن نماز جو ایک دن میں ۵ دفعہ ادا کرنی ضروری ہے اس کی تفصیلات رکعت وغیرہ کیوں بیان نہیں کرتا ؟

اصول نمبر ۲ (الف) مسلمانوں کی تباہی کا سبب کیا روایات نہیں ہیں ؟

(ب) کوئی قوم جس کا شیرازہ منتشر ہو گیا ہو اور جس کے لیے مختلف آرڈر موجود ہوں اس وقت ترقی نہیں کر سکتی جب تک ایک آرڈر پر اصول وحدت نہ ہو جائے۔ کیا روایات کے قبول کرتے ہوئے مسلم قوم کے لیے آپ ایک آرڈر کی توقع رکھ سکتے ہیں؟ میرا ایمان ہے کہ اس وقت مسلمان صرف وحدت و یگانگت اور اتحاد ملی سے نجات حاصل کر سکتے ہیں اصولاً اس وحدت کا حل آپ کیا تجویز کریں گے۔

خادم عبد الحمید مرزا۔ سیالکوٹ

ترجمان القرآن۔ آپ نے جو سوالات کیے ہیں وہ اتنے پیچیدہ نہیں ہیں کہ تھوڑے سے تامل سے خود آپ ہی ان کا جواب نہ پا لیتے۔ ترجمان القرآن کے اُن مضامین میں بھی جن کا آپ نے حوالہ دیا ہے، ان میں سے بعض سوالات کا حل موجود ہے۔ "ہم جب آپ کو ان مسائل میں الجھن پیش آ رہی ہے اور کچھ دوسرے لوگ بھی اس الجھن میں مبتلا ہیں تو ان کی تشفی کے لیے مختصراً کچھ عرض کیا جاتا ہے:۔

(۱) قرآن حکیم "نجات" کے لیے نہیں بلکہ "ہدایت" کے لیے کافی ہے۔ اس کا کام صحیح فکر اور صحیح عمل کی راہ بتانا ہے اور اس رہنمائی میں وہ یقیناً کافی ہے۔ مگر نجات کے لیے صرف قرآن کا پڑھ لینا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم خلوص نیت کے ساتھ اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلیں اور وہی اعتقاد رکھیں جس کی تعلیم قرآن نے دی ہے، اور اسی قانون کے مطابق عمل کریں جس کے اصول قرآن نے مقرر کیے ہیں۔

(۲) ہدایت کے لیے قرآن کے کافی ہونے کا مفہوم بھی عام طور پر غلط سمجھا جاتا ہے۔ کسی کتاب کے متعلق جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ کسی علم یا فن کی تعلیم کے لیے کافی ہے، تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس فن کے جتنے گُر ہیں، یا اس علم کے جتنے اہم مسائل ہیں وہ سب اس کتاب میں آگئے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہر شخص جو اس کتاب کے الفاظ کو پڑھ سکتا ہو، اس کے تمام مطالب پر حاوی ہو جائے گا، اور محض کتاب کے مطالعہ ہی سے اس کو اپنے فن میں اتنی مہارت بھی حاصل ہو جائے گی کہ وہ عملاً اس سے کام لے سکے۔ کتاب اپنی جگہ کتنی ہی کامل سہی۔ لیکن دوسری طرف اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک طرف تو خود طالب علم میں ایک خاص استعداد موجود ہو، اور دوسری طرف ایک ماہر فن استاد بھی نہ جو نہ صرف کتاب کے

مطالب کی توضیح و تشریح کرے، بلکہ مشاہدہ اور مشق و تمرین کے ذریعہ سے فن کی وہ عملی تفصیلات بھی سکھا دے جو نہ تو کتابوں میں پوری طرح بیان ہو سکتی ہیں، اور نہ محض کتابیں پڑھنے سے کوئی ان پر علم و عمل کے اعتبار سے حاوی ہو سکتا ہے۔ بس یہی حال قرآن مجید کا بھی ہے۔ وہ اس لحاظ سے ہدایت کے لیے کافی ہے کہ اس میں وہ صحیح علم موجود ہے جس کی روشنی میں انسان صراط مستقیم پر چل سکتا ہے اور وہ تمام اصول اس میں بیان کر دیے گئے ہیں جن پر اللہ کا پسندیدہ دین قائم ہے۔ مگر اس علم سے فائدہ اٹھانے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ طالب علم استفادہ کی خالص نیت رکھتا اور ان علوم سے واقف ہو جو قرآن کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔ دوسرے یہ کہ ایک ماہر فن استاد موجود ہو جو کتاب اللہ کے نکات سمجھائے، آیات کا صحیح معنی و مفہوم بتائے، احکام پر خود عمل کر کے دکھائے، اور اصول قوانین کو عملی زندگی میں نافذ کر کے ان کا تفصیلی ضابطہ مقرر کر دے۔ پہلی چیز کا تعلق ہر شخص کی اپنی ذات سے ہے۔ رہی دوسری چیز تو اس کا انتظام اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔ کتاب کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی غرض سے بھیجا گیا تھا کہ آپ اس ماہر فن استاد کی ضرورت کو پورا کریں۔ آپ نے استاد کی حیثیت سے جو کچھ بتایا اور سکھایا ہے وہ بھی اسی طرح خدا کی طرف سے ہے جس طرح قرآن خدا کی طرف سے ہے۔ اسکو "غیر از قرآن" کہنا صحیح نہیں ہے۔ جو شخص اسکی ضرورت کا منکر ہے، اور قرآن کو اس معنی میں کافی کہتا ہے کہ اس کو سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی و عملی ہدایت کی حاجت نہیں ہے، وہ درحقیقت یہ کہتا ہے کہ صرف قرآن کی تنزیل کافی تھی خدا نے نعوذ باللہ یہ فعل عبث کیا کہ اس کے ساتھ رسول کو بھی مبعوث کیا۔

(۴) آپ پوچھتے ہیں کہ "تفصیلات نماز وغیرہ جو "غیر از قرآن" ہیں کیوں فریضۂ اولین قرار دی جائیں" اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی تفصیلات نماز وغیرہ کو غیر از قرآن کہنا ہی سرے سے غلط ہے۔ اگر کوئی ماہر فن طبیب فن طب کے کسی قاعدہ کو عملی تجربہ کر کے شاگردوں کو سمجھائے تو آپ اسے خارج از فن نہیں کہہ سکتے۔ اگر کوئی پروفیسر اقلیدس کے کسی مسئلہ کو اشکال کھینچ کر تشریح و تفصیل کے ساتھ سمجھائے تو آپ اس کو "غیر از اقلیدس" نہیں کہہ سکتے۔ ہر علم و فن کی اصولی کتابوں میں صرف اصول اور اہمات مسائل بیان کر دیے جاتے ہیں، اور عملی تفصیلات

استاد کے لیے چھوڑ دی جاتی ہیں، کیونکہ استاد عملی مظاہرے سے جس بات کو چند لمحوں میں بتا سکتا ہے، اسی کو اگر الفاظ میں بیان کیا جائے تو صفحے کے صفحے سیاہ ہو جائیں اور پھر بھی شاگردوں کے لیے لفظی بیان کے مطابق ٹھیک ٹھیک عمل کرنا مشکل ہو جائے۔ کتاب کے حسن کلام اور اس کے کمال ایجاز کا غارت ہو جانا مزید برآں۔ یہ حکیمانہ قاعدہ جس کو معمولی انسان تک اپنے علوم و فنون کی تعلیم میں ملحوظ رکھتے ہیں، آپ کی خواہش ہے کہ وہ سب سے بڑا حکیم جس نے قرآن نازل کیا ہے اس کو نظر انداز کر دیتا۔ آپ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں نماز کے اوقات کا نقشہ بناتا۔ رکعتوں کی تفصیل دیتا، رکوع و سجود اور قیام و قعود کی ہیئتیں تفصیل کے ساتھ بیان کرتا، بلکہ نماز کی رائج الوقت کتابوں کی طرح ہر ہیئت کی تصویر بھی مقابل کے صفحات پر بنا دیتا، پھر تکبیر تحریمہ سے لیکر سلام تک نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے وہ بھی لکھتا، اور اس کے بعد وہ مختلف جزئی مسائل تحریر کرتا جن کے معلوم کرنے کی ہر نمازی کو ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح قرآن کے کم از کم دو تین پارے صرف نماز کے لیے مخصوص ہو جاتے۔ پھر اسی طور پر دو دو تین تین پارے روزہ، حج اور زکوٰۃ کے تفصیلی مسائل پر بھی مشتمل ہوتے۔ اس کے ساتھ شریعت کے دوسرے معاملات بھی جو قریب قریب زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہیں، جزئیات کی پوری تفصیل کے ساتھ درج کتاب کیے جاتے۔ اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ آپ کی یہ خواہش تو پوری ہو جاتی کہ شریعت کا کوئی مسئلہ "غیر از قرآن" نہ ہو۔ لیکن اس سے قرآن مجید کم از کم انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے برابر ضخیم ہو جاتا، اور وہ تمام فوائد باطل ہو جاتے جو اس کتاب کو محض ایک مختصر سی اصولی کتاب رکھنے سے حاصل ہوئے ہیں۔

(۴) یہ تو آپ کو بھی تسلیم ہے کہ قرآن حکیم میں نماز وغیرہ کی تفصیلات بیان نہیں کی گئی ہیں بلکہ صرف ارکان اسلام کی فرضیت پر زور دیا گیا ہے، ان کے قائم کرنے کی بار بار تاکید کی گئی ہے، اور کہیں کہیں ان کے ادا کرنے کے طریقوں کی طرف بھی اشارات کر دیے ہیں جو عملی تفصیلات پر کسی طرح بھی مشتمل نہیں کہے جا سکتے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان تفصیلات کو مقرر کرنے والا کون ہے؟ کیا وہ ہر شخص کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دی گئی ہیں کہ جو جس طرح چاہے عمل کرے؟ اگر ایسا ہوتا تو دو مسلمانوں کی نمازیں بھی شاید ایک طریقے پر نہ ہوتیں۔ نہ دوسرے ارکان اسلام کے عملی طریقوں میں مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کی ہم آہنگی پائی جاتی۔ آج آپ جس "شیرازۂ قومی" کے انتشار کا ماتم فرما رہے ہیں، وہ صرف چند

اُردوؤں کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ تاہم ہر اُردو میں لاکھوں کروڑوں مسلمان مجتمع ہیں۔ لیکن اگر ہر شخص قرآن کے احکام کی عملی تفصیلات مقرر کرنے میں مختار رہتا، تو اسلام کے پیروؤں میں سرے سے کوئی اُردو ہی نہ ہوتا۔ ان مختلف افراد کو جس چیز نے ایک قوم بنایا ہے وہ اعتقاد و عمل کی یک رنگی و یکسانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اور یہ معلوم ہے کہ نظام جماعت کو قائم کرنے میں اعتقادی اشتراک سے بڑھ کر عمل کا اشتراک کارگر ہوتا ہے، کیونکہ انسان حواس کا بندہ ہے، اور اس کے حواس کو محسوس صورتیں ہی متاثر کر سکتی ہیں، اور انہی صورتوں کی یکسانی و یک رنگی اس میں جمعیت کا احساس پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا طریقہائے عمل کو افراد کے اختیار پر چھوڑ دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ محض اعتقاد کے اشتراک سے مسلمان کبھی ایک قوم نہ بن سکتے۔ پھر جب وحدت قومی کے لئے اتحاد عمل ناگزیر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں وہ تفصیلات نہیں دیں جن سے یہ اتحاد حاصل ہو سکتا تھا تو آخر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون تھا جس کے مقرر کئے ہوئے طریقوں کو تمام امت بالاتفاق واجب التقلید سمجھتی اور جس کی پیروی پر ہر زمانے اور ہر ملک کے کروڑوں متبعین اسلام مجتمع ہو جاتے؟ یہ آنحضرتؐ ہی کا فیض تعلیم تو ہے جس کی بدولت آج ساڑھے تیرہ سو برس سے تمام مسلمان ایک ہی ہیئت سے نماز پڑھتے ہیں، ایک ہی طریقہ سے حج کرتے ہیں، ایک ہی زمانہ میں ایک ہی طرح روزے رکھتے ہیں۔ فرق جو کچھ بھی ہے محض جزئیات کا ہے، اور وہ بھی اس بنا پر نہیں ہے کہ کوئی مسلمان خود اپنے آپ کو ان جزئیات کے مقرر کرنے کا حق دار سمجھتا ہو، بلکہ اس بنا پر ہے کہ ہر گروہ اپنے علم کے مطابق اسی جزئیہ کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے مسنون سمجھتا ہے جس پر وہ عامل ہے۔ باقی رہی حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی امامت، اور آپ کی سنت کا واجب التقلید ہونا تو گنتی کے چند افراد کے سوا تمام امت اس پر متفق ہے، اور اسی اتفاق پر مسلمانوں کی وحدت قومی کا انحصار ہے۔

(۵) آپ قرآن مجید میں ایک مرتبہ پھر غور سے ملاحظہ فرمائیے کہ اس میں روزہ، حج، اور زکوٰۃ کی تفصیلات کہاں ہیں؟ زکوٰۃ کے متعلق تو یہ بھی نہیں بتایا گیا ہے کہ کن چیزوں پر کتنی زکوٰۃ دی جائے، اور زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے؟ حج اور روزہ کے جن احکام کو آپ تفصیلات سے تعبیر کر رہے ہیں وہ نماز کے احکام سے بھی زیادہ مجمل ہیں۔ آپ غور سے دیکھیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ قرآن مجید میں اول سے آخر تک اس قاعدہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ وہ دوران بیان ایمانیات کی

تعلیم میں صرف کیا جائے کیونکہ وہی دین کی بنیاد ہیں، اور عبادات و معاملات کے صرف اصول، اور امہات مسائل بیان کر کے تفصیلات کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر چھوڑ دیا جائے۔

(۶) مسلمانوں کی تباہی کا سبب روایات نہیں ہیں بلکہ نفسانیت، اور عصبیت جاہلیہ، فروع کو اصول سے بڑھ کر اہمیت دینے کی حماقت، اور کتاب اللہ و سنت رسول کو چھوڑ کر اپنے مزعومات میں حد سے زیادہ غلو کرنے کی عادت، اور نئے نئے طریقے ایجاد کرنے کا شوق ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو روایات کے اختلافات کوئی فتنہ پیدا نہیں کرسکتا کیونکہ روایات خواہ ضعیف ہوں یا قوی، اور ان کے درمیان خواہ کتنا ہی اختلاف پایا جاتا ہو، بہرحال ان سب کا مرجع رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، اور ان مختلف روایتوں کو ماننے والے اس امر میں بہرطور متفق ہیں کہ وہ سب آنحضرت صلعم کو اپنا متبوع اور پیشوا مانتے ہیں۔ علاوہ بریں روایات کے اختلاف سے صرف فروع میں اختلاف واقع ہوتا ہے۔ باقی رہے اصول دین تو وہ سب کے سب کتاب پاک میں موجود ہیں جو روایات سے بالاتر، اور تمام مسلمانوں میں مشترک ہے۔ پس اگر مسلمان خلوص نیت کے ساتھ اس حقیقت کا ادراک کرلیں کہ وہ سب کتاب اللہ کے ماننے والے اور رسول اللہ صلعم کا اتباع کرنے والے ہیں، اور ان کے درمیان اصول دین مشترک ہیں، تو وہ اختلاف مٹ سکتا ہے جو تمام فتنوں کا منبع ہے۔ اور اگر اس کا ادراک نہ ہو تو روایات کا سارا دفتر نذر آتش کر دینے سے بھی اختلاف دور نہیں ہوسکتا۔ انسان کے نفس میں وہ شیطان موجود ہے جو قرآن کو بھی جنگ وجدل کا آلہ بنانے سے نہیں چوکتا۔

(۷) "ایک آرڈر" آپ کس معنی میں چاہتے ہیں؟ اگر آپ کا مقصد یہ ہے کہ فروع میں کوئی اختلاف نہ ہو تو جب تک انسان کی فطرت نہ بدل جائے، یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ بشری فطرت کے ساتھ تو یہ بھی ممکن نہیں کہ صرف دو ہی آدمیوں کا نقطہ نظر بالکلیہ ایک ہو جائے۔ لہٰذا ایسا "ایک آرڈر" تو کبھی قائم نہیں ہوسکتا جس میں کسی نوع کا اختلاف رائے اور اختلاف عمل سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ ہاں اگر آپ "ایک آرڈر" سے مراد ایسا آرڈر لیتے ہیں جو اصولوں کی وحدت پر مبنی ہو تو خدا کی کتاب اور اس کے رسول نے ایسا ہی آرڈر قائم کیا تھا اور

وہ ہر وقت قائم ہو سکتا ہے بشرطیکہ مسلمان اصول اور فروع کا فرق سمجھ لیں اور دونوں کے مراتب میں امتیاز کرنا سیکھ جائیں۔

حدیث ادبر الشیطان لہ ضراط

جمادی الاولیٰ کے اشارات میں حدیث اذا نودی للصلوٰۃ ادبر الشیطان لہ ضراط کی جو شرح کی گئی تھی اس پر لاہور کے ایک صاحب نے اعتراض کیا ہے۔ ان کا خط بجنسہ اسلیے درج نہیں کیا جاتا کہ اسکی زبان نامناسب ہے، اور اس میں علماء اہل حدیث کے لیے سخت الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ خلاصہ ان کے اعتراض کا یہ ہے:-

"آپ نے بخاری کے ادبر الشیطان لہ ضراط کو مسلم کے لہ حصاص کے سامنے بے حقیقت اور محض استعارہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اور ان لوگوں کو کودن قرار دیا ہے جو حدیث بخاری کے الفاظ کو ظاہر پر محمول کر کے یہ فرض کر لیتے ہیں کہ شیطان پیٹ رکھتا ہے اور اس سے ریاح خارج ہوتے ہیں۔ لیکن علماء اہل حدیث اس سے متفق نہیں ہیں۔ ان کے لٹریچر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک شیطان کا مجسم ہونا اور اس کے پیٹ سے ریاح کا خارج ہونا ایک مسلّم حقیقت ہے۔ با ایں ہمہ آپ کے جواب سے نفس اعتراض پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ اصل اعتراضات ہنوز طے نہیں ہوئے۔ از انجملہ ایک عام اعتراض جو روز سننے میں آتا ہے یہ ہے کہ اذان سن کر شیطان کا بھاگ جانا مگر نماز پڑھنے کی حالت میں معاً پھر نہ صرف لوٹ آنا بلکہ نمازیوں کے دل و دماغ پر مسلط ہو جانا آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ آیا اذان نماز سے بہتر ہے یا خود نماز میں ایسی کوئی خرابی موجود ہے جس کے باعث شیطان کو ایسے تسلط کا موقع مل جاتا ہے کہ از روئے روایات خود رسول اللہ کم رکعتیں بھول لئے اور بروئے حکایت علماء امام غزالی تک نماز میں نفس نماز سے منحرف ہو کر ادھر ادھر کے خیالات میں منہمک ہو جاتے تھے؟ براہ مہربانی واضح طور پر بتلایئے کہ نماز میں بمقابلہ اذان کے شیطانی تسلط قائم ہونے کے وجوہ کیا ہیں؟"

میں نے حدیث بخاری کے الفاظ کو حدیث مسلم کے الفاظ کے سامنے بے حقیقت ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ صرف یہ کہا تھا کہ مسلم میں جو الفاظ آئے ہیں وہ حدیث بخاری کے الفاظ کی تفسیر کرتے ہیں۔ مختلف احادیث پر نظر ڈالنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر اذان کی تاثیر کو مختلف طریقوں سے بیان فرمایا ہے۔ ان سب ارشادات کو ملا کر پڑھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اصل مقصد اذان کا یہ اثر بیان کرنا تھا کہ اس کو سن کر شیطان بھاگ جاتا ہے، اور اس کے دوران میں انسان شیطانی وساوس سے محفوظ رہتا ہے۔

علماء اہل حدیث کی رائے اگر اس سے مختلف ہے تو ان کے دلائل معلوم ہونے کے بعد میں کچھ عرض کر سکونگا میں نے جہاں تک کتاب اللہ کا مطالعہ کیا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس اور اس کی ذریت اور جن انسان و حیوان کی طرح مادی جسم نہیں رکھتے، بلکہ آتشین مخلوق ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ابلیس کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ۔ اور جنوں کے متعلق حق تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا ہے کہ وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ۔ اور ابلیس کے متعلق ارشاد ہے کہ کَانَ مِنَ الْجِنِّ۔ ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ شیطان کی حقیقت انسان سے مختلف ہے۔ نہ وہ انسان کا سا جسم رکھتا ہے اور نہ اس پر وہ احوال گزرتے ہیں جو انسان پر گزرا کرتے ہیں، مثلاً اکل طعام و اخراج ریاح وغیرہ۔ باقی رہی یہ بات کہ حدیث نبوی کے الفاظ لہٗ ضراطٌ کو شیطان کے صاحب شکم ہونے اور اس سے ریاح خارج ہونے کے لیے دلیل قرار دیا جائے تو میرے خیال میں یہ صحیح نہیں ہے۔ لغت عرب میں ضراط کا لفظ محض ریح شکم کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ مجازاً بہت سے معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً خفت کے معنی میں، چنانچہ بالوں کی کمی کو الضرط کہتے ہیں اور جس شخص کی ڈاڑھی ہلکی ہو اس کو اَضْرَط کہا جاتا ہے۔ جس عورت کی بھویں ہلکی ہوں وہ ضَرْطاء کہلاتی ہے۔ انکار اور استخفاف کے معنی میں۔ یقال اضرط فلان بفلان اذا استخف به وسخر منه۔ اور حدیث علی رضی اللہ عنہ میں ہے کہ انه دخل بیت المال فاضرط به ای استخف به وسخر منه۔ ناپسندیدگی اور کراہت کے معنی میں۔ وفی المثل الاکل سرطان والقضاء ضرطان۔ وتاویل ذالک تحب ان تاخذ وتکرہ ان ترد اس سے

معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں شیطان کے بھاگنے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے حضورؐ نے "له ضراط" جو فرمایا ہے، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بھاگتے وقت فی الواقع اس کے پیٹ سے ریاح خارج ہوتے ہیں بلکہ اس سے مراد ایسی شدت فرار ہے جس میں خوف اور کراہت اور گھبراہٹ بھی شامل ہے۔ خود ہماری زبان کے محاورات میں بھی گوز کرنے کا لفظ حقیقی معنی پر محمول نہیں کیا جاتا بلکہ اس سے اضطراب اور خوف اور بدحواسی اور عجز وغیرہ کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کہیں کہ فلاں شخص گوز کرتا ہوا بھاگا تو کوئی بھی اس کا یہ مفہوم نہیں لیتا کہ فی الواقع بھاگتے وقت اس کے پیٹ سے ریاح خارج ہو رہے تھے، بلکہ اس سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ سخت بدحواسی اور خوف کی حالت میں بھاگا۔ پس جب انسان کے متعلق یہ الفاظ سن کر آپ ان کو حقیقت پر محمول نہیں کرتے، حالانکہ انسان پیٹ رکھتا ہے اور اس سے ریاح خارج ہونا ایک امر طبیعی ہے، تو پھر شیطان کے حق میں یہ الفاظ سن کر آپ ان کو حقیقت پر کس طرح محمول کر سکتے ہیں، درانحالیکہ وہ انسان وحیوان کا سا جسم نہیں رکھتا؟

میں اپنے محدود علم کی بنا پر اس حدیث کے معنی کی جو تحقیق کر سکتا تھا وہ میں نے بیان کر دی ہے۔ اگر کوئی شخص میری تحقیق کو غلط ثابت کر دے تو میں اس سے رجوع کرنے میں کبھی تامل نہ کروں گا۔ الحمدللہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی رائے کو وحی والہام سمجھتے، اور اختلاف کرنے والوں کو گالیاں دیتے ہیں۔

رہا آپ کا یہ سوال کہ جب اذان سن کر شیطان بھاگ جاتا ہے تو نماز پڑھنے میں واپس کیوں آجاتا ہے؟ اور کیا نماز اذان سے فروتر چیز ہے؟ تو اس کا جواب میرے ذمہ نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ سے دریافت کرنا چاہئے کہ اس نے اذان اور نماز کے درمیان کیا فرق رکھا ہے جس کا یہ اثر ہے۔ یا پھر شیطان سے پوچھنا چاہئے کہ تو اذان کی آواز سن کر بھاگ کیوں جاتا ہے اور نماز پڑھنے میں واپس کیوں آجاتا ہے؟ مگر ایک بات میں بھی آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ حدیث میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے آیا وہ صحیح ہے یا نہیں؟ آپ کا خود اپنا تجربہ اس کی تصدیق کرتا ہے یا نہیں؟ دوسرے نماز پڑھنے والوں کے تجربات بھی اس کی تائید کرتے ہیں یا نہیں؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اذان کی آواز سن کر ہر نمازی مسلمان کا دل یکایک ذکر الٰہی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، اور وہ چند لمحے شیطانی وساوس سے خالی گزرتے ہیں، لیکن نماز پڑھتے میں طرح طرح کے خیالات آکر اسکو گھیر لیتے ہیں، اور ایسی باتیں یاد آتی ہیں جو نماز شروع کرنے سے پہلے اس کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں ہوتیں؟ اگر یہ واقعہ ہے اور آپ کا ذاتی تجربہ

بھی لکل تشابہ ہے تو آپ اسکی تصدیق کو اسکی وجہ معلوم ہونے پر کیوں موقوف رکھتے ہیں؟ کیا واقعہ کو واقعہ تسلیم کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ آپکو اسکی وجہ معلوم ہو جائے؟ اگر کسی واقعہ کی وجہ نہ معلوم ہو تو کیا آپ اس کے واقعہ ہونے سے انکار کر دیں گے؟ اگر آپ کسر میں درد ہو اور اسکی وجہ سمجھ میں نہ آئے تو کیا آپ اپنے احساس درد کو جھٹلا دیں گے؟ یہ بات تو بالکل عقل عام COMMON SENSE سے تعلق رکھتی ہے کہ واقعہ کو واقعہ ماننے کے لیے وجہ کا معلوم ہونا شرط نہیں ہے۔ آپ دنیا کے بہت سے واقعات کو تسلیم کرتے ہیں درانحالیکہ آپکو انکی وجہ معلوم نہیں ہوتی پھر آخر یہ حجت طلبی مذہبی لٹریچر ہی کے ساتھ کیوں مخصوص ہو گئی ہے کہ اگر اس کے کسی بیان کی تائید تجربہ و مشاہدہ سے بھی ہو جائے تو اسے ماننے کو دل نہیں چاہتا جب تک کہ اسکی وجہ معلوم نہ ہو جائے؟ اور اگر اسکی وجہ بھی معلوم ہو جائے تو پھر تصدیق میں یہ سوال مانع ہو جاتا ہے کہ جب اس خاص معاملہ میں یہ واقعہ پیش آتا ہے تو ایک دوسرے معاملہ میں بھی یہی واقعہ کیوں پیش نہیں آتا؟

آپ پوچھتے ہیں کہ کیا نماز اذان سے بہتر ہے یا نماز میں کوئی ایسی خرابی موجود ہے جس کے باعث حالت نماز میں شیطان کو تسلط کا موقع مل جاتا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ شیطان کے بھاگنے اور واپس آجانے سے نہ تو نماز پر اذان کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور نہ نماز میں کسی خرابی کا موجود ہونا لازم آتا ہے۔ اس سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اذان اور نماز کی کیفیات میں فرق ہے۔ شیطان کے لیے ان دونوں میں جو کچھ فرق ہے اسکو ہم نہیں جان سکتے، نہ وہ ہم کو بتایا گیا ہے۔ البتہ نفس انسانی کے لیے ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ہم سمجھ سکتے ہیں۔ نفسیات کا ایک معمولی نکتہ ہے کہ جب کوئی آواز انسان کی توجہ کو دفعتہً اپنی طرف جذب کرتی ہے تو تھوڑی دیر کے لئے انسان کا نفس دوسرے مشاغل سے ہٹ کر اسکی جانب متوجہ ہو جاتا ہے۔ مگر جب انسان کسی کام میں زیادہ دیر تک مشغول رہتا ہے تو بغیر خاص کوشش کے اسکو پوری جمعیت خاطر — CNOCENTRATION حاصل نہیں ہوتی، اور خیالات ادھر ادھر بھٹکنے لگتے ہیں۔ عوام پر یہ حالت اکثر گزرتی ہے، کیونکہ وہ جمعیت خاطر اور کامل توجہ الی اللہ بہم پہونچانے پر کم قادر ہوتے ہیں لیکن خواص بھی باوجود اسپر خاص قدرت رکھنے کے کبھی کبھی بتقاضائے بشریت محض اضطراری طور پر انتشار خیال میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اذان اور نماز کا یہ فرق دونوں کی کیفیتوں کے فرق پر مبنی ہے، نہ کہ خدا کی جناب میں انکی مقبولیت اور ان کے مراتب کے فرق پر۔

مطبوعات

تصدیق احمدیت از جناب سید بشارت احمد صاحب جنرل سیکرٹری جماعت احمدیہ حیدر آباد۔ دکن ضخامت ۲۲۲ صفحہ۔ ملنے کا پتہ :۔ احمدیہ کتاب گھر، جوبلی ہال، افضل گنج، حیدر آباد۔ دکن۔

یہ کتاب، الحاج مولوی محمد الیاس برنی صاحب استاذ معاشیات کلیۂ جامعہ عثمانیہ کی تالیف "قادیانی مذہب" کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ لائق مجیب نے نہایت کاوش و محنت سے اپنے پیشوا اور ان کے خلفاء و متبعین کی تحریرات کی تشریح کو تاویل کی ہے لیکن مذہبی جوش میں وہ ذرا تہذیب و متانت کے طریق سے ہٹ گئے ہیں۔ مثلاً لکھا ہے :" ان کی پوری کتاب وسادس انگیزی اور دسیسہ کاریوں کا مجموعہ ہے" (ص ۱) " برنی صاحب نے اس اخلاقی کمزوری اور علمی خیانت کا ارتکاب کیا" (ص ۲)" برنی صاحب اپنا پایہ مواد فاسد خارج کرلیں" (ص ۴) " اگرچہ حسن ظن صحیح ہے تب بھی حافظہ نباشد کی مثال ضرور صادق آتی ہے" (ص ۲۲)" چہ دلاور ست دزدے کہ بکف چراغ دارد" (ص ۴۱) اور اسی طرح کے بکثرت ذاتی حملے ہیں جنھوں نے اس کتاب کو متانت تحریر کے بلند درجہ سے گرا دیا ہے۔ مذہبی مباحثہ میں ہمیشہ اصول پیش نظر رکھنا چاہیے کہ سخت الفاظ کے بجائے مضبوط دلائل سے اپنے مذہب کو حق ثابت کیا جائے کیونکہ کسی مذہب کی حقانیت کو الفاظ کی سختی سے نہیں بلکہ دلائل کی مضبوطی ہی سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ جو شخص دلائل کے بجائے الفاظ کی قوت سے کام لیتا ہے وہ در اصل یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کے پاس اپنے مذہب کی تائید میں کافی دلایل نہیں ہیں۔

رہا اصل مسئلہ تو اس کتاب نے برنی صاحب کے الزام کی توثیق کردی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ برنی صاحب نے مخالفانہ پہلو سے اس الزام کو پیش کیا تھا اور بشارت احمد صاحب نے موافقت کے ساتھ اسی الزام کو تسلیم کرلیا۔ برنی صاحب نے میرزا صاحب کی کتابوں سے یہ ثابت کیا تھا کہ وہ مدعی نبوت تھے۔ "تصدیق احمدیت" کے لائق مؤلف نے بھی میرزا صاحب کی تحریرات سے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ فی الواقع مرزا صاحب کا یہی دعویٰ تھا۔ انھوں نے اپنے اس عقیدے کا

اعلان کیا ہے کہ "جن لوگوں نے حضرت مرزا صاحب کے دعویٰ مسیح موعود و مہدی معہود کو قبول کیا ہے ان کو مجبوراً ان کے لوازم فضیلت اور خصوصیت نبوت کو قبول کرنا پڑے گا۔"

قادیانی مذہب از الحاج مولوی محمد الیاس برنی صاحب، استاذ معاشیات کلیۂ جامعۂ عثمانیہ۔ حیدر آباد۔ دکن ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ ملنے کا پتہ :۔ کمال احمد صاحب فاروقی، بیت السلام، حیدر آباد۔ دکن۔

یہ قادیانی مذہب کا دوسرا ایڈیشن ہے اس میں برنی صاحب نے بہت زیادہ وسعت اور استقصار کے ساتھ تقریباً دو سو عنوانات کے تحت مرزا صاحب اور ان کے خلفاء و متبعین کی کتابوں سے ان کی سیرت، ان کی تعلیم و دعوت اور ان کے دعاوی نبوت، مہدویت و مسیحیت وغیرہ کے متعلق اقتباسات مہذب و مرتب کئے ہیں۔ اقتباسات کی ترتیب ایسی ہے کہ پڑھنے والا خود بخود اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے جو لائق مرتب نے ان سے اخذ کیا ہے۔ عنوانات کے سوا مرتب نے اپنی طرف سے کسی رائے کا اظہار نہیں کیا ہے۔

قادیانی حساب از الحاج پروفیسر الیاس برنی صاحب۔ یہ بھی اسی سلسلے کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں قادیانی جماعت کے مختلف ٹریکٹوں کا جواب دیا گیا ہے جو "قادیانی مذہب" کی اشاعت کے بعد حیدرآباد اور بنگلور سے شائع ہوئے تھے۔

یہ دونوں رسائل پتہ بالا سے ۱۰ ؍ کے ٹکٹ بھیج کر مفت طلب کئے جا سکتے ہیں۔

رسالہ حسب و نسب از حکیم محمد عثمان صاحب ضخامت ۵۰ صفحات، قیمت ۵ ؍ ملنے کا پتہ: حکیم محمد عثمان صاحب، محلہ بیگہ، شیخپورہ، ضلع مونگیر۔

لائق مؤلف نے تحقیق و جامعیت کے ساتھ کلام اللہ و احادیث سے حسب و نسب کی حقیقت پر بحث کی ہے، اور آجکل حسب و نسب پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کے معقول جواب دیئے ہیں۔

انسولا ضخامت ۲۵ صفحات، قیمت ۱۲ ؍ ملنے کا پتہ :۔ مینیجر اخبار الجمعیۃ، دہلی۔

الجمعیۃ میں مدتوں ایک تبلیغی افسانہ شائع ہوتا رہا ہے جو اب کتابی صورت میں طبع کیا گیا ہے۔ اس میں ایک

تاریخی واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ اسپین کی اسلامی حکومت کے زمانہ میں ایک پادری کی لڑکی کس طرح مسلمان ہوئی۔ مسلمان علماء کے ساتھ لڑکی اور پادریوں کے مناظرے اس تفصیل کے ساتھ درج کیے گئے ہیں کہ مسیحیت اور اسلام کے تقابل کا اچھا خاصہ مواد ان میں مل جاتا ہے۔ تاریخی واقعات کو افسانہ کے رنگ میں اور افسانہ کو مناظرہ کی صورت میں پیش کرنے کا یہ طریقہ خواہ فن افسانہ نگاری کے لحاظ سے کیسا ہی ہو، مگر مسلمانوں کو مذہبی معلومات بہم پہونچانے کے لیے دلچسپ اور مفید ضرور ہے۔

چراغ ایمن | از جناب فکری سلطان پوری ضخامت ۹۰ صفحات۔ پتہ:۔ کنور احمد اعتبار حسین خاں، مارہرہ، ڈاک خانہ جگدیش پور، ضلع سلطان پور۔

یہ جناب فکری سلطان پوری کے کلام کا مجموعہ ہے، جو دو حصوں میں منقسم ہے، ایک حصہ نظموں پر اور دوسرا غزلوں پر مشتمل ہے۔ زبان اور طرز ادا پسندیدہ ہے۔

مساوات اسلامیہ | از جناب شیر محمد صاحب قادری کاکوروی، نظیر آباد، لکھنؤ ضخامت ۲۰ صفحات قیمت ۲ر

اس رسالہ میں لائق مؤلف نے مستند مآخذ سے اسلامی مساوات کی حقیقت پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اجتماعی مشکلات کے حل میں کہاں تک اس کا دخل ہے۔

خلق عظیم | از قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی ضخامت ۱۰ صفحات قیمت ۲ر ملنے کا پتہ: قاضی ظہور الحسن صاحب، معرفت مولوی فیض الدین صاحب ایڈوکیٹ۔ محلہ عابد شاپ۔ حیدرآباد۔ دکن۔

اس رسالے میں جناب قاضی صاحب نے نہایت خوش اسلوبی اور کامیابی کے ساتھ سیرت نبوی کے واقعات و روایات کو ان کے اصلی خدوخال میں نظم کیا ہے۔

فہرست مضامین

ماہ رمضان المبارک ۱۳۵۳ھ جلد ۵ عدد ۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اجتماعی نظم، خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو، اور کسی غرض وغایت کے لیے ہو، اپنے قیام و استحکام اور اپنی کامیابی کے لیے دو چیزوں کا ہمیشہ محتاج ہوتا ہے:۔

"ایک یہ کہ جن اصولوں پر کسی جماعت کی تنظیم کی گئی ہو وہ اس پوری جماعت اور اس کے ہر ہر فرد کے دل و دماغ میں خوب بیٹھے ہوئے ہوں اور جماعت کا ہر فرد ان کو ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھتا ہو۔

دوسرے یہ کہ جماعت میں سمع وطاعت کا مادہ موجود ہو، یعنی اس نے جس کسی کو اپنا صاحب امر تسلیم کیا ہو، اس کے احکام کی پوری طرح اطاعت کرے، اس کے مقرر کیے ہوئے ضوابط کی سختی کے ساتھ پابند رہے، اور اس کے حدود سے تجاوز نہ کرے۔

یہ ہر نظام کی کامیابی کے لیے ناگزیر شرطیں ہیں۔ کوئی نظام خواہ وہ نظام عسکری ہو، یا نظام سیاسی، یا نظام عمرانی، یا نظام دینی، ان دونوں شرطوں کے بغیر نہ قائم ہو سکتا ہے، نہ باقی رہ سکتا ہے اور نہ اپنے مقصد کو پہنچ سکتا ہے۔

دنیا کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ جائیے۔ آپ کو ایک مثال بھی ایسی نہیں ملیگی کہ کوئی تحریک تھڑولے، منافق، نافرمان اور غیر مطیع پیرووں کے ساتھ کامیاب ہوئی ہو، یا بدرجۂ آخر چل سکی ہو۔ تاریخ کے صفحات میں بھی جانے کی ضرورت نہیں۔ خود اپنے گرد و پیش کی دنیا ہی پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ آپ اس فوج کے متعلق

کیا اسے قائم کریں گے جو اپنی سلطنت کی وفادار اور اپنے سالار لشکر کی مطیع فرمان نہ رہے۔ جس کے سپاہی فوجی ضوابط کی پابندی سے انکار کر دیں، پریڈ کا بگل بجے تو کوئی سپاہی اپنی جگہ سے نہ ہلے، کمانڈر کوئی حکم دے تو سپاہی سنی ان سنی کر جائیں؟ کیا آپ سپاہیوں کے ایسے انبوہ کو "فوج" کہہ سکتے ہیں؟ کیا آپ امید کر سکتے ہیں کہ ایسی بن سری فوج کسی جنگ میں کامیاب ہوگی؟ آپ اس سلطنت کے متعلق کیا کہتے ہیں جس کی رعایا میں قانون کا احترام باقی نہ رہے، جس کے قوانین علی الاعلان توڑے جائیں، جس کے محکموں میں کسی قسم کا ضبط و نظم باقی نہ رہے، جس کے کارکن اپنے مقتدر اعلیٰ کے احکام بجا لانا چھوڑ دیں؟ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایسی رعایا اور ایسے عُمّال کے ساتھ کوئی سلطنت دنیا میں قائم رہ سکتی ہے؟ آج آپ کی آنکھوں کے سامنے جرمنی اور اٹلی کی مثالیں موجود ہیں۔ ہٹلر اور مسولینی نے جو عظیم الشان کامیابی حاصل کی ہے تمام دنیا اس کی معترف ہے۔ مگر کچھ معلوم بھی ہے کہ اس کامیابی کے اسباب کیا ہیں؟ وہی دو، یعنی ایمان اور اطاعت۔ نازی اور فاسسٹ جماعتیں ہرگز اتنی طاقتور اور اتنی کامیاب نہیں ہو سکتی تھیں اگر وہ اپنے اصولوں پر اتنا پختہ اعتقاد نہ رکھتیں اور اپنے لیڈروں کی اس قدر سختی کے ساتھ مطیع نہ ہوتیں۔ دوسری طرف ہندوستان کو دیکھیے۔ کانگریس کی تحریک دو مرتبہ کس زور شور سے اٹھی اور آخر کار ناکامی و نامرادی کے ساتھ ختم ہوگئی۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ تحریک کے علمبردار نے خود اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس کے پیرووں میں نہ تو اس کے اصولوں پر کامل اعتقاد تھا، اور نہ اس کے احکام کی پوری اطاعت۔

یہ قاعدۂ کلیہ ایسا ہے جس میں کوئی استثناء نہیں ہے۔ ایمان اور اطاعت در اصل نظم کی جان ہے۔ ایمان جتنا راسخ ہوگا اور اطاعت جتنی کامل ہوگی، نظم اتنا ہی مضبوط اور طاقتور ہوگا۔ اور اپنے مقاصد تک پہنچنے میں اتنا ہی زیادہ کامیاب ہوگا۔ بخلاف اس کے ایمان میں جتنا ضعف اور اطاعت سے جتنا انحراف ہوگا، اسی قدر نظم کمزور ہوگا اور اسی نسبت سے وہ اپنے مقاصد تک پہونچنے میں ناکام رہے گا۔

یہ قطعاً ناممکن ہے کہ کسی جماعت میں نفاق، بدعقیدگی، انتشارِ خیال، خودسری، نافرمانی اور بے ضابطگی کے امراض پھیل جائیں، اور پھر بھی اس میں نظم باقی رہے، اور وہ کسی شعبۂ حیات میں ترقی کی طرف رواں نظر آئے۔ یہ دونوں حالتیں ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ دنیا جب سے آباد ہوئی ہے، اس وقت سے آج تک ان دونوں کا کبھی اجتماع نہیں ہوا۔ اور اگر قانونِ فطرت اٹل ہے، تو اس قانون کی یہ دفعہ بھی اٹل ہے کہ یہ دونوں حالتیں کبھی یکجا جمع نہیں ہو سکتیں۔

اب ذرا اس قوم کی حالت پر نظر ڈالیے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہے۔ نفاق اور بدعقیدگی کی کونسی قسم ایسی ہے جس کا انسان تصور کر سکتا ہو، اور وہ مسلمانوں میں موجود نہ ہو۔ اسلامی جماعت کے نظام میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اسلام کی بنیادی تعلیمات تک سے ناواقف ہیں اور اب تک جاہلیت کے عقائد پر جمے ہوئے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو اسلام کے اساسی اصولوں میں شک رکھتے ہیں اور شکوک کی علانیہ تبلیغ کرتے ہیں، وہ بھی ہیں جو علی الاعلان انکار کرتے ہیں، وہ بھی ہیں جو اسلامی عقائد اور شعائر کا کھلم کھلا مذاق اڑاتے ہیں، وہ بھی ہیں جو علانیہ مذہب اور مذہبیت سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں، وہ بھی ہیں جو خدا اور رسول کی تعلیمات کے مقابلہ میں کفار سے حاصل کیے ہوئے تخیلات و افکار کو ترجیح دیتے ہیں، وہ بھی ہیں جو خدا اور رسول کے قانون پر جاہلیت کے رسوم یا کفار کے قوانین کو مقدم رکھتے ہیں، وہ بھی ہیں جو خدا اور رسول کے دشمنوں کو خوش کرنے کے لیے شعائر اسلامی کی توہین کرتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو اپنے چھوٹے سے چھوٹے فائدے کی خاطر اسلام کے مصالح کو بڑے سے بڑا نقصان پہنچانے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں، جو اسلام کے مقابلہ میں کفر کا ساتھ دیتے ہیں، اسلامی اغراض کے خلاف کفار کی خدمت کرتے ہیں، اور اپنے عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ اسلام ان کو اتنا بھی عزیز نہیں کہ اس کی خاطر وہ ایک بال برابر بھی نقصان گوارا کر سکیں۔ راسخ الایمان اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کی ایک نہایت ہی قلیل جماعت کو چھوڑ کر اس قوم کی بہت بڑی اکثریت اسی قسم کے منافق اور فاسد العقیدہ لوگوں پر مشتمل ہے۔

یہ تو تھا ایمان کا حال۔ اب سمع و طاعت کا حال دیکھئے۔ آپ مسلمانوں کی کسی بستی میں چلے جائیے۔ آپ کو عجیب نقشہ نظر آئے گا۔ اذان ہوتی ہے مگر بہت سے مسلمان یہ بھی محسوس نہیں کرتے کہ موذن کس کو بلا رہا ہے اور کس چیز کے لیے بلا رہا ہے۔ نماز کا وقت آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ مگر ایک قلیل جماعت کے سوا کوئی مسلمان اپنے کاروبار یا لہو و لعب کو خدا کے لیے نہیں چھوڑتا۔ رمضان کا زمانہ آتا ہے تو بعض مسلمانوں کے گھروں میں یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ یہ رمضان کا مہینہ ہے۔ بہت سے مسلمان علانیہ کھاتے پیتے ہیں اور اپنے روزہ نہ رکھنے پر ذرہ برابر نہیں شرماتے، بلکہ بس چلتا ہے تو اُلٹا روزہ رکھنے والوں کو شرمندہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر جو لوگ روزہ رکھتے بھی ہیں ان میں سے بھی بہت کم ہیں جو احساس فرض کے ساتھ ایسا کرتے ہیں۔ ورنہ کوئی محض رسم ادا کرتا ہے، کوئی صحت کے لیے مفید سمجھ کر رکھ لیتا ہے اور کوئی روزہ رکھ کر وہ سب کچھ کرتا ہے جس سے خدا اور اُس کے رسول نے منع کیا ہے۔ زکوٰۃ اور حج کی پابندی اس سے بھی کم تر ہے۔ حلال اور حرام، پاک اور ناپاک کا امتیاز تو مسلمانوں میں سے اُٹھتا ہی چلا جاتا ہے۔ وہ کون سی چیز ہے جس کو خدا اور رسول نے منع کیا ہو اور مسلمان اسکو اپنے لیے مباح نہ کر لیتے ہوں۔ وہ کون سی حد ہے جو خدا اور رسول نے مقرر کی ہو اور مسلمان اس سے تجاوز نہ کرتے ہوں۔ وہ کون سا ضابطہ ہے جو خدا اور رسول نے قائم کیا ہو اور مسلمان اس کو نہ توڑتے ہوں۔ اگر مردم شماری کے لحاظ سے دیکھا جائے تو مسلمان کروڑوں ہیں، مگر ان کے اندر ہی دیکھیے کہ کتنے فی صدی نہیں، کتنے فی ہزار، بلکہ کتنے فی لاکھ خدا اور رسول کے احکام کو ماننے والے اور اسلامی ضوابط کی پابندی کرنے والے ہیں؟

جس قوم میں منافقت اور ضعف اعتقاد کا مرض عام ہو جائے، جس قوم میں فرض کا احساس باقی نہ رہے، جس قوم سے سمع و طاعت اور ضابطہ کی پابندی اُٹھ جائے، اس کا جو کچھ انجام ہونا چاہیے ٹھیک وہی انجام مسلمانوں کا ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ آج مسلمان تمام دنیا میں محکوم و مغلوب ہیں۔ جہاں ان کی

اپنی حکومت موجود ہے وہاں بھی وہ غیروں کے اخلاقی، ذہنی اور مادّی تسلط سے آزاد نہیں ہیں۔ جہالت، مفلسی، اور خستہ حالی میں وہ ضرب المثل ہیں۔ اخلاقی پستی نے ان کو عدد رجہ ذلیل کر دیا ہے۔ امانت، صداقت اور وفائے عہد کی صفات جن کے لیے وہ کبھی دنیا میں ممتاز تھے، اب ان سے دوسروں کی طرف منتقل ہو چکی ہیں، اور ان کی جگہ خیانت، جھوٹ دغا اور بدمعاملگی نے لے لی ہے۔ تقویٰ، پرہیزگاری اور پاکیزگی اخلاق سے وہ عاری ہوتے جاتے ہیں۔ قومی غیرت و حمیت روز بروز ان سے مفقود ہوتی جاتی ہے، کسی قسم کا نظم ان میں باقی نہیں رہا ہے۔ آپس میں ان کے دل پھٹتے چلے جاتے ہیں اور کسی مشترک غرض کے لیے مل کر کام کرنے کی صلاحیت ان میں باقی نہیں رہی ہے۔ وہ غیروں کی نگاہوں میں ذلیل ہو گئے ہیں، قوموں پر سے ان کا اعتماد اٹھ گیا ہے اور اٹھتا جا رہا ہے، ان کی قومی طاقت اور اجتماعی قوت کمزور ہوتی جا رہی ہے، ان کی قومی تہذیب و شائستگی فنا ہوتی چلی جا رہی ہے، اور اپنے حقوق کی مدافعت اور اپنے شرف قومی کی حفاظت سے وہ عاجز ہوتے جا رہے ہیں۔ باوجودیکہ تعلیم ان میں بڑھ رہی ہے، گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ اور یورپ کے تعلیم یافتہ حضرات کا اضافہ ہو رہا ہے، بنگلوں میں رہنے والے، موٹروں پر چڑھنے والے، سوٹ پہننے والے، بڑے بڑے ناموں سے یاد کئے جانے والے، بڑی سرکاروں میں سرفرازیاں پانے والے، ان میں روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں، لیکن جن اعلیٰ اخلاقی اوصاف سے وہ پہلے متصف تھے اب ان سے عاری ہیں، اپنی ہمسایہ قوموں پر ان کی جو ساکھ اور دھاک پہلے تھی وہ اب نہیں ہے، جو عزت وہ پہلے رکھتے تھے وہ اب نہیں رکھتے، جو اجتماعی قوت و طاقت ان میں پہلے تھی وہ اب نہیں ہے، اور آئندہ اس سے بھی زیادہ خراب آثار نظر آ رہے ہیں۔

کوئی مذہب یا تہذیب ہو یا کسی قسم کا نظام جماعت ہو، اس کے متعلق دو ہی طرز عمل انسان کے لئے معقول ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ اس میں داخل ہو تو اس کے اساسی اصول پر پورا پورا اعتقاد رکھے اور اس کے

قانون وضابطہ کی پوری پوری پابندی کرے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو اس میں داخل نہ ہو یا ہو چکا ہے تو بالاعلان اس میں سے نکل جائے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی تیسری صورت معقول نہیں ہے۔ اس سے زیادہ نامعقول کوئی طرز عمل نہیں ہو سکتا کہ تم ایک نظام میں شریک ہو، اس کے ایک جزء بن کر رہو، اس نظام کے تابع ہونے کا دعویٰ کرو، اور پھر اس کے اساسی اصولوں سے قولاً یا عملاً انحراف بھی کرو، اس کے قانون کی خلاف ورزی بھی کرو، اپنے آپ کو اس کے آداب اور اس کے ضوابط کی پابندی سے مستثنیٰ بھی کر لو۔ اس طرز عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تم میں منافقانہ خصائل پیدا ہوں، خلوص نیت سے تمہارے دل خالی ہو جائیں تمہارے قلوب میں کسی مقصد کے لیے گرم جوشی اور رسوخ عزم نہ پیدا ہو سکے، فرض شناسی، اتباع قانون اور باضابطگی کے اوصاف سے تم عاری ہو جاؤ، اور تم میں یہ صلاحیت باقی نہ رہے کہ کسی نظام جماعت کے کارآمد رکن بن سکو۔ ان کمزوریوں اور بدترین عیوب کے ساتھ تم جس جماعت میں بھی شریک ہو گے اسکے لیے لعنت بن جاؤ گے، جس نظام میں داخل ہو گے اسے درہم برہم کر دو گے، جس تہذیب کے جسم میں داخل ہو گے اس کے لیے جذام کے جراثیم ثابت ہو گے، جس مذہب کے پیرو بنو گے اسکو مسخ کر کے چھوڑو گے۔ ان اوصاف کے ساتھ تمہارے مسلمان ہونے سے بدرجہا بہتر یہ ہے کہ جس گروہ کے اصولوں پر تمہارا دل ٹھکے اور جس گروہ کے طریقوں کی تم پوری طرح پیروی کر سکو اس میں جا شامل ہو۔ منافق اور نافرمان مسلمانوں سے وہ کافر بہتر ہیں جو اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کے دل سے معتقد ہوں اور اسکے ضوابط کی پابندی کریں

جو لوگ مسلمانوں کے مرض کا علاج تعلیم مغربی، اور تہذیب جدید، اور اقتصادی حالات کی اصلاح، اور سیاسی حقوق کے حصول کو سمجھتے تھے وہ غلطی پر تھے، اور اب بھی جو ایسا سمجھ رہے ہیں وہ غلطی کر رہے ہیں۔ بخدا، اگر مسلمانوں کا ہر فرد بی۔اے، اور پی ایچ ڈی اور بیرسٹر ہو جائے، دولت و ثروت سے مالا مال ہو، مغربی فیشن سے از سرتا بقدم آراستہ ہو، اور حکومت کے تمام عہدے اور کونسلوں

کی تمام نشستیں مسلمانوں ہی کو مل جائیں، مگر ان کے دل میں نفاق کا مرض ہو، وہ فرض کو فرض نہ سمجھیں، وہ نافرمانی سرکشی اور بے ضابطگی کے خوگر ہوں، تو اُسی پستی اور ذلت اور کمزوری میں وہ اس وقت بھی مبتلا رہیں گے جس میں آج مبتلا ہیں۔ تعلیم، فیشن، دولت اور حکومت، کوئی چیز ان کو اس گڑھے سے نہیں نکال سکتی جس میں وہ اپنی سیرت اور اپنے اخلاق کی ان بنیادی کمزوریوں کی وجہ سے گر گئے ہیں۔ اگر ترقی کرنی ہے اور ایک طاقتور باعزت قوم بننا ہے تو سب سے پہلے مسلمانوں میں ایمان اور اطاعت امر کے اوصاف پیدا کرو، کہ اس کے بغیر نہ تمہارے افراد میں کَس بَل پیدا ہو سکتا ہے، نہ تمہاری جماعت میں نظم پیدا ہو سکتا ہے، اور نہ تمہاری اجتماعی قوت اتنی زبردست ہو سکتی ہے کہ تم دنیا میں سربلند ہو سکو۔ ایک منتشر جماعت جس کے افراد کی اخلاقی اور معنوی حالت خراب ہو کبھی اس قابل نہیں ہو سکتی کہ دنیا کی منظم اور منضبط قوموں کے مقابلہ میں سر اُٹھا سکے۔ پھونس کے پولوں کا انبار خواہ کتنا ہی بڑا ہو، کبھی قلعہ نہیں بن سکتا۔

اسلام اور مسلمانوں کے بدترین دشمن وہ ہیں جو مسلمانوں میں بدعقیدگی اور نافرمانی پھیلا رہے ہیں۔ یہ منافقوں کی سب سے زیادہ بری قسم ہے جن کا وجود مسلمانوں کے لیے حربی کافروں سے بھی زیادہ خطرناک ہے کیونکہ یہ باہر سے حملہ نہیں کرتے بلکہ گھر میں بیٹھ کر اندر ہی اندر ڈائنا مائٹ بچھاتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کو دین اور دنیا دونوں میں رسوا کرانا چاہتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ وہ تمہیں بھی اسی طرح کافر بنانا چاہتے ہیں جس طرح وہ خود ہو گئے ہیں۔ وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً (۴: ۱۲) ان کے شر سے بچنے کی کم سے کم تدبیر یہ ہے کہ جو لوگ واقعی مسلمان ہیں اور مسلمان رہنا چاہتے ہیں وہ ان سے قطع تعلق کر لیں فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ (۴: ۱۲) ورنہ قرآن مجید نے تو ان کی آخری سزا یہ قرار دی ہے کہ ان سے جنگ کی جائے۔ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ (۴: ۱۲) ✣

کتب سماوی پر ایک نظر

(۱۱)

عہد جدید (اناجیل وغیرہم)

(از جناب ذوقی شاہ صاحب)

افسانۂ صلیب عیسائی علماء کا یہ عقیدہ ہے کہ مسیح علیہ السلام یہودیوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے، صلیب پر چڑھائے گئے، مرنے کے بعد تین دن تک قبر میں دفن رہے، پھر زندہ ہوئے، حواریوں کو نظر آئے، اور آسمان پر اُٹھا لیے گئے۔ اور صلیب پر مسیح کی یہ قربانی عیسائیوں کے تمام عمر کے گناہوں کا کفارہ ہوگئی۔ مگر اناجیل اربعہ پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو ان میں سے ایک بات بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔ بیانات میں اس قدر اختلافات ہیں کہ افسانۂ صلیب کا کوئی پہلو ثابت نہیں ہوتا۔ روایت و درایت کی رو سے کوئی بیان تحقیق کی کسوٹی پر قابلِ اعتماد نہیں پایا جاتا۔

سب سے پہلے گرفتاری کے واقعات کو لیجئے۔ اس واقعہ کی صورت میں اختلاف ہے۔ متی (۲۶: ۴۸ و ۴۹) میں لکھا ہے کہ مسیح کے حواری یہوداہ اسکریوطی نے اپنے ساتھیوں کو گرفتاری مسیح کے لیے یہ علامت قرار دی تھی کہ جسے میں چوموں اُسے گرفتار کر لینا چنانچہ ایسا ہی عمل میں آیا۔ مگر یوحنا (۱۸: ۴ تا میں واقعہ اس طور پر درج ہے کہ عیسیٰ نے خود آگے بڑھ کر دو بار اپنے پکڑنے والوں سے کہا کہ تم کسے ڈھونڈتے ہو یسوع میں ہوں وہ لوگ یہ سُنکر پیچھے ہٹے اور زمین پر گر پڑے۔ آخر کار عیسیٰ علیہ السلام نے خود ہی اپنے آپ کو خوب پہچنوا کر اپنے کو گرفتار کرا دیا اور اب ان دو بیانات میں سے ہم کسے سچا سمجھیں؟ لازمی طور پر ان میں سے

ایک بیان غلط ہوگا۔ اور ممکن ہے کہ دونوں بیان غلط ہوں۔ کیونکہ جب کسی کتاب میں غلطیوں کا احتمال ہوجاتا ہے تو ساری کتاب بے اعتبار ہوجاتی ہے خصوصاً وہ کتاب جسے آسمانی یا الہامی ہونے کا دعویٰ ہو۔

دوسرا اختلاف تعین صلیب بردار میں ہے۔ یوحنا (۱۹: ۱۷) میں ہے کہ یسوع خود اپنی صلیب کو اُٹھا کر لے گئے تھے۔ اور متی (۲۷: ۳۲) اور مرقس (۱۵: ۲۱) اور لوقا (۲۳: ۲۶) میں یہ لکھا ہے کہ مسیح کی صلیب شمعون قرینی سے اُٹھوا کر لے گئے تھے۔ علاوہ اس اختلاف کے یہاں ایک اور امر بھی قابل غور ہے۔ اسکاٹ صاحب اپنی تفسیر میں زیر آیت ۳۲ باب ۲۷ متی لکھتے ہیں کہ اس زمانہ کا دستور یہ تھا کہ جس شخص کو صلیب دی جاتی تھی وہ شخص خود ہی اپنی صلیب اُٹھا کر لے جاتا تھا۔ قرآنی تعلیم یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نہ قتل کئے گئے نہ آپ کو صلیب دی گئی بلکہ اس بارہ میں لوگوں کو شبہ میں ڈال دیا گیا۔ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (۴: ۲۲) عیسائی مصنفین کو اعتراف ہے کہ قبل نزول قرآن بھی عیسائیوں میں چار فرقے ایسے تھے جن کا اعتقاد یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام مصلوب نہ ہوئے تھے بلکہ ان کی جگہ شمعون قرینی پکڑا گیا اور مصلوب ہوا۔ وہ چار فرقے یہ ہیں:۔ (۱) باسلیدی۔ (۲) سرنتھی۔ (۳) کارپوکراتی (۴) اگناسٹک۔ جارج سیل بھی قرآن کے انگریزی ترجمہ میں سورۂ آل عمران کے رکوع ۵ میں وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ کے تحت ان فرقوں کے وجود اور ان کے بہت قدیم ہونے اور ان کے متذکرہ بالا عقیدہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں سیل صاحب اپنے اسی نوٹ میں برناباس کی انجیل سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول نقل کرتے ہیں:۔

"اے برناباس میری بات پر یقین کر کہ ہر گناہ کی خواہ وہ کتنا ہی خفیف کیوں نہ ہو خدا بڑی دردناک سزا ضرور دیتا ہے کیونکہ خدا گناہ سے ناراض ہوتا ہے چونکہ میری والدہ اور میرے وفادار شاگردوں کو جو مجھ سے محبت تھی اس میں محبت دنیا کی بھی آمیزش تھی خدائے عادل نے یہی مناسب سمجھا کہ اس جرم کی پاداش میں انہیں اسی دنیا میں رنج دیا جائے تاکہ آخرت میں وہ دوزخ کے شعلوں سے نجات پائیں۔

اور میرا معاملہ یہ ہے کہ اگرچہ میں دنیا میں بے قصور رہا تاہم بعض لوگوں نے مجھے خدا
اور خدا کا بیٹا کہا۔ اس لیے مشیت الٰہی اس امر کی مقتضی ہوئی کہ قیامت کے دن
شیاطین میری ہنسی نہ اڑائیں بلکہ اُس کی رضا۔ اسی میں ہوئی کہ یہوداہ کی موت کے
ذریعہ سے اسی دنیا میں میری جگ ہنسائی ہو جائے اور ہر شخص یہ گمان کرے کہ میں نے
صلیب پر جان دی اور یہ ساری ہنسی اور ہتک اُس وقت تک رہے کہ محمد رسول اللہ
(صلے اللہ علیہ وسلم) اس دنیا میں آئیں اور ہر ایمان دار کو اس غلطی سے نکالیں"

ممکن ہے کہ اسی نوع کے مضامین کی بنا پر انجیل برنباس کو عیسائیوں نے جعلی قرار دیکر موجودہ مطبوعہ کتب مقدسہ سے خارج کر رکھا ہو مگر اکثر قدیم قلمی نسخوں میں یہ انجیل موجود ہے اور نسخہ سینا میں بھی یہ انجیل موجود ہے۔ یہ وہی نسخہ ہے جسے حال میں انگلستان نے ایک لاکھ پونڈ پر خریدا ہے اور جس کا ذکر اس سلسلہ کے مضمون نمبر ۲ میں آچکا ہے سیل صاحب اپنے نوٹ میں لکھتے ہیں کہ یہ عبارت مسلمانوں نے اِس انجیل میں شامل کردی ہے۔ باوجود اس اہتمام کے سیل صاحب نے اس عبارت کو اس قدر اہمیت دی کہ اپنے نوٹ میں اسے بالکلیہ نقل کردیا اور اپنے اس خیال کی تائید میں نقل کیا کہ نزول قرآن سے بہت قبل عیسائیوں کی متعدد جماعتیں اس عقیدہ پر قائم تھیں کہ مسیح نہ مصلوب ہوئے نہ قتل ہوئے۔ الحاقی اور غلط بیان کو غلط جان کر کوئی معقول پسند شخص اپنی تائید میں اُس بیان کو پیش نہیں کیا کرتا۔ علاوہ بریں جس زمانہ میں انجیل برنباس لکھی گئی اور مشہور ہوئی اور اُسکی نقلیں پھیلیں اُس زمانہ میں ان مسلمانوں کا وجود ہی کہاں تھا کہ مندرجہ بالا عبارت کو انجیل میں شامل کر دیتے۔ اگر مسلمانوں نے اپنے وجود میں آنے کے بعد کسی نہ کسی تدبیر سے انجیل میں اس عبارت کو شامل کر دیا تو عیسائی اس الزام کے ثبوت میں کسی ایک ہی قدیم نسخہ انجیل برنباس کو پیش کردیں جس میں یہ عبارت نہ ہو۔ عیسائی دنیا میں یقیناً متعدد نسخے ایسے ہونگے جو محض عیسائیوں ہی کی تحویل میں رہے ہوں گے اور جن تک کسی مسلمان کا ہاتھ نہ پہونچا ہوگا۔ اگر ان نسخوں میں بھی یہ عبارت موجود ہے تو مسلمانوں پر یہ اتہام ظلم ہے

بفرضِ محال اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے عیسائیوں کی انجیل میں تحریف ہو گئی اور عیسائی اب ایک بھی نسخہ ایسا پیش نہیں کر سکتے جو اُس تحریف سے بچا ہو تو اس صورت میں بھی عیسائیوں کی کتابیں غیر محفوظ او تحریف شدہ اور ناقابلِ اعتماد ثابت ہوتی ہیں۔

بہرحال صرف ایک انجیل میں یہ لکھا ہے کہ صلیب اُٹھا کر لے جانے والے خود مسیح تھے۔ اسکے مقابلہ میں تین انجیلیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ نہیں بلکہ اس صلیب کا اُٹھا کر لے جانے والا شمعون قرینی تھا۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ اس زمانہ کا دستور یہی تھا کہ جو صلیب پر لٹکایا جائے وہ صلیب کو خود اٹھا کر لٹکنے کی جگہ لے بھی جائے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ قدما کی چار جماعتیں یہی کہتی ہیں کہ مصلوب ہونے والا شمعون قرینی تھا نہ کہ مسیح علیہ السلام۔ مزید براں حضرت مسیح کے قول مندرجہ انجیل برنباس پر بھی نظر ڈالی جائے۔ اس کے بعد منصف مزاج حضرات خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ افسانۂ صلیب میں صداقت کو کس حد تک دخل ہے۔

تیسرا اختلاف صلیب دئیے جانے کے وقت سے متعلق ہے۔ مرقس (۱۵: ۲۵) میں ہے کہ تیسرا گھنٹہ تھا جبکہ انھوں نے اُسے صلیب دی یعنی صبح کے نو (۹) بجے تھے اور یوحنا (۱۹: ۱۴) میں ہے کہ چھٹے گھنٹے کے قریب سولی دی گئی جس کے معنی یا تو یہ ہو سکتے ہیں کہ چھ (۶) بجے صبح سولی ملی یا چھ (۶) گھنٹے دن چڑھے یعنی ۱۲ بجے دوپہر کو۔ متی (۲۷: ۴۶) سے نویں (۹) گھنٹے تک یسوع کا زندہ رہنا پایا جاتا ہے اور اس وقت ان کا بڑے شور سے چلا کر یہ کہنا بیان کیا جاتا ہے کہ "ایلی ایلی لما سبقتنانی" یعنی اے میرے خدا اے میرے خدا تو کیوں مجھے چھوڑ دیا۔ لاطینی زبان کی ایک کتاب سیلس اَنالیسس کرونالاجیکا کے باب ۲ صفحہ ۲۰۹ پر لکھا ہے کہ فصح کے دن شام کے وقت انھوں نے اسے صلیب پر لٹکایا۔ اتنا اہم واقعہ اور اُس میں اس درجہ اختلاف متذکرہ بالا جملہ اوقات مذکورہ کی بے اعتباری پر دلالت کرتا ہے۔

چوتھا اختلاف ان دو چوروں کی بابت ہے جو مسیح کے ساتھ صلیب پر دائیں بائیں لٹکائے گئے تھے۔ متی (۲۷: ۴۴) کا بیان ہے کہ دونوں چور مسیح کو برا کہہ رہے تھے۔ مگر لوقا (۲۳: ۳۹ تا ۴۳) کا

بیان ہے کہ صرف ایک ہی چور آپ کو بُرا کہتا تھا اور دوسرا چور آپ کی تعریف کرتا تھا۔ بعض مفسرین ان ہی اختلافات کے دور کرنے کی کوشش کی ہے مگر نتیجہ تشفی بخش نہ نکل سکا۔ مثلاً اسکاٹ صاحب نے اپنی طرف سے ترتیب زمانی وضع کر کے بیانات مختلفہ کو آگے پیچھے اس طرح بیان کر دیا کہ پہلے دونوں چور آپ کو برا کہتے تھے۔ پھر ایک نے بد کہنے سے توبہ کی اور اچھا کہنا شروع کر دیا۔ اس تطبیق بلا دلیل سے کسی کی بھی تشفی نہیں ہو سکتی۔ اس صورت سے تو تمام متضاد و متناقض امور میں تطبیق باہمی دی جا سکتی ہے اور صدق و کذب کا امتیاز ہی اٹھ جاتا ہے۔

پانچواں اختلاف اُس کتبہ کی عبارت میں ہے جو مسیح کی صلیب پر لٹکایا گیا تھا۔ یوحنا (۱۹:۱۹) میں یہ عبارت درج ہے :۔ "یسوع ناصری یہودیوں کا بادشاہ" متی (۲۷: ۳۷) کی عبارت ہے: "یہ یسوع یہودیوں کا بادشاہ ہے"، ناصری کا لفظ یہاں درج نہیں۔ مرقس (۱۵: ۲۶) اور لوقا (۲۳: ۳۸) میں کتبہ کی عبارت یہ بیان کی گئی ہے کہ "یہودیوں کا بادشاہ ہے"، یعنی یہاں نہ یسوع کا لفظ ہے نہ ناصری کا۔

چھٹا اختلاف اس میں ہے کہ مسیح کو صلیب پر چڑھتے اور جان دیتے کس کس نے دیکھا۔ متی (۲۶: ۵۶) میں لکھا ہے کہ جب مسیح گرفتار ہوئے اسی وقت "سب شاگرد اُسے چھوڑ کر بھاگ گئے" تو ظاہر ہے کہ مصلوبی کے وقت شاگردوں میں سے ایک بھی مسیح کے پاس نہ تھا۔ مرقس (۱۴: ۵۰) سے بھی اسی بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ لوقا (۲۳: ۴۹) میں لکھا ہے کہ عورتیں وغیرہ مسیح کے صلیب پانے کے وقت دور سے کھڑی ہو کر سارا حال دیکھ رہی تھیں۔ مگر یوحنا (۱۹: ۲۵) میں لکھا ہے کہ یہ سب لوگ اور عورتیں صلیب کے پاس کھڑی تھیں اور اتنے قریب تھیں کہ مسیح نے اپنی والدہ کو اپنے ایک شاگرد کے سپرد فرمایا۔ اور فرمایا کہ دیکھ یہ تیری ماں ہے۔ ان بیانات میں کس قدر اختلاف ہے ؟

متی (۲۷: ۵۰ تا ۵۵) میں مسیح کے جان بحق تسلیم ہوتے وقت کا منظر یوں کھینچا گیا ہے کہ ہیکل کا

پردہ پھٹ گیا اور زمین کانپی اور پتھر تڑخ گئے اور قبریں کھل گئیں اور مردے نکل پڑے اور زندہ ہوگئے۔ متی ہی کا یہ قول ہے کہ مسیح کی گرفتاری کے وقت سب شاگرد مسیح کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ پھر یہ دیکھا کس نے کہ ہیکل کا پردہ پھٹ گیا اور زمین کانپی اور مردے قبروں میں سے نکل کر زندہ ہوگئے اور اندھیرا چھا گیا؟ کیا دشمنان مسیح کی شہادت پر یہ سارے واقعات درج انجیل کر دیئے گئے؟ اگر انجیل یوحنّا کے مطابق یوحنا اُس وقت حاضر تھا تو یوحنا نے تو ان باتوں کا ذکر ہی نہیں کیا۔ پھر متی نے یہ جملہ عجائبات کہاں سے دیکھ لیئے؟ ایکطرف متی لکھتے ہیں کہ قبروں میں سے مردے نکل کھڑے ہوئے اور زندہ ہوگئے۔ دوسری طرف ایوب (۷: ۹ و ۱۰) میں لکھا ہے کہ جو قبر میں جاتا ہے وہ پھر قیامت تک واپس نہیں آتا۔ اب ان دونوں میں سے اگر ایک بات صحیح ہے تو دوسری یقیناً غلط ہے اور دونوں میں سے ایک قول کی بھی غلطی موجودہ بائیبل پر سے اعتبار اٹھا دینے کے لیے کافی ہے اور جب بائیبل ہی سے اعتبار اُٹھ گیا تو محتاط لوگوں کے نزدیک اُس کا ہر بیان جس کی کہیں خارج سے تائید نہ ہو مشکوک ہے۔

ساتواں اختلاف ان لوگوں کی بابت ہے جن کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے مسیح کو مر کر دوبارہ زندہ ہوتے دیکھا۔ قرنتیوں کے (۱۵: ۵ و ۶) میں پولوس لکھتے ہیں کہ مسیح کا دوبارہ زندہ ہونا بارہ حواریوں نے دیکھا پھر اس کے بعد "پانچ سَو بھائیوں سے زیادہ تھے جنھیں وہ ایک بار دکھائی دیا" اول تو بارہ حواریوں کی تعداد ہی غلط ہے۔ زمانۂ مسیح میں صرف گیارہ (۱۱) ہی حواری تھے۔ بارہواں حواری مسیح کے آسمان پر جانے کے بعد بذریعہ قرعہ اندازی کے منتخب ہوا ہے جس کی تفصیل کتاب اعمال کے باب اول میں درج ہے۔ پھر اناجیل اربعہ متفق ہیں کہ سوا گیارہ حواریوں کے کسی نے مسیح کو دوبارہ زندہ نہیں دیکھا۔ اعمال (۱۰: ۴۰ و ۴۱) میں بھی صاف لکھا ہے کہ "اسکو (یعنی مسیح کو) خدا نے تیسرے دن اُٹھایا اور ظاہر کر دکھایا ساری قوم پر نہیں بلکہ ان گواہوں پر کہ آگے سے خدا کے چُنے ہوئے تھے یعنی ہم پر۔" پھر پولوس نے یہ کہاں سے کہہ دیا کہ پانچسَو بھائیوں سے زیادہ تھے جنھیں وہ ایک بار دکھائی دیا۔ اعمال (۱: ۱۵) کی رو سے شاگردوں کی

تعداد اکیسو بیس (۱۲۰) سے زائد نہ تھی۔ یہ تعداد عروج مسیح سے بعد کی ہے، کہ وقوع صلیب سے قبل کی قبل کی تعداد تو اس سے بھی کم ہو گی۔ پولوس کے یہ پانچسو سے زائد بھائی کہاں سے پیدا ہو گئے جنھوں نے مسیح کی حیات ثانی کا مشاہدہ کر لیا کیا متی اور یوحنا اور پطرس وغیرہم جو مسیح کے مقرب حواری تھے پولوس کے پانچ سو بھائیوں میں شامل نہ تھے کہ یہ بھی اپنی تصانیف میں کچھ اس کا ذکر کرتے۔ بقول مسیحی علماء کے لوقا اور مرقس نے پولوس اور پطرس ہی کی تعلیم سے اپنی اپنی انجیلیں لکھیں مگر ان دونوں نے بھی یہ بات کہیں نہ لکھی لوقا نے خاص طور پر پولوس ہی سے پوچھ پوچھ کر مسیح کا حال لکھا مگر باوجود اس کے یہی لکھا کہ صرف گیارہ حواریوں ہی نے مسیح کی حیات ثانی کا مشاہدہ کیا۔ اس نے نہ بارہ حواریوں کا ذکر کیا نہ پانچسو سے زائد بھائیوں کا۔

اب جنھیں اس حیاتِ ثانی کا مشاہدہ ہوا ان کی بابت بھی مختلف بیانات ذرا ملاحظہ ہوں۔

یوحنا (۲۰: ۱۴) میں لکھا ہے کہ مریم مگدلینی نے مسیح کو مصلوبی کے تیسرے دن دیکھا مگر نہ پہچانا۔ لوقا (۲۴: ۴ و ۵ و ۹) میں لکھا ہے کہ مریم مگدلینی نے فرشتوں سے یسوع کے جی اٹھنے کا حال سنکر شاگردوں کو خبر دی تھی مگر یوحنا (۲۰: ۱ و ۲ و ۱۴) سے ظاہر ہوتا ہے کہ مریم مگدلینی کو مسیح کے جی اٹھنے کی خبر نہ تھی اور جب تک کہ مسیح کو مرنے کے بعد زندہ نہ دیکھا یہی سمجھا تھا کہ مسیح کی نعش کو کوئی قبر سے نکال کر لے گیا ہے اور جب مسیح کو دیکھا بھی تو اسے نہ پہچانا بلکہ یہی سمجھا کہ کوئی باغبان ہے۔ مرقس (۱۶: ۹) میں ہے کہ یسوع قبر سے جی اٹھنے کے بعد پہلے مریم مگدلینی کو دکھائی دیے۔ لوقا (۲۴: ۱۳ و ۳۴) میں ہے کہ پہلے دو مردوں کو یا شمعون کو دکھائی دیا۔ متی (۲۸: ۹) میں ہے کہ مریم نے یسوع کو دیکھ کر ان کے قدم پکڑے مگر یوحنا (۲۰: ۱۷) میں ہے کہ یسوع نے کہا کہ مجھ کو مت چھو، کیونکہ میں ہنوز اوپر اپنے باپ کے پاس ابھی نہیں گیا۔ پھر یوحنا (۲۰: ۱۲) میں ہے کہ مریم نے دو فرشتے یسوع کی قبر میں بیٹھے دیکھے۔ لوقا (۲۴: ۴) میں ہے کہ دو شخص اپنے پاس کھڑے دیکھے۔ مرقس (۱۶: ۵) میں ہے کہ ایک جوان کو سفید پوشاک پہنے ہوئے قبر میں بیٹھے دیکھا۔ متی (۲۸: ۲) میں ہے کہ ایک فرشتے کو قبر کے باہر پتھر پر بیٹھے دیکھا۔ اب خیال فرمایئے کہ ایک ہی واقعہ کو چار انجیلوں

میں چار مختلف صورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ بیانات میں اختلاف کی اس سے زیادہ بین مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

پھر مرقس باب ۱۶: ۱ اور لوقا باب ۲۴ میں جو لکھا ہے کہ عورتیں تیسرے دن خوشبو لے کر قبر پر گئیں کہ یسوع کی لاش پر وہ خوشبو ملیں یہ صریح مغالطہ ہے۔ کیونکہ بقول اناجیل ہی کے قبر پر ایک بھاری پتھر رکھا گیا تھا اور اُس پتھر پر مہر لگا دی گئی تھی اور رومی سپاہیوں کا وہاں بہت سخت پہرا بٹھا دیا گیا تھا۔ اس پہرہ کا باعث یہ تھا کہ یہودیوں کو پہلے سے اس بات کا خوف تھا کہ ایسا نہ ہو کہ عیسائی لوگ مسیح کی لاش کو قبر میں سے چوری سے نکال لے جائیں اور مشہور کر دیں کہ مسیح دوبارہ زندہ ہو گیا تو اس صورت میں یہ فتنہ پہلے فتنے سے شدید تر ثابت ہو گا۔ چنانچہ بعد میں عیسائیوں نے جسے مسیح کا پھر زندہ ہو جانا بیان کیا وہ یہودیوں میں اس مصلوب کی لاش کا چوری ہو جانا مشہور رہے جس کی تائید متی (۲۸: ۱۳ اور ۱۴ و ۱۵) سے بھی پوری طرح ہوتی ہے۔ اور رومی سپاہیوں کا پہرہ بہت سخت ہوتا تھا۔ اسکاٹ صاحب اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ رومی فوج میں یہ قانون تھا کہ جو سپاہی اپنے پہرے پر سو جائے وہ قتل کر دیا جائے۔ ایسے سخت پہرے کے ہوتے ہوئے وہ عورتیں کیا دیوانی تھیں جو خوشبو لے کر مصلوب کی قبر پر جا پہنچیں۔ اگر یہ سمجھا جائے کہ اونھیں مسیح کے جی اٹھنے کا یقین تھا تو اول تو یہ بات کسی انجیل سے ثابت نہیں ہوتی۔ دوم۔ ایسی صورت میں قبر پر جانے کی کیا ضرورت تھی زندہ شخص کو اب قبر سے کیا تعلق۔ سوم ان عورتوں نے پھر یہ کیوں کہا کہ "ہمارے لیے پتھر کو قبر کے دروازے پر سے کون ڈھلکائے گا" ۹۔

متی (۲۷: ۶۳) میں جو یہ قول مسیح سے منسوب کیا گیا ہے کہ میں تین دن زمین کے نیچے رہوں گا وہ قول اگر صحیح ہے تو ممکن ہے کہ اس سے اس جانب اشارہ ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام نے زمین پر تین برس نبوت کا کام کیا اور اس کے بعد اٹھا لیے گئے کیونکہ حزقی ایل (۴: ۶) کی رو سے نبیوں کے ایک دن سے ایک سال مراد ہوتی ہے ڈاکٹر جان مکڈول بھی اپنی کتاب تعلیم الایمان مطبوعہ امریکن مشن لدھیانہ ۱۸۶۹ء کے صفحہ ۱۱۲ پر لکھتے ہیں کہ "اکثر عالموں نے کلام الٰہی کی تفسیر میں ایک دن کو ایک برس تصور کیا ہے اور قدیم یہودی

اور سب مسیحی عالم بھی اسی شمار میں متفق ہیں" اگر قول مسیح سے مندرجہ بالا معنی نہ سمجھے جائیں بلکہ یہ معنی لیے جائیں کہ آپ تین دن قبر میں ۷۲ گھنٹے ہونگے تو یہ قول غلط ثابت ہوجائے گا کیونکہ اناجیل کی رو سے آپ صرف ایک دن اور دو راتیں قبر میں رہے۔

جب صلیب ہی کا افسانہ غلط ہے تو مر کر زندہ ہوجانے کا قصہ تو آپ ہی غلط ہوا چاہیے۔ افسانۂ صلیب کی تردید اس سے یوں بھی کیا ہو سکتی ہے کہ استثناء (۲۱: ۲۳) میں لکھا ہے کہ جو لکڑی پر لٹکایا جاتا ہے یعنی جو سولی دیا جاتا ہے وہ خدا کا ملعون ہوتا ہے۔ اگر یہ آیت صحیح ہے تو اللہ تعالیٰ نے ضرور اپنے پیارے اور برگزیدہ بندے عیسیٰ علیہ السلام کو اس لعنت سے دور اور صلیب پانے سے محفوظ رکھا ہوگا۔ اس کے خلاف اناجیل میں جس قدر واقعات درج ہیں وہ سب یقیناً غلط اور الحاقی ہیں اور ان میں اس قدر اختلافات ہیں کہ وہ سب بیانات پایۂ اعتبار سے گر جاتے ہیں۔

قربانی اور کفارہ | اگر عیسائی عقیدہ کے مطابق تھوڑی دیر کے لیے اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ مسیح نے صلیب پائی تو تفتیش طلب مسئلہ یہ باقی رہتا ہے کہ یہ مصلوبی قربانی کیونکر ہو گئی اور اس قربانی کی ضرورت کیا پیش آئی تھی اور یہ دوسروں کے لئے کفارہ کس حد تک ثابت ہو سکتی ہے

اول تو وہ تخیل ہی غلط ہے جس پر قربانی اور کفارہ کے اس عقیدہ کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ یہ بات عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے کہ آدم علیہ السلام کے گناہ میں جملہ بنی آدم شریک ہیں۔ آدم سے ایک گناہ ہوا تھا جس کی انہیں دو سزائیں مل چکیں، ایک بہشت سے اخراج۔ دوسری موت (پیدائش ۳۔ رومیوں ۵: ۱۲ تا ۱۹۔ اول قرنتیون ۱۵: ۲۱) جب ایک گناہ کی دو سزائیں مل چکی ہیں تو وہ گناہ اب باقی کہاں رہا جو اولاد آدم سینکڑوں ہزاروں پشت تک اس ناکردہ گناہ کی سزا میں مبتلا رہے اگر خروج (۲۰: ۵) کا سہارا ڈھونڈا جائے جس کا مضمون یہ ہے کہ باپ دادا کی بدکاریوں کا بدلہ اولاد سے تیسری اور چوتھی پشت تک لیا جاتا ہے یا استثنا (۲۳: ۲) سے مدد لی جائے جس میں لکھا ہے کہ حرامی بچہ اور اُس کی دس پشتیں خداوند کی جماعت میں داخل نہیں ہو سکتیں تب بھی مطلب براری نہیں ہو سکتی کیونکہ آدم علیہ السلام کی سینکڑوں ہزاروں پشتیں گزر چکی ہیں یہ خیال بھی غلط ہے کہ موت گناہ کا نتیجہ ہے۔ پرندوں اور جانوروں نے حضرت آدم کی طرح کس نیکی و بدی کی شناخت کے درخت کا پھل کھا لیا تھا جو وہ اور ان کے بچے بھی مرتے ہیں حالانکہ سانپ

آدم کے اس گناہ کا باعث ہوا تھا مگر اس کے بچے ہزاروں برس تک زندہ رہتے ہیں۔ پھر مسیح کی قربانی اگر کفارہ بن گئی تو مسیح پر ایمان لانے والوں کے لیے چاہیئے تھا کہ موت نہ ہوتی مگر تعجب ہے کہ وہ بھی اسی طرح مرتے ہیں جس طرح مسیح پر ایمان نہ لانے والے۔ آدم کے اس گناہ میں حوا بھی شریک تھیں بلکہ حوا ہی نے آدم کو اس گناہ پر ابھارا تھا چنانچہ پیدائش (۳: ۱۶) کی رو سے حوا کو یہ سزا سنائی گئی کہ بچہ پیدا ہوتے وقت عورت دردِ زہ میں مبتلا ہوگی مگر ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی عورتیں آج بھی دردِ زہ میں مبتلا ہوتی ہیں اور ان کا مسیح اور مسیح کی قربانی پر ایمان انھیں اس درد کی تکلیف سے نجات نہیں دیتا۔ کفارہ کا فائدہ تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ مسیح پر ایمان لانے والے موت سے نجات پانے اور ایمان لاتے ہی فوراً بغیر مرے بہشت میں داخل ہو جاتے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ لوگوں نے مسیح پر ایمان لانے کے بعد بھی ایسی ایسی تکلیفیں اُٹھائی ہیں جو موت سے بھی شدید تر تھیں عیسائیوں میں ایسے فرقے بھی گزرے ہیں جو اس عقیدہ کو لغو سمجھتے ہیں اور لوگوں کو آدم کی نسل میں ہونے کی بنا پر ناپاک اور گنہگار نہیں تسلیم کرتے اور موت انسانی کو آدم کے گناہ کی سزا نہیں قرار دیتے۔

دوسرا امر قابل غور یہ ہے کہ ایک طرف تو بائبل میں یہ لکھا ہے کہ: "وہ جو جان کے لیے کفارہ دیتا ہے سو لہو ہے" (احبار ۱۷: ۱۱) یعنی قربانی کے خون کے بغیر گناہوں کا کفارہ نہیں ہوتا "بغیر لہو بہائے معافی نہیں ہوتی" (عبرانیوں ۹: ۲۲) "وہ (یعنی مسیح) ایک بار ظاہر ہوا کہ اپنے تئیں قربانی کرنے سے گناہ کو نیست کرے" (عبرانیوں ۹: ۲۶) اور لہو بہانے کی تفسیر علمائے نصاریٰ یہ کرتے ہیں کہ اس قدر خون بہایا جائے کہ موت واقع ہو جائے۔ یعنی ایک طرف تو بائبل میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ بغیر قربانی کا خون بہائے گناہوں کا کفارہ نہیں ہو سکتا اور نجات کی کوئی دوسری تدبیر ممکن نہیں اور مسیح مصلوب نہ ہوئے ہوتے تو جہان میں کوئی نجات نہ پاتا اور خدا کا عدل اور رحم پورا نہ ہوتا۔ اور دوسری طرف اسی بائبل میں ایسی مثالیں بھی پائی جاتی ہیں کہ صلیب کا قصہ پیش آنے سے قبل بغیر اس کے کہ کوئی قربانی عمل میں آئی ہو یا خون کی ایک بوند بھی زمین پر ٹپکی ہو مسیح نے محض اپنے اختیار سے لوگوں کے گناہ معاف کر دیے۔ متی (۹: ۲ تا ۶) میں یہ واقعہ درج ہے جبکہ مسیح نے اپنی مصلوبیت سے بہت پہلے ایک مفلوج کے گناہ بخش دیے تھے اور کہا تھا کہ

۔۔۔ ابن آدم (یعنی مسیح) کو زمین پر گناہ بخش دینے کا اختیار ہے"۔ لوقا (۷: ۴۷) میں ہے کہ مسیح نے ایک عورت کے بھی گناہ بخش دیئے تھے حالانکہ قصۂ صلیب ابھی پیش نہ آیا تھا۔ یوحنا (۸: ۱ تا ۱۱) میں ہے کہ مسیح نے ایک زانیہ عورت کو بھی معاف کر دیا تھا اور فرمایا تھا کہ جا اور پھر گناہ نہ کرنا۔ لوقا (۱۹: ۹) میں ہے کہ محصول لینے والوں کے سردار اور متمول زکی کو بھی نجات کی بشارت دیدی گئی تھی۔ لوقا (۲۳: ۴۳) میں ہے کہ صلیب پر (یعنی ابھی قربانی پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ) مسیح نے ایک چور کے گناہ بخش دیئے تھے۔ متی (۲۰: ۱۵) میں مسیح کا یہ قول درج ہے کہ: "کیا روا نہیں کہ میں اپنے مال میں سے جو چاہوں سو کروں"۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم تو اپنی امت کو یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، اس کے بندے اسکی ملکیت ہیں، وہ اپنی ملکیت میں جو چاہے تصرف کر سکتا ہے اور وہ اپنے بندوں کے گناہ معاف کرنے میں کسی قربانی یا کفارے یا کسی اور چیز کا محتاج نہیں اور مندرجہ بالا مثالوں سے اگر وہ صحیح ہیں تو یہ پایا جاتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے یہ اختیار مل گیا تھا کہ وہ جس کے چاہیں گناہ معاف کر دیں بغیر اس کے کہ کوئی قربانی کی گئی ہو یا کفارہ ادا کیا گیا ہو۔ پھر مصلوبیت اور کفارہ کی حاجت ہی کیا رہی؟

گناہوں کی بخشش نے عیسائیوں میں وہ وسعت اختیار کر رکھی ہے کہ صرف مسیح ہی نہیں بلکہ مسیح کے شاگردوں کو بھی جنت اور دوزخ کی چابی عطا فرما دی گئی تھی حالانکہ ان شاگردوں میں سے ایک بھی مصلوب نہ ہوا تھا۔ یوحنا (۲۰: ۲۳) میں لکھا ہے کہ مسیح نے اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ: "جن کے گناہوں کو تم بخشو گے ان کے گناہ بخشے جائیں گے اور جنہیں تم نہ بخشو گے نہ بخشے جائیں گے"۔ یوحنا کی رو سے یہ اجازت حواریوں کو مصلوبیت کے بعد مسیح کی حیات ثانی میں عطا ہوئی۔ مگر متی (۱۶: ۱۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ مصلوبیت سے بہت دن قبل جنت و دوزخ کا یہ اختیار حواریوں کو مل چکا تھا۔ چنانچہ پاپائے روم نے ورثہ میں اس اختیار پر چنگل مارا اور گناہوں کی معافی کی چٹھیاں یروشلم پر لڑنے والے عیسائیوں کو سینکڑوں برس تک تقسیم کیں۔

نہ صرف حواریوں اور ان کے جانشینوں بلکہ ہر عیسائی مرد اور عورت کو اپنی گنہگار زوجہ یا اپنے گنہگار شوہر کو دوزخ سے بچا لینے کا مرتبہ حاصل ہے (اول قرنتیون ۷: ۱۶) بلکہ عیسائیوں میں کا ہر فرد تنہا اپنی نجات کی آپ ہی تدبیر

کر سکتا ہے (لوقا ۱:۵۰: ۲۵ تا ۳۸) متی ۱۰: ۲۲) ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے حضرت عیسیٰ کی مصلوبی اور کفارہ کی قطعاً کوئی حاجت نہ تھی۔

تیسرا امر قابل غور یہ ہے کہ مسیح کی یہ قربانی مسیح پر ایمان لانے والے کے لیے اس کے تمام عمر کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے یا صرف ایمان لانے کے وقت تک کے گناہ ہی معاف ہوتے ہیں؟ اگر تمام عمر کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں تو پھر دین کی پابندی اور عبادت و ریاضت اور یوم السبت کے احترام کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اور وہ جملہ پند و نصائح اور اوامر و نواہی جن سے کتب مقدسہ پُر ہیں لایعنی اور بیکار ہو جاتی ہیں۔ اگر ایمان لانے سے قبل ہی کے گناہ معاف ہوتے ہیں تو ایمان لانے سے بعد کے گناہوں کے کفارہ کے لیے اسے دوسری قربانی کرنی پڑے گی۔ اور جب وہ بعد کے گناہوں کو قربانی سے دور کر دیتا ہے تو پہلے کے گناہوں کو بھی خود ہی قربانی سے دور کر سکتا تھا۔ قربانی مسیح کی کیا ضرورت تھی؟ مگر عبرانیوں کے باب ۱۰ آیہ ۲۶ میں یہ عبارت بھی درج ہے کہ:-

"لہٰذا اس لئے کہ ہم نے سچائی کی پہچان حاصل کی ہے جان بوجھ کے گناہ کریں تو پھر گناہوں کے لیے کوئی قربانی باقی نہیں"

بہت کم عیسائی ایسے ہوں گے جو عیسائی ہونے کے بعد کسی گناہ کے مرتکب نہ ہوئے ہوں۔ مندرجہ بالا آیت کی رو سے افسوس ہے کہ اُن کے ان گناہوں کی معافی کی کوئی صورت نہیں۔ ان سے کافر ہی اچھے جو مسیح پر ایمان لاتے ہی گناہوں سے پاک ہو جاتے ہیں۔ ان عیسائیوں کے گناہ تو مسیح پر ایمان لانے سے بھی دور نہیں ہوتے اور کسی دوسری قربانی سے بھی ان گناہوں کا کفارہ ادا نہیں ہو سکتا۔

چوتھا امر قابل توجہ یہ ہے کہ قربانی ہمیشہ عمدہ نفیس بے عیب اور مال طیب کی دی جاتی ہے۔ عیسائی عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ میں کمال الوہیت اور کمال انسانیت دونوں کا اجتماع تھا۔ الوہیت کی حیثیت کو تو قربانی سے کوئی تعلق ہی نہیں ہو سکتا اور وہ الوہیت ہی کیا ہے جو قربان ہو سکے۔ چونکہ کفارہ انسانی گناہوں کا مقصود تھا اس لیے قربانی انسان ہی کی ہو سکتی تھی اور مسیح صرف انسان کامل ہونے کی حیثیت ہی سے صلیب پر چڑھے اور

قربان ہو گئے۔ مگر عیسائی عقیدہ ہی کے رو سے مسیح بحیثیت انسان ہونے کے بے عیب نہ تھے اور العوذ باللہ گناہ سے پاک نہ تھے۔ رومیون (۳: ۹ تا ۱۲) کا فتویٰ ہے کہ آدم کی اولاد میں کوئی بے گناہ نہیں، کوئی راستباز نہیں کوئی سمجھ دار نہیں، کوئی خدا کا طالب نہیں سب گمراہ ہیں نکمے ہیں اور بدکار ہیں۔ ایوب (۲۵: ۴) کا فیصلہ ہے کہ:۔ "وہ جو عورت سے پیدا ہوا ہے کیونکر پاک ٹھیرے"۔ چنانچہ مسیح نے یوحنا اصطباغی (یعنی جان دی بپٹسٹ) سے بپتسما لیا اور یوحنا صرف توبہ ہی کا بپتسما دیتے تھے اور توبہ گناہوں سے ہوتی ہے (متی باب ۳ مرقس باب ۱) لہذا مسیحیوں کے ان اقوال کے بموجب قربانی مسیح بے داغ نہ تھی۔ یہاں صرف مسیحی اقوال ہی سے بحث ہے ورنہ مسلمان تو عیسیٰ علیہ السلام اور تمام دیگر انبیاء کو معصوم قرار دیتے ہیں اور ان گستاخیوں سے لرزتے ہیں جو بعض عیسائی عقائد اور عیسائی تحریروں سے جناب مسیح اور دیگر انبیاء کی شان میں واقع ہوتی ہیں۔

پانچویں بات جو غور طلب ہے یہ ہے کہ عیسائی عقیدہ کے بموجب عیسیٰ علیہ السلام صلیب پانے کے بعد جب جی اٹھے تھے تو انسانیت کے ساتھ آسمان پر گئے۔ کیونکہ مصلوبی کے بعد اگر عیسیٰ علیہ السلام کی انسانیت مفقود ہو گئی یا اُس انسانیت نے دریا۔ ورنہ کیا تو جی اُٹھنے کے نہ کوئی معنی ہیں نہ جی اٹھنے کا ثبوت۔ الوہیت تو ماورائے موت و حیات ہے۔ مرنے جینے کا اطلاق انسان پر ہوتا ہے مخلوق پر ہوتا ہے عیسیٰ علیہ السلام اپنی اسی انسانیت کے ساتھ جس سے آپ اس دنیا میں متصف تھے اور اپنے اُسی انسانی جسم کے ساتھ جس سے اس دنیا میں آپ نے زندگی بسر فرمائی آسمان پر نہ گئے ہوتے تو آسمان پر جانے کی فضیلت ہی کیا تھی۔ یوں تو ہر شخص مرتا ہے اور اُسکی روح آسمان پر جاتی ہے مگر یہاں فضیلت تو اس میں تھی کہ حضرت الیاس اور حضرت حنوک (یعنی ادریس) کی طرح حضرت عیسیٰ بھی دنیوی انسانی جسم کے ساتھ آسمان پر اُٹھائے گئے۔ مصلوبی کے بعد خود مسیح نے لوگوں کو اپنا جسم دکھلایا لوقا (۲۴: ۳۶ تا ۴۳) کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو جو مصلوبی کے بعد کے زمانہ سے متعلق ہے:۔

"مگر اُس نے (یعنی مسیح نے) ان سے کہا کہ تم کیوں گھبراہٹ میں ہو اور کاہے کو تمہارے دل میں اندیشے پیدا ہوتے ہیں۔ میرے ہاتھ پاؤں کو دیکھو کہ میں ہی ہوں اور مجھے چھوؤ اور

دیکھو کیونکہ روح کو جسم اور ہڈی نہیں جیسا مجھ میں دیکھتے ہو۔ اور یہ کہہ کے انھیں اپنے ہاتھ اور پاؤں دکھائے۔ اور جب وے مارے خوشی کے اعتبار نہ کرتے تھے اور تعجب تھے تو اس نے ان سے کہا کہ کیا یہاں تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے۔ تب انھوں نے بھونی ہوئی مچھلی کا ایک ٹکڑا اور شہد کا ایک چھتا اُس کو دیا۔ اس نے لے کے اُن کے سامنے کھایا۔"

اسی نوع کی گفتگو مصلوبی کے بعد مسیح اور تھوما میں بھی یوحنا (۲۰: ۲۷) میں درج ہے۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مسیح کی انسانیت برقرار ہے اور ان کا دنیاوی جسم قائم و محفوظ ہے تو سولی پر کون چڑھا اور قربان کون ہوا اور قربانی میں نذر کیا چیز ہوئی اور انسانی گناہوں کا کفارہ کیونکر ادا ہو سکا؟ وہ فدیہ بھی فدیہ ہے جو واپس کر دیا گیا ہو؟ وہ قربانی بھی قربانی ہے جو قبول نہ کی گئی اور جسم کو اور جان کو واپس کر دیا گیا؟۔ اور ایسی نامقبول قربانی جو رد کر دی گئی ہو کیا انسانی گناہوں کا کفارہ ہو سکتی ہے جبکہ قربانی کی شرط یہ ہو کہ اس قدر خون بہایا جائے کہ موت واقع ہو جائے؟ بات دراصل یہ ہے کہ اناجیل مروجہ سے بھی ثابت نہیں ہوتا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی گئی۔ اور جب آپ کو سولی ہی نہیں دی گئی تو مر کر جی اٹھنے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا اور قربانی اور کفارہ کے تخیلات بھی ہوا میں اڑ جاتے ہیں۔

باوجود جملہ امور مندرجہ بالا کے عیسائی حضرات اسی پر مصر ہوں کہ مصلوبی مسیح کو ثابت کر کے اس قربانی کو اپنے گناہوں کا کفارہ قرار دیں تو انھیں معاملہ کے ذرا اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ عام قاعدہ یہ ہے کہ قربانی کا فائدہ قربانی گذراننے والے کو ملتا ہے۔ اس قاعدہ کی رو سے قربانی مسیح کا فائدہ صرف یہوداہ اسکریوطی ہی کو پہونچتا ہے جس نے یہ بیش قیمت قربانی گذرانی نہ کہ اُن عیسائیوں کو جو صرف باتیں بناتے رہتے ہیں۔ جب تک کہ ہر عیسائی مسیح کے گرفتار کرانے میں اپنی شرکت ثابت نہ کر دے اس قربانی کے مفاد میں حصہ دار کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اور اگر مسیح کو صرف ایک ہی شخص یعنی یہوداہ اسکریوطی نے گرفتار کرایا اور اس گرفتاری اور قربانی سے لاکھوں کروڑوں عیسائیوں نے فائدہ اٹھایا اور دوزخ سے نجات پائی اور جنت کے مستحق ٹھہرے تو یہوداہ اسکریوطی نے بہت بڑا کام کیا اور بہت بڑا ثواب کمایا اور بہت اچھا آدمی اُسے سمجھنا چاہیئے اور تمام عیسائیوں کو اس کا شکر گزار ہونا چاہیئے اور کم از کم اس کے

زانی گناہ تو اسی کی گزرانی ہوئی قربانی کے طفیل میں معاف ہو ہی جانے چاہئیں۔ مگر تعجب ہے کہ متی (۲۶: ۲۴) میں مسیح اسی یہوداہ اسکریوطی کی بابت فرماتے ہیں کہ: "۔۔ اس شخص پر افسوس جس کے ہاتھوں ابن آدم گرفتار کرایا جاتا ہے اگر وہ شخص پیدا نہ ہوتا تو اس کے لیے بہتر تھا۔" گویا اپنی امت کے لیے یہ قربانی یہ کفارہ اور گناہوں کی یہ بخشش عام جناب مسیح کو بہت ناگوار گزری اور آپ نے اس قربانی گزراننے والے کے اس دنیا میں ہونے پر تاسف فرمایا۔ پھر یوحنا (۶: ۷۰) میں جناب مسیح یہوداہ اسکریوطی کو شیطان کے لقب سے ملقب فرماتے ہیں عجائبات قدرت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ایک حیرت میں ڈالنے والی نشانی ہے کہ اس شیطان نے بہشت کا دروازہ ساری خلقت کے لیے کھول دیا۔ ایک شیطان آدم علیہ السلام کے بہشت سے نکالے جانے کا باعث ہوا۔ دوسرا شیطان اولاد آدم کے بہشت میں جانے کا باعث بنا گویا بہشت سے نکالنا اور بہشت میں لے جانا شیاطین ہی کے اختیار میں ہو گیا۔ عیسائی علماء اگر اپنے موجودہ عقائد ایسے رکھتے ہیں جن کے لیے اناجیل مروجہ میں بھی کوئی قابل اعتماد تائید نہیں ملتی تو ان جملہ لازمی نتائج کو انھیں طوعاً و کرہاً ماننا پڑیگا اور ان کا مذہب دنیا کے لیے ایک مضحکہ انگیز چیز بن جائے گا۔

مختلف مذاہب پر تنقیدی نظر ڈالنے والوں کے لیے اسکی ضرورت سب سے پہلے ہے کہ وہ اصلی اور حقیقی تعلیم کو بدعات مابعد سے علیحدہ کر کے دیکھیں پھر مختلف مذاہب کی اصلی تعلیمات کا باہمی موازنہ کر کے اُن مذاہب کی حقانیت یا عدم حقانیت کے متعلق رائے قائم کریں۔ اور اگر کسی مذہب زیر تفتیش میں انھیں لغویات اور بیہودگیوں سے سابقہ پڑے تو اس غلط نتیجہ پر نہ آجائیں کہ ہر مذہب ایسی ہی کچھ لغویات اور بیہودگیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ سچ اس جہان سے مفقود نہیں ہوا اور سچا مذہب لغویات اور توہمات و ظنیات و رسمیات لایعنی سے اب بھی محفوظ ہے اور آئندہ بھی محفوظ رہے گا صرف چشم حق بین کی ضرورت ہے۔

(باقی)

"اِسْلام اور سائنس"

(از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز، بی اے، ہوم ڈپارٹمنٹ۔ دہلی)

(جمعیت انصار المسلمین شملہ کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۶ ستمبر ۱۹۳۴ء میں عنوان بالا پر میں نے ایک تقریر کی تھی۔ احباب کا اصرار ہے کہ اسے محفوظ کر لیا جائے۔ اس لیے ذہن پر زور دیکر اسے ضبط تحریر میں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔ ممکن ہے اس میں بعض باتیں ایسی بھی آگئی ہوں جو میرے بعض مضامین میں کہیں شائع ہو چکی ہوں۔ لیکن چونکہ مقصود اسی تقریر کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا ہے۔ اس لیے تکرار و توارد کے احتساب سے درگزر کرتا ہوں۔ پرویز)

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ۔ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ۔

میرے واجب الاحترام بزرگو! اور عزیز بھائیو! جیسا کہ آپ کو اس جلسہ کے پروگرام سے معلوم ہو گیا ہو گا مجھے جس موضوع پر آپ کی خدمت میں کچھ عرض کرنا ہے وہ "اسلام اور سائنس" ہے۔ سائنس سے مراد علم الکیمیا اور طبعیات ہی نہیں جیسا کہ اس لفظ کے اطلاق سے بالعموم ذہن منتقل ہو جایا کرتا ہے، بلکہ یہ لفظ اپنی جامعیت کے اعتبار سے تمام ان علوم و فنون پر حاوی ہے جن کا تعلق مشاہدات حسی و عقلی سے ہے۔ خواہ وہ جمادیات سے متعلق ہوں یا نباتات سے، عام حیوانات سے ان کا علاقہ ہو یا خود نفس انسانی سے۔ اس کرہ عناصر کے خواص و طبائع کا تجزیہ کریں یا پھر، کارزمین ہائے ساختہ، اجرام فلکی کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں، یہ علوم اور علوم کے تمام شعبے سائنس ہی کہلائیں گے۔ پھر اسلام اور علوم دنیوی کے عنوان پر عام طور پر جو کچھ کہا جاتا ہے یا لکھا جاتا ہے اس سے مقصد صرف اس قدر ہوتا ہے کہ مسلمانو

درخشندہ عہد ترقی کے چند خوشگوار مناظر سامنے لاکر یہ نظر فریب اطمینان دلا دیا جائے کہ خیر اگر آج اور قومیں تحصیل علوم و فنون میں ترقی کر رہی ہیں تو کبھی تم بھی اس میدان کے مرد رہ چکے ہو۔ اور داستان کے اس خواب آور اثر سے قوم کو تھپک تھپک کر سلا دیا جائے۔ اگرچہ میں بھی کچھ ایسی ہی تفصیلات پیش کروں گا جو عام طور پر کی جاتی ہیں۔ اور مجھے بھی کچھ ایسے ہی سحر کار مناظر سامنے لانے ہوں گے جو تاریخ کے اوراق پر درخشندہ موتیوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں۔ لیکن میں ان کیفیات و مناظر کو کسی اور زاویہ سے دکھانا چاہتا ہوں اور میرے نتائج مستخرجہ افسون خواب آور ہونے کی بجائے اہل بصیرت کے لیے عبرت و موعظت کے ہزار سامان اپنے اندر رکھیں گے۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ۔

برادران! یوں تو دنیا کی جس چیز پر نگاہ ڈالیے تغیر و تبدل کے ایک لامتناہی سلسلہ کی جولانگاہ نظر آئے گی۔ سائنس کی تحقیقات اور آثری اکتشافات نے اب یہ حقیقت بے نقاب کر دی ہے کہ مہیب و عمیق سمندر کبھی فلک بوس پہاڑ تھے اور ہمالیہ کی برخ بستہ چوٹیاں بحر اطلانطک کی سی گہرائیاں تھیں۔ آبادی کی جگہ ویرانے اور ویرانوں کی جگہ آبادیاں تھیں۔ اور یہی سلسلہ غیر محسوس طور پر آج بھی جاری و ساری ہے۔ لیکن ان انقلابات ارضی و سماوی کا انسان کی عمرانی زندگی پر کچھ ایسا گہرا اثر نہیں پڑتا، جیسا ان تغیرات کا جو زمین کی بجائے خود اہل زمین کے اندر پیدا ہوتے ہیں اور جن سے سطح ارض کے نقشے بدلنے کی بجائے انسانی تہذیب و تمدن کے آثار بنتے اور بگڑتے ہیں۔ آج ایک قوم اپنی ترقی کی معراج کمال پر ہوتی ہے اور کل ہی آثار قدیمہ کے کھنڈرات اس کے اجڑے ہوئے کاشانوں اور لٹے ہوئے خزانوں کے مرثیہ خواں ہوتے ہیں۔ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔ پھر مصیبت یہ ہوتی ہے کہ دور ہبوط میں سے گزرنے والی قوم اپنی دولت و ثروت ہی نہیں کھو بیٹھتی بلکہ اسکی ذہنیت بھی کچھ ایسی پستی کے گڑھے میں جا پڑتی ہے کہ اسے اپنے ہاں کی ہر چیز معیوب نظر آتی ہے۔ اور رو بہ ترقی اقوام کی ہر ادا محبوب۔ وہ سعادت و نجات کا راستہ ڈھونڈتی ہے تو انہی کے نقوش قدم میں اور اسکو فلاح و بہبود کی راہیں کھلتی نظر آتی ہیں تو انہی کی کورانہ تقلید میں غرض کہ وہ دیکھتی ہے تو انہی کی آنکھوں سے سنتی ہے تو انہی کے کانوں سے اور سمجھتی ہے تو انہی کے دلوں سے۔ اور اپنی یہ حالت ہوتی ہے کہ :۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا-أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (۰۰: ۲۲)	ان کے دل ہوتے ہیں مگر ان سے سمجھتے نہیں آنکھیں ہوتی ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں کان ہوتے ہیں مگر ان سے سنتے نہیں۔ وہ ڈھور ڈنگر کی طرح سے ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ یہی لوگ غفلت شعار ہیں۔

یہی حالت آج امت مسلمہ کی ہے جس کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود ہے۔

حضرات! زمانہ ترقی کر رہا ہے اور نہایت برق رفتاری کے ساتھ۔ زمانہ سے مراد آج اقوام یورپ ہی ہیں کہ وہ ترقی کی لامحدود فضاؤں میں بجلیوں کی سی سرعت کے ساتھ اڑتی چلی جا رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ پسماندہ اقوام پر ان کی اس محیر العقول ترقی کا جتنا بھی مرعوب کن اثر ہو کم ہے، لیکن مسلمانوں کی ذہنیت پر اس کا خاص طور پر بڑا ہلاکت آفرین اثر پڑا ہے۔ اور اگر اس زہر کو، جو ملت اسلامیہ کی رگ و پے میں اس سرعت سے سرایت کرتا چلا جا رہا ہے، جلدی زائل نہ کیا جائے گا تو بعید نہیں کہ مسلمان اپنی ہستی کے جوہر خاص کو ہی کھو بیٹھیں۔ یورپ کو جب علمی ترقی کا خیال آیا تو مذہب ان کے راستے میں سب سے بڑا روڑا تھا۔ مسیحیت نے علمی ترقیوں کی کس قدر مخالفت کی۔ اس کا اندازہ لگانا ہو تو یورپ میں علم و کلیسا کی جنگ کی داستانیں پڑھیے۔ معلوم ہو جائے گا کہ جناب مسیح علیہ السلام کی معصوم بھیڑوں نے ہر جویائے علم و حقیقت کے ساتھ (جو غیر نہیں بلکہ یگانے تھے) جس درندگی کا سلوک کیا ہے قتل و خون ریزی کی بڑی خونچکاں داستانیں اس کے سامنے شرمندہ ہیں۔ گلیلیو Galileo کا کیا قصور تھا؟ یہی نا کہ اس نے کہہ دیا کہ میری آنکھیں مجھے دکھا رہی ہیں کہ زمین ساکن نہیں متحرک ہے۔ اور اس نے دوربین کے ذریعے کوپرنیکس Copernicus کے نظریہ کی تائید کر دی۔ رومن کلیسا اس کے خلاف جوش غیظ و غضب میں دیوانہ ہو گیا۔ مقدمہ چلایا گیا اور اس مجرم انکشاف حقیقت کے خلاف موت کا فتویٰ صادر کر دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ جب اسے پیسا Pisa کے بلند مینار پر لے گئے کہ وہاں سے گرا کر اس ملحد کا خاتمہ کر دیا جائے تو ایک پادری بھی ساتھ گیا کہ مرنے والے سے گناہوں کے اعتراف کی آخری رسم ادا کرائی جائے۔ اس نے وہاں پہونچ کر کہا کہ اگر اب بھی

کہدو کہ زمین ساکن ہے متحرک نہیں تو جان بخشی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس پرستار صداقت نے وہاں بھی کہدیا کہ ع

بردار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

"مجھے تو اب بھی زمین متحرک ہی نظر آتی ہے" چنانچہ پیسا کا مینار آج تک اس کے خون ناحق کا شاہد ہے۔ یہاں یہ واضح کردینا بھی خلاف محل نہ ہوگا کہ مسیحیت کوپرنیکس یا گلیلیو کے اس نظریہ کے خلاف کیوں تھی؟ فلکیات کے متعلق حکمت یونان میں آرسطو کا نظریہ نہایت معتبر سمجھا جاتا تھا جس کی رو سے زمین اس کائنات کی مرکز اور ساکن تصور کی گئی تھی اور جملہ اجرام سماوی اس کے گرد چکر لگاتے تھے۔ اگرچہ اس نظریہ کی فیثاغورث وغیرہ نے اسی زمانے میں تردید کردی تھی لیکن بایں ہمہ اسے خاص اہمیت حاصل رہی اور یہی نظام بطلیموسی نظام فلکی کے نام سے یورپ میں رائج ہوگیا۔ مسیحیت کے اعتقاد میں جملہ کائنات میں اس زمین کو خاص اہمیت حاصل ہونی چاہیئے تھی جس پر خود خدا یا خدا کے بیٹے کی قربانی ہوئی۔ چونکہ بطلیموسی نظام کی روسے زمین کو عالم موجودات میں ایک مرکزی اور خصوصی حیثیت حاصل تھی، اس لیے مسیحیت نے اس نظام کو اپنے اعتقادات میں داخل کرلیا۔ ازاں بعد جب علم و تحقیق کی روشنی میں یہ معلوم ہوا کہ زمین بھی دیگر اجرام فلکی کی طرح متحرک ہے اور اسے کوئی خاص امتیازی شان حاصل نہیں تو اس سے چونکہ مسیحیت کے اولین اعتقاد پر زد پڑتی تھی، اس لیے کلیسا نے اسکی مخالفت کی۔ یورپ میں اس جدید نظام فلکی کو کوپرنیکس کا نظام کہتے ہیں۔ گلیلیو، بیچارے نے چونکہ علی وجہ البصیرت اس جدید نظام کی تائید کردی اس لیے حوالہ دار و رسن کردیا گیا۔ علم و تحقیق کے خلاف یہ آندھی صرف قدامت پسند کلیسا کی طرف سے ہی نہ تھی بلکہ ان کے روشن خیال اور تجدد پسند طبقہ پراٹسٹنٹ نے بھی اس کے خلاف کافی زہر اگلا ہے جس کے متعلق خود لوتھر Luther اور میلانکتھون Melanchthon وغیرہ کی تصنیفات بھری پڑی ہیں۔

یورپ اگر ایسے مذہب کو چھوڑ تا نہ تو اور کیا کرتا۔

ادھر ہندوستان میں جب علمی ترقی کا خیال پیدا ہوا تو وہی مظاہر فطرت۔ جن سے کروڑوں کام لینے تھے دیوی اور دیوتاؤں کی شکل میں سامنے موجود تھے۔ اندر۔ اگنی اور وایو (پانی۔ آگ اور ہوا) جن کو تابع فرمان بنا کر

یورپ نے زمین و آسمان کو مسخر کر رکھا تھا ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر ڈیوٹی بجا لانا پڑتا تھا جس آزادی پسند طبقہ نے علمی ترقیوں کو ضروری سمجھا وہ قدامت پسند طبقہ کے احتجاج کی کچھ پروا نہ کرتے ہوئے مستانہ وار آگے بڑھ گیا اور یہاں بھی قدیم مذہب تیاگ دیا گیا۔

مسلمانوں نے جب دیکھا کہ دنیا میں جس قوم کو علمی ترقی کا خیال آتا ہے اسے سب سے پہلے مذہب کو چھوڑنا پڑتا ہے تو انھوں نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ "صاحب ہونہ ہو ہمارے موجودہ نکبت و افلاس ہبوط و تنزل پستی و تہی مائدگی کا واحد ذمہ دار ہمارا مذہب ہے۔ اور جب تک ہم اسلام کو نہیں چھوڑ دیتے دنیا میں کبھی ترقی نہیں کر سکتے" اس میں شبہ نہیں کہ ایک حد تک اس مذہبی منافرت کے ذمہ دار وہ حضرات بھی ہیں جنھوں نے اسلام کا غلط مفہوم ان کے سامنے پیش کیا۔ لیکن اسلام کوئی ایسا مذہب تو نہیں کہ نہ اسکی اصلی تعلیم کے مآخذ مل سکتے ہوں اور نہ اسکی عملی تاریخ میسر آ سکے۔ انھیں چاہیے تھا کہ یک طرفہ ڈگری صادر کر دینے سے پہلے اسلام کو موقع تو دیتے کہ اپنی صفائی پیش کر سکتا۔ کتاب و سنت کو اٹھا کر دیکھتے تاریخ امت کو ملاحظہ کرتے۔ اور پھر اس کے متعلق اپنی رائے قائم کرتے اور اس رائے کا اظہار بھی کرتے پھرتے۔ اگر اتنی تکلیف گوارا فرما لیتے تو یہ حقیقت ان پر واضح ہو جاتی کہ اور قوموں نے اگر مذہب کو چھوڑا ہے تو اس لیے کہ ان کا مذہب انکی علمی ترقیوں کے راستہ میں حائل ہو رہا تھا۔ برعکس اس کے ان کی علمی ترقیوں کا دور ہی وہ تھا جس میں مذہب اپنے اوج کمال پر تھا۔ اوروں کو اگر ترقی کرنے کے لیے مذہب چھوڑنا پڑا ہے تو یہ ترقی کر ہی نہیں سکیں گے جب تک کہ حقیقی مذہب اسلام کو اپنا رہبر و ہادی نہیں بنائیں گے۔ یہ نہ تو محض ہماری خوش عقیدگی ہے اور نہ ہی صنمیات یونان کے افسانے۔ بلکہ یہ قرآن کریم کی صریح تعلیم ہے اور تاریخ کی ٹھوس حقیقتیں جو کچھ میں آج عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہی ہے کہ سائنس کی ترقیوں کے باب میں اسلام کی تعلیم کیا ہے؟ اور جب ایک مقدار پرست قوم نے اس تعلیم پر عمل کر کے دکھایا تو کیا کیا نتائج مرتب ہوئے۔ اور تاریخ کا یہ حصہ مسلمان نہیں بلکہ غیر مسلم مصنفین کی شہادات پر مبنی ہوگا کہ کسی جانبداری کا احتمال نہ ہو۔

سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ انسان کو جس چیز نے "انسان" بنا دیا اور اسے اس قدر شرف و امتیاز بخشا ہے

وہ امتیازی خصوصیت کونسی ہے ؟ قرآن کریم نے اس حقیقت کبریٰ کو اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں نہایت لطیف و حسین پیرائے میں بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ " میں دنیا میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں " فرشتوں کی معصوم نگاہوں نے جب اس پیکر کو دیکھا تو اس کے خمیر میں کچھ آتشین اجزا بھی انھوں نے مضمر دیکھے۔ عرض کیا کہ " الٰہا کیا دنیا میں ایسا نائب بنایا جائے گا جو وہاں فساد برپا کرے گا اور قتل و خونریزی کا مرتکب ہوگا ؟ حالانکہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں " ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ " ہم بہتر جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے " لیکن اس کے ساتھ ہی اس موقع پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری سمجھا کہ وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر یہ پیکر خاکی خلافت و نیابت الٰہی کے قابل سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے " وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا " ۔ اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی میں بلا تحدید و تعین تمام حقائق اشیاء کا علم ودیعت کر کے رکھ دیا اور اسی فضیلت کی بنا پر اسے مسجود ملائک قرار دیا۔ لہٰذا یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ وہ شرف و اجتبا جس کی بنا پر انسان خلیفۃ فی الارض بنا علم حقائق اشیاء تھا۔ علم الاسماء سے محض الفاظ کی تعلیم مراد لینا درست نہیں۔ اس لیے کہ اصل تو علم کہتے ہی ہیں ادراک معلومات کو جو غیر متبدل ہیں۔ برخلاف الفاظ کے جو ہمیشہ تغیر پذیر رہتے ہیں۔ پھر جو علم اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے مقابلے اور معارضے میں عطا فرمایا تھا وہ اس قدر ناقص نہیں ہو سکتا کہ محض اشیاء کے نام بتا دیئے ہوں۔ بلکہ اسماء سے مراد ہیں مسمیات چنانچہ مفسرین کا ایک کثیر گروہ اسی طرف گیا ہے جن میں امام رازی علیہ الرحمۃ بھی شامل ہیں۔ یہی وہ علم الاشیا ہے جس کے ایک حصہ کو یورپ علم الفطرت (Natural Science) سے تعبیر کرتا ہے اور اسے اپنے یہاں کی ایجاد بتاتا ہے حالانکہ اسلام نے صدیوں پیشتر اسے اصل انسانیت کا امتیاز قرار دیا ہے۔ پھر علم کی فضیلت کے متعلق قرآن کریم نے ان الفاظ میں فرما دیا کہ :-

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۹ : ۱۰)

کہو کہ جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں ؛

چنانچہ تحصیل علم کی تحریک و تحریص کے طور پر نبی اکرمؐ کی متعدد احادیث مروی ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص

طلب علم کے لیے گھر سے نکلتا ہے اس کے ایک ایک قدم کے ساتھ دس دس نیکیاں شامل ہوتی ہیں"

کتاب وسنت کی ان تصریحات کے بعد اب ہمیں مسلمانوں کی علمی تاریخ کو دیکھنا ہے کہ وہ کس حد تک اس تعلیم کا پابند ہوئی۔ اگرچہ علمی ترقیوں کی طرف رجحان تو بنی امیہ کے وقت سے ہی شروع ہوچکا تھا لیکن یہ ترقیاں اپنی معراج پر بغداد کی عباسی سلطنت اور اندلس کی اموی سلطنت میں پہنچیں اور قرطبہ وبغداد وہ مرکز تھے جہاں سے آفتاب علم و فضل فضائے عالم میں ضیا پاشی کرتا تھا۔ اس عہد کی علمی تاریخ پر بالاستیعاب نگاہ ڈالنے کے لیے بہت بڑی فرصت درکار ہے اس لیے اس مختصر سی صحبت میں مختلف علوم وفنون کی چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جائے گا۔ یہاں اتنا ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہر زمانہ کی ترقی کا موازنہ اس زمانہ کی حیثیت مجموعی سے کرنا چاہیے۔ آج دنیا من حیث الکل بہت ترقی کرچکی ہے اور ترقی کا معیار بھی اتنا ہی بلند ہو چکا ہے۔ میں عہد اسلامیہ کی جس ترقی کا ذکر کر رہا ہوں یہ وہ زمانہ تھا جس میں ابھی یورپ کا بیشتر حصہ پتوں اور کھالوں سے ستر ڈھانپا کرتا تھا۔

سب سے پہلے علم الارض کو لیجیے:۔

(۱) زمین کی پیمائش اور طبقات الارض کی تقسیم کا کام سب سے پہلے مسلمانوں نے شروع کیا۔ خلیفہ مامون الرشید نے شام کے علاقہ سے مساحت شروع کرائی۔ محمد ابن موسیٰ اس Survey Party کے انچارج تھے نیز اس نے ستر (۷۰) علماء (Scholars) کی مدد سے کرۂ ارض کا ایک نقشہ بنایا۔ ان میں الخوارزمی بھی تھے جنہوں نے اپنی کتاب میں تمام روئے زمین کو سات مختلف طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ جس میں آج تک کوئی ردوبدل نہیں کیا جاسکا۔ اس سے قبل بطلیموسی جغرافیہ میں اس تقسیم کا کوئی وجود نہ تھا۔

(۲) المسعودی اس زمانہ کا جہاں گرد (Globe Trotter) تھا جس نے تمام آباد دنیا کا سفر پاپیادہ کیا اور اپنے مشاہدات قلم بند کرتا چلا گیا۔

(۳) مشہور اندلسی حکیم ابوبکر نے تمام روئے زمین کی آبادی کے حالات متعدد ضخیم جلدوں میں لکھے ہیں۔

(۴) ادریسی بھی اس زمانہ کا مشہور جغرافیہ داں ہے جس کی علمی شہرت کا اندازہ اس سے لگا لیجیے کہ صقلیہ (سسلی) کے

عیسائی بادشاہ راجر دوم نے اسے اپنے دربار میں بلا لیا وہاں اس نے بادشاہ کے لیے ایک چاندی کا کرہ تیار کیا جس پر تمام دنیا کا نقشہ کندہ کرایا گیا تھا۔

(۵) اسی زمانہ میں حکیم ناصر خسرو۔ ابن بطوطہ اور ابن جبیر جیسے سیاح پیدا ہوئے جن کی علمی کاوشیں آج تک اہل علم و تحقیق کے لیے مایہ ناز ہیں۔

(۶) مقدسی نے جغرافیہ پر ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) لکھا جو تین حصوں پر مشتمل ہے ایک ذاتی مشاہدات۔ ایک ثقہ روایات اور تیسرا حصہ مطالعہ کتب پر مبنی ہے۔

(۷) الخوارزمی نے اس زمانہ میں جبکہ امریکہ کا خیال تک بھی کسی کو نہ تھا۔ ایک نظریہ ایجاد کیا جسے یورپ میں نظریۂ Arim کہتے ہیں۔ جس کی رو سے اس نے ایک نئی دنیا کے وجود کے امکان کا پتہ دیا۔ مشہور فلاسفر بیکن نے اس نظریہ سے استفادہ حاصل کیا اور اسی کی روشنی میں کولمبس نے نئی دنیا کو دریافت کیا۔

(ب) جغرافیہ کے ساتھ ہی جہاز رانی منسلک ہے۔

(۱) دسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے جہاز چین کے شہر کانٹن تک جا پہنچے تھے اور وہیں سے کچھ مسلمان تاجر جاپان اور کوریا تک بھی گئے۔ ان علاقوں میں اسلام زیادہ تر انہی تجار کی بدولت پھیلا کیونکہ اس زمانہ میں تبلیغ کا کام کسی خاص طبقہ سے مختص نہیں کر دیا گیا تھا بلکہ ہر مسلمان کا پیشہ جداگانہ اور فریضہ تبلیغ ہوتا تھا۔

(۲) واسکوڈے گاما جس زمانہ میں افریقہ کا چکر کاٹ رہا تھا کہ اسے کسی طرح ہندوستان کا راستہ مل جائے تو جس شخص نے اس راہ گم کردہ منزل کو ٹھکانے لگایا وہ ایک عرب جہاز ران احمد ابن مجید تھا۔

(۳) نہر سویز کھودنے کا خیال حضرت عمرو ابن العاص رض (عہد فاروقی) کے مجلہ دماغ کا رہین منت ہے۔

(۴) یورپ کی عام منڈیوں میں عرب تجار جس کثرت سے پھیل چکے تھے اس کا خفیف سا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ عربوں کی تجارتی اور جنسی اصطلاحات آج تک یورپ میں رائج ہیں مثلاً Traffic وہی لفظ ہے جو عربوں کے یہاں تفریق (یعنی راستہ) تھا Tariff ان کے رسم التعریف سے نکلا ہے۔

(Magazine)عربوں کا مخزن (یعنی اسٹور) ہے۔ Cheque جس پر آج تمام کاروباری دنیا کا انحصار ہے۔ صک کا تفریخ ہے۔ اسی طرح Cotton ان کے یہاں کی قطن (کپاس) ہے۔ ان کے یہاں کا زعفران Orange وہاں کا نارنج Lemon لیموں اور Saffaron ہے۔ وقس علیٰ ہذا۔ چنانچہ مشہور عیسائی جغرافیہ داں مسٹر سٹلطبرون لکھتا ہے کہ کولمبس سے پہلے عرب کی جماعتیں بحر اطلانٹک میں مختلف مقامات و سرزمینوں کی تلاش کرتی پھرتی تھیں۔

زمین کے بعد اہل زمین کے حالات یعنی علم تاریخ کو دیکھیے۔ امام طبری کی تاریخ بارہ مجلدات میں ہے۔ ابن خلدون کا مقدمۂ تاریخ۔ فن تاریخ میں (جسے Fronde نے "تاریخ کی سائنس" کہا ہے) آخری تصنیف سمجھی جاتی ہے اور جسے آج تک یورپ عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتا ہے۔ حاجی خلیفہ نے خاص عہد عباسیہ کی تاریخ میں قریب چودہ سو تصانیف شمار کی ہیں۔ مسعودی نے تاریخ کا انسائیکلوپیڈیا لکھا ہے جس طرح مقدسی نے جغرافیہ کا لکھا تھا۔

(۴) اب فلسفہ اور الٰہیات لیجیے جو ایک مہذب قوم کے نظام حیات میں بمنزلہ روح کے ہیں۔ الفریڈ گیلام مشہور مستشرق لکھتا ہے کہ یورپ میں جس قدر یونانی فلسفہ کی ترویج و اشاعت ہوئی، مسلمانوں کے تراجم کی رہین منت ہے۔ فارابی۔ ابن سینا۔ ابن رشد وغیرہم حکمائے اسلام نے یونانی فیلسوفوں کی تصانیف یورپ کے سامنے کھول کر رکھ دیں۔ حتیٰ کہ لاطینی زبان، جو یورپ کے جملہ علوم و فنون کی سرچشمہ سمجھی جاتی ہے اس میں بھی جس قدر فلسفہ منتقل ہوا سب اندلس کے مسلمانوں کی تصانیف کے راستہ سے آیا۔ شاہنشاہ الفانسو Alfonso The wise نے مشہور فلاسفر ابوبکر کو اپنے دربار میں دعوت دی کہ وہ یہودی اور عیسائی فلاسفہ کو درس دیا کریں۔ پروفیسر گب کا بیان ہے کہ جس طرح یورپ مذہب کے معاملہ میں یہودیت کا شرمندۂ احسان ہے اسی طرح فلسفہ اور رومان کے مسئلہ میں عربوں کا زیر بار کرم ہے۔ قریب قریب یہی الفاظ ہسٹورینس ہسٹری اوف دی ورلڈ میں مسٹر ہینڈ نے لکھے ہیں Lewes ہسٹری اوف فلاسفی میں لکھتا ہے کہ اگر ڈیکارٹ کے زمانہ میں احیاء العلوم امام غزالی

کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہو گیا ہوتا تو لوگ ڈیکارٹ پر ادبی سرقہ کا الزام لگا دیتے۔

اب طب اور طبیعیات کو لیجئے۔ سر تھامس آرنلڈ کا بیان ہے کہ انکشافات طبیعی کے متعلق ابھی مسلمانوں کی تصانیف بتمام و کمال یورپ کے سامنے نہیں آئیں۔ ایک قسطنطنیہ ہی کی قریب قریب ستر لائبریریوں میں اس موضوع پر ایسی نادر تصانیف دھری رکھی ہیں جن سے یورپ آشنا نہیں ہوا۔ پھر یہ تصانیف کس کد و کاوش سے بہم پہونچائی گئیں اور کس تفحص و تجسس سے لکھی گئی تھیں اس کا اندازہ مامون الرشید کے عہد کے مشہور سائنسدان حنین بن اسحٰق کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے جالینوس کی ایک کتاب کی تصحیح کے لیے عراق، شام، فلسطین اور مصر کا سفر کیا۔ اسی طرح فارابی نے ارسطو کی ایک کتاب پر تنقید لکھنے کے لیے اسے دو سو مرتبہ پڑھا۔

علم طب اور طبیعیات میں الکندی کی قریب ۶۵ تصانیف گنائی جاتی ہیں۔ جن میں اکثر جر ثقیل، مد و جزر، روشنی، آب و ہوا، فلکیات، معدنیات اور نباتیات پر ہیں۔

الرازی کی کتاب الحاوی ایک مدت تک یورپ کی طبی درسگاہوں میں داخل نصاب رہی ہے۔ الرازی نے سب سے پہلے چیچک کو متعدی مرض ثابت کیا۔ چنانچہ اس موضوع پر اس کا مقالہ یورپ میں عام مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

ابن سینا کے قانون کی شہرت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ تیس برس کے عرصہ میں ایک لاطینی زبان میں [illegible] ایڈیشن چھپ گئے تھے۔ ابن سینا نے پہاڑوں کی تخلیق، جمادیات کی تحقیق، زلزلوں کے اسباب، اصول [illegible] سفیا الحرارت) اور دیگر عناصر طبیعی کے خواص پر بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں جو یورپ کے سامنے موجود ہیں۔

اخوان الصفا نے چودھویں صدی میں ایک خفیہ انجمن تحقیقات علمی کے لیے قائم ہوئی تھی، ایک سائنس کا انسائیکلوپیڈیا لکھا ہے جو ۵۲ مقالات پر مشتمل ہے اور جن میں سے ۱۷ مقالات علم الفطرت Natural [illegible] سے متعلق ہیں۔

خطیب اندلسی نے طاعون کے اسباب دریافت کیے اور تعدیہ کے لیے حفظ ما تقدم کے اصول متعین کیے۔

ابن زہر اندلسی کی کتاب التیسیر، خواص الادویہ اور طریق علاج میں لاطینی میں سند مانی جاتی ہے

اسی طرح زہراوی اندلسی کی جراحت پر کتاب علم تشریح الابدان کی بنیادی تصانیف میں سے ہے۔

عملی میکانکس (علم الحیل) کے متعلق حکیم خرنی نے تیرھویں صدی میں ایک تحقیقی مقالہ لکھا اور ڈاکٹر لیبان نے لکھا ہے کہ عربوں نے عملی میکانکس کے آلات ایجاد کرکے یورپ کو ان کا استعمال سکھایا۔ کاغذ آٹھویں صدی میں اسلامی ممالک میں رائج ہوچکا تھا۔ پانی کی گھڑیاں خلفائے عباسیہ کے وقت استعمال میں آتی تھیں۔ چنانچہ ہارون الرشید نے ایک عجیب وغریب گھڑی تحفتہً شاہ شارلیمین کو بھیجی تھی۔

مشہور مورخ گبن لکھتا ہے کہ الکیمیا (Chemistry) اپنی اصل کے اعتبار سے عربوں کی ایجاد ہے۔ انھوں نے ہی سب سے پہلے آنشبین مرکبات ایجاد کیے۔ تیزاب مثل نائٹرک ایسڈ ہائیڈروکلورک ایسڈ پوٹاس۔ امونیا۔ کلورائیڈ آف مرکری۔ وغیرہ کیمیاوی مادے نکالے۔ زہروں کو دوائیوں میں تبدیل کیا۔ اور (Gasses) کی خصوصیات دریافت کیں (ملاحظہ ہو Intellectual Development of Europe) اب فلکیات کو دیکھیے، خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں بغداد کے شمسیہ دروازے کے باہر ایک عظیم الشان رصدگاہ (Observatory) قائم ہوچکی تھی جہاں اجرام سماوی کی گردش کے متعلق تحقیقات بہم پہنچائی جاتی تھیں یحییٰ بن منصور اس رصدگاہ کے انچارج تھے۔ ان کی کتاب الاعمال، علم ہیئت پر ایک مستند تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ یورپ کل تک بھی بطلیموسی نظام کا قائل تھا۔ جس کی رو سے زمین ساکن بتائی جاتی تھی۔ لیکن فارابی نے بہت عرصہ پیشتر اس نظریہ کی سوفیانہ توجیہات کی دھجیاں اڑائیں، اور اسکی جگہ اس نظام فلکی کی بنا ڈالی جو یورپ میں کوپرنیکس کے نظام کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس پر آج یورپ کی تمام فلکی تحقیقات کی بنیاد قائم ہے۔

علاوہ بریں مختلف علوم وفنون کے متعلق مسٹر ٹی۔ ایل۔ وسوانی۔ ایم۔ اے لکھتے ہیں کہ یورپ جس زمانہ میں جہالت کی عمیق گہرائیوں میں پڑا ہوا تھا اسپین کے حکماء اسلام سائنس اور ادب کی شمعیں لے کر آگے بڑھے اور یورپ کو طب، ریاضی، فلسفہ۔ اور دیگر علوم پر درس دینے لگے۔ وہ لوگ جہازوں کی ساخت۔ باغوں کی پرورش۔ پھولوں کے تحفظ۔ لوہے اور پیتل کے ظروف۔ سوتی اور ریشم کے کپڑے۔ طباعت ومرصع کاری وغیرہ صنعتوں میں بھی بہت ماہر تھے۔

لیکن یہ سب علمی تحقیقات اور سائنس کے انکشافات ان علماء اسلام کی ذہنی لغفا یا طبعی ڈھان کا نتیجہ نہ تھی بلکہ ایک خاص جذبہ تھا جس کے ماتحت یہ امور سر انجام پاتے تھے۔ وہ جذبہ کیا تھا؟ وہ کونسی قوت تھی جو انھیں ان علمی و عملی پیکار وہ کر دیتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب ایک اور صرف ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ مخصوص جذبہ، وہ قوت محرکہ ان کے مذہب کی تعلیم تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب مسلمانوں کے نظام حیات میں ہمیشہ بمنزلہ دماغ کے رہا ہے۔ جب تک دماغ درست و صلاح اور قوی ہوتا ہے تمام اعضاء و جوارح اپنی اپنی جگہ بحسن و خوبی کام کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب اس سرچشمۂ قوت و صلاح میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے تو اعضاء و جوارح اگرچہ بظاہر صحیح و سالم نظر آتے ہیں لیکن ان کی قوت عمل سلب ہو جاتی ہے۔ اس زمانہ میں چونکہ حرارت دینی نظام حیات میں موجود تھی اس لیے ہر شعبۂ زندگی اپنی اپنی جگہ نشو و ارتقاء کے منازل طے کرتا چلا جاتا تھا۔ یہی مذہبی ولولہ اور جوش ہی تھا کہ وہ اتنی مصیبتیں جھیلتے تھے۔ مگر علمی تحقیقات میں ان کا قدم پیچھے نہ ہٹتا تھا۔ اس لیے کہ وہ اسے بھی ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر انجام دیتے تھے۔ پھر وہ زمانہ کچھ آج کا نہ تھا کہ علمی ریسرچ کے لیے اس قدر آسانیاں موجود ہوتیں۔ آج کسی سکالر کے دل میں کسی علمی تحقیق کا خیال پیدا ہو۔ فوراً بڑی بڑی سوسائٹیاں اسکی مدد کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ فنڈ جمع کیے جاتے ہیں۔ رفقائے کار سر بکف پا بہ رکاب ہوتے ہیں۔ وہ اگر افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں اپنا کیمپ نصب کریں تب بھی ہالینڈ کا مکھن لندن کے بسکٹ، کشمیر کے سیب اور کینیڈا کی روٹی۔ غرض سب کچھ وہیں ان کو پہونچتا رہتا ہے لیکن وہ زمانہ ایسا تھا کہ فن حدیث کے امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ جب میں تحصیل علم کے لیے گھر سے نکلا تو والدہ نے دو سو کلچے چادر میں باندھ دیئے تھے معمول یہ تھا کہ ہر روز ایک کلچہ وضو کے پانی میں بھگو کر کھا لیتا۔ چنانچہ جب یہ کلچے ختم ہو گئے تو دار العلوم کا دامن چھوڑنا پڑا اور جب تک پھر روٹی کا انتظام نہ ہوا تحصیل علم کا سلسلہ جاری نہ ہو سکا۔ ابن حاتم رازی نے لکھا ہے کہ انھوں نے تحصیل علم کے لیے نو ہزار میل کا پیادہ سفر کیا حضرت امام مالک رح فرماتے ہیں کہ ایک ایک حدیث کی تحقیق کے لیے اکثر اوقات چالیس چالیس دن کا سفر کرنا پڑا۔ ضیاء الدین ابن عاصم نے خاص نباتات کی تحقیق کے لیے روم، یونان، اور اسپین کے ممالک کا سفر کیا اور اکثر ان حالات میں کہ نہ کھانے کو روٹی ملتی نہ سونے کو چھت میسر آتی۔

غرض حالت یہ تھی کہ پاؤں میں چھالے پڑے ہوئے ہیں، پنڈلیاں گرد وغبار سے اٹی رہی ہیں۔ لباس چیتھڑے ہو رہا ہے چہرے پر ضعف و نقاہت سے مردنی چھا رہی ہے۔ لیکن سر میں ایک ولولہ ہے کہ ان کے پائے استقلال میں جنبش نہیں پیدا ہونے دیتا۔ اور ان کی یہ ہیئت گذائی زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ ؎

بے دست و پا ئیم کہ ہنوز از دو فور عشق

سر وہمت و سرم کہ بیاباں برابر است

تہذیب اخلاق و تزکیہ نفس ہو یا تہیہ ملک تنظیم جیش، علوم و فنون کی تحقیق ہو یا تمدن و تہذیب کی کاوش سب منزلیں اسی جوشش مذہبی کے جذبہ میں طے ہو جاتیں۔ ان کے نزدیک ؎

ولایت پادشاہی، علم اشیاء کی جہانگیری

یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتہ ایماں کی تفسیریں

اس لیے کہ قرآن کریم گوناگوں طریقوں سے تدبر و تفکر کی تاکید کر رہا ہے کہیں حکم ہے۔ کہیں ترغیب و ترہیب، کہیں عام تفکر پر مذمت۔ وہ لوگ اس کتاب کو ہماری طرح محض ثواب کی غرض سے نہ پڑھتے تھے بلکہ ان کے نزدیک یہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کا ایک مکمل دستور و ضابطہ تھا اور منازل حیات کے ایک ایک قدم پر وہ اس سے استشارہ کرتے تھے۔ ہم میں سے کون ہے جس نے اس آیت کو نہیں پڑھا:۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۴۰:۹)	کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ جو لوگ ان سے پہلے گزر چکے ہیں ان کا کیا انجام ہوا؟

ہم اس آیت مقدسہ کو پڑھتے ہیں اور پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن وہ دور عمل تھا جس کے متعلق حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا:۔

"ہم میں سے جب کوئی قرآن کی دس آیتیں بھی سیکھ لیتا تو جب تک ان کی حقیقت سے آگاہ نہ ہو جاتا۔ اور ان پر عمل نہ کر لیتا۔ آگے نہ بڑھتا،" (تفسیر ابن جریر)

انھوں نے اس آیت کے رموز و معارف پر غور کیا۔ سیروا فی الارض سے سیاحت کا نکتہ پایا اور اس سیاحت اور لطائف ارضی سے علم جغرافیہ کی بنا پڑی۔ اقوام گزشتہ کے انجام و عواقب پر نگاہ ڈالی تو علم تاریخ مرتب ہو گیا اور ان کے اجڑے ہوئے کاشانوں کو چشم عبرت سے دیکھا تو آثار قدیمہ کا علم وجود میں آ گیا۔ غرضیکہ ایک ہی آیت قرآنی پر تدبر و تفکر اور عمل سے علم کے تین مختلف شعبوں کا قیام عمل میں آیا۔

انھوں نے اس آیت کو دیکھا :-

أَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرَاتٍ فِي جَوِّ السَّمَاءِ	کیا انھوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ جو سما میں مسخر کیے
مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا اللَّهُ ۔ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ	گئے ہیں۔ اور ان کو اللہ کے سوا کوئی نہیں سنبھالتا۔
لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۔ (۱۱ ۱۱۶)	اس میں ایمان والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

اس میں غور کیا کہ ایمان والوں کے لیے جو اس میں نشانیاں بتائی گئی ہیں۔ وہ کیا ہیں۔ اب ایمان کا تقاضا تھا کہ وہ اس کی کنہ و حقیقت تک پہنچتے۔ انھوں نے کوشش کی اور جر ثقیل، مرکز ثقل، کشش ارضی کے سے نظریے دریافت کیے۔ چنانچہ پروفیسر Deitrici نے جو لکھا ہے کہ "نیوٹن کے نظریہ کشش ثقل کے آثار مسلمانوں کی تصانیف میں ملتے ہیں"، تو وہ انہی آیات پر تدبر کا نتیجہ تھا۔ اور یہی وہ نظریے ہیں جن کی ارتقائی شکل آج طیاروں (ہوائی جہازوں) کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔

انھوں نے رتق و فتق کی آیت پر غور کیا تو یہ حقیقت ان کے سامنے بے نقاب ہو گئی کہ آسمانی کرے تمام کرے آغاز پیدائش میں ایک ہیولیٰ سے مرکب تھے۔ پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر الگ الگ کرے بن گئے :-

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَ	کیا ان لوگوں نے جو آیات الٰہی کا انکار کرتے ہیں یہ نہیں دیکھا
الْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا ۔ وَجَعَلْنَا	کہ آسمان اور زمین پہلے آپس میں ملے ہوئے تھے پھر ہم
مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۔ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ	نے ان کو الگ الگ کر دیا۔ اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی
(۲۱:۳۰)	سے بنایا۔ کیا پھر بھی یہ ایمان نہیں لاتے ؟

آیت کے آخری ٹکڑے سے انکی توجہ اس طرف بھی گئی کہ تمام ذی حیات اشیاء کا تولد اولین پانی سے ہوا کیا فی الحقیقت اور پانی کا مبداء حیات ہونا آج سائنس کے آخری انکشافات نہیں ہیں۔ نظریہ ارتقا۔

Evolution Theory آج سائنس کی تحقیقات کا معرکۃ الآرا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اہل علم حضرات سے پوشیدہ نہیں کہ اسکی ابتدا بھی مسلم ائمہ علم و حکمت کی ذہنی کاوشوں کی رہین کرم ہے۔ فارابی۔ ابن سینا ابن مسکویہ اور ابن باجہ۔ نے اپنی تصانیف میں اس نظریے پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ یورپ کے ارتقائیوں نے ابتداء میں ضرور ان حکماء اسلام کے اشارات سے استفادہ حاصل کیا ہوگا مگر فرق یہ ہے کہ حکمائے اسلام کے نظریے کے مطابق تمام سلسلہ نشو و ارتقاء مشیت و ارادہ باری تعالے کے ماتحت عمل میں آتا ہے اور مغربی سائنسدانوں کی تعلیم کی رو سے خدا کی ہستی کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی یہی اساسی فرق ہے اسلام اور مغربی سائنس میں۔

انھوں نے تکویر لیل و نہار۔ اور تسخیر شمس و قمر پر غور کیا تو فلکیات کے راز ان پر منکشف ہوگئے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ یُکَوِّرُ الَّیْلَ عَلَی النَّهَارِ وَیُکَوِّرُ النَّهَارَ عَلَی الَّیْلِ۔ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ۔ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی۔ (۱۱:۳۹)	اس نے زمین و آسمان کو حکمت سے پیدا کیا۔ وہ رات (کی تاریکی) پر دن (کی روشنی) اور دن (کی روشنی) پر رات (کی تاریک) چادر لپیٹ دیتا ہے۔ اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک ایک وقت معین تک چلے جا رہا ہے۔

جس نظام شمسی کی بنیاد انھوں نے قرآن کریم کی ان آیات کی روشنی میں قائم کی وہ آج سائنس کی تحقیقات کی کافی موید ہے۔ چنانچہ کُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ (ہر ایک کرہ اپنے اپنے دائرہ میں تیرتا پھرتا ہے) نے بطلیموسی نظام کی تغلیط کر کے علم ہیئت کی صحیح منزل کی طرف فارابی کی رہنمائی کی۔ "کل فی فلك" میں ایک لفظی و معنوی صنعت بھی ہے۔ یعنی اس کو اگر الٹ کر بھی پڑھیے پھر بھی "کل فی فلک" ہی بنتا ہے۔ یعنی نصف دائرہ سیدھا پڑھنے سے اور پھر باقی نصف دائرہ الٹنے سے۔ گویا اس طرح سے ایک پورا دائرہ بن جاتا ہے (تعلیمات قرآن) خیر یہ تو

ایک ضمنی بات تھی۔ فلکیات کے متعلق ہرشل نے اپنی مدت العمر کے تجارب کے بعد جس نظریے کا اضافہ کیا ہے وہ یہی ہے کہ سورج مع اپنے نظام کے ایک اور ستارے کی طرف دوڑ رہا ہے جو اس کا مستقر ہے۔ اس ستارے کو ویگہ کہتے ہیں۔ لیکن ہرشل سے تیرہ سو سال پیشتر قرآن کریم کی اس آیت نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا تھا۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا۔ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ۔ (۳۶ : ۳)

اور سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جا رہا ہے۔ یہ اندازہ باندھا ہوا ہے اُس خدا کا جو زبردست علم والا ہے۔

غرض کہ ان اہل نظر مسلمانوں کے نزدیک دنیا کی ہر چیز میں ایک آیت الٰہی۔ ایک خداوندی نشان۔ ایک راز فطرت مضمر ہوتا تھا۔ وہ ہر ایک چیز کو تجسس کی نگاہ سے دیکھتے اور نقاب برافگندہ عروس حقیقت کو اپنی تحقیقات اور تجارب سے جنت نگاہ بنا لیتے۔ صبح کی سپیدی میں، رات کی سیاہی میں، شفق کی رنگینی میں، قوس قزح کی بہجت آفرینی میں، پہاڑوں کی بلندیوں میں، سمندروں کی گہرائیوں میں۔ بادلوں کی روانیوں میں، نسیم سحر کی عنبر فشانیوں میں، سورج کے جلال میں، چاند کے جمال میں، انھیں صحیفہ فطرت کے اوراق کھلے ہوئے ملتے جو انھیں دعوت علم و عمل دیتے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے :۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ۔ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ مِنْ مَّاۗءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا۔ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَاۗبَّةٍ۔ وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ۔ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔ (۲۰ : ۲)

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں۔ اور رات اور دن کے آنے جانے میں۔ اور جہازوں میں جو کہ لوگوں کے فائدہ کی چیزیں سمندروں میں لے کر چلتے ہیں۔ اور (بارش کے) پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے برسایا پھر اس سے زمین کو مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشی، اور اس میں ہر قسم کے حیوانات پھیلا دیے، اور ہواؤں کے (رخ) بدلنے میں، اور بادلوں میں جو زمین و آسمان کے درمیان معلق (ہیں) سمجھ رکھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

ایک مسلمان کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ ان آیات اللہ پر ایک محکم یقین رکھے وہاں یہ بھی لازمی ہے کہ قرآن کریم کی ان شہادات کو دنیا کے سامنے سچا ثابت کر دے۔ اور یہ اسی طرح سے ہو سکتا ہے کہ فطرت کے ایک ایک نقش و نگار کو دیکھے اور پیہم تجربات اور مسلسل مشاہدات سے ان کی حقیقتیں دنیا کے سامنے کھول کر رکھے۔ اس لیے کہ قرآن کریم کے نزدیک تو مومن کی صفت ہی یہی ہے کہ وہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اس صانع حقیقی کی صنعتوں پر غور کرے اور اسکی نگاہ دقیقہ رس، پھول اور کانٹے کے نظر فریب امتیازات سے گزر کر شاخ گل کی ان گہرائیوں تک جا پہنچے جہاں ایک ہی قسم کے قوام سے پھول کو مشام جانفزا اور کانٹے کو نوک خلش زا عطا ہوتی ہے۔ وہ چل رہا ہو تو گل و بوٹے کی شادابی و شگفتگی اسے دعوت نظارہ دے۔ بیٹھے تو ریت کے ایک ایک ذرے میں ہزاروں آفتاب درخشاں نظر آئیں اور لیٹے تو آسمان کی چراغ چھت ایک مرصع کار کی تحسین و تزئین کی داد مانگ رہی ہو۔ غرضکہ نہ اس کا اٹھنا بیکار ہو اور نہ اس کا بیٹھنا خالی از مصلحت ۔؎

بیٹھے تو عجز نقش کف پا لیے ہوئے
اُٹھے تو درد دل کا بہانہ لیے ہوئے

اس لیے کہ اس کے خضر راہ کا اشارہ ہے کہ :۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۳: ۲)	بلا شبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں، اور رات اور دن کے آنے جانے میں، اہل عقل کے لیے نشانیاں ہیں وہ لوگ جن کی یہ حالت ہے کہ کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں، آسمانوں اور زمین کی ساخت میں غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار تو نے اس (موجودات) کو لا یعنی پیدا نہیں کیا۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا کا دعویٰ ہم اسی وقت کر سکتے ہیں جبکہ فی الحقیقت ہم دنیا کی ہر ایک چیز کو سود مند کر دکھائیں۔ اور یہ علم حقایق اشیاء اور علم منافع اشیاء، کے بغیر کیسے ممکن ہے ؟

برادران! سائنس کا سب سے بڑا احسان یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے ہر ایک چیز کی کنہ حقیقت کو آشکارا کر کے دنیا میں عجائب پسندی اور توہم پرستی کے امکانات کو کم کر دیا ہے۔ یہ بالکل درست ہے۔ لیکن دیکھنے تو یہی کہ توہم پرستی کا استیصال سب سے پہلے اسلام نے کیا ہے یا موجودہ سائنس کے انکشافات نے۔ مذاہب کی دنیا میں یہ شرف صرف اسلام کو حاصل ہے کہ اس نے اپنے ہر ایک دعوے کی بنیاد دلیل و برہان پر رکھی ہے۔ دین اور عقل میں شروع سے ایک جنگ چلی آتی تھی لیکن اسلام نے اپنی بصیرت افروز تعلیم سے دین اور عقل کو ایک کر دکھایا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ :-

أَدْعُوا إِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي (۱۲:۱۲)

(اے رسول فرما دیجئے کہ) میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں اور جس نے میری پیروی کی وہ بصیرت کی بنا پر اس راستہ پر چل رہا ہے

"اسلام اور عقل" ایک مستقل عنوان ہے جس کے متعلق ضمناً شرح و بسط سے کچھ عرض نہیں کیا جا سکتا۔ کسی اور فرصت میں گزارش کروں گا۔ البتہ اس وقت توہم پرستی کے متعلق ایک واقعہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں نبی اکرمؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؑ کا انتقال ہوا تو اس دن سورج گہن لگ گیا۔ عرب کا سا توہم پرست ملک، لوگ فوراً حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضورؐ کی صداقت کا کتنا زبردست ثبوت ہے کہ آپ کے غم میں اجرام فلکی نے بھی ماتمی لباس پہن لیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "بجا نہیں۔ چاند اور سورج کا گہن قوانین قدرت کے مطابق عمل میں آتا ہے۔ اس کا کسی کی موت یا پیدائش سے کچھ تعلق نہیں"۔ کیا توہم پرستی کی جڑ پر اس سے بھی زیادہ شدید کوئی ضرب لگائی جا سکتی ہے؟ اور یہ اس "روشنی" کے زمانہ سے تیرہ سو برس پیشتر کا واقعہ ہے۔

حضرات! اس دھندلے سے خاکے سے آپ کو کچھ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اسلام علمی تحقیقات اور سائنس کی ترقیوں کا کس درجہ حامی و مؤید ہے اور مذہب اسلام کے دور عروج میں سائنس کی ترقیاں کس بلندی پر پہنچ گئی تھیں۔ پھر یورپ کے محققین اور حکمائے اسلام میں ایک بہت بڑا اصولی فرق بھی ہے یورپ اپنے محققین کے صرف علمی کارنامے پیش کرتا ہے ان کے ذاتی کیرکٹر سے کسی کو کچھ سروکار نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے اسلام سب سے پہلے کیرکٹر کو پرکھتا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان اور تقوے کی فضیلت سب سے مقدم ہے۔ یورپ میں نیکی کو

علمی تحقیقات میں جو مرتبہ حاصل ہے ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن اسی بیکن کی اخلاقی لغزشوں کی یہ حالت ہے کہ پوپ اس کے متعلق لکھتا ہے کہ :۔

"نوع انسانی کا شریف ترین اور ذلیل ترین فرد"

لیکن مسلمانوں میں اگر امام غزالی۔ ابن تیمیہ۔ ابن مسکویہ وغیرہم کا نام جو آج تک سلام و حرمت سے لیا جاتا ہے تو محض اس لیے کہ علمی کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی بلندیوں کی مثال بھی کم ہی نظر آئے گی۔ پھر انفرادیت کو چھوڑ کر اگر اجتماعی حالت پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اقوام مغرب اگر سائنس کے ایجادات میں اس درجہ منہمک ہیں تو محض اس لیے کہ ایک قوم کی قوت قاہرہ دوسری قوم سے کم نہ ہو جائے اور .... میدان حرب میں سائنس کی کرشمہ سازیاں اقوام مقابل کو بالادست نہ کر دیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سائنس کی ترقیاں گزشتہ جنگ عظیم کے بعد سے جو اس قدر برق رفتار ہوئی ہیں اسکی وجہ یہی ہے کہ اقوام عالم میں باہمی اعتماد اٹھ چکا ہے اور ہر قوم دوسری قوم سے خائف ہے اور اسی لیے سائنس کی ایجادات میں ایک دوسرے پر مسابقت کی فکر دامنگیر ہے ظاہر ہے کہ جس علمی اور عملی انہماک کا محرک یہ جذبہ ہو اس سے اہل عالم کے امن و سکون اور اطمینان قلبی میں کس قدر اضافہ ہوگا ؟ برعکس اس کے مسلمانوں کی علمی ترقیوں کا مطمح نظر کیا تھا اور خدا کی زمین پر بسنے والوں پر انکا کیا اثر پڑا ؟ اس کے متعلق اگر ہم کچھ کہیں گے تو شاید جانبداری پر محمول کیا جائے گا۔ اس لیے ایک غیر مسلم کی رائے اس باب میں زیادہ موثق سمجھی جائے گی۔ ہندوستان کی علمی دنیا کی مایہ ناز ہستی مسٹر سروجنی نیڈو نے فرمایا ہے :۔

"عرب فوجیں یلغار کرتی ہوئی فرانس کے دروازے پر پہنچی تھیں تو کیوں ؟ فتح و ظفر و دولت کے لیے نہیں۔ ملک گیری اسلام کا اصل مقصد نہ تھا اس کا مقصد حریت، آزادی کی اشاعت عمومی اور غلامی کا استیصال تھا۔ آج کل ہم ملکی طاقت کے لیے مرتے ہیں۔ اور ملکوں کا روندا دیتے ہیں۔ مگر اسلام کا مطمح نظر کوئی ملک یا صوبہ یا خطہ نہ تھا بلکہ اس کا مقصد ساری دنیا کی نجات تھا۔ اور مسلم داعی یہی دھن لے کر ملکوں ملکوں مارے مارے پھرتے تھے۔ عرب

نہ صرف ملک کی زمینیں فتح نہیں کیں بلکہ دل اور دماغ فتح کیے۔ انھوں نے ہمارے لٹریچر اور خیالات کو متاثر کیا۔ ہمارے (اہل ہند کے) نیم وحشیانہ خیال کو عقیدت کا جامہ مسلمانوں نے پہنایا۔ ہمارے افکار و تخیلات میں حرکت اور جان انھوں نے ڈالی مسلمانوں نے دنیا میں علوم و فنون کی بے شمار خدمات انجام دی ہیں۔ اخلاق۔ فیاضی۔ اور مردانگی ہمیشہ ان کی قومی خصوصیات رہی ہیں۔ انھوں نے ہندوؤں کی طرح اشاعت علوم میں کبھی بخل نہیں کیا۔ یہ ہمیشہ بنی نوع انسان کی تعلیم و تربیت کی فکر میں رہے ہیں"

(بحوالہ کیپٹل مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۱۸ء)

بہرحال! میں یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ نہایت ضروری سمجھتا ہوں جس کی طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا تھا۔ ہمارے ہاں ایک تجدد پسند روشن خیال طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جس کے نزدیک کسی شے کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار محض حکماء یورپ کی رائے ہے۔ حتیٰ کہ وہ قرآن کریم کے حقائق و معارف بلکہ اوامر و نواہی تک کو بھی انہی کی کسوٹی کے ذریعے سے پرکھتے ہیں۔ اگر قرآن حکیم کا کوئی ارشاد کسی یورپین محقق کے قول یا نظریے سے مطابقت پا جاتا ہے تو وہ اسے قرآن حکیم کی صداقت کا ایک زندہ معجزہ سمجھ کر ساری دنیا میں اسے لیے پھرتے ہیں۔ اور اگر قرآنی تعلیم اور یورپ کے دماغ میں کہیں تضاد و تخالف واقع ہوتا ہے تو ان کی انتہائی کوشش اس میں صرف ہو جاتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر۔ موڑ توڑ کر۔ قرآن کو یورپ کی ذہنی افتاد کے مطابق ثابت کر دیا جائے اور پھر اس "جہاد عظیم" کی دھن میں وہ قرآنی آیات کی ایسی مضحکہ خیز تاویلیں کرتے ہیں کہ غیر تو غیر خود اپنوں کی ہنسی بھی تھامے نہ تھم سکے۔ یہ مرعوب ذہنیت کی خود فریبی اور اصول قرآن فہمی کی بنیادی غلطی ہے۔ اس چیز کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ علمی تحقیقات اور سائنس کے انکشافات، خواہ کسی ملک میں ہوں یا کسی زمانہ میں، جب بھی وہ یقینیات کے درجہ کو پہونچ جائیں گے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ارشادات قرآنی کے خلاف ہو سکیں۔ اس لیے کہ سائنس کے انکشافات بالآخر ہیں کیا؟ یہی نا کہ فطرت کی چھپی ہوئی حقیقتوں پر سے پردہ اٹھا دیا جائے۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ فطرت کی

علمی تحقیقات میں جو مرتبہ حاصل ہے ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن اسی بیکن کی اخلاقی لغزشوں کی یہ حالت ہے کہ پوپ اس کے متعلق لکھتا ہے کہ :۔

"نوع انسانی کا شریف ترین اور ذلیل ترین فرد"

لیکن مسلمانوں میں اگر امام غزالی۔ ابن تیمیہ۔ ابن مسکویہ وغیرہم کا نام جو آج تک سلام و حرمت سے لیا جاتا ہے تو محض اس لیے کہ علمی کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی بلندیوں کی مثال بھی کم ہی نظر آئے گی۔ پھر انفرادیت کو چھوڑ کر اگر اجتماعی حالت پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اقوام مغرب اگر سائنس کے ایجادات میں اس درجہ منہمک ہیں تو محض اس لیے کہ ایک قوم کی قوت قاہرہ دوسری قوم سے کم نہ ہو جائے اور .... میدان حرب میں سائنس کی کرشمہ سازیاں اقوام مقابل کو بالادست نہ کر دیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سائنس کی ترقیاں گزشتہ جنگ عظیم کے بعد سے جو اس قدر برق رفتار ہوئی ہیں اسکی وجہ ہی یہی ہے کہ اقوام عالم میں باہمی اعتماد اٹھ چکا ہے اور ہر قوم دوسری قوم سے خائف ہے اور اسی لیے سائنس کی ایجادات میں ایک دوسرے پر سابقت کی فکر دامنگیر ہے ظاہر ہے کہ جس علمی اور عملی انہماک کا محرک یہ جذبہ ہو اس سے اہل عالم کے امن و سکون اور اطمینان قلبی میں کس قدر اضافہ ہوگا؟ برعکس اس کے مسلمانوں کی علمی ترقیوں کا مطمح نظر کیا تھا اور خدا کی زمین پر بسنے والوں پر انکا کیا اثر پڑا؟ اس کے متعلق اگر ہم کچھ کہیں گے تو شاید جانبداری پر محمول کیا جائے گا۔ اس لیے ایک غیر مسلم کی رائے اس باب میں زیادہ موثق سمجھی جائے گی۔ ہندوستان کی علمی دنیا کی مایہ ناز ہستی مسٹر سروجنی نیڈو نے فرمایا ہے :۔

"عرب فوجیں یلغار کرتی ہوئی فرانس کے دروازے پر پہنچی تھیں تو کیوں؟ فتح و ظفر یا دولت کے لیے نہیں۔ ملک گیری اسلام کا اصل مقصد نہ تھا اس کا مقصد حریت، آزادی کی اشاعت عمومی اور غلامی کا استیصال تھا۔ آج کل ہم ملکی طاقت کے لیے مرتے ہیں۔ اور علاقوں کا رونا روتے ہیں۔ مگر اسلام کا مطمح نظر کوئی ملک یا صوبہ یا خطہ نہ تھا بلکہ اس کا مقصد ساری دنیا کی نجات تھا۔ اور مسلم داعی اسی دھن لے کر ملکوں ملکوں مارے مارے پھرتے تھے۔ عرب

نے صرف ملک کی زمینیں فتح نہیں کیں بلکہ دل اور دماغ فتح کیے۔ انھوں نے قوموں کے لٹریچر اور خیالات کو متاثر کیا۔ ہمارے (اہل ہند کے) رسم و خیال کو حقیقت کا جامہ مسلمانوں نے پہنایا۔ ہمارے افکار و تخیلات میں حرکت اور جان انھوں نے ڈالی۔ مسلمانوں نے دنیا میں علوم و فنون کی بے شمار خدمات انجام دی ہیں۔ اخلاق۔ بیباکی۔ اور مردانگی ہمیشہ انکی قومی خصوصیات رہی ہیں۔ انھوں نے ہندوؤں کی طرح اشاعت علوم میں کبھی بخل نہیں کیا۔ یہ ہمیشہ بنی نوع انسان کی تعلیم و تربیت کی فکر میں رہے ہیں۔"

(بحوالہ کیپٹل صفحہ ۲، ۲۰ جنوری ۱۹۳۸ء)

برادران! میں یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ نہایت ضروری سمجھتا ہوں جس کی طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا تھا۔ ہمارے ہاں ایک تجدد پسند، روشن خیال، طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جس کے نزدیک کسی شے کے صحیح او غلط ہونے کا معیار محض حکمائے یورپ کی رائے ہے۔ حتیٰ کہ وہ قرآن کریم کے حقائق و معارف بلکہ اوامر و نواہی تک کو بھی اسی کسوٹی کے ذریعے سے پرکھتے ہیں۔ اگر قرآن حکیم کا کوئی ارشاد کسی یورپین محقق کے قول یا نظریے سے مطابقت پا جاتا ہے تو وہ اسے قرآن حکیم کی صداقت کا ایک زندہ معجزہ سمجھ کر ساری دنیا میں اسے لیے پھرتے ہیں۔ اور اگر قرآنی تعلیم اور یورپ کے دماغ میں کہیں تضاد و تخالف واقع ہوتا ہے تو ان کی انتہائی کوشش اس میں صرف ہو جاتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر، موڑ توڑ کر، قرآن کو یورپ کی ذہنی ارتقاء کے مطابق ثابت کر دیا جائے اور پھر اس "جہل عظیم" کی دھن میں وہ قرآنی آیات کی ایسی مضحکہ خیز تاویلیں کرتے ہیں کہ غیر تو غیر خود اپنوں کی ہنسی بھی تھامے نہ تھم سکے۔ یہ مرعوب ذہنیت کی خود فریبی اور اصول قرآن فہمی کی بنیادی غلطی ہے۔ اس چیز کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ علمی تحقیقات اور سائنس کے انکشافات، خواہ کسی ملک میں ہوں یا کسی زمانہ میں، جب بھی وہ یقینیات کے درجہ کو پہنچ جائیں گے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ارشادات قرآنی کے خلاف ہو سکیں۔ اس لیے کہ سائنس کے انکشافات بالآخر ہیں کیا؟ یہی نا کہ فطرت کی چھپی ہوئی حقیقتوں پر سے پردہ اٹھا دیا جائے۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ فطرت کی

کوئی حقیقت بے نقاب ہوا اور وہ صحیفۂ فطرت کے مصنفِ حقیقی کے کسی ارشاد کے خلاف نکلے ؟

"ایں خیال است و محال است و جنوں"

لیکن علمی تحقیقات کی یہ حالت ہے کہ ایک نظریے کو یقین کے درجہ تک پہنچنے کے لیے ہزاروں قیاسات کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کبھی تو ایک موجد کی زندگی میں ہی اس کا قیاس غلط ثابت ہو جاتا ہے اور کبھی آنے والی نسلیں اسکی دھجیاں بکھیر دیتی ہیں۔ لہٰذا جو نظریہ آج قرآن کریم کے کسی ارشاد سے مطابقت نہیں پاتا اسکی کیا دلیل ہے کہ وہ نظریہ محکم و یقینی ہے۔ قیاسی اور ظنی نہیں؟ مشاہدات اور قیاسات میں ایک بین فرق ہے جسے کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ قرآن کریم کا کوئی اشارہ بھی آج تک کسی مشاہدہ کے خلاف ثابت نہیں ہو سکا۔ لیکن اسکی تعلیم کو قیاسات کے مطابق ثابت کرنے میں عجلت نہیں کرنی چاہیئے۔ یہی غلطی ہم اس سے پہلے بھی ایک دفعہ کر چکے ہیں جبکہ علمائے اسلام نے قرآن حکیم کو فلسفۂ یونان کے مطابق ثابت کرنے پر اس قدر دماغ سوزی سے کام لیا۔ حالانکہ فلسفہ کے اصول بھی تمام قیاسات پر مبنی ہوتے ہیں۔ نتیجہ انکا یہ ہوا کہ آج اس فلسفہ قدیم کی بنیادیں منہدم ہونے کے ساتھ ہی ان علماء کی تمام کاوشیں بھی اکارت گئیں۔ نہیں بلکہ جن لوگوں نے قرآن کریم کو انہی علماء کی وساطت سے سمجھا تھا اور ان کی توضیحات کو اصل قرآن خیال کرتے تھے، ان کے دلوں میں خود قرآن کے متعلق طرح طرح کے شکوک و شبہات سے ارتیابی کیفیتیں پیدا ہو گئیں۔ ان آیات قرآنی کو جن کی تصدیق کسی زمانہ کے قیاسی نظریات سے نہ ہو سکے، متشابہات کے تحت رکھنا چاہیئے اور ان کے متعلق یہ ایمان ہونا چاہیئے کہ ان کی حقیقتیں بلا شک و شبہ صحیح اور درست ہیں اور زمانہ کی ترقی سے ایک وقت آئے گا کہ مشاہدات ان کی تصدیق کر کے انھیں محکمات کے زمرے میں داخل کر دیں گے۔

آخر میں ایک مختصر سی گزارش حضرات علماء کی خدمت میں بھی کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے لیکن چونکہ بات قرآن کی ہے اس لیے اس کے عرض کرنے میں کوئی باک نہیں سمجھتا۔ قرآن کریم نے جو علم کی اس درجہ تائید فرمائی ہے اس علم کی تعریف کیا ہے۔ قرآن حکیم میں آیا ہے :-

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (۱۷:۳۶)

جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت چلو (یاد رکھو) کان۔ آنکھ اور دل۔ ان سب سے باز پرس ہوگی۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک علم وہ ہے جس کی شہادت سمع۔ بصر اور قلب سلیم دیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ظن اور قیاس ہے۔ علم کے یقینی مرتبہ تک نہیں پہونچتا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ صاحب تذکرہ نے بھی غالباً اس آیت سے کچھ ایسا ہی استدلال کیا ہے۔ یہ بات میں نے کچھ بطور سند کے پیش نہیں کی بلکہ توارد کے طور پر کہدی ہے)۔ ہمارے مذہبی مکاتب میں جو نصاب تعلیم مقرر ہے اس میں غور فرمائیے کہ کتنا حصہ ظن وقیاس کا ہے اور کس قدر علم ویقین کا۔ فلسفہ یونان منطق علم الکلام (جسے فی الحقیقت فلسفہ یونان کی ہی ایک شاخ کہنا چاہیئے) تمام ظنی اور قیاسی ہیں۔ وہ بھی ایسی کہ خود موجودہ ظنیات میں بھی انھیں کوئی نہیں قبول کرتا۔ یورپ ایک عرصہ تک انہی قیاسات کی نکتہ آفرینیوں میں الجھا رہا۔ مسئلہ پیش ہوجاتا کہ "مرغی کے منہ میں دانت ہوسکتے ہیں یا نہیں"، اب فلاسفر زکی ایک جماعت اثبات کی طرف اور ایک نفی کی طرف ہو جاتی ہے۔ دلائل پر دلائل لائے جاتے ہیں۔ منطقی توجیہات پیش کی جاتی ہیں۔ صغریٰ اور کبریٰ ملائے جاتے ہیں۔ لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ مرغی کا منہ کھول کر دیکھ لو کہ اس میں دانت ہیں یا نہیں۔ حتیٰ کہ بیکن ان میں پیدا ہوا۔ اس نے سب سے پہلے یورپ میں علم کی وہ تعریف کی جو قرآن کریم کی مصرحہ صدر آیت میں تیرہ سو سال پیشتر دنیا کے سامنے آچکی تھی اور اس نے مرغی کا منہ کھول کر دکھا دیا۔ آپ حیران ہونگے کہ علم کی اس تعریف بدل جانے سے اس قوم کی ذہنیت بدل گئی۔ اور آج جس قدر علمی تحقیقات اور سائنس کی ترقیاں ہو رہی ہیں سب علم کی اسی تعریف پر مبنی ہیں۔ لیکن ایک ہم ہیں کہ :۔

ہوئی لاکھ دنیا ادھر کی اُدھر رہے
وہی سنگ در ہے وہی اپنا سر رہے

صراط مستقیم اور راہ حق کی تلاش ہوتی ہی اس وقت ہے جب کہ خدا کا خوف دل میں موجود ہو اور اس کے غضب اور لعنت سے بچنے کی فکر ہو ورنہ جس شقی اور بدبخت کا دل خدا کے خوف سے خالی ہے اس کے حق میں انبیاء کا ڈرانا اور نہ ڈرانا سب برابر ہے۔

الٓمّٓ

اس قسم کے حروف جو سورتوں کی ابتداء میں ذکر کیے جاتے ہیں ان کو حروف مقطعات کہتے ہیں۔

سلف صالحین کے نزدیک یہ حروف متشابہات میں سے ہیں۔ان کی مراد اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں کما قال تعالیٰ

وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ - ان متشابہات کی حقیقت اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔

خلفائے راشدین اور دیگر حضرات صحابہ و تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے ایسا ہی منقول ہے (ابن کثیر)۔

بعض سلف اور جمہور متکلمین اور خلیل اور سیبویہ کے نزدیک حروف مقطعات ان سورتوں کے نام ہیں جن کی ابتداء میں یہ وارد ہوئے ہیں۔جو مضامین اس سورت میں بالتفصیل مذکور ہیں یہ حروف مقطعہ بالاجمال ان پر دلالت کرتے ہیں جیسا کہ صحیح بخاری کا نام الجامع الصحیح المسند من احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ و ایامہ، کتاب موصوف کے تمام مفصل مضامین کا ایک اجمال ہے۔

جس طرح مرکبات کلامیہ کا مفید معنی ہونا ان کے اجزاء یعنی کلمات مفردہ کے مفید معنی ہونے پر موقوف ہے اسی طرح کلمات مفردہ کا مفید معنی ہونا حروف ہجائیہ کے مفید معنی ہونے پر موقوف ہے۔اور علیٰ ہذا ترکیب معنی ترکیب کلام پر موقوف ہے۔کلام میں جس درجہ ترکیب ہوگی اسی درجہ معنی میں بھی ترکیب ہوگی۔یہی وجہ ہے کہ مرکبات اضافیہ اور مرکبات توصیفیہ کے معنی میں اتنی ترکیب نہیں جتنی کہ مرکبات تامہ خبریہ کے معنی میں ترکیب ہے ترکیب لفظی کے اختلاط سے ترکیب معنوی میں بھی اختلاط آگیا۔

مرکبات اضافیہ اگرچہ فی حد ذاتہا مرکبات ہیں ....

مگر مرکبات تامہ جزیہ کے لحاظ سے فی الجملہ بسیط ہیں اور اسی نسبت سے اُن کے معنی میں بھی بساطت اور اجمال ہے مگر حروف ہجائیہ اصل لغات اور مادہ کلمات ہونے کی وجہ سے انتہا درجہ کے بسیط ہیں پس اسی نسبت سے اُن کے معنی میں بھی انتہا درجہ کی بساطت اور غایت درجہ کا اجمال ہوگا بغیر تفہیم الٰہی اور بدون تائید غیبی کے ایسے اجمال کا سمجھنا ناممکن و محال ہے حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ نے فوز الکبیر میں اسی مسلک کو اختیار فرمایا ہے۔

علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ حروف مقطعات کے اسرار و رموز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد اُنھیں حضرات پر منکشف ہوتے ہیں جو من جانب اللہ علوم نبوت کے خاص طور پر وارث بنائے گئے ہیں۔ بلکہ کسی وقت حروف مقطعات خود بخود ان وارثین علوم نبوت کے سامنے اپنے اندرونی اسرار و غوامض بولنے لگتے ہیں۔ جس طرح کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے دست مبارک پر سنگریزے تسبیح پڑھتے تھے اور گوہ اور ہرن آپ سے کلام کرتے تھے۔ باقی ہم جیسوں کا حروف مقطعات کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہنا اس کی ہرگز ہرگز دلیل نہیں ہو سکتا کہ نعوذ باللہ و فی الواقع یہ حروف حقائق و معارف سے عاری ہیں (روح المعانی)۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

کتاب حقیقت میں یہی ہے جس کے حق اور منزل من اللہ ہونے میں کسی قسم کا کوئی شک اور شبہ نہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

الٓمّٓ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔	اس نازل کردہ کتاب کے منجانب اللہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔

خدا کی نازل کی ہوئی کتاب میں کبھی شک ہو ہی نہیں سکتا اور اگر کسی کو شک پیش آئے تو وہ اس کے فہم کا قصور ہے۔ خدا کی بھیجی ہوئی کتاب میں بھی اگر شبہ کی گنجائش نکل آئے تو پھر وہ کون سی کتاب ہے جس پر یقین کیا جائے۔ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ۔

ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں سب سے پہلے یہی سورت نازل ہوئی۔ مگر یہ آیت وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ

رنیه الی اللہ۔ حجۃ الوداع میں دسویں تاریخ ذی الحجہ کو منیٰ میں اُتری تبع کے زمانہ سے یہود نبی آخرالزمان کے انتظار میں مدینہ منورہ آکر آباد ہوئے تھے۔ ان آیات میں انھیں کو خطاب ہے کہ یہ وہی کتاب ہے کہ جس کی خبر انبیا علیہم السلام دیتے چلے آئے ہیں چنانچہ بہت سے علماء بنی اسرائیل جو حقیقت میں علماء تھے وہ ایمان لائے اور جن کی قلوب ثمن قلیل اور دراہم معدودہ کی محبت میں گرفتار تھے وہ اس سعادت سے محروم رہے کما قال تعالیٰ شانہ۔

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى
مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۔ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ
اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ
مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ
سُجَّدًا وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ
وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ
يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ۔

قرآن کو ہم نے بتفریق نازل کیا تاکہ آپ اس کو لوگوں کے سامنے آہستہ آہستہ پڑھیں اور بتدریج ہم نے اسکو نازل کیا آپ کہہ دیجئے کہ اس قرآن پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ۔ مگر یہ لوگ کہ جن کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے اُن کی حالت تو یہ ہے کہ جب ان پر اس کی تلاوت کی جاتی ہے تو ٹھوڑیوں پر سجدہ میں گر جاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ سبحان اللہ بیشک خدا کا وعدہ (جو اس کتاب کے نازل کرنے کا تھا) وہ پورا ہو کر رہا۔ اور گریہ وزاری کرتے ہوئے ٹھوڑیوں پر گرتے ہیں اور ان کے خشوع میں اور اضافہ ہوتا ہے۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ

(وسمات مومنین مخلصین) هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ - یہ جملہ ذالک الکتاب کی دوسری دلیل ہے یعنی کتاب حقیقت میں یہی ہے اس لیے کہ اول تو اس میں کسی قسم کے شک اور شبہ کی گنجائش نہیں دوم یہ کہ یہ کتاب خدا کے عقاب و عتاب سے ڈرنے والوں کے لیے ایک نور مبین اور مشعل ہدایت ہے۔ سورۂ فاتحہ میں بندوں کی جانب سے خدا کی حمد و ثناء کا تذکرہ تھا۔ سورۂ بقرہ میں اس کے برعکس خدائے عزوجل کی جانب سے عباد متقین کی مدح و ثناء کا ذکر ہے۔ سبحان اللہ محض اپنی رحمت کاملہ اور فضل عمیم سے ایمان اور تقویٰ کی

توفیق عطا فرماتے ہیں۔ اور پھر خود ہی اس کی توصیف فرماتے ہیں۔ اللهم لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسك۔

لغت میں تقوی کے معنی صیانت اور حفاظت کے ہیں۔ اور اصطلاح شریعت میں اُن چیزوں سے جو آخرت میں ضرر رساں اور نقصان دہ ہوں، بچنے کا نام تقوی ہے۔ اور چونکہ ضرر کے درجات مختلف ہیں اسی اعتبار سے تقوی کے بھی مراتب مختلف ہیں۔

پہلا مرتبہ یہ ہے کہ اسلام میں داخل اور کفر سے تائب ہو کر عذاب دائمی سے اپنے کو بچا لینا۔

دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ ارتکاب کبائر اور اصرار علی الصغائر سے اپنے نفس کو محفوظ رکھنا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے :۔

خَلِّ الذُّنُوْبَ صَغِيْرَهَا وَكَبِيْرَهَا ذَاكَ التُّقٰى

چھوٹے اور بڑے سب گناہوں کو چھوڑ دے یہی تقوی ہے

وَاصْنَعْ كَمَاشٍ فَوْقَ اَرْ ضِ الشَّوْكِ يَحْذَرُ مَا يَرٰى

راہ خدا میں اس طرح چل جس طرح کہ خار دار جنگل میں ڈر ڈر کر اور سنبھل سنبھل کر کوئی چلتا ہے

لَا تَحْقِرَنَّ صَغِيْرَةً اِنَّ الْجِبَالَ مِنَ الْحَصٰى

چھوٹے چھوٹے گناہ کو بھی حقیر مت سمجھو چھوٹے چھوٹے سنگریزوں ہی سے پہاڑ بن جاتے ہیں

حضرت عمرؓ نے اُبی بن کعب رضؓ سے تقوی کی حقیقت دریافت فرمائی تو انھوں نے فرمایا کہ اے امیر المومنین کیا کبھی کسی پرخار راہ سے نہیں گزرے ؟ فرمایا کیوں نہیں۔ اُبی بن کعبؓ نے کہا کہ اے امیر المومنین پھر آپ نے اس وقت کیا کیا ؟ فرمایا کہ میں نے دامن چڑھائے اور کانٹوں سے بچنے میں اپنی پوری جد و جہد کو خرچ کر ڈالا۔ ابی بن کعب رضؓ نے کہا کہ اے امیر المومنین بس یہی تقوی ہے۔ یعنی حق جل و علا کی معصیت اور نافرمانی سے بچنے کے لیے اپنی پوری ہمت اور طاقت کو خرچ کر دینا اسی کا نام تقوی ہے۔ اسی لیے ارشاد ہے :۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ یقیناً خدا کے نزدیک سب سے زائد عزت والا وہی ہے جو تم میں سے سب سے زائد پرہیزگار اور خدا سے ڈرنے والا ہے۔

تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ قلب کو ہر اُس چیز سے محفوظ کر لینا جو خدا سے غافل کرتی ہو۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ (اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) میں یہی تقویٰ مراد ہے۔

خدا کا خوف اور اس کے عقاب و عتاب کا ڈر ہی ہدایت کا مبداء اور ہر قسم کے فوز و فلاح کا سرچشمہ ہے اسی لیے حضرت نوح اور حضرت ہود اور حضرت صالح اور حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم الصلوٰۃ والسلام نے سب سے پہلے اپنی قوموں کو یہ نصیحت فرمائی۔ اَلَا تَتَّقُوْنَ (کیا تم کو خدا کا خوف نہیں) اور فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ جیسا کہ سورۂ شعراء میں مذکور ہے۔ اس لیے کہ بغیر خدا کے خوف کے کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی۔ کما قال تعالیٰ سَیَذَّکَّرُ مَنْ یَّخْشٰی۔ یعنی جو خدا سے ڈرتا ہوگا وہ جلد نصیحت قبول کرے گا۔

حق جل وعلا نے دوسرے موقعہ پر بجائے ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کے ھُدًی لِّلنَّاسِ (یعنی ہدایت ہے انسانوں کے لیے) ارشاد فرمایا ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو متقی نہیں وہ انسان بھی نہیں انسانیت اور آدمیت کا اقتضاء یہ ہے کہ اپنے مالک اور خالق سے ڈرے اور جو اُس احکم الحاکمین سے نہیں ڈرتا وہ انسان نہیں بہائم کے مثل بلکہ اُن سے بھی بدتر کما قال تعالیٰ اُولٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ۔

سفر آخرت کے لیے تقویٰ ہی کا توشہ اور تقوے ہی کا لباس کارآمد ہوتا ہے۔ کما قال تعالیٰ:

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی سفر کیلیے توشہ لو پس تحقیق کہ سب سے بہتر توشہ تقویٰ ہے

جس طرح بغیر زاد راہ کے مسافر کی ظاہری اور جسمانی حیات ناممکن ہے، اس سے کہیں زائد بغیر زاد تقویٰ کے مسافر آخرت کی معنوی اور روحانی حیات ناممکن اور محال ہے۔ اور جس طرح ایک معمولی راستہ سے

عریان اور برہنہ گزرنا خلاف حیا و شرم ہے اسی طرح اس عظیم الشان شاہراہ سے جو ایک لمحے کے لیے بھی بے شمار ملائکۃ اللہ سے خالی نہیں ہوتی لباس تقویٰ سے برہنہ اور عریاں گزرنا کس طرح بے حیائی اور بے شرمی نہ ہوگا۔ اعاذنا اللہ من ذلک آمین۔

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ۔ یہ کلمہ المتقین کی صفت ہے۔ المتقین میں تمام بری باتوں کے ترک کی طرف اشارہ تھا اب امور خیر کا ذکر فرماتے ہیں۔ چونکہ اجزاء انسان میں سب سے عظیم اور اشرف جزء قلب ہے اس لیے سب سے پہلے فعل قلب یعنی ایمان کا ذکر فرمایا۔ قرآن عظیم اور حدیث نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بے شمار نصوص سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایمان فعل قلب ہے۔ **کما قال تعالیٰ**:۔

مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ۔ بعض لوگ محض زبان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے۔ حالانکہ ان کے دل ایمان نہیں لائے۔

اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ۔ ایسے ہی لوگوں کے دلوں میں ایمان کو نقش کر دیا ہے۔

وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ یہ کہو کہ اسلام لائے یعنی ظاہراً اطاعت قبول کی لیکن دلوں میں ابھی تک ایمان نہیں پہونچا۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا مشہور ہے :۔

اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰى دِیْنِكَ۔ اے اللہ میرے دلکو اپنے دین پر قائم رکھ

لغت میں ایمان کے معنی مطلق تصدیق کے ہیں اور اصطلاح شریعت میں جن چیزوں کا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دین سے ہونا قطعی اور یقینی اور بدیہی طور پر ثابت ہو گیا محض نبی اور رسول کے اعتماد پر ان کی تصدیق کا نام ایمان ہے اور ایسے ہی امور کی تکذیب اور انکار کا نام کفر ہے مثلاً توحید و رسالت ختم نبوت حشر و نشر۔ بعث و جزاء اور ہیئت مخصوصہ اور ارکان معلومہ کے ساتھ نماز اور حج کا ادا کرنا وغیر ذلک جس طرح سے ان کا دین ہونا ثابت ہوا ہے اسی طریق پر اُن کی تصدیق و تسلیم ایمان کہلائیگی اور اگر بالفرض کوئی شخص مثلاً

صلوٰۃ کا شعار اسلام اور عماد الدین ہونا بمعنی الدعاء تو تسلیم کرتا ہے مگر قیام و قعود اور رکوع و سجود یعنی اس ہیئۃ مخصوصہ کے ساتھ جو قطعی اور یقینی طور پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوئی ہے اس کی فرضیت اور اس کا شعار اسلام ہونا تسلیم نہیں کرتا تو یہ صریح کفر ہے۔ ایسے امور میں تاویل بھی معتبر نہیں۔ تاویل اسی جگہ معتبر ہے کہ جو قواعد ضوابط کے ماتحت ہو ہوائے نفسانی اور معاذ اللہ انبیاء کرام کے ساتھ سوء ظن اور بدگمانی پر مبنی نہ ہو۔

عارف جامی شواہد النبوت کے پہلے ہی صفحہ پر حمد و نعت کے بعد فرماتے ہیں:-

"نخستین رکن از ارکان اسلام اقرار بکلمۂ شہادت است و حقیقت ایمان تصدیق مضمون آن و آن مشتمل بر دو امر است یکے اقرار بوحدانیت حق سبحانہ و تعالیٰ و گرویدن بآن۔ دوم اقرار بنبوت و رسالت محمد صلی اللہ علیہ وسلم و گرویدن بآن وامر اول وقتے معتبر است کہ مقتبس از مشکوٰۃ نبوت باشد اگر بمجرد دلائل عقلی اکتفا کنند چوں فلاسفہ و از مشکوٰۃ نبوت نگیرند مفید نجات نیست۔"

امام غزالی قدس اللہ سرہٗ فیصل التفرقہ بین الاسلام والزندقہ میں ایمان اور کفر کی یہ تعریف فرماتے ہیں

الکفر ھو تکذیب الرسول	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی شئی میں بھی تکذیب
صلی اللہ علیہ وسلم فی شیٔ مما جاء	کر دینے کا نام کفر ہے اور تمام امور میں آپ کی تصدیق
به والایمان تصدیقه فی جمیع ما جاء به	کرنا اس کا نام ایمان ہے۔

امام غزالی قدس اللہ سرہٗ کی اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ ایمان کے لیے فقط ایک دو امور کی تصدیق کافی نہیں تمام امور میں رسول اللہ کی تصدیق لازم ہے۔ ہاں کفر میں تمام امور کی تکذیب ضروری نہیں ایک شئی میں بھی رسول کی تکذیب کفر ہے۔

اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک اہل ایمان اور اہل قبلہ وہی لوگ ہیں جو تمام امور میں رسول کی تصدیق کرتے ہیں۔ فقط قبلہ کی طرف نماز پڑھنے سے اہل ایمان اور اہل قبلہ کے زمرہ میں شمار نہیں کیا جائے گا جب تک تمام

اسکی تصدیق نہ کرے۔ کما قال تعالیٰ۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (الیٰ آخر الآیات)

نیکی اور بھلائی اس میں منحصر نہیں کہ تم اپنے چہرے کو مشرق اور مغرب کی جانب پھیر لو۔ لیکن نیکی اور بھلائی یہ ہے کہ جو ایمان لائے اللہ پر اور یوم قیامت پر اور تمام فرشتوں پر اور اللہ کی ہر کتاب پر اور تمام پیغمبروں پر۔

الحاصل۔ شریعت کے نزدیک اہل قبلہ وہی لوگ کہلائیں گے جو تمام امور دینیہ کی تصدیق کرتے ہوں اور کسی امر دینی کے مکذب اور منکر نہ ہوں۔ جو شخص ضروریات دین میں سے کسی ایک امر کا بھی مکذب اور منکر ہو وہ شخص قطعاً و یقیناً دائرہ ایمان اور زمرۂ اہل قبلہ سے خارج ہے اگرچہ وہ شخص قبلہ رو ہو کر دن میں پانچ نمازیں ادا کرتا ہو۔ قال تعالیٰ :۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۔

کیا تم کتاب کی بعض باتوں پر ایمان لاؤ گے اور بعض کا انکار کرو گے؟ تو تم میں سے جو ایسا کرے گا اُس کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ حیات دنیا میں رسوائی اور قیامت کے دن ایسے لوگ زیادہ شدید عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں گے اور اللہ غافل نہیں ہے اُس سے جو تم کرتے ہو۔

ناظرین کرام غور فرمائیں کہ آیت شریفہ میں دنیا کی رسوائی اور آخرت کا سخت سے سخت عذاب اُنہی لوگوں کے لیے ذکر فرمایا ہے جو کتاب الٰہی کے بعض احکام کی تصدیق اور بعض کی تکذیب کرتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ اخروی نجات کے لیے فقط بعض احکام کی تصدیق ہرگز کافی نہیں۔ پھر آگے ارشاد فرماتے ہیں :۔

أُولٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا	یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے حیات دنیا کو آخرت کے عوض
بِالْآخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ	خرید لیا ہے۔ پس ان پر سے عذاب کم نہ کیا جائے گا اور
وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ۔ وَلَقَدْ آتَيْنَا	نہ ان کی مدد کی جا سکے گی۔ اور یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب
مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ	دی تھی اور اس کے بعد دوسرے رسول بھیجے اور عیسیٰ
وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ	بن مریم کو کھلے ہوئے نشانات (معجزے) دیئے
بِرُوحِ الْقُدُسِ أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ	اور روح قدس سے اس کی تائید کی۔ تو پھر کیا تم
بِمَا لَا تَهْوَى أَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا	ایسے ہو گئے کہ جب کبھی کوئی رسول تمہارے پاس تمہاری
كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ	خواہشات کے خلاف کچھ لے کر آیا تو تم نے سرکشی کی پھر کسی
بَلْ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَا يُؤْمِنُونَ ۔	کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کرنے لگے؟ انھوں نے کہا کہ ہمارے

دل غلافوں میں محفوظ ہیں۔ نہیں، بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی ہے، وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں جس خاص کفر پر لعنت فرمائی ہے وہ یہی کفر ہے کہ جب انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام بجانب اللہ ایسی چیزیں لے کر آتے جو نفسانی خواہشوں کے خلاف ہوں تو یہود بے بہبود نے اسوقت سرکشی اور انبیاء کرام کی تکذیب کی۔

عارف ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ فلاسفہ یونان جو سموات وکواکب کے فنا و فساد کے قائل نہیں وہ قطعاً کافر ہیں جیسا کہ امام غزالی نے اپنے رسائل میں اسکی تصریح کی ہے اس لیے کہ یہ لوگ نصوص قطعیہ اور اجماع انبیاء کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے منکر ہیں۔ کما قال تعالیٰ:۔

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ وقال اللّٰه تعالیٰ إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ وقال اللّٰه تعالیٰ وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا۔

نمیدانند کہ مجرد تلفظ بکلمۂ شہادت و رسلام کافی نیست — نہیں جانتے کہ محض کلمہ شہادت پڑھ لینا مسلمان ہونے کیلئے کافی نہیں

تصدیق جمیع ما علم مجیئه من الدین بالضرورة باید (مکتوبات صفحہ ۳۲۳ جلد ۱)

مسلمان ہونے کے لیے اُن تمام چیزوں کی تصدیق جن کا دین ہونا قطعی اور بدیہی طور پر ثابت ہو گیا لازمی اور ضروری ہے۔

الحاصل جو شخص ضروریات دین اور قطعیات اسلام کا منکر اور مکذب ہو وہ شخص اہل قبلہ سے نہیں

چنانچہ ردالمحتار (صفحہ ۵۷۲) میں ہے:۔

اهل القبلة فی اصطلاح المتکلمین من یصدق بضروریات الدین ای الامور التی علم ثبوتها فی الشرع واشتهر فمن انکر شیئا من الضروریات کحدوث العالم وحشر الاجساد وعلم الله سبحانه بالجزئیات وفرضیة الصلوٰة والصوم لم یکن من اهل القبلة ولو کان مجاهدا بالطاعات وکذلک من باشر شیئا من امارات التکذیب کسجود الصنم والاهانة بامر شرعی والاستهزاء علیه فلیس من اهل القبلة ومعنی عدم تکفیر اهل القبلة ان لا یکفر بارتکاب المعاصی ولا بانکار الامور الخفیة غیر المشهورة۔ هذا ما حققه المحققون فاحفظه۔

متکلمین کی اصطلاح میں اہل قبلہ وہ ہے جو ضروریات دین کی تصدیق کرے یعنی اُن امور کی جن کا ثبوت شرع میں معلوم و مشہور ہو چکا ہے۔ پس جس نے ضروریات میں سے کسی چیز مثلاً حدوث عالم اور حشر اجساد اور اللہ سبحانہٗ کے عالم جزئیات ہونے اور نماز روزہ کی فرضیت کا انکار کیا وہ اہل قبلہ میں سے نہیں ہے اگرچہ وہ طاعات میں کتنی ہی کوشش کرتا ہو۔ اسی طرح جو شخص علامات تکذیب میں سے کسی فعل کا ارتکاب کرے مثلاً بت کو سجدہ کرنا اور کسی امر شرعی کی توہین کرنا اور اس کا مذاق اڑانا، تو وہ اہل قبلہ میں سے نہیں ہے اور اہل قبلہ کی تکفیر نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ گناہوں کے ارتکاب یا چھوٹی چھوٹی غیر مشہور باتوں کے انکار پر کسی کی تکفیر نہ کی جائے گی یہ محققین کی تحقیق ہے۔ اسے یاد رکھو۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا۔

یقیناً جو لوگ انکار کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسولوں کا اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لائیں گے اور بعض کا انکار کریں گے۔ اور چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان کوئی راہ اختیار کریں، وہ بالتحقیق کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لئے ایک رسواکن عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور جنھوں نے ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کی ان کو عنقریب اللہ ان کے اجر عطا کرے گا۔ اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ جو شخص بعض چیزوں پر ایمان لائے اور بعض پر ایمان نہ لائے وہ شخص پکا کافر ہے۔ فقط بعض چیزوں پر ایمان لانے سے اللہ کے نزدیک وہ مومن نہیں ہوتا۔

علیٰ ہذا حلال قطعی کو حلال سمجھنا اور حرام قطعی کو مثلاً زنا اور لواطت، خمر اور خنزیر کو حرام سمجھنا یہی ایمان کا جزو لاینفک ہے اور حلال قطعی کی حلت کا انکار اور حرام قطعی کی حرمت کا انکار صریح کفر ہے مثلاً اگر کوئی شخص زنا اور لواطت کی حرمت کا انکار کرے تو وہ شخص بلاشبہ کافر ہے۔ ہاں جن چیزوں کی حلت و حرمت ظنی ہو ان کے انکار سے کافر نہیں ہوتا۔ کما قال تعالیٰ:۔

وَقَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ۔

اور جنگ کرو ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور روز آخر پر، اور حرام نہیں سمجھتے اس چیز کو جسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے۔

(باقی)

منّ وسلوے

(از جناب مولانا عبداللہ العمادی)

چندسال ہوئے "ادبی دنیا" (لاہور) میں "منّ وسلویٰ" کے متعلق بحث چھڑی تھی، الہ آباد کے پروفیسر نعیم الرحمٰن اور پنجاب کے ایک پیشوائے جماعت نے "ابن الفارس" کے نام سے طویل وعریض افادات فرمائے تھے، جی چاہتا ہے آج اُسی "منّ" سے امتنان اور اُسی "سلویٰ" سے تسلی حاصل ہو، یہ بنی اسرائیل کے زمانہ کی بات تھی، آج ذوق توحید کیونکر اس سے لذت یاب ہو؟

(۱)

سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل سے خطاب ہے:۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ	(۱) ہم نے تم پر ابر کو سایہ گستر بنایا
وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ	(۲) ہم نے تم پر منّ وسلویٰ اُتارا
كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ	(۳) ہم نے جو پاک رزق تمہیں دیا ہے اُنہیں سے کھاؤ۔
وَمَا ظَلَمُونَا	(۴) اِن لوگوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا۔
وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ	(۵) یہ تو خود اپنے آپ پر ظلم کر رہے تھے۔

یہاں "منّ اور سلویٰ" سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے اَن گنت تاویلیں کی ہیں اور کیا کچھ روایتیں لکھی ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ عرب اس کا مفہوم کیا سمجھتے تھے؟ جاہلیت کے مشہور سخن گو "امیہ بن ابی الصلت" نے یہ داستان نظم کی ہے جس میں دکھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب دیکھا کہ بنی اسرائیل "تیہ" میں تباہ ہو رہے ہیں تو اُن کو "منّ وسلویٰ" کی نعمت دی، یہ کیا چیز تھی؟ وہ اس کو یوں ظاہر کرتا ہے ؎

فرأى الله أنهم بمضيع لا بذي مزرع ولا مثمورا

فسناها عليهم غاديات ويرى مزنهم خلايا وخورا

عسلا ناطفا وماء فراتا

وحليبا ذا بهجة مزمورا

ناطف :- رواں وسیال حلیب مزمور، صافی وزلال -

امیہ کی رائے میں مَن و سلویٰ، رقیق شہد اور اس کا صاف پانی تھا۔

اس سے کم از کم اتنا تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ مَن و سلویٰ کے جو معنی ہماری تفسیروں میں مبسوط ہیں، عہد جاہلیت میں یہ معنی نہ تھے۔ بلکہ اُس زمانہ میں اس کا کچھ اور ہی مطلب سمجھتے تھے۔

(۲)

علمائے محدثین کی تحقیق ملاحظہ ہو:-

ان عبارات المفسرین متقاربة فی شرح المن، فمنهم من فسره بالطعام ومنهم من فسره بالشراب والظاهر - والله اعلم - انه کل ما امتن الله به علیهم من طعام وشراب وغیر ذلک مما لیس لهم فیه عمل ولا کد [1]

"مَن" کی تشریح میں مفسرین کی عبارتیں قریب قریب اور ملتی جلتی ہیں کسی مفسر نے "مَن" کی تفسیر کھانے کی چیز سے کی ہے اور کسی نے پینے کی چیزوں سے۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ حقیقت کیا ہے، لیکن ظاہر معنی تو یہ ہیں کہ "مَن" سے ہر ایسی نعمت مراد ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اُن کو ممنون فرمایا تھا، مثلاً کھانا، پانی وغیرہ تمام وہ چیزیں جن میں خود ان کے عمل و کوشش و محنت کو ذرا بھی دخل نہ تھا [1]

اس کی تائید امام بخاری کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو سعید بن زید سے مروی ہے، قال قال

---

[1] تفسیر ابن کثیر (علی ہامش فتح البیان) طبع بولاق، مصر، سنہ ۱۳۰۰ھ ج اص ۱۶۱۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:۔ الکمأۃ من المنّ، وماؤھا شفاءٌ للعین، یہ حدیث بہت ہی تھوڑے لفظی اختلاف سے بیشتر محدثین اور خصوصاً اصحاب صحاح نے روایت کی ہے، اس میں نقطۂ بحث یہ ہے کہ "منّ" جو بنی اسرائیل پر نازل ہوا تھا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم "کمأۃ" کو بھی اسی ذیل میں شامل فرماتے ہیں کیوں؟ اس لیے کہ:۔

(۱) منّ وہ نعمت ہے جو ممنونیت کا باعث ہو۔

(۲) کمأۃ میں بھی شفا کی خاصیت ہے، آشوب چشم والے اس کے ست پذیر ہیں۔

کمأۃ:۔ وہ برساتی روئیدگی جسے عوام چھتری کہتے ہیں، ہماری مجلس مصطلحات نے اس کا نام "فُطر" رکھا ہے، کہ یہی قدیم عربی نام ہے۔

(۳)

"سلویٰ" کے کیا معنی ہیں؟ اسرائیلیات میں پڑنے کی ضرورت نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ "سلویٰ" کے معنی عرب کیا سمجھتے تھے عہد جاہلیت کا شہرۂ آفاق شاعر "ہذلی" کہتا ہے ؎

وقاسمھا باللہ جھداً لانتم
الذ من السلویٰ اذ ما نشورھا

اس میں سلویٰ کے معنی شہد کے ہیں۔

قال القرطبی: المورج احد علماء اللغۃ والتفسیر قال: انہ رای السلوی: العسل واستدل ببیت الھذلی ھذا وذکر انہ کذلک فی لغۃ کنانۃ لانہ یسلی بہ ومنہ عین سلوان[۱]

علامہ قرطبی کہتے ہیں کہ مورج جو لغت عرب و تفسیر قرآن کے عالم تھے کا بیان ہے کہ سلویٰ شہد کو کہتے ہیں ہذلی کے اسی شعر سے انھوں نے بھی استدلال کیا ہے کہ قبائل کنانہ کی زبان میں سلویٰ کے معنی شہد کے ہیں کیونکہ شہد ایسی چیز ہے جس سے تسلی ہوتی ہے اسی بنا پر ایک چشمہ کا نام بھی سلوان پڑ گیا۔ یعنی تسلی بخش چشمہ[۱]

[۱] تفسیر ابن کثیر، ج ۱ ص ۱۶۴۔

قرطبی کے استدلال میں ایک جھلک اس کی بھی ہے کہ سلوے کے اصل معنی تسلی کے ہیں۔ جو چیزیں تسلی بخش ہوں وہ بھی اسی میں آجائیں گی۔ اسلوانہ میں بھی اسی تسلی کا مفہوم ہے :-

شربت علی سلوانۃ ماء مزنۃٍ — فلا وجدید العیش یا میّ لا اسلو

ایک دوا کا نام "سلوان" تھا اور ایک چڑیا کو "سلواۃ" کہتے تھے :-

وانی لتعرونی لذکراک ھزۃٌ — کما انتفض السلواۃ من بلل القطر

تسلی ہی کا مادہ سب میں ہے اور یہی اصل معنی ہیں۔

(۴)

امام راغب اصفہانی اسی لفظ "سلویٰ" کی تفسیر کرتے ہیں :-

اصلها ما یسلی الانسان ومنه السلوان والتسلی، وقیل السلوی طائر۔ — اصل میں سلویٰ وہ چیز ہے جس سے انسان کو تسلی ہو جائے سلوان اور تسلی کا اشتقاق اسی سے ہے۔ ایک ضعیف قول یہ بھی ہے کہ سلویٰ ایک چڑیا ہے۔

پھر لکھتے ہیں :-

واصل السلوی من التسلی، یقال سلیت عن کذا، وسلوت عنه، وتسلیت اذا زال عنک محبته۔ له — سلویٰ کی اصل تسلی ہے، دل سے جب کسی کی محبت جاتی رہی اور اس کی جانب سے تسلی ہوگئی تو محاورہ میں "سلیت عنہ" "سلوت عنہ" اور "تسلیت" کہتے ہیں۔

"منّ" اور "منت" کا مادہ ایک ہی ہے، منت کی توضیح کی ہے :-

المنة النعمة الثقیلة ۲ه — منت بھاری نعمت کو کہتے ہیں ۲ه

پھر لفظ "قیل" فرماتے ہیں، جو اگرچہ تمریض کے لیے ہو مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام راغب اس کی صحت کے قائل نہیں

له المفردات فی غریب القرآن - طبع میمنیہ مصر سنہ ۱۳۲۴ ص ۲۴۱ ۲ه المفردات - ص ۴۹۱

المن والسلوی کلاهما اشارة الی ما انعم الله به علیهم، وهما بالذات شیٔ واحد، لکن سماه منّا بحیث انه امتن به علیهم وسماه سلوی من حیث انه کان لهم به التسلی۔ لہ

من و سلویٰ دونوں سے اس نعمت کی جانب اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو عطا فرمائی تھی، یہ دونوں چیزیں بالذات ایک ہی ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے "منّ"، اس لیے کہا کہ اس نعمت سے ان کو منت پذیر فرمایا تھا، اور سلویٰ اس حیثیت سے نام رکھا کہ یہ چیز ان کے لیے وجہ تسلی تھی۔

(۵)

اساطین عربیت و قدمائے ادب کی تصریح ملاحظہ ہو:۔

قال ابو سحاق: جملة المن فی اللغة ما یمن الله به عما لا تعب فیه ولا نصب

زجاج کا قول ہے کہ "منّ" کے بہت سے معنی بیان کیے ہیں، ان سب کا مجمل و ملخص یہ ہے کہ عربی زبان میں وہ تمام چیزیں "منّ" ہیں جو بغیر کسی محنت و مشقت و کد و کاوش کے اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمائی ہوں۔

وقیل المن ما من الله به علی عباده

یہ معنی بھی بیان کئے گئے ہیں کہ اللہ نے اپنے بندوں پر جو احسان کیا ہو وہ "منّ" ہے

قال ابوبکر: قال المفسرون المن و السلوی السمانی۔ قال ... عند العرب العسل وانشد

کتاب الجمہرہ کے مصنف ابو بکر بن دُرَید نے بیان کیا کہ مفسرین نے "منّ" کے معنی ترنجبین اور "سلویٰ" کے "سمانی" (چڑیا) لیے ہیں، لیکن عرب میں تو سلویٰ شہد تھا، جس کی سند یہ ہے:۔

لو ابصروا المن والسلوی مکانهم
ما ابصر الناس طعما فیهم نجعا

حقیقت یہ ہے کہ اس مادہ کے تمام مشتقات تسلی بخش ہیں، یعنی تسلی کا مفہوم سب میں ہے۔ بجتنے ...

لہ مفردات ... (۲۹۱)۔

کہتے ہیں:۔ ھو فی سلوۃ من العیش، ای فی رخاءِ

راعی:۔ اخو سلوۃٍ مسّیٰ بہ اللیل املح،

ابوذویب:۔ علی انّ الفتی الخثمیّ سلّی
بنصل السیف غیبۃ من یغیب

روبہ:۔ مسلم ما انسا لت ما حییتُ لو اشرب سلوان ما سلیتُ ما بی غنیً عنک وان غنیتُ

ابن بری:۔ جعلت لعراف الیمامۃ حکمہ وعراف نجد ان ھما شفیانی
فما ترکا من رقیۃٍ یعلما نھا ولا سلوۃٍ الّا بھا سقیانی

قال الفارسی:۔ السلویٰ کل ما سلاک وقیل للعسل السلویٰ لانہ یسلیک بحلاوتہ وتاتیہ عن غیرہ مما تلحقک فیہ مؤنۃ الطبخ وغیرہ من انواع الصناعۃ

ابو علی فارسی کا بیان ہے کہ جو چیز تمہیں تسلی دے وہی سلویٰ ہے، شہد کو بھی اسی لیے سلویٰ کہا گیا ہے کہ اس کی حلاوت تسلی بخش ہے اور بغیر زحمت کے حاصل ہوتی ہے کہ نہ اُس میں پکانے کی مشقت ہے اور نہ کسی دوسری قسم کی صنعت کا دخل ہے۔

حاملان قرآن

قاضی طیّب عمادی

از

جناب مولوی محمد عثمان صاحب عمادی، بی ایس سی (علیگ)

وَنَحْنُ اُنَاسٌ کُلَّمَا غَابَ کَوْکَبٌ
بَدَا کَوْکَبٌ تَاوِیْ اِلَیْهِ کَوَاکِبُہٗ

آل عماد کا طرز حیات یہ تھا کہ معارف نبوی میں یکتائی اور اتقای روحانیت میں بے ہمتائی دونوں بدوش رہے، یہ امتیاز ہر عہد میں معہود رہتا چلا آیا اور کوئی زمانہ اس سے خالی نہیں رہا، البتہ بسترِ اہ... لیے بواطن حقایق پر ظواہر شرائع کو راجح رکھتے تھے کہ اگرچہ علم و عرفان دونوں بجائے خود محکم بالشان ہیں، تاہم عالم کو عارف پر ترجیح ہے، دیکھو اللہ تعالیٰ کو عالم کہتے ہیں مگر عارف نہیں کہہ سکتے کیونکہ علم کے مقابلہ میں معرفت اس کے دون مرتبہ ہے۔

علوم نبوی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جتنے علوم حقّہ ماثور یا مستنبط ہیں حضرت طیب اُن سب کے حامل تھے اور صدلقیت میں تو شیخ کامل تھے، تعلیمات ولایت پر اپنے والد سے فائز ہوئے اور تکمیل ظاہر و باطن کے بعد خلافت نبوی کا خاندانی میراث حصہ میں آیا، مگر تقویم نسبت کے لیے اجازت خلافت حضرت شیخ محمد بن قطب بینادل رضی اللہ عنہما سے حاصل فرمائی، حضرت شیخ کی جناب میں آپ درجۂ خلّت رکھتے تھے،

حضرت شیخ جب کسی کو مرید کرتے تو اس کی تعلیم آپ کے ذمہ ہوتی اور جب خلافت دیتے تو مثال خلافت پر آپ کے دستخط بھی ہوتے۔

حلقہ درس میں علمائے اعلام و شیوخ اسلام بکثرت شریک ہوتے، جامع میاں پورہ جو برلب دریائے گومتی حضرت شیخ قطب بینادل کی یادگار ہے، وہیں آپ درس دیتے اور کلام اللہ و سنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تفسیر فرماتے، خاندان کی زبان عربی تھی اس لیے عربی ہی میں کلام کرتے، اور عربیت بھی اس پایہ کی جس سے عبداللہ بن المقفع و عبدالحمید و جاحظ کی یاد تازہ ہوتی اور سامعین کچھ بھی فرق نہ کرسکتے، كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِزْقًا قَالُوا هَذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا۔

قضاءِ اسلام آوازۂ علم و غلغلۂ فضل اس قدر بلند ہوا کہ سلطنت کو کشش ہوئی اور مکرر فرمان طلب نافذ ہوا ارباب عذر کرنے پر بھی جب گلوخلاصی نہ ہوسکی تو حضرت شیخ محمد بن قطب نے ارشاد فرمایا کہ تم "کاضیان فی النار" سے کیوں ڈرتے ہو، "قاضٍ فی الجنۃ" کیوں نہیں بنتے، امتثال امر شیخ لازم تھا اس لیے دربار شاہی میں حاضر ہوئے مگر اس شان سے کہ نہ آداب بجالائے، نہ تین تسلیمیں کیں، نہ زمین بوس ہوئے وہ گردن پادشاہ کے لیے جھکائی جو اللہ ہی کے لیے جھکتی تھی، سلطنت کو بزرگداشت منظور تھی اس لیے کوئی ادا گراں نہ گزری اور خدمت قضائے بنگال پر مامور فرمائے گئے جہاں آپ کا مستقر عظیم آباد تھا کہ سقوط دولت شرقیہ کے بعد سرور پور کی ویرانی سے آباد ہوا تھا، تمام شرفا و ملوک سرور پور سے ہجرت کر گئے اور اسی کو اپنا وطن بنالیا، اس سے پیشتر آپ صاحب اولاد ہو چکے تھے مگر عظیم آباد میں معارف سادات عرب کے خاندان میں جو مہاجرین سرور پور کا سرگروہ تھا، ایک شادی کی اور اس سے بھی اولاد ہوئی جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، نشر نصفت نفاذ عدل میں آپ کو نہایت انہماک تھا اور اپنے طرز عمل سے اپنے جد بزرگ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے منشور خلافت کو ممثل بنادیا تھا کہ "حقوق کے معاملات میں جو قوی ہیں تا بحد حق رسانی میں ان کو ضعیف سمجھوں گا اور جو ضعیف ہیں تا بحد حق رسی ان کو قوی کردوں گا"

اِس سے قبل امرنو ایک وادی غیر ذی زرع تھا، آپ نے اُس کو شیخ عبد الغنی اور سید ناصر کی شرکت میں نوسو روپے میں خرید فرمایا، ان میں ایک صاحب آپ کے برادر نسبتی اور دوسرے کو آپ کی خواہر منسوب تھیں، بیعنامہ اب تک موجود ہے اور اس پر حضرت شیخ محمد بن قطب رضی اللہ عنہما کی عبارت شہادت بھی اُنھیں کے خط شریف میں بصیرت افروز باصد تزئین و برکت ہے۔

حضرت نے عظیم آباد ہی میں انتقال فرمایا اور وہیں مدفون ہیں، سقی اللہ ثراہ وا فاض شآبیب رحمتہ علی مثواہ۔

دیوان منسوب بعلی مرتضیٰؓ معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو آداب فارسیت سے بھی آپ مستفید ہو چکے تھے، حکیم سید مظفر حسین صاحب (چھتہ بازار حیدرآباد) نے اُس دیوان کی شرح کا ایک نسخہ مجھے دکھایا جو امیر المومنین علی بن ابی طالب سے منسوب ہے۔ یہ نہایت پاکیزہ خط کا قلمی نسخہ ہے اور فارسی میں دیوان موصوف کی کمل شرح کی ہے، عبارت خاتمہ یہ ہے: "کتبہ الفقیر الی اللہ طیب بن داؤد بن قطب بن جمال الجون پوری" اور اسی کے تحت بخط طلسم بھی یہی اعلام ثبت ہیں:-

"۲۱۹ ۵۲ ۴۶۶۱۴ ۲۹|۵۲ ۵۲ ۳۱۴۳ ۱۲۶۲۵۶۳۳۱"

مجھے پہلے شبہ ہوا کہ کسی دوسرے بزرگ کی تعریف ہوگی اس لیے کہ قاضی طیب تو حضرت داؤد بن قطب ابن عماد کے چشم و چراغ تھے اور یہاں بجائے عماد کے جمال مرسوم ہے، لیکن بعد کو انکشاف ہوا کہ جمال العالم حضرت شیخ عماد ہی کا خطاب تھا جو بیعت خلافت کے بعد بارگاہ بنیادل سے مرحمت ہوا تھا، اس کتاب کا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ شرح ابیات کے ساتھ یہ بھی تشریح کر دی ہے کہ اخبار عرب میں یہ بیتیں فلان و فلاں شعرائے قدیم سے مروی ہیں۔

مجلس درس قرآن آپ کی دو مجلسیں تھیں، ایک جس میں اس طرح فصل خصومات فرماتے کہ قضائے عدل سے ایاس و شریح کو یاد دلاتے، دوسری مجلس درس تھی جس میں حقائق تنزیل کو دقائق تاویل سے بلند آوازہ کرتے

اور عکرمہ و ابن عباس کا عہد نامہ کرتے، قریہ زادبوم پر جب آپ نے دخل پایا تو اس آیت کو تلاوت فرمایا۔

دعائے ابراہیمؑ

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ۔

وہ وقت یاد کرو جب ابراہیمؑ نے کہا: اے میرے پروردگار اس شہر کو محل امن بنا اور مجھے اور میری اولاد کو بچا کہ بتوں کی پرستش نہ کریں۔

رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِي فَهُوَ مِنِّي وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ۔

اے میرے پروردگار ان بتوں نے بہتیرے لوگوں کو گمراہ کر دیا، اب جس نے میری پیروی کی وہ میری نسل میں سے ہے اور جس نے نافرمانی کی تو اے پروردگار فی الحقیقت تو ہی غفور رحیم ہے۔

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ۔ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ، فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ، لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ

اے ہمارے پروردگار میں نے اپنی نسل میں سے بعض کو تیری عزت و حرمت والے گھر کے پاس ایک بے کشت وادی میں ٹھیرایا ہے۔ اے ہمارے پروردگار غرض یہ ہے کہ اقامت صلاۃ میں یہ لوگ مستقیم رہیں، لہذا تو کچھ لوگوں کے دلوں کو انکی جانب مائل کر دے، اور کچھ پھل اور پیداوار ان کو روزی کر، کہ شاید وہ شکر کریں۔

رَبَّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِي وَمَا نُعْلِنُ وَمَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ

اے ہمارے پروردگار جو ہم چھپاتے ہیں اور جو علانیہ سامنے لاتے ہیں درحقیقت تو ان سب کو جانتا ہے اللہ سے کوئی چیز نہ زمین میں چھپی ہے نہ آسمان میں۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعُ الدُّعَاءِ۔

اللہ کے لیے ہر طرح کی حمد ہے جس نے کبر سن کی حالت میں مجھے اسمٰعیل و اسحٰق بخشے حقیقت میں میرا پروردگار ہی دعا سننے والا ہے

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ۔	اے میرے پروردگار مجھے اور میری نسل کے کچھ لوگوں کو اقامت صلاۃ پر ملتزم رکھ۔
رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ	اے ہمارے پروردگار یہ بھی عرض ہے کہ میری دعا کو قبول کر لے۔
رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ	اے ہمارے پروردگار میری، میرے والدین کی، اور تمام ایمانداروں کی اُس دن مغفرت کر جو حساب کا دن ہوگا

دعائے انبیاء طالبانِ حقیقت ہمیشہ فرصت کے منتظر رہتے تھے، حضرت سے گزارش کی: دعائے انبیا مقبول ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا کہ میری اولاد کو بت پرستی سے بچانا، کیوں قبول نہ ہوئی؟ قریش بھی تو اولاد ابراہیمؑ تھے: دعا قبول ہوتی تو یہ پوری نسل بت پرستی سے ملوث ہوتی،

یہ بھی واضح ہے کہ جاہلیت میں اصحاب فیل اور اسلام میں قرامطہ نے مکۂ مبارکہ پر حملے کیے پھر یہ دعا کہاں پوری ہوئی کہ اس شہر کو امن وامان میں رکھنا؟

فرمایا:۔ مفسرین نے تو بہتیری توجیہیں کی ہیں، مگر قولِ فیصل یہ ہے کہ ہندوستان میں آکر اولاد کا مفہوم بہت وسیع ہوگیا، حضرت ابراہیمؑ کی دعا یہ تھی وَ اجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ (مجھے اور میرے بیٹوں کو بچانا) اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اور ان کے بیٹوں کو کہ اسمٰعیل و اسحٰق تھے (علیہم السلام) عبادت اصنام سے بچائے رکھا،

بلدِ آمن فرمایا:۔ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا اے میرے پروردگار اس شہر کو امن میں رکھنا،

اس کی تفسیر میں یہ روایت بطریق صحیح وارد ہے:۔

اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ عَلَیْهِ السَّلَامُ لَمَّا فَرَغَ مِنْ بِنَاءِ الْکَعْبَۃِ ذَکَرَ هٰذَا الدُّعَاءَ	تعمیر کعبہ شریف سے فارغ ہونے کے بعد ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی تھی۔
وَالْمُرَادُ جَعْلُ تِلْکَ الْبَلْدَۃِ آمِنَۃً مِنَ الْخَرَابِ	مراد یہ تھی کہ یہ شہر ویرانی سے محفوظ رہے۔

وھی عامرۃ للاٰن، لایخربھا الفتن، ماظھر منھا ومابطن۔

خدا کے فضل سے یہ شہر اب تک آباد ہے ظاہری باطنی کسی طرح کے فتنے اسے ویران نہ کرسکے۔

اولادِ غیر صالح فرمایا:۔ اولاد ہونے میں اولاد بعید بھی نسبت قریب کچھ بہت دور نہیں، مگر ان کے لیے ابراہیم علیہ السلام نے خود ہی تصریح کردی کہ جو میرے پیرو ہیں وہی میری اولاد میں شامل ہیں، نافرمان اولاد کو یہ تو نہیں فرمایا کہ وہ میری نسل ہی سے نہیں، البتہ یہ ضرور فرمایا کہ ایسے لوگوں کا اللہ مالک ہے جو غفور بھی ہے اور رحیم بھی، فمن تبعنی فھو منّی، ومن عصانی فانّک غفورٌ رحیم۔

وادیٔ غیر ذی زرع میں سکونت کی مصلحت عرض کی:۔ اس میں کیا مصلحت تھی کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی بیوی اور بیٹے کو ایک دشت بے آب وگیاہ میں چھوڑ گئے؟

فرمایا:۔ معتزلہ بھی یہی اعتراض کرتے ہیں، قاضی جبائی کا قول ہے:۔

اکثر الامور المذکورۃ فی ھذہ الحکایۃ بعیدۃٌ لانّہ لایجوز لابراھیم علیہ السلام ان ینقل ولدہ الی حیث لا طعام ولا ماء مع انہ کان یمکنہ ان ینقلھما الی بلدۃ اخری۔

اس کہانی کی اکثر باتیں حقیقت سے دور ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے یہ جائز نہ تھا کہ وہ اپنے فرزند کو ایسی جگہ منتقل کرتے جہاں نہ کھانے کی چیزیں تھیں نہ پانی تھا، ہوسکتا تھا کہ بیٹے اور بیوی دونوں کو کسی دوسرے شہر میں منتقل کردیتے۔

اس کا جواب ضروری نہیں، اس باب میں جیسا اعتراض حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ شانہٗ پر بھی ایسا ہی ایراد وارد ہوگا کہ خروج مصر کے بعد بھی بنی اسرائیل کو سالہا سال ایک دشت بے آب وگیاہ میں کیوں سرگرداں رکھا؟

اگر یہ کہیے کہ وہاں تو منّ وسلویٰ کا نزول تھا، تو یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہاں بھی تورزق ثمرات ومیلانِ قلوب کی نعمت عظمیٰ عطا ہوئی تھی۔

اصل یہ ہے کہ خلافت الٰہی کے لیے مومنین ایسے ہی مقامات میں تربیت پاتے اور تیار کیے جاتے ہیں، وہاں بھی یہی ہوا اور یہاں بھی یہی ہوتا رہے گا۔

درحضرتِ کریم تمنا چہ حاجت است

فرمایا:۔ ابراہیم علیہ السلام کی تمنا تو یہ ہے کہ ان کی اولاد کو صلاح و فلاح نصیب ہو، مگر اسکے لیے دعا نہیں کرتے، اللہ کی ثنا کرتے ہیں، کہ دل کی آرزو اللہ پر خود روشن ہے۔

کأنه کان فی قلبه ان یطلب من اللہ علنتها واعانة ذریتهما بعد موته ولکنه لم یصرح بهذا المطلوب بل طفق یحمد اللہ ویثنی علیه وذلك یدل علی ان الاشتغال بالثناء عند الحاجة الی الدعاء افضل من الدعاء

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے جی میں یہ آرزو تھی کہ اللہ سے دعا کریں میرے مرنے کے بعد میری بیوی اور بیٹے اور ان کی اولاد کا اللہ مددگار رہے۔ لیکن انھوں نے علانیہ ایسی دعا نہ کی، بلکہ اللہ کی حمد و ثنا کی، اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ جہاں دعا کی ضرورت ہو وہاں ثنائے الٰہی میں مشغولیت دعا سے بھی بڑھ کے ہے۔

شکر تو اقبل ولادت! عرض کی:۔ ابراہیم علیہ السلام نے جب اسمٰعیل و ہاجرہ علیہما السلام کو وادی غیر ذی زرع میں چھوڑا ہے تو اسوقت تک حضرت کے دوسرے فرزند اسحاق علیہ السلام کی ولادت نہیں ہوئی تھی، پھر حضرت کا یہ فرمانا کہ "اللہ کو حمد ہے جس نے کبرسن میں مجھے دو بیٹے، اسمٰعیل و اسحٰق عطا کئے" کیا معنی رکھتا ہے؟

فرمایا:۔ آیت میں کہیں مذکور نہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ اسوقت فرمایا جب اسمٰعیل و ہاجرہ علیہما السلام کو وادی غیر ذی زرع میں چھوڑ کے چلے تھے۔

ان ابراهیم علیه السلام انما ذکر هذا الکلام فی زمان آخر، لا عقب ما تقدم من الدعاء

یہ اسوقت کی بات نہیں ہے جب ابراہیم علیہ السلام نے بیوی بچے کو وادی غیر ذی زرع میں چھوڑا تھا اور ان کے لیے دعا کی تھی، یہ دوسرے وقت کی دعا ہے۔

رسائل و مسائل

حدیث لاتسبوا الدھر

مکرمی - السلام علیکم - رسالہ ترجمان القرآن شعبان ۱۳۵۳ھ میں جناب نے حدیث شریف اور الشیطان لہ ضراط کے سلسلہ میں جو تحریر فرمایا ہے اس کا مفصل جواب عنقریب جناب کی خدمت میں پہنچیگا۔ کیونکہ آپ کا یہ جواب ناتسلی بخش ہے اور صحیح بھی نہیں ہے۔ کاش آپ کامل توجہ فرماتے اور مناسب عالمانہ جواب دیتے اور علماء اہلحدیث پر اللہ اور اسلام کو ترجیح دیتے۔ نیز مزید گزارش ہے کہ اسی سلسلہ میں آپ مندرجہ ذیل استفسار پر بھی توجہ فرماویں:-

۱- بخاری شریف کی حدیث ہے۔ فان اللہ ھو الدھر ۲ و قال اللہ یسبّ بنو آدم الدھر و انا الدھر ۳۔ مؤطا امام مالک۔ فان اللہ ھو الدھر ۴۔ و حدیث ترمذی لو انکم دلیتم بحبل الی الارض السفلی لھبط علی اللہ۔ ان سے ظاہر ہے کہ دہر ہی بخاری صاحب وغیرہ کا معبود (الہ) ہے اور ان کا (الہ) صرف دہر ہے اب فرمایئے ان دہر کو اپنا معبود (الہ) ماننے والوں کی بابت آپ کا کیا فتویٰ ہے؟ راغب اصفہانی کی سند زیر نظر رکھکر جواب مرحمت کیا جائے۔ ھل الدھر الا لیلۃ و نہارھا۔ و الا طلوع الشمس ثم غیارھا جس کی رو سے تو نظام شمسی کواکب کرہ ارض عناصر یہی دہر ہیں۔ زمانہ میں جنکی بابت کفار دہریے کہا کرتے تھے وقالوا ما ھی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا وما یھلکنا

اِلَّا الدَّھْرُ وَمَا لَھُمْ بِذٰلِکَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ (سورۃ الجاثیہ ۲۴)

برائے مہربانی اس کو مسترد نہ فرمایئے نہ چھپایئے بلکہ اس مختصر عریضہ کو مکمل چھاپیے اور عالمانہ

جواب مرحمت فرمایئے۔ فقط والسلام۔ ابراہیم حنیف داعی الی اللہ از لاہور۔

آپ کے اصل استفسار کا جواب دینے سے پہلے اُس طرزِ عمل کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جو آپ نے اس مسئلے میں اختیار کیا ہے۔

میں نے آپ کا وہ مضمون پڑھا ہے جو آپ نے عیسائیوں کے ماہنامہ المائدہ میں "روایتی نماز کی فلاسفی" کے عنوان سے لکھا ہے۔ آپ کے جذبات کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن کم از کم میرے اپنے جذبات یہ ہیں کہ اگر مجھے خدانخواستہ اپنے کسی مسلمان بھائی سے جھگڑا کرنا بھی ہوگا تو غیر مسلموں کے سامنے جا کر کبھی ایسا نہ کروں گا۔ کجا کہ وہ جھگڑا کسی مذہبی مسئلہ میں ہو، اور اس سے غیر مسلموں کو اسلام اور مسلمانوں پر استہزا کرنے کے لیے اچھا خاصا سامان تفریح ہاتھ آتا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی مسلمان بھی جس میں ذرا سی بھی اسلامی غیرت ہوگی ایسا کرنا پسند نہ کرے گا بلکہ مجھے تو ابھی تک عیسائیوں، ہندوؤں، اور دوسرے مذاہب کے پیروؤں میں بھی کوئی مثال ایسی نہیں ملی کہ کسی شخص نے خود اپنے ہم مذہبوں کے مذہبی عقائد کا مذاق اڑانے یا ان پر لعن وطعن کرنے کے لیے کسی دوسرے مذہب والوں کے اخبار کو ذریعہ بنایا ہو۔ پھر آپ تو ماشاء اللہ "داعی الی اللہ" ہیں۔ ابراہیم حنیف آپ کا اسم گرامی ہے۔ آپ کی غیرت نے یہ کس طرح گوارا کیا کہ مسلمانوں سے مذہبی مسائل میں جھگڑا کرنے کے لیے ان لوگوں کے رسالہ کو واسطہ بنائیں جو اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اور اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ کے قائل ہیں؟ جن کے سامنے ایک داعی الی اللہ کو تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ کی دعوت پیش کرنی چاہیے تھی، ان کے سامنے آپ اپنے آپس کے اختلافات پیش فرما رہے ہیں، اور وہ بھی اس انداز میں کہ دوسروں کی نگاہوں میں جمہور اسلام کے عقائد اور ان کے مذہب کا استخفاف ہو۔

آپ نے اپنے مذکورہ بالا مضمون میں جو زبان استعمال کی ہے اور جس انداز سے حدیث زیر بحث اور اسکی صحت کے قائلین اور عموماً حدیث کے ماننے والوں پر نقد فرمایا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آج کل مذہبی مناظرے کا جو عام رنگ ہے اسی قسم کے مناظرے کی اسپرٹ آپکے اندر بھی بھری ہوئی ہے۔ اس اسپرٹ کا اظہار آپکے مندرجہ بالا خط سے بھی ہوتا ہے۔ نیز آپ کا یہ فعل بھی اسی اسپرٹ کا ایک مظہر ہے کہ آپنے یہ خط رجسٹری کے ذریعہ سے میرے نام ارسال فرمایا ہے۔ گویا خط بھیجنے سے پہلے ہی اپنے مخاطب کے متعلق آپ کافی بدگمان تھے، اور اس کے مقابلہ میں قانونی احتیاطیں برت لینا ضروری سمجھتے تھے تاکہ آیندہ اس پر گرفت کی جاسکے۔ اس ذہنیت اور اس جنگی روح کو دیکھ کر میں نہ چاہتا تھا کہ آپکے اس عنایت نامے کی طرف توجہ کروں کیونکہ میں پیشہ ور مناظر نہیں ہوں۔ زبانی اور قلمی کشتیوں کے دنگل آراستہ کرنا میرا شیوہ نہیں۔ جس مباحثہ کا مقصد احقاق وتحقیق نہ ہو اس میں ایک منٹ صرف کرنا بھی تضیع اوقات سمجھتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میرا ضمیر مجھے مجبور کر رہا ہے کہ آپ کی اصلاح خیال کے لیے کم ازکم ایک مرتبہ کوشش ضرور کی جائے۔

آپ اپنے عنایت نامے کی ابتدا میں فرماتے ہیں کہ حدیث ادبر الشیطان لہ ضراط کی شرح میں جو کچھ میں نے عرض کیا تھا وہ ناتسلی بخش ہے۔ اس عدم تسلی کی وجہ تو میں آپکے مفصل جواب کو دیکھ کر ہی سمجھ سکوں گا۔ لیکن اتنا آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ آپ کو تسلی بخشنا میرا یا کسی انسان کا کام نہیں ہے۔ دوسرا شخص جو کچھ کرسکتا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ تسلی حاصل کرنے میں آپ کی مدد کرے۔ باقی رہی تسلی، تو اس کا سرچشمہ خود آپکے اپنے نفس میں موجود ہے۔ اگر آپ تسلی حاصل کرنا ہی نہ چاہیں، اور اپنے دل کے کان اور دل کی آنکھیں ہر اس آواز اور ہر اس چیز کے لیے بند کرلیں جو آپکے پہلے سے جمے ہوئے خیالات کے خلاف ہو، تو کسی انسان میں یہ قدرت نہیں کہ آپ کو مطمئن کرسکے۔ ہم معمولی انسانوں کی تو کیا ہستی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ان لوگوں کو مطمئن نہ کرسکے جنھوں نے مطمئن نہ ہونا چاہا۔ لہذا سب سے پہلے اپنے نفس کی طرف توجہ فرمایئے۔ اگر وہ اطمینان اور تسلی حاصل کرنا چاہتا ہے تو کھلے دل سے اور تحقیق کی نیت سے بحث فرمایئے اور

اگر وہ اس متاع کا طالب ہی نہیں ہے تو اس کام میں اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع نہ کیجئے۔

اب میں آپ کے اصل سوال کی طرف آتا ہوں، اور اس پر کلام کرنے سے میرا مقصد آپ پر صرف اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ تعصب کی عینک چڑھا کر محض سرسری نظر سے کسی چیز کو دیکھنا اور ایک قطعی رائے قائم کر لینا کس قدر غلط طریقہ ہے، اور اس سے انسان کس قدر گمراہ ہو جاتا ہے۔ آپ کے ارشادات کا حاصل یہ ہے کہ:-

(۱) امام مالک اور امام بخاری وغیرہ حضرات جنھوں نے اس مضمون کی احادیث کو روایت کیا ہے، دراصل ان روایات کے واضع ہیں اور یہ حدیثیں انھوں نے خود گھڑ کر نبی اکرم کی طرف منسوب کر دی ہیں۔

(۲) ان روایات میں جس دھر کو برا کہنے سے روکا گیا ہے اس سے مراد زمانہ ہے یا نیچر ہے جس میں نظام شمسی، کواکب، کرہ ارض، اور عناصر سب آجاتے ہیں۔ پس ان احادیث کے وضع کرنے والے اور اس کو ماننے والے دراصل دہریئے اور نیچری تھے۔

(۳) یہ حدیث دہریوں کے اس اعتقاد کی تائید کرتی ہے جس کی تردید قرآن مجید نے کی ہے۔

ان تینوں بدگمانیوں کی حقیقت ترتیب وار ملاحظہ ہو:-

(۱) اس مضمون کی کم و بیش پندرہ سولہ روایتیں مختلف طریقوں سے امام مالک، امام احمد ابن حنبل امام بخاری، امام مسلم، اور امام ابوجعفر ابن جریر طبری نے نقل کی ہیں۔ ان تمام احادیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے والے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ اور اس بات پر جمہور اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ صحابہ سب کے سب عدول ہیں۔ ان میں سے کسی پر یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا باندھا ہوگا۔ حضرت ابوہریرہ سے جن لوگوں نے ان روایات کو لیا ہے ان میں محمد بن سیرین، سعید بن مسیب، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن اور اعرج جیسے لوگ ہیں۔ اس کے بعد ہر مرتبہ روایت میں راوی ثقہ مانے جاتے ہیں اور کئی طریقوں سے یہ روایتیں ائمہ مذکورین تک پہنچتی ہیں جن میں سے اکثر کے صحیح

ہونے پر اتفاق کیا گیا ہے، اور یہ قاعدہ ہے کہ اگر کسی ضعیف روایت کی تائید میں کوئی قوی روایت موجود ہو تو وہ ضعیف بھی قوی ہو جاتی ہے۔

ایک طرف اتنی شہادتیں ہیں۔ اور دوسری طرف آپ کا صرف یہ مختصر سا فیصلہ کہ تمام روایتیں جعلی ہیں کیوں؟ صرف اس لیے کہ جو مضمون ان روایات میں بیان ہوا ہے وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ روایات اور شہادتوں کو جانچنے کا یہ بالکل نیا طریقہ ایجاد ہوا ہے کہ جو روایت آپ کی سمجھ میں نہ آئے یا جس کا مضمون آپ کی رائے کے خلاف ہو، اسکو بلا تکلف غلط اور اس کے راوی کو بے تامل جھوٹا کہہ دیجیے۔ کیونکہ صداقت کے لیے لازم ہے کہ وہ آپ کی رائے اور سمجھ کے عین مطابق ہو۔ معلوم نہیں کہ یہ حق آپ نے صرف اپنے لیے محفوظ رکھا ہے یا ہر سامع کو فرداً فرداً یہی حق عطا فرماتے ہیں۔ اگر پہلی صورت ہے تو آپ اس کے مستحق ہیں کہ تمام دنیا کے واحد قاضی قرار پائیں۔ کیونکہ اور کوئی شخص اس کا اہل نہ ہوگا کہ کسی گواہ کی جرح یا تعدیل کر سکے۔ اور اگر دوسری صورت ہے تو شہادتوں اور روایتوں کو جانچنے اور ان کو صحیح یا غلط قرار دینے کے لیے دنیا میں کوئی متفق علیہ معیار نہ ہوگا بلکہ ہر شخص جس کو چاہے گا سچا اور جس کو چاہے گا جھوٹا کہہ دیگا، اور اسکی زد سے خود آپ بھی نہ بچ سکیں گے۔

آپ نے اپنے اس قاعدے کے مطابق جن لوگوں کو کذاب اور واضع حدیث، اور رسول اللہؐ پر بہتان گھڑنے والے اور دہری و نیچری قرار دیا ہے، وہ امت مسلمہ کے سب سے زیادہ نامور اور ممتاز بزرگ ہیں۔ سے ہیں اپنے تقویٰ، دینداری، صداقت، خدمت دین، اور علمی تحقیق و کاوش کے لحاظ سے ان کا درجہ اتنا بلند ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد مسلمانوں کی پوری تاریخ میں شاید ان سے زیادہ بلند پایہ شخصیتیں آپ کو نہ مل سکیں گی۔ یہ مسلمانوں کے وہ ہیرو ہیں جن پر وہ تمام دنیا کی قوموں کے مقابلے میں فخر کر سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے خلاف زبان کھولنے اور بدترین قسم کے کذب و افترا کا الزام لگانے اور اس سے بھی بڑھ کر کفر اور دہریت کا فتویٰ صادر کرنے سے پہلے آپ کو کافی غور و خوض اور بحث و تحقیق سے کام لینا چاہیے تھا، اور ذرا اس پہلو پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیے تھی کہ کہیں آپ خود تو غلطی پر نہیں ہیں۔ اگر آپ اپنے آپکو

غلطی سے بالکل مبرّا نہیں سمجھتے تو امام مالک، اور امام احمد ابن حنبل جیسے لوگوں پر اتنے بڑے الزامات عائد کرتے ہوئے آپ کو خدا سے ڈرنا چاہیئے تھا کہ اگر آپ خود غلطی پر ہوئے تو خدا کے ہاں اس گناہ کی کیسی سخت باز پرس ہوگی۔ کیا ایک ”داعی الی اللہ“ کے دل میں اللہ کا اتنا بھی خوف نہ ہونا چاہیئے؟

(۳) آپنے حدیثوں کے آدھے آدھے ٹکڑے نقل کرکے ان کو بالکل غلط معنی پہنائے ہیں۔ ذیل میں ان تمام حدیثوں کو نقل کیا جاتا ہے جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں۔ ان کو ترجمے کے ساتھ پڑھ کر بتائیے کہ ان سے دہریت کی تائید نکلتی ہے یا صریح اور شدید تردید۔

بخاری کتاب التفسیر، تفسیر سورۂ جاثیہ، اور کتاب التوحید میں ہے:-

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللہ عز وجل یؤذینی ابن آدم یسب الدھر وانا الدھر بیدی الامر اقلب اللیل والنھار

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے کہ ابن آدم مجھ کو اذیت پہنچاتا ہے کہ زمانے کو بُرا کہتا ہے۔ زمانہ تو میں ہوں۔ تمام معاملات میرے ہاتھ میں ہیں۔ میں ہی لیل و نہار کو گردش دیتا ہوں۔

طبری نے بھی حدیث دو طریقوں سے نقل کی ہے مسلم اور احمد ابن حنبل نے بھی اسکو لیا ہے۔ ”یؤذینی“ کی تشریح میں قرطبی نے لکھا ہے کہ انما ھذا من التوسع فی الکلام۔ والمراد ان من وقع ذلک منہ تعرض لسخط اللہ۔ واللہ منزہ عن ان یصل الیہ الاذی۔

بخاری کتاب الادب باب لاتسبوا الدھر میں ایک دوسری سند سے یہ روایت آئی ہے:-

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللہ یسب بنو آدم الدھر وانا الدھر بیدی اللیل والنھار۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ بنی آدم زمانے کو برا بھلا کہتے ہیں، حالانکہ زمانہ میں ہوں لیل و نہار میرے قبضۂ قدرت میں ہیں۔

طبری نے ایک دوسرے طریقے سے یہی حدیث نقل کی ہے، مسلم نے بھی تھوڑے سے لفظی تغیر کے ساتھ

اس کو نکالا ہے۔

مسند امام حنبل اور تفسیر ابن جریر طبری، میں مختلف طریقوں اور تھوڑے سے لفظی اختلاف کیساتھ یہ حدیث آئی ہے

لا یقولن احدکم یا خیبة الدھر فانی انا اللہ اقلب لیلہ ونھارہ واذا شئت قبضتھما۔ — تم میں سے کوئی ہائے زمانہ نہ کہے کیونکہ زمانہ تو میں خود ہوں اسکے لیل و نہار کو میں ہی گردش دیتا ہوں اور جب چاہونگا اسکو سمیٹ دونگا

امام احمد بن حنبل نے ایک دوسرے طریقے سے یہ حدیث نقل کی ہے :-

لا تسبوا الدھر فان اللہ قال انا الدھر الایام واللیالی لی اجددھا وابلیھا وآتی بملوک بعد ملوک۔ — زمانے کو گالیاں نہ دو۔ کیونکہ اللہ فرماتا ہے کہ زمانہ میں خود ہوں رات اور دن میرے ہی قبضہ قدرت میں ہیں انکو میں ہی نیا اور پرانا کرتا ہوں۔ بادشاہوں کے بعد بادشاہوں کو لاتا ہوں

مسلم اور طبرانی میں ہے :-

لا تسبوا الدھر فان اللہ ھو الدھر — زمانے کو برا نہ کہا کرو کیونکہ اللہ ہی زمانہ ہے۔

موطا امام مالک باب ما یکرہ من الکلام میں ہے :-

لا یقولن احدکم یا خیبة الدھر فان اللہ ھو الدھر۔ — تم میں سے کوئی ہائے زمانہ نہ کہے کیونکہ اللہ ہی زمانہ ہے۔

اب فرمائیے کہ دھریت اور نیچریت ان احادیث سے کہاں نکلتی ہے؟ ان کا مفہوم تو یہ ہے کہ تم پر جو مصائب ونوائب آتے ہیں ان کو تم اپنی جہالت سے زمانے کی طرف منسوب کرتے ہو۔ اور کہا کرتے ہو کہ زمانے نے ہم کو مٹا دیا۔ گردش لیل ونہار نے ہم کو تباہ کر ڈالا۔ حالانکہ تمام افعال کا فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہے لیل ونہار جن کی گردش کا نام زمانہ ہے، اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ لہذا تم جو زمانے کو گالیاں دیتے ہو تو دراصل وہ گالیاں خدا کی طرف راجع ہوتی ہیں، کیونکہ وہ زمانہ جس کو تم مصیبت اور راحت لانے والا سمجھتے ہو، وہ اللہ کے سوا اور کوئی نہیں ہے، اور وہ زمانہ جو گردش لیل ونہار سے عبارت ہے حقیقت میں کسی فعل پر بھی قادر نہیں

کیا یہی بات ہے جس کو آپ دھریت اور نیچریت سے تعبیر فرما رہے ہیں؟ کیا اسی سرمایۂ فہم و تدبر کے ساتھ جناب کو یہ جرأت ہوئی کہ اسلام کے جلیل القدر ائمہ پر حملہ آور ہوں؟

ذرا غور کیجئے تو معلوم ہو جائے گا کہ ان احادیث میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ضرور ادا ہوا ہوگا اور مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے ہوا ہوگا۔ کیونکہ مصیبت کے وقت زمانے کو کوسنا اور برا بھلا کہنا اب بھی عوام کی عادت ہے اور عہد رسالت میں اہل عرب کی بھی یہی عادت تھی چنانچہ خود قرآن مجید شہادت دیتا ہے کہ عرب کے جہلاء زمانے کو ہلاک اور فنا کرنے والا سمجھتے تھے پس تکلیفوں کے وقت عام دستور کے مطابق مسلمانوں کی زبان سے بھی زمانے کی شکایت ضرور نکل جاتی ہوگی، اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ان کو اس سے یقیناً منع فرماتے ہونگے۔ اس میں کونسی ایسی انوکھی بات ہے جو بالکل خلاف عقل اور بعید از امکان ہو اور اسکی بنا پر ان روایات کو غلط اور ان کے راویوں کو جھوٹا قرار دینا ضروری ہو جائے؟

(۳) قرآن مجید کی جو آیت آپ نے نقل کی ہے وہ ان احادیث کے خلاف نہیں بلکہ انکی مؤید ہے۔ اس آیت میں کفار عرب کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "ہماری جو کچھ بھی زندگی ہے اسی دنیا کی زندگی ہے۔ ہم مرتے اور جیتے ہیں اور زمانے کے سوا کوئی ہم کو ہلاک کرنے والا نہیں ہے"۔ اس قول کو نقل کرنے کے بعد اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ "ان کو اس کا کوئی علم نہیں ہے بلکہ یہ صرف ان کا گمان ہے"۔ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ "یعنی اے محمد! ان سے کہدو کہ تمہارا مارنے اور جلانے والا جس کو تم جہالت سے دھر کہتے ہو وہ اللہ ہی ہے۔ پھر وہی تم کو قیامت کے روز جمع کریگا"۔ اوپر احادیث میں جو کچھ بیان ہوا ہے کیا وہ یہی مضمون نہیں ہے؟

اب آپ ضد اور تعصب کو چھوڑ کر اپنے دل کی طرف رجوع کیجئے اور سوچئے کہ بغیر کسی غور و فکر اور بغیر کسی تحقیق کے آپنے اللہ کے ان محبوب بندوں پر جھوٹ اور دھریت کے جو الزامات عائد کئے ہیں وہ کس قدر غلط ہیں اور ان پر آپ کو اللہ کے ہاں کیسی سخت جوابدہی کرنی ہوگی میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو توبہ کی توفیق عطا فرمائے اور آئندہ کے لیے آپکے قلب اور زبان و قلم کو ایسی گمراہی سے محفوظ رکھے، اور آپ کو حقیقی معنوں میں داعی الی اللہ بنائے۔

مطبوعات

قرآن مجید ایک معجز نما کتاب | از مولوی محمد عبد البصیر صاحب حسب ملتقی آزاد سیوہاروی ضخامت ۸۰ صفحات قیمت ۸/ پتہ :- مینجر رسالہ پیشوا، دہلی

اس رسالے میں لائق مصنف نے قرآن مجید کے اعجاز پر سات جہتوں سے بحث کی ہے اور بدلائل ثابت کیا ہے کہ قرآن شریف ہر حیثیت سے ایک معجز نما کتاب ہے۔ جہات اعجاز، جن پر صاحب رسالہ نے کلام کیا ہے یہ ہیں :- قرآنی فصاحت و بلاغت قرآن کا ایک مضمون دوسرے مضمون سے مغلوب نہیں ہوتا قرآن کا بلیغانہ نظم و اسلوب خود اس کے معجز نما ہونے پر دال ہے قرآن مجید ہر فن میں غایت فصاحت و بلاغت پر ہے۔ قرآنی اعجاز۔ قرآنی پیشین گوئیاں۔ حفظ القرآن۔

ایوان | مرتبہ جناب مجنون گورکھپوری حجم ۸۰ صفحات، تقطیع کلاں۔ قیمت سالانہ للعہ پتہ ایوان اشاعت گورکھپور

رسالہ ایوان اردو کا مشہور ماہنامہ ہے۔ دو برس ملتوی رہکر جولائی ۳۴ء سے پھر نکلا ہے۔ ایوان نے اپنی گزشتہ زندگی میں بھی علم و ادب کی مفید خدمت انجام دی تھی، اس زندگی میں بھی اسی نقش قدم پر گامزن ہے۔ "داستان یوسف"، "دنیائے انسانیت کا امکانی مستقبل"، "موجودہ اقتصادی ہیجان"، بہت اچھے مضامین ہیں۔

ماہ تمام | اڈیٹر جناب محمد اسحق صاحب امرتسری حجم ۶۰ صفحات۔ قیمت سالانہ للعہ پتہ :- ۲/۱۶ بی، کنائی اسٹریٹ، کلکتہ

یہ مصور رسالہ کلکتہ سے اردو زبان کے درجۂ پست زبان کو بلند کرنے، نکلا ہے۔ اب تک چھ نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ مضامین کا بیشتر حصہ انگریزی زبان کے رسائل کے مضامین اور افسانوں کے ترجموں یا ملخصات پر مشتمل ہے۔ رسالہ بحیثیت مجموعی اچھا ہے۔

فہرست مضامین

ماہ شوال ۱۳۵۳ھ جلد ۵ عدد ۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

دوسری صدی ہجری کی ابتداء کا واقعہ ہے کہ سجستان و رخج کے فرمانروا نے جس کا خاندانی لقب رتبیل تھا بنی امیہ کے عمال کو خراج دینا بند کر دیا۔ پیہم چڑھائیاں کی گئیں مگر وہ مطیع نہ ہوا۔ یزید بن عبد الملک کے عہد میں جب اس کے پاس طلب خراج کے لئے سفارت بھیجی گئی تو اس نے مسلمانوں کے سفراء سے دریافت کیا کہ:-

"وہ لوگ کہاں گئے جو پہلے آیا کرتے تھے؟ ان کے پیٹ فاقہ زدوں کی طرح پچکے ہوئے ہوتے تھے۔ پیشانیوں پر پاؤ گٹے پڑے رہتے تھے اور کھجور کی چھال کی چپلیں پہنا کرتے تھے"

کہا گیا کہ وہ لوگ تو گذر گئے۔ رتبیل نے کہا:-

"اگرچہ تمہاری صورتیں ان سے زیادہ شان دار ہیں۔ مگر وہ تم سے زیادہ عہد کے پابند تھے اور تم سے زیادہ طاقت ور تھے۔"

مورخ لکھتا ہے کہ یہ کہکر رتبیل نے خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا اور تقریباً نصف صدی تک وہ اسلامی حکومت سے آزاد رہا۔

یہ اس عہد کا واقعہ ہے جب تابعین و تبع تابعین کثرت سے موجود تھے۔ ائمۂ مجتہدین کا زمانہ تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کو صرف ایک صدی گزری تھی۔ مسلمان ایک زندہ اور طاقت ور قوم کی حیثیت سے دنیا پر چھائے جا رہے تھے۔ ایران، روم، مصر، افریقہ، اسپین وغیرہ ممالک کے وارث ہو چکے تھے۔ اور

سازوسامان، شان وشوکت، اور دولت وثروت کے اعتبار سے اس وقت دنیا کی کوئی قوم ان کی ہم پلہ نہ تھی۔ یہ سب کچھ تھا۔ دلوں میں ایمان بھی تھا۔ احکام شریعت کی پابندی اب سے بہت زیادہ تھی۔ سمع وطاعت کا انتظام قایم تھا۔ پوری قوم میں ایک زبردست ڈسپلن پایا جاتا تھا۔ مگر پھر بھی جو لوگ عہد صحابہ کے فاقہ کش، خستہ حال صحرانشینوں سے زور آزمائی کر چکے تھے۔ انہوں نے ان پر سروسامان والوں اور اُن بے سروسامانوں کے درمیان زمین وآسمان کا فرق محسوس کیا۔ کس چیز کا فرق تھا؟ فلسفۂ تاریخ والے اس کو محض بداوت اور حضریت کے فرق پر محمول کرینگے وہ کہیں گے کہ پرانے بادیہ نشین زیادہ جفاکش تھے اور بعد کے لوگوں کو دولت اور تمدن نے عیش پسند بنا دیا تھا۔ مگر میں کہونگا کہ یہ فرق دراصل ایمان، خلوص نیت، اخلاق اور اطاعتِ خدا ورسول کا فرق تھا۔ مسلمانوں کی اصلی قوت یہی چیزیں تھیں۔ ان کی قوت نہ کثرتِ تعداد پر مبنی تھی۔ نہ اسباب وآلات کی افراط پر۔ نہ مال ودولت کی فراوانی پر۔ نہ علوم وصناعات کی مہارت پر۔ نہ تمدن وحضارت کے لوازم پر۔ وہ صرف ایمان وعمل صالح کے بل پر ابھرے تھے۔ اسی چیز نے ان کو دنیا میں سربلند کیا تھا۔ اسی نے قوموں کے دلوں میں ان کی دھاک اور ساکھ بٹھائی تھی۔ جب قوت وعزت کا یہ سرمایہ تھا تو وہ قلت تعداد اور بے سروسامانی کے باوجود طاقتور اور معزز تھے۔ اور جب یہ سرمایہ ان کے پاس کم ہوتا گیا تو وہ کثرت تعداد اور ساز وسامان کی فراوانی کے باوجود کمزور اور بے وقعت ہوتے چلے گئے۔

رتبیل نے ایک دشمن کی حیثیت سے جو کچھ کہا وہ دوستوں اور ناصحوں کے ہزار وعظوں سے زیادہ سبق آموز ہے۔ اس نے دراصل یہ حقیقت بیان کی تھی کہ کسی قوم کی اصلی طاقت اس کی آراستہ فوجیں اس کے آلات جنگ، اس کے خوش خور وخوش پوش سپاہی، اور اس کے وسیع ذرائع ووسائل نہیں ہیں، بلکہ اس کے پاکیزہ اخلاق، اس کی مضبوط سیرت، اس کے صحیح معاملات، اور اس کے بلند تخیلات ہیں،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

دوسری صدی ہجری کی ابتداء کا واقعہ ہے کہ سجستان و رُخّج کے فرمانروا نے جس کا خاندانی لقب رُتبیل تھا بنی اُمیہ کے عمال کو خراج دینا بند کردیا۔ پیہم چڑھائیاں کی گئیں مگر وہ مطیع نہ ہوا۔ یزید بن عبدالملک کے عہد میں جب اس کے پاس طلب خراج کے لئے سفارت بھیجی گئی تو اس نے مسلمانوں کے سفراء سے دریافت کیا کہ :۔

"وہ لوگ کہاں گئے جو پہلے آیا کرتے تھے؟ ان کے پیٹ فاقہ زدوں کی طرح پچکے ہوئے ہوتے تھے۔ پیشانیوں پر سیاہ گٹے پڑے رہتے تھے اور کھجور کی چھال کی چپلیں پہنا کرتے تھے"

کہا گیا کہ وہ لوگ تو گذر گئے۔ رُتبیل نے کہا :۔

"اگرچہ تمہاری صورتیں ان سے زیادہ شاندار ہیں۔ مگر وہ تم سے زیادہ عہد کے پابند تھے اور تم سے زیادہ طاقتور تھے۔"

مورخ لکھتا ہے کہ یہ کہکر رُتبیل نے خراج ادا کرنے سے انکار کردیا اور تقریباً نصف صدی تک وہ اسلامی حکومت سے آزاد رہا۔

یہ اُس عہد کا واقعہ ہے جب تابعین و تبع تابعین کثرت سے موجود تھے۔ ائمہ مجتہدین کا زمانہ تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کو صرف ایک صدی گزری تھی۔ مسلمان ایک زندہ اور طاقتور قوم کی حیثیت سے دنیا پر چھائے جارہے تھے۔ ایران، روم، مصر، افریقہ، اسپین وغیرہ ممالک کے وارث ہو چکے تھے۔ اور

ساز و سامان، شان و شوکت، اور دولت و ثروت کے اعتبار سے اس وقت دنیا کی کوئی قوم ان کی ہم پلہ نہ تھی۔ یہ سب کچھ تھا۔ دلوں میں ایمان بھی تھا۔ احکام شریعت کی پابندی اب سے بہت زیادہ تھی۔ سمع و طاعت کا نظام قایم تھا۔ پوری قوم میں ایک زبردست ڈسپلن پایا جاتا تھا۔ مگر پھر بھی جو لوگ عہد صحابہ کے فاقہ کش، خستہ حال صحرانشینوں سے زور آزمائی کر چکے تھے۔ انہوں نے ان سروسامان والوں اور اُن بے سروسامانوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق محسوس کیا۔ یہ کس چیز کا فرق تھا؟ فلسفۂ تاریخ والے اس کو محض بداوت اور حضریت کے فرق پر محمول کرینگے وہ کہیں گے کہ پرانے بادیہ نشین زیادہ جفاکش تھے اور بعد کے لوگوں کو دولت اور تمدن نے عیش پسند بنا دیا تھا۔ مگر میں کہونگا کہ یہ فرق دراصل ایمان، خلوص نیت، اخلاق اور اطاعتِ خدا و رسول کا فرق تھا۔ مسلمانوں کی اصلی قوت یہی چیزیں تھیں۔ ان کی قوت نہ کثرتِ تعداد پر مبنی تھی۔ نہ اسباب و آلات کی افراط پر۔ نہ مال و دولت کی فراوانی پر۔ نہ علوم و صناعات کی مہارت پر۔ نہ تمدن و حضارت کے لوازم پر۔ وہ صرف ایمان و عمل صالح کے بل پر ابھرے تھے۔ اسی چیز نے ان کو دنیا میں سربلند کیا تھا، اسی نے قوموں کے دلوں میں ان کی دھاک اور ساکھ بٹھائی تھی۔ جب قوت و عزت کا یہ سرمایہ تھا تو وہ قلت تعداد اور بے سروسامانی کے باوجود طاقتور اور معزز تھے۔ اور جب یہ سرمایہ ان کے پاس کم ہوتا گیا تو وہ کثرت تعداد اور ساز و سامان کی فراوانی کے باوجود کمزور اور بے وقعت ہوتے چلے گئے۔

رتبیل نے ایک دشمن کی حیثیت سے جو کچھ کہا وہ دوستوں اور ناصحوں کے ہزار وعظوں سے زیادہ سبق آموز ہے۔ اس نے دراصل یہ حقیقت بیان کی تھی کہ کسی قوم کی اصلی طاقت اس کی آراستہ فوجیں، اُس کے آلات جنگ، اس کے خوش خور و خوش پوش سپاہی، اور اس کے وسیع ذرائع و وسائل نہیں ہیں، بلکہ اس کے پاکیزہ اخلاق، اس کی مضبوط سیرت، اس کے صحیح معاملات، اور اس کے بلند تخیلات ہیں،

یہ طاقت وہ روحانی طاقت ہے جو مادّی وسائل کے بغیر دنیا میں اپنا سکہ چلا دیتی ہے۔ خاک نشینوں کو تخت نشینوں پر غالب کر دیتی ہے۔ صرف زمینوں کا وارث ہی نہیں بناتی بلکہ دلوں کا مالک بھی بنا دیتی ہے۔ اس طاقت کے ساتھ کھجور کی چھلیاں پہننے والے، سوکھی ہڈیوں والے، بے رونق چہروں والے، چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی تلواریں رکھنے والے دنیا پر وہ رعب، وہ سطوت و جبروت، وہ قدر و منزلت، وہ اعتبار و اقتدار جما دیتے ہیں جو اس طاقت کے بغیر شاندار لباس پہننے والے، بڑے ڈیل ڈول والے، بارونق چہروں والے، اونچی بارگاہوں والے، بڑی بڑی منجنیقیں اور ہولناک دبابے رکھنے والے نہیں جما سکتے۔ اس روحانی طاقت کی فراوانی مادّی وسائل کے فقدان کی تلافی کر دیتی ہے۔ مگر مادّی وسائل کی فراوانی اس طاقت کے فقدان کی تلافی کبھی نہیں کر سکتی۔ اس طاقت کے بغیر محض مادّی وسائل کے ساتھ اگر غلبہ نصیب ہو بھی گیا تو ناقص اور عارضی ہوگا، کامل اور پائدار نہ ہوگا۔ دل کبھی مسخر نہ ہونگے۔ صرف گردنیں جھک جائینگی اور وہ بھی اکڑنے کے پہلے موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے مستعد رہینگی۔

کسی عمارت کا استحکام اس کے رنگ و روغن، نقش و نگار، زینت و آرائش صحن و چمن اور ظاہری خوش نمائی سے نہیں ہوتا۔ نہ مکینوں کی کثرت، ساز و سامان کی افراط اور اسباب و آلات کی فراوانی اس کو مضبوط بناتی ہے۔ اگر اس کی بنیادیں کمزور ہوں، دیواریں کھوکھلی ہوں، ستونوں کو گھن لگ جائے، کڑیاں اور تختے بوسیدہ ہو جائیں تو اس کو گرنے سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی خواہ وہ مکینوں سے خوب معمور ہو اور اس میں کروروں روپے کا مال و اسباب بھرا پڑا ہو، اور اس کی سجاوٹ نظروں کو لبھاتی اور دلوں کو موہ لیتی ہو۔ تم صرف ظاہر کو دیکھتے ہو۔ تمہاری نظریں مناظر پر اٹک کر رہ جاتی ہیں۔ مگر حوادث زمانہ کا معاملہ نمائشی مظاہر سے نہیں بلکہ اندرونی حقائق سے پیش آتا ہے۔ وہ عمارت کی بنیادوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ دیواروں کی پختگی کا امتحان لیتے ہیں۔ ستونوں کی استواری کو جانچتے ہیں۔ اگر یہ چیزیں مضبوط اور

مستحکم ہوں تو زمانے کے حوادث ایسی عمارت سے ٹکرا کر پلٹ جائینگے اور وہ ان پر غالب آجائیگی خواہ وہ زینت و آرائش سے یکسر محروم ہو۔ ورنہ حوادث کی ٹکریں آخر کار اس کو پاش پاش کرکے رہنگی اور وہ اپنے ساتھ اپنے مکینوں اور اپنے اسباب زینت کو بھی لے بیٹھے گی۔

ٹھیک یہی حال حیات قومی کا بھی ہے۔ ایک قوم کو جو چیز زندہ اور طاقت ور اور سربلند بناتی ہے وہ اس کے مکان، اس کے لباس، اس کی سواریاں، اس کے اسباب عیش، اس کے فنون لطیفہ، اس کے کارخانے، اس کے کالج اور اس کے آلات نہیں ہیں، بلکہ وہ اصول ہیں جن پر اس کی تہذیب قایم ہوتی ہے، اور پھر ان اصولوں کا دلوں میں راسخ ہونا اور اعمال پر حکمراں بن جانا ہے۔ یہ تین چیزیں یعنی اصول کی صحت، ان پر پختہ ایمان اور عملی زندگی پر اُن کی کامل فرمانروائی، حیات قومی میں وہی حیثیت رکھتی ہیں جو ایک عمارت میں اس کی مستحکم بنیادوں، اس کی پختہ دیواروں اور اس کے مضبوط ستونوں کی ہے۔ جس قوم میں یہ تینوں چیزیں بدرجۂ اتم موجود ہوں وہ دنیا پر غالب ہوکر رہیگی، اس کا کلمہ بلند ہوگا، خدا کی زمین میں اس کا سکہ چلے گا، دلوں میں اس کی دھاک بیٹھے گی، گردنیں اس کے حکم کے آگے جھک جائیںگی اور عزتیں اس کی عزت ہو گی۔ خواہ وہ جھونپڑیوں میں رہتی ہو، پھٹے پُرانے کپڑے پہنتی ہو، فاقوں سے اس کے پیٹ پچکے ہوے ہوں، اس کے ہاں ایک بھی کالج نہ ہو، اس کی بستیوں میں ایک بھی دھواں اُڑانے والی چمنی نظر نہ آے اور علوم وصناعات میں وہ بالکل صفر ہو۔ تم جن چیزوں کو سامان ترقی سمجھ رہے ہو وہ محض عمارت کے نقش ونگار ہیں۔ اس کے قوایم و ارکان نہیں ہیں۔ کھوکھلی دیواروں پر اگر تم سونے کے پترے بھی چڑھادوگے تو وہ ان کو گرنے سے نہ بچا سکینگے۔

یہی بات ہے جس کو قرآن مجید بار بار بیان کرتا ہے۔

وہ اسلام کے اصولوں کے متعلق کہتا ہے کہ وہ اس اٹل اور غیر متغیر فطرت کے مطابق

ہیں جس پر خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اس لیے جو دین ان اصولوں پر قایم کیا گیا ہے وہ دین قیم ہے یعنی ایسا دین جو معاش و معاد کے تمام معاملات کو ٹھیک ٹھیک طریقوں پر قایم کر دینے والا ہے۔ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۳۰:۴)۔

پھر وہ کہتا ہے کہ اس دین پر تم پوری مضبوطی کے ساتھ جم جاؤ، اس پر ایمان لاؤ اور اس کے مطابق عمل کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا میں تم ہی سربلند ہوگے، تم ہی کو زمین کا وارث بنایا جائیگا، تم ہی خلعت خلافت سے سرفراز ہوگے۔ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (۲۱:۷) وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (۳:۱۴) وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (۲۴:۷) وَمَن يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ (۵:۸)۔

بخلاف اس کے جو لوگ بظاہر دین کے دائرے میں داخل ہیں مگر دین نہ تو اُن کے دلوں میں بیٹھا ہے اور نہ اُن کی زندگی کا قانون بنا ہے۔ ان کے ظاہر تو بہت شاندار ہیں۔ وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ۔ اور ان کی باتیں بھی بہت مزے دار ہیں۔ وَإِن يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ مگر حقیقت میں وہ لکڑی کے کندے ہیں جن میں جان نہیں كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ وہ خدا سے زیادہ انسانوں سے ڈرتے ہیں۔ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً ان کے اعمال سراب کی طرح ہیں کہ دیکھنے میں پانی نظر آئیں مگر حقیقت میں کچھ نہیں۔ أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا ایسے لوگوں کو اجتماعی قوت کبھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ان کے دل آپس میں پھٹے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ خلوص نیت کے ساتھ کسی کام میں اشتراک عمل نہیں کر سکتے۔ بَأْسُهُم بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ ان کو وہ قوت ہرگز ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی جو صرف

مومنین صالحین کا حصہ ہے۔ لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قُرًى مُحَصَّنَةٍ أَوْ مِنْ وَرَاءِ جُدُرٍ۔ یہ ظالم ہیں جن کو دنیا کی امامت کا منصب کبھی نہ ملے گا۔ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ان کے لئے بجز اس کے اور کوئی انجام نہیں کہ دنیا میں بھی ذلت وخواری اور آخرت میں بھی عذاب وعقاب۔ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔

آپ تعجب کرینگے کہ قرآن نے مسلمانوں کی ترقی اور ان کے ایک حکمران قوم بننے اور سب پر غالب آجانے کا ذریعہ صرف ایمان وعمل صالح کو قرار دیا، اور کہیں یہ نہیں کہا کہ تم یونیورسیٹیاں بناؤ، کالج کھولو، کارخانے قایم کرو، جہاز بناؤ، کمپنیاں قایم کرو، بنک کھولو، سائنس کے آلات ایجاد کرو، اور لباس، معاشرت، انداز واطوار میں ترقی یافتہ قوموں کی نقل کرو۔ نیز اس نے تنزل وانحطاط اور دنیا وآخرت کی ذلت ورسوائی کا واحد سبب نفاق کو ٹھیرایا نہ کہ اُن اسباب کے فقدان کو جنہیں آج کل کی دنیا اسباب ترقی سمجھتی ہے

لیکن اگر آپ قرآن کی اسپرٹ کو سمجھ لیں تو آپ کا یہ تعجب خود رفع ہو جائیگا۔ سب سے پہلی بات جس کا سمجھنا ضروری ہے، یہ ہے کہ "مسلمان" جس شئے کا نام ہے اس کا قوام بجز "اسلام" کے اور کوئی چیز نہیں ہے۔ مسلم ہونے کی حیثیت سے اس کی حقیقت صرف اسلام سے متحقق ہوتی ہے۔ اگر وہ اس پیغام پر ایمان رکھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اور اُن قوانین کا اتباع کرے جن کو آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ سے نازل کیا گیا ہے، تو اس کا اسلام متحقق ہو جائیگا خواہ ان چیزوں میں سے کوئی چیز اس کے ساتھ شامل نہ ہو جو اسلام کے ماسوا ہیں۔ بخلاف اس کے اگر وہ ان تمام زیوروں سے آراستہ ہو جو زینت حیات دنیا کے قبیل سے ہیں، مگر ایمان اس کے دل میں نہ ہو اور قوانین اسلامی کے اتباع سے اس کی زندگی خالی، تو وہ گریجویٹ ہو سکتا ہے، ڈاکٹر ہو سکتا ہے، کارخانہ دار ہو سکتا ہے، بینکر ہو سکتا ہے، جنرل یا امیر البحر ہو سکتا ہے، غرض سب کچھ ہو سکتا ہے، مگر مسلمان نہیں ہو سکتا۔

پس کوئی ترقی کسی مسلمان شخص یا قوم کی ترقی نہ ہوگی جب تک کہ سب چیزوں سے پہلے اُس شخص یا قوم میں حقیقت اسلامی متحقق نہ ہو جائے۔ اس کے بغیر وہ ترقی خواہ وہ کیسی ہی ترقی ہو، مسلمان کی ترقی نہ ہوگی اور ایسی ترقی ظاہر ہے کہ اسلام کا نصب العین نہیں ہو سکتی۔

پھر ایک بات تو یہ ہے کہ کوئی قوم سرے سے مسلمان نہ ہو، اور اس کے افکار و اخلاق اور نظام اجتماعی کی اساس اسلام کے سوا کسی اور چیز پر ہو۔ ایسی قوم کے لیے تو بلاشبہ یہ ممکن ہے کہ وہ ان اخلاقی سیاسی، معاشی اور عمرانی اصولوں پر کھڑی ہو سکے جو اسلام سے مختلف ہیں اور اس ترقی کے منتہا کو پہنچ جائے جس کو وہ اپنے نقطۂ نظر سے ترقی سمجھتی ہے۔ لیکن یہ بالکل ایک امر دیگر ہے کہ کسی قوم کے افکار، اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت، اور سیاست کی بنیاد اسلام پر ہو، اور اسلام ہی میں وہ عقیدے اور عمل دونوں کے لحاظ سے ضعیف ہو۔ ایسی قوم مادی ترقی کے وسائل خواہ کتنی ہی کثرت اور فراوانی کے ساتھ مہیا کرلے، اس کا ایک مضبوط اور طاقتور قوم کی حیثیت سے اٹھنا اور دنیا میں سربلند ہونا قطعاً غیر ممکن ہے۔ کیونکہ اس کی قومیت اور اس کے اخلاق اور تہذیب کی اساس جس چیز پر ہے، وہی کمزور ہے، اور اساس کی کمزوری ایسی کمزوری ہے جس کی تلافی محض اوپری زینت کے سامان کبھی نہیں کر سکتے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ علوم و فنون اور مادی ترقی کے وسائل کی جائز اہمیت سے انکار ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ مسلمان قوم کے لیے یہ تمام چیزیں ثانوی درجہ میں ہیں۔ اساس کا استحکام ان سب پر مقدم ہے۔ وہ جب مستحکم ہو جائے تو مادی ترقی کے وہ تمام وسائل اختیار کیے جا سکتے ہیں جو اس بنیاد کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں۔ لیکن اگر وہ مضمحل ہو، دلوں میں اس کی جڑیں کمزور ہوں، اور زندگی پر اس کی گرفت ڈھیلی ہو جائے تو انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے قوم کے اخلاق کا فاسد ہونا، سیرت کا بگڑ جانا، معاملات کا خراب ہو جانا، نظام اجتماعی کی بندشوں کا سست ہو جانا، اور قوتوں کا پراگندہ ہو جانا ناگزیر ہے، اور اس کا لازمی نتیجہ

یہ ہے کہ قوم کی طاقت کمزور ہو جائے اور بین الملّی قوتوں کے ترازو میں اس کا پلڑا روز بروز ہلکا ہوتا چلا جائے یہاں تک کہ دوسری قومیں اس پر غالب آجائیں۔

اب سے بڑھ کر ایک اور بات بھی ہے۔ قرآن حکیم نہایت وثوق کے ساتھ کہتا ہے کہ "تم ہی سربلند ہوگے اگر تم مومن ہو"۔ اور "اللہ کی پارٹی والے ہی غالب ہونگے"۔ اور "جو لوگ ایمان و عمل صالح سے آراستہ ہونگے ان کو زمین کی خلافت ضرور ملے گی"۔ اس وثوق کی بنیاد کیا ہے؟ کس بنا پر یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ دوسری قومیں خواہ کیسے ہی مادّی وسائل کی مالک ہوں ان پر مسلمان صرف ایمان اور عمل صالح کے اسلحہ سے غالب آجائینگے؟

اس عقدے کو خود قرآن حل کرتا ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَن يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ وَإِن يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنقِذُوهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ۔ مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ۔ (۲۲ : ۱۰)

لوگو ایک مثال بیان کیجاتی ہے۔ اس کو غور سے سنو! خدا کو چھوڑ کر تم جن چیزوں کو پکارتے ہو وہ ایک مکھی تک کو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہیں اگرچہ وہ سب اس کام کے لئے ملکر زور لگائیں اور اگر ایک مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو اس سے وہ چیز چھڑا لینے کی قدرت بھی ان میں نہیں۔ مطلوب بھی ضعیف اور اس کا طالب بھی ضعیف۔ ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ کی جیسی کرنی چاہیے تھی حالانکہ درحقیقت اللہ ہی قدرت اور عزت والا ہے۔

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ (۲۹ : ۴)

جن لوگوں نے خدا کے سوا دوسروں کو کارساز ٹھیرایا انکی مثال ایسی ہے جیسے مکڑی کہ وہ گھر بناتی ہے حالانکہ سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مادی طاقتوں پر اعتماد کرتے ہیں ان کا اعتماد دراصل ایسی چیزوں پر ہے جو بذاتِ خود کسی قسم کی بھی قوت و قدرت نہیں رکھتیں۔ ایسے بے زوروں پر اعتماد کرنے کا قدرتی نتیجہ ہے کہ وہ خود بھی بے زور ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے نزدیک جو مستحکم قلعے بناتے ہیں وہ مکڑی کے جالے کی طرح کمزور ہیں۔ ان میں کبھی یہ طاقت ہو ہی نہیں سکتی کہ ان لوگوں کے مقابلہ میں سر اٹھا سکیں جن کا اعتماد حقیقی قدرت و عزت رکھنے والے خدا پر ہے۔

وَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا (۲: ۲۴)

جو طاغوت کو چھوڑ کر اللہ پر ایمان لے آیا اس نے مضبوط رسی تھام لی جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں ہے۔

قرآن دعوے کے ساتھ کہتا ہے کہ جب کبھی اہل ایمان اور اہل کفر کا مقابلہ ہوگا تو غلبہ اہل ایمان ہی کو حاصل ہوگا۔

وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوَلَّوُا الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلُ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا۔ (۴۸: ۳)

اور اگر وہ جنہوں نے کفر کیا ہے تم سے جنگ کرینگے تو ضرور پیٹھ پھیر جائینگے پھر کوئی یار و مددگار نہ پائینگے۔ یہ اللہ کی سنت ہے جو پہلے سے چلی آرہی ہے اور تم کبھی اللہ کی سنت میں تغیر نہ پاؤگے۔

سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا (۳: ۱۶)

ہم کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دینگے کیونکہ انہوں نے خدا کے ساتھ اُن چیزوں کو شریک کر لیا ہے جن کو خدا نے کوئی تمکن نہیں بخشا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص خدا کی طرف سے لڑتا ہے اس کے ساتھ خدائی طاقت ہوتی ہے، اور جس کے ساتھ خدائی طاقت ہو اس کے مقابلے میں کسی کا زور چل ہی نہیں سکتا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ (۴۷:۱) — یہ اس لئے کہ ایمانداروں کا مددگار تو اللہ ہے اور کافروں کا مددگار کوئی نہیں۔

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸:۲) — جب تو نے پھینکا تو وہ تو نے نہیں پھینکا بلکہ خدا نے پھینکا۔

یہ تو مومن صالح کی سطوت کا حال ہے۔ دوسری طرف یہی خدا کا قانون ہے کہ جو شخص ایماندار ہوتا ہے جس کی سیرت پاکیزہ ہوتی ہے، جس کے اعمال نفسانیت کی آلودگیوں سے پاک ہوتے ہیں، اور جو ہوائے نفس اور اغراض نفسانی کے بجائے خدا کے مقرر کیے ہوے قانون کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرتا ہے، اس کی محبت اور عزت دلوں میں بیٹھ جاتی ہے، دل آپ ہی آپ اسکی طرف کھنچنے لگتے ہیں، نگاہیں اس کی طرف احترام سے اٹھتی ہیں، معاملات میں اس پر اعتماد کیا جاتا ہے، دوست تو دوست دشمن تک اس کو امین و صادق سمجھتے ہیں اور اس کے عدل، اس کی عفت، اور اس کی وفا شعاری پر بھروسہ کرتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (۱۹:۶)۔ — جو لوگ ایمان لے آئے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے یقیناً اللہ تعالیٰ دلوں میں محبت ڈال دیگا۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ (۱۴:۴) — ایمان لانے والوں کو اللہ قول ثابت کے ساتھ جما دیتا ہے، دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (۱۶:۱۳) — جو کوئی نیک عمل کریگا خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور اس کے ساتھ وہ مومن بھی ہو تو ہم ضرور اس کو بہترین زندگی بسر کرائینگے اور (ان) بہترین اعمال کا اجر دینگے جو وہ کرتے رہے ہیں۔

مگر یہ سب کسی چیز کے نتائج ہیں؟ محض زبان سے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہنے کے نہیں مسلمانوں کے سے نام رکھ لینے اور معاشرت کے چند مخصوص اطوار اختیار کرنے اور چند گنی چنی رسمیات ادا کر لینے کے نہیں۔ قرآن حکیم ان نتائج کے ظہور کے لیے ایمان اور عمل صالح کی شرط لگاتا ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کی حقیقت تمہارے قلب و روح پر اس قدر جاگزیں ہو جائے کہ تمہارے تخیلات و افکار اور اخلاق و معاملات سب پر اسی کا غلبہ ہو، تمہاری ساری زندگی اسی کلمہ طیبہ کے معنوی قالب میں ڈھل جائے، تمہارے ذہن میں کوئی ایسا خیال راہ نہ پا سکے جو اس کلمہ کے معنی سے مختلف ہو اور تم سے کوئی ایسا عمل سرزد نہ ہو جو اس کلمہ کے مقتضیٰ کے خلاف ہو۔ لا الٰہ الا اللہ کو زبان سے ادا کرنے اور قلب سے اس کی تصدیق کرنے کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ تمہاری زندگی میں اس کے ساتھ ہی ایک انقلاب برپا ہو جائے۔ تمہاری رگ رگ میں تقویٰ کی روح سرایت کر جائے۔ پھر اللہ کے سوا تمہاری گردن کسی طاقت کے آگے نہ جھکے، اللہ کے سوا تمہارا ہاتھ کسی کے آگے نہ پھیلے، اللہ کے سوا کسی کا خوف تمہارے دل میں نہ رہے، اللہ کے سوا کسی کو راضی کرنے کی خواہش تمہارے قلب میں باقی نہ رہے، تمہاری محبت اور تمہارا بغض اللہ کے سوا کسی اور کے لیے نہ ہو، اللہ کے قانون کے سوا تمہاری زندگی پر کسی اور کا قانون نافذ نہ ہو، تم اپنے نفس اور اس کی ساری خواہشوں اور اس کے تمام مرغوبات و محبوبات کو اللہ کی خوشنودی پر قربان کر دینے کے لیے ہر وقت طیار رہو، اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مقابلہ میں تمہارے پاس سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کے سوا کوئی اور قول اور فعل نہ ہو۔ جب ایسا ہو گا تو تمہاری قوت صرف تمہارے اپنے نفس اور جسم کی قوت نہ ہو گی بلکہ اس احکم الحاکمین کی قوت ہو گی جس کے آگے زمین و آسمان کی ہر چیز طوعاً و کرہاً سربسجود ہے۔ اور تمہاری ذات اس نور السمٰوات والارض کے جلووں سے منور ہو جائیگی جو تمام عالم کا حقیقی محبوب و معشوق ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد میں یہی چیز مسلمانوں کو حاصل تھی۔ پھر اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔ اس زمانہ میں جس نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہا اسکی کایا پلٹ ہوگئی۔ مس خام سے یکایک وہ کندن بن گیا۔ اسکی ذات میں وہ کشش پیدا ہوئی کہ دل اسکی طرف کھنچنے لگے۔ اس پر جسکی نظر پڑتی وہ محسوس کرتا کہ گویا تقویٰ اور پاکیزگی اور صداقت کو مجسم دیکھ رہا ہے۔ وہ ان پڑھ، مفلس، فاقہ کش، پشمینہ پوش، اور بوریا نشین ہوتا مگر پھر بھی اسکی ہیبت دلوں میں ایسی بیٹھتی کہ بڑے بڑے شان وشوکت والے فرمانرواؤں کو نصیب نہ تھی۔ ایک ایک مسلمان کا وجود گویا ایک چراغ تھا کہ جدھر وہ جاتا اسکی روشنی اطراف واکناف میں پھیل جاتی اور اس ایک چراغ سے سینکڑوں ہزاروں چراغ جل جاتے پھر جو اس کی روشنی قبول نہ کرتا اور اس سے ٹکرانے کی جرأت کرتا تو اس کو جلانے اور فنا کردینے کی قوت بھی اس میں موجود تھی۔

ایسی ہی قوت ایمانی اور طاقت اور سیرت رکھنے والے مسلمان تھے کہ جب وہ ساڑھے تین سو سے زیادہ نہ تھے تو انہوں نے تمام عرب کو مقابلہ کا چیلنج دیدیا، اور جب وہ چند لاکھ کی تعداد کو پہنچے تو ساری دنیا کو مسخر کرنے کے عزم سے اٹھ کھڑے ہوئے اور جو قوت انکے مقابلے پر آئی پاش پاش ہوگئی۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے، مسلمان کی اصلی طاقت یہی ایمان اور سیرت صالحہ کی طاقت ہے، جو صرف ایک لا الٰہ الا اللہ کی حقیقت دل میں بیٹھ جانے سے حاصل ہوتی ہے لیکن اگر یہ حقیقت دل میں جاگزیں نہ ہو محض زبان پہ الفاظ جاری ہوں، مگر ذہنیت اور عملی زندگی میں کوئی انقلاب برپا نہ ہو لا الٰہ الا اللہ کہنے کے بعد بھی انسان وہی کا وہی رہے جو اس سے پہلے تھا، اور اس میں اور لا الٰہ الا اللہ کا انکار کرنے والوں میں کوئی فرق نہ ہو، وہ بھی انہی کی طرح غیر اللہ کے آگے گردن جھکائے، اور ہاتھ پھیلائے، انہی کی طرح غیر خدا سے ڈرے اور غیر خدا کی رضا چاہے اور غیر خدا کی محبت میں گرفتار ہو، انہیں کی طرح ہوائے نفس کا بندہ ہو، اور قانون الٰہی کو چھوڑ کر انسانی قوانین یا اپنے نفس کی خواہشات کا اتباع کرے، اسکے خیالات اور ارادوں اور نیتوں میں بھی وہی گندگی ہو جو ایک

غیر مومن کے خیالات ارادات اور نیات میں ہوسکتی ہے اور اس کے اقوال وافعال ومعاملات بھی ویسے ہی ہوں جیسے ایک غیر مومن کے ہوسکتے ہیں تو پھر مسلمان کو نامسلمان پر فوقیت کس بنا پر ہو؟ روح ایمان اور روح تقویٰ نہ ہونے کی صورت میں ایک مسلمان ویسا ہی ایک بشر ہے جیسا ایک نامسلمان ہے۔ اسکے بعد مسلم اور غیر مسلم کا مقابلہ صرف جسمانی طاقت اور مادی وسائل ہی کے اعتبار سے ہوگا اور اس مقابلہ میں جو طاقتور ہوگا وہ کمزور پر غالب آجائیگا۔

ان دونوں حالتوں کا فرق تاریخ کے صفحات میں اتنا نمایاں ہے کہ ایک نظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یا تو مٹھی بھر مسلمانوں نے بڑی بڑی حکومتوں کے تختے الٹ دیے تھے اور اٹک کے کنارے سے لے کر اٹلانٹک کے سواحل تک اسلام پھیلا دیا تھا۔ یا اب کروڑوں مسلمان دنیا میں موجود ہیں اور غیر مسلم طاقتوں سے دبے ہوئے ہیں اور جن آبادیوں میں کروڑوں مسلمان بستے ہیں اور ان کو بستے ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں وہاں اب بھی کفر و شرک موجود ہے۔

اس رسالے میں "مطبوعات" کے عنوان سے عام کتابوں اور رسالوں پر جو مختصر انتقادات شائع ہوتے ہیں، وہ درحقیقت ہمارے مقاصد اور حدود سے خارج ہیں کیونکہ "ترجمان القرآن" کا مقصد محض قرآن مجید کی خدمت ہے لیکن ہم نے ان غیر متعلق انتقادات کیلیے تھوڑی سی جگہ صرف اس وجہ سے مخصوص کردی ہے کہ بعض اصحاب اپنی عنایت سے ہمارے پاس کتابیں اور رسالے بغرض تنقید بھیج دیتے ہیں اور صحافت کے عمومی آداب کا مقتضیٰ ہے کہ ان پر تنقید کیجائے۔ اپنے مقاصد وحدود سے اس حد تک تجاوز تو غالباً ہمارے لیے جائز ہے۔ لیکن ہماری کسی تنقید کے جواب میں کوئی لمبی چوڑی تحریر آئے تو اس تحریر کو شائع کرنا اور پھر اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لئے ایک اور لمبی چوڑی تحریر سے رسالے کے صفحات کو بھرنا یقیناً بہت زیادہ تجاوز ہے جس کے لئے جواز کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔

یہ چند جملے اس لیے لکھے جارہے ہیں کہ گذشتہ ماہ شعبان کے پرچہ میں جناب بشارت احمد صاحب جنرل

سکریٹری جماعتہائے احمدیہ دکن کی کتاب "تصدیق احمدیت" پر جو تبصرہ کیا گیا تھا اس کے جواب میں صاحب موصوف نے ایک طویل تحریر ارسال فرمائی ہے، اور اس کی اشاعت کو ہماری "قوتِ اظہار حق" کا گویا امتحان قرار دیا ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ کسی موقع پر دوسرے مؤلفین و مصنفین کی جانب سے بھی ایسی ہی تحریریں آئیں اور اسی طرح ان کی اشاعت کا بھی مطالبہ کیا جائے۔ اسلیے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ایسی تحریریں شائع نہ کرنے کے لئے ایک عام معذرت نامہ شائع کردیں

اس سلسلہ میں ایک اصولی بات کی طرف اشارہ کردینا بھی غالباً نامناسب نہ ہوگا۔ ہندوستان میں ایک مدت سے مذہبی مناظرات نے جو رنگ اختیار کر رکھا ہے وہ نہ صرف متانت و سنجیدگی سے عاری ہے، بلکہ اُس مقصد کے بھی منافی ہے جس کے لیے مناظرہ کیا جاتا ہے۔ مناظرہ کا اصل مقصد اپنے مذہب کی صداقت کا اثبات ہے اور یہ صرف دلائل سے ہوسکتا ہے۔ دلائل اگر سنجیدگی کے ساتھ پیش کیے جائیں تو پڑھنے یا سننے والا ٹھنڈے دل سے اُن پر غور کرکے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے لیکن اگر ان کے ساتھ گرمی زبان و تلخی کلام کا عنصر بھی شامل ہوجائے تو سامعین و ناظرین کے دل و دماغ اُس سکون کے حامل نہیں رہتے جو صحیح غور و فکر کیلیے ضروری ہے۔ ایسے مناظرے خواہ کسی مذہب کی طرف سے کیے جائیں ہمارے نزدیک قابل اعتراض ہیں، اور اس مذہب کے لیے کبھی تقویت کے موجب نہیں ہوسکتے جس کی تائید انکے ذریعہ سے کی جاتی ہو۔ یہی قاعدہ ہے جس کو ملحوظ رکھکر ہم نے جناب الیاس برنی صاحب کی کتاب "قادیانی مذہب" کی تائید کی، اور جناب بشارت احمد صاحب کی کتاب "تصدیق احمدیت" سے اختلاف کیا۔

جناب بشارت احمد صاحب کو خود اعتراف ہے کہ "بلاشبہ جناب برنی صاحب کی عبارت سلیس و متین ہے" اور "عبارت متانت و تہذیب سے پُر اور قلم قابو میں نظر آتا ہے"۔ دوسری طرف وہ یہ بھی اعتراف فرماتے ہیں کہ "جو شکایت آپ نے اپنی تنقید میں کی ہے وہ شکایت اس سے پہلے خود میری جماعت کے بعض نازک و لطیف احساس رکھنے والے و نیز بعض ... دیگر احباب بھی کرچکے ہیں"۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے طرز عمل کو صرف اس بنا پر جائز ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ "ہم اقتباسات محولات میں ناجائز تصرف اور صریح تحریف ظاہر کرکے پبلک کو متوجہ کرکے کہتے ہیں کہ برنی صاحب نے محض اپنے من مانے عنوانات کی ترتیب سے وسوسہ پیدا کرنا چاہا ہے ورنہ نہ ہمارے یہ اعتقادات ہیں نہ ہماری کتابوں کے

غیر مومن کے خیالات ارادات اور نیات میں ہو سکتی ہے، اور اس کے اقوال و افعال و معاملات بھی ویسے ہی ہوں جیسے ایک غیر مومن کے ہو سکتے ہیں تو پھر مسلمان کو نا مسلمان پر فوقیت کس بنا پر ہو؟ روح ایمان اور روح تقویٰ نہ ہونے کی صورت میں ایک مسلمان ویسا ہی ایک بشر ہے جیسا ایک نا مسلمان ہے۔ اسکے بعد مسلم اور غیر مسلم کا مقابلہ صرف جسمانی طاقت اور مادی وسائل ہی کے اعتبار سے ہوگا، اور اس مقابلہ میں جو طاقت ور ہوگا وہ کمزور پر غالب آجائیگا۔

ان دونوں حالتوں کا فرق تاریخ کے صفحات میں اتنا نمایاں ہے کہ ایک نظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یا تو مٹھی بھر مسلمانوں نے بڑی بڑی حکومتوں کے تختے الٹ دیے تھے اور اٹک کے کنارے سے لے کر اٹلانٹک کے سواحل تک اسلام پھیلا دیا تھا۔ یا اب کروڑوں مسلمان دنیا میں موجود ہیں اور غیر مسلم طاقتوں سے دبے ہوئے ہیں اور جن آبادیوں میں کروڑوں مسلمان بستے ہیں اور ان کو بستے ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں وہاں اب بھی کفر و شرک موجود ہے۔

اس رسالے میں مطبوعات کے عنوان سے عام کتابوں اور رسالوں پر جو مختصر انتقادات شائع ہوتے ہیں، وہ درحقیقت ہمارے مقاصد اور حدود سے خارج ہیں، کیونکہ "ترجمان القرآن" کا مقصد محض قرآن مجید کی خدمت ہے لیکن ہم نے ان غیر متعلق انتقادات کیلیے تھوڑی سی جگہ صرف اس وجہ سے مخصوص کردی ہے کہ بعض اصحاب اپنی عنایت سے ہمارے پاس کتابیں اور رسالے بغرض تنقید بھیج دیتے ہیں، اور صحافت کے عمومی آداب کا مقتضیٰ ہے کہ ان پر تنقید کیجائے۔ اپنے مقاصد و حدود سے اس حد تک تجاوز تو غالباً ہمارے لیے جائز ہے۔ لیکن ہماری کسی تنقید کے جواب میں کوئی لمبی چوڑی تحریر آئے تو اس تحریر کو شائع کرنا اور پھر اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لئے ایک اور لمبی چوڑی تحریر سے رسالے کے صفحات کو بھرنا یقیناً بہت زیادہ تجاوز ہے جس کے لئے جواز کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔

یہ چند جملے اس لیے لکھے جا رہے ہیں کہ گذشتہ ماہ شعبان کے پرچہ میں جناب بشارت احمد صاحب جنرل

سکرٹری جماعتہائے احمدیہ دکن کی کتاب "تصدیق احمدیت" پر جو تبصرہ کیا گیا تھا اُس کے جواب میں صاحب موصوف نے ایک طویل تحریر ارسال فرمائی ہے، اور اس کی اشاعت کو ہماری "قوتِ اظہارِ حق" کا گویا امتحان قرار دیا ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ کسی موقع پر دوسرے مؤلفین ومصنفین کی جانب سے بھی ایسی ہی تحریریں آئیں اور اسی طرح ان کی اشاعت کا بھی مطالبہ کیا جائے۔ اسلیے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ایسی تحریریں شائع نہ کرنے کے لئے ایک عام معذرت نامہ شائع کردیں۔

اس سلسلہ میں ایک اصولی بات کی طرف اشارہ کردینا بھی غالباً نامناسب نہ ہوگا۔ ہندوستان میں ایک مدت سے مذہبی مناظرات نے جو رنگ اختیار کر رکھا ہے وہ نہ صرف متانت وسنجیدگی سے عاری ہے بلکہ اُس مقصد کے بھی منافی ہے جس کے لیے مناظرہ کیا جاتا ہے۔ مناظرہ کا اصل مقصد اپنے مذہب کی صداقت کا اثبات ہے اور یہ صرف دلائل سے ہوسکتا ہے۔ دلائل اگر سنجیدگی کے ساتھ پیش کیے جائیں تو پڑھنے یا سننے والا ٹھنڈے دل سے اُن پر غور کرکے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے لیکن اگر ان کے ساتھ گرمی زبان وتلخی کلام کا عنصر بھی شامل ہوجائے تو سامعین وناظرین کے دل ودماغ اُس سکون کے حامل نہیں رہتے جو صحیح غور وفکر کیلیے ضروری ہے۔ ایسے مناظرے خواہ کسی مذہب کی طرف سے کیے جائیں ہمارے نزدیک قابلِ اعتراض ہیں، اور اس مذہب کے لیے بھی نصرت کے موجب نہیں ہوسکتے جس کی تائید انکے ذریعہ سے کی جاتی ہے۔ یہی قاعدہ ہے جس کو ملحوظ رکھکر ہم نے جناب الیاس برنی صاحب کی کتاب "قادیانی مذہب" کی تائید کی، اور جناب بشارت احمد صاحب کی کتاب "تصدیق احمدیت" سے اختلاف کیا۔

جناب بشارت احمد صاحب کو خود اعتراف ہے کہ "بلاشبہ جناب برنی صاحب کی عبارت سلیس ومتین ہے" اور "عبارت متانت وتہذیب سے پُر اور قلم قابو میں نظر آتا ہے"۔ دوسری طرف وہ یہ بھی اعتراف فرماتے ہیں کہ "جو شکایت آپ نے اپنی تنقید میں کی ہے وہ شکایت اس سے پہلے خود میری جماعت کے بعض نازک ولطیف احساس رکھنے والے ونیز بعض ... دیگر احباب بھی کرچکے ہیں"۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے طرزِ عمل کو صرف اس بنا پر جائز ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ "ہم اقتباسات محولات میں ناجائز تصرف اور صریح تحریف ظاہر کرکے پبلک کو متوجہ کرکے کہتے ہیں کہ برنی صاحب نے محض اپنے من مانے عنوانات کی ترتیب سے وسوسہ پیدا کرنا چاہا ہے ورنہ نہ ہمارے یہ اعتقادات ہیں نہ ہماری کتابوں کے

وہ اقتباسات ہیں جو پیش کیے گئے۔"

گویا اعتراض کسی "ناجائز تصرف" اور "صریح تحریف" کے اظہار پر نہ تھا بلکہ اس زبان پر تھا جو اس کے ساتھ استعمال کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک جناب بشارت احمد صاحب کے لیے صحیح طریق جواب یہ تھا کہ اپنی کتابوں سے اپنے مذہب کے اصل اعتقادات پیش کر دیتے اور برنی صاحب نے اگر "ناجائز تصرف" یا "صریح تحریف" سے کام لیا تھا تو اس کو صاف صاف ظاہر کر دیتے۔ اگر جناب برنی صاحب نے حملہ متانت و تہذیب سے کیا تھا تو اس کی مدافعت غیر متین اور غیر سنجیدہ طریقے سے کرنا جائز نہ تھا۔ مہذب معترض کا جواب غیر مہذب طریقے سے دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ اس کو بھی خلاف تہذیب طریقوں کی طرف کھینچ لانا چاہتے ہیں اور اپنا مفاد اسی میں دیکھتے ہیں کہ عام ناظرین کو ٹھنڈے دل سے غور کرنے کا موقع نہ دیں۔ یہ بات تو آپ کے مذہب کی کمزوری کو ظاہر کرتی ہے اور خود آپ کی طرف سے لوگوں کو بدگمان کرنے والی ہے۔

جناب بشارت احمد صاحب نے اپنے طرز عمل کی تائید میں قرآن مجید سے بھی استدلال فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"مجھے اولیاء نہایت پرانی کتاب کا جس کی ترجمانی کے لیے آپ نے اپنا رسالہ جاری فرمایا ہے صرف ایک چھوٹا سا جملہ یاد ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میں نے تصدیق احمدیت میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اسکو کافی طور پر ملحوظ رکھا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ السُّوْٓءَ بِالْجَہْرِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ۔"

لیکن اس پرانی کتاب میں یہ جملہ ہمیں کہیں نہیں ملا۔ اصل آیت یہ ہے:- لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَہْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (۴: ۲۱)۔ اور اسی پرانی کتاب میں بار بار یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْہِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ (۲: ۲۴) وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِہٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَہُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ (۱۶: ۶) قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ ہِیَ اَحْسَنُ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَہُمْ اِنَّ الشَّیْطَانَ کَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا (۱۷: ۶) اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ہِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَۃَ (۲۳: ۶) وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُہَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ (۴۲: ۴)

مقالات

کتب سماوی پر ایک نظر

عہد جدید (اناجیل وغیرہم)

(۱۱)

از جناب نورانی شاہ صاحب

پیشین گوئیاں | بائبل کی بعض پیشینگوئیوں پر عیسائی علماء کو بڑا ناز ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ انجیلی پیشینگوئیوں پر بھی کسی قدر روشنی ڈالی جائے۔ نمونہ کے طور پر ہم صرف دو پیشینگوئیوں کو لیتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ وہ خود کیا کہتی ہیں اور عیسائی علماء ان سے کیا سمجھتے ہیں۔

پیشنگوئی نمبر (۱) | یوحنا (۱: ۱۹ تا ۲۵) کی عبارت پہلے ملاحظہ فرمائی جائے جو حسب ذیل ہے:۔

"اور یوحنا کی گواہی یہ تھی جبکہ یہودیوں نے یروشلم سے کاہنوں (یعنی اماموں) اور لاویوں (یعنی اُس فرقہ کے لوگ جس میں ہارون علیہ السلام تھے) کو بھیجا کہ اُس سے پوچھیں کہ تو کون ہے۔ اور اُس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں مسیح نہیں ہوں۔ تب اُنھوں نے اُس سے پوچھا کہ پھر تو کون ہے۔ کیا تو الیاس ہے۔ اُس نے کہا میں نہیں ہوں۔ پس آیا تو وہ نبی ہے۔ اُس نے جواب دیا نہیں۔ × × × × × × اور اُنھوں نے اُس سے سوال کیا اور کہا کہ اگر تو مسیح ہے نہ الیاس اور نہ وہ نبی پس کیوں بپتسمہ دیتا ہے"

اس عبارت کی پوری تفہیم کے لیے سب سے پہلے اس بات کے ذہن نشین کر رکھنے کی ضرورت ہے کہ اُس زمانہ کے یہودی توریت کی پیشینگوئیوں اور اپنی مذہبی روایات پر اعتماد کرکے تین نبیوں کی آمد کے انتظار میں تھے اور اُن تینوں کا ذکر اقتباس مندرجہ بالا میں آیا ہے۔ ایک مسیح۔ دوسرا الیاس تیسرے وہ جن کی جانب اشارہ "وہ نبی" سے اوپر کی عبارت میں کیا گیا ہے۔ یہودیوں نے یوحنا بپتسمہ دینے والے (John the Baptist) یعنی حضرت یحییٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ آپ کون ہیں۔ اس سے یہودیوں کی مراد یہ نہ تھی کہ آپ نبی ہیں یا غیر نبی۔ کیونکہ یہ سوال ہوتا تو آپ کا یہ جواب ہوتا کہ میں نبی ہوں۔ آپ کو اپنی نبوت کا پورا علم تھا (لوقا ۱: ۷۶ ملاحظہ ہو) اور کوئی وجہ نہ تھی کہ آپ اپنی نبوت سے انکار کرتے۔ بلکہ یہودیوں کا یہ مطلب تھا کہ جو نبی آنے والے ہیں اُن میں سے آپ کون ہیں۔ آپ نے یہودیوں کا مطلب پوری طرح سمجھ کر فرمایا کہ میں مسیح نہیں ہوں تب یہودیوں نے دوسرے آنے والے نبی کی جانب اشارہ کرکے پوچھا کہ کیا پھر آپ الیاس ہیں۔ یحییٰ علیہ السلام نے اس سے بھی انکار فرمایا۔ تب یہودیوں نے تیسرے آنے والے نبی کی جانب اشارہ کرکے سوال کیا کہ کیا پھر آپ "وہ نبی" ہیں۔ آپ نے اس سے بھی انکار فرمایا۔ یعنی اس مکالمہ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام نے صاف صاف فرما دیا کہ آپ نہ مسیح ہیں، نہ الیاس ہیں، نہ "وہ نبی"۔ گویا "وہ نبی" مسیح اور الیاس سے غیر ہیں اور آنے والے نبیوں میں اس درجہ مشہور و معروف ہیں کہ اُس زمانہ کے یہودیوں نے صرف "وہ نبی" کہا اور یحییٰ علیہ السلام پہچان گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ نبی کون ہیں؟ عیسائی علماء بڑے چکر میں ہیں کہ اس کا جواب کیا دیں۔ مگر مسلمان بلا خوف تردید کہتے ہیں کہ "وہ نبی" سے مراد محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ انجیل یوحنا کی مندرجہ بالا عبارت سے معقول پسند لوگوں کے لیے کسی اور نتیجہ پر آنا ناممکن ہے۔

توریت کی وہ پیشینگوئیاں جن کی بنا پر اُس زمانہ کے یہودیوں کو نبی آخر زمان حضرت محمد

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کا انتظار تھا حسب ذیل ہیں:-

استثناء (۱۸ : ۱۵) میں موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول درج ہے :-

"خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میرے مانند ایک نبی برپا کرے گا تم اُس کی طرف کان دھریو"

استثناء (۱۸ : ۱۷ اور ۱۸) میں موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ :-

"اور خداوند نے مجھے کہا کہ انھوں نے جو کچھ کہا سو اچھا کہا - میں اُن کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے فرماؤں گا وہ سب اُن سے کہے گا اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنھیں وہ میرا نام لیکے کہے گا نہ سُنے گا تو میں اُس کا حساب اس سے لوں گا"

انجیل میں بھی یہی پیشینگوئیاں نقل کی گئی ہیں - اعمال (۳ : ۲۲) میں ہے کہ:-

"موسیٰ نے باپ دادوں سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لیئے ایک نبی میری مانند اُٹھاویگا جو کچھ وہ تمھیں کہے اُس کی سب سُنو"

اعمال (۷ : ۳۷) میں ہے کہ :-

"یہ وہی موسیٰ ہے جس نے بنی اسرائیل سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لیئے مجھ سا ایک نبی ظاہر کریگا اُسکی سنو"

(ب) یہ پیشینگوئیاں توریت اور انجیل دونوں میں اب تک موجود ہیں - مگر بات صرف اتنی ہی ہے کہ عیسائی انھیں عیسیٰ علیہ السلام پر منطبق کرتے ہیں حالانکہ نظر انصاف سے دیکھا جائے

تو یہ انطباق صحیح نہیں۔

اس مسئلہ پر غور کرنے سے قبل سب سے پہلے اس بات کا صاف کر دینا ضروری ہے کہ استثنار (۱۸: ۱۵) میں جو "تیرے ہی درمیان سے" کے الفاظ ہیں وہ الحاقی ہیں۔ خدا کی طرف سے اس بارہ میں جو کچھ موسیٰ علیہ السلام کو ارشاد ہوا تھا اور استثنار (۱۸: ۱۸) میں درج ہے اور اوپر منقول ہے اُس میں یہ الفاظ داخل نہیں۔ پطرس حواری نے جو استثنار (۱۸: ۱۵) کی عبارت اعمال (۳: ۲۲) میں نقل کی ہے اُس میں بھی یہ الفاظ نہیں۔ استیفان (استفنس) نے جب استثنار کی اس پیشینگوئی کو بیان کیا جو کہ اعمال (۷: ۳۷) میں درج ہے تو اس میں بھی یہ الفاظ مذکور نہیں توریت کے مشہور ترجمہ سپٹواجنٹ میں بھی یہ الفاظ موجود نہیں۔ پھر "تیرے ہی درمیان سے" اور "تیرے ہی بھائیوں میں سے" دو بالکل جداگانہ اور مختلف بلکہ دو متضاد باتیں ہیں کہ اُن میں سے اگر ایک صحیح ہو تو دوسری صحیح نہیں ہوسکتی اور توریتی محاورہ کے مطابق دونوں کا ہم معنی ہونا محال ہے جسکی تفصیل آگے آئے گی۔

اب اصلی پیشینگوئی پر غور فرمائیے۔ خدا نے آنے والے نبی کے متعلق موسیٰ علیہ السلام سے یہ فرمایا کہ:-

> "میں اُن کے لیے اُن کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا
> اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا" (استثنار ۱۸: ۱۸)

"اُن کے لیے" یعنی بنی اسرائیل (بنی اسحٰق) کے لیے۔ "اُن کے بھائیوں میں سے" یعنی بنی اسمٰعیل میں سے۔ حضرت اسمٰعیل حضرت اسحٰق کے بھائی تھے اور توریتی محاورہ میں بنی اسمٰعیل کو بنی اسحٰق (یعنی بنی اسرائیل) کا بھائی کہا گیا ہے۔ استثنار (۲: ۴) اور پیدائش (۱۶: ۱۲ - ۲۵: ۱۸) میں بنی اسمٰعیل کو بنی اسرائیل کا بھائی کہا گیا ہے۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ جس آنے والے نبی کی خبر

دی گئی ہے وہ نبی بنی اسمٰعیل میں سے ہوگا نہ کہ بنی اسرائیل سے، اگر وہ نبی بنی اسرائیل سے ہوتا تو فرمایا جاتا کہ "میں اُن کے لیے اُن ہی میں سے تجھ سا نبی برپا کروں گا"، حالانکہ ایسا نہیں فرمایا گیا۔ اگر "تیرے ہی درمیان سے" کے الفاظ الحاقی نہ سمجھے جائیں، حالانکہ اوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ وہ الحاقی ہیں تو ان الفاظ کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ نبی اولاد ابراہیم سے ہوگا اور تمہارا ہم عقیدہ ہوگا یعنی تمہاری طرح خالص توحید کی تعلیم دینے والا ہوگا نہ کہ تثلیث کی۔ دوسری نہایت اہم بات یہ ہے کہ "تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا"، یعنی وہ نبی موسیٰ علیہ السلام کے مانند ہوگا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ مشابہت ہے یا عیسیٰ علیہ السلام کو؟

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ کبھی تو عیسائی علماء موسیٰ علیہ السلام کو (نعوذ باللہ) "چور اور بٹمار" اور عیسیٰ علیہ السلام کا دشمن قرار دیتے ہیں (جس کا ذکر ہمارے مضمون ۳ میں آ چکا ہے) اور کبھی مندرجہ بالا پیشینگوئی کو عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں ثابت کرنے کی کوشش میں آپ کو موسیٰ علیہ السلام کے مشابہ بیان کرتے ہیں۔ مسلمان یہ کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو جو مشابہت آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حاصل ہے وہ کسی دوسرے پیغمبر کو حاصل نہیں۔ استثناء (۳۴ : ۱۰) میں ہے کہ :۔

"اب تک بنی اسرائیل میں موسیٰ کی مانند کوئی نبی نہیں اُٹھا جس سے خداوند آمنے سامنے آشنائی کرتا"

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں سورہ مزمل میں فرماتا ہے کہ :۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۔

ہم نے تمہارے پاس ایک تم پر گواہی دینے والا رسول بھیجا جیسا ہم نے فرعون کے پاس بھیجا تھا یعنی موسیٰ علیہ السلام

توریت کی رو سے بنی اسرائیل میں کوئی موسیٰ کے مانند پیدا نہ ہوا۔ اور قرآن کی رو سے بنی اسمٰعیل میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم موسیٰ علیہ السلام کے مانند پیدا ہوئے۔ اگر مشابہتوں میں مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو

پیشینگوئی حضرت عیسیٰ پر کسی طرح صادق نہیں آتی۔ ان مشابہتوں کو اگر پوری تفصیل سے بیان کیا جائے تو اس کے لیے بہت سے اوراق پُر کرنے کی ضرورت ہوگی اس لیے ہم یہاں ایک مختصر فہرست کے درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ موسیٰ علیہ السلام ماں اور باپ سے پیدا ہوئے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ماں اور باپ سے پیدا ہوئے۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام صرف ماں سے پیدا ہوئے۔

۲۔ موسیٰ علیہ السلام میں محض انسانیت وعبدیت تھی۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی انسان کامل اور اللہ کے بندے تھے۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام خود عیسائی عقیدہ کی رو سے اللہ کے بیٹے تھے۔

۳۔ موسیٰ علیہ السلام نے نکاح کیا اور عیالداری کے جملہ حقوق ادا کئے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی نکاح کیا اور پوری عیالداری برتی۔ عیسیٰ علیہ السلام تمام عمر ان باتوں سے آزاد رہے۔

۴۔ موسیٰ علیہ السلام انتقال کے بعد زمین میں دفن ہوئے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی جسد مطہر زمین ہی میں امانت ہے اور زمین کو ایسی امانتوں پر فخر ہے۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام کو اور آپ کے جسم کو زمین سے کوئی تعلق نہیں۔

۵۔ موسیٰ علیہ السلام کو چالیس برس بعد نبوت عطا ہوئی۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی چالیس برس کی عمر میں مبعوث ہوئے۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام کی تو ساری عمر بھی چالیس برس کی نہ ہونے پائی تھی کہ آپ اٹھا لیے گئے۔

۶۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام پر شریعت نازل ہوئی آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی شریعت نازل ہوئی۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام نے شریعت موسوی ہی کی پابندی کی اور اپنے شاگردوں کو بھی اسی کا حکم فرمایا۔

۷۔ شریعت موسوی اور شریعت محمدی کی باہمی مشابہتوں کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی نظر ڈالی جائے تو ایک پوری ضخیم کتاب لکھنی پڑے گی اور شریعتوں کی مشابہت ہی اس معاملہ میں اصل چیز ہے مگر مثی

معنی باتیں جن میں کہ مشابہت بہت ہی نمایاں ہے یہ ہیں کہ :-

(۱) دونوں شریعتوں میں توحید خالص کی تعلیم ہے حالانکہ بقول عیسائیوں کے مسیح کی تعلیم میں تثلیث تھی۔ (۲) دونوں شریعتوں میں حدود و قصاص و تعزیرات غسل، طہارت کے احکام پائے جاتے ہیں مگر انجیل ان سے خالی ہے۔ (۳) دونوں شریعتوں میں جہاد کی تعلیم اور جہاد کے احکام ہیں بلکہ دونوں پیغمبروں نے باقاعدہ فوج لے کر جہاد کیا بھی۔ حالانکہ مسیحی تعلیم یہ ہے کہ کوئی ایک رخسار پر طمانچہ مارے تو دوسرا رخسار بھی پیش کر دیا جائے اور عیسیٰ علیہ السلام کو کبھی اس قسم کی نوبت نہیں آئی کہ باقاعدہ فوج لے کر جہاد کیا ہو۔ (۴) دونوں شریعتوں میں ختنہ کا حکم ہے حالانکہ عیسائیوں کے نزدیک ختنہ ضروری نہیں۔ (۵) دونوں شریعتوں میں کثیر الازدواجی کی اجازت ہے حالانکہ عیسائیوں کے نزدیک یہ جرم ہے۔ غرضکہ دونوں پیغمبر نہ صرف صاحب شریعت ہونے میں باہم مشابہ ہیں بلکہ ان کی شریعتیں بھی بڑی حد تک آپس میں مشابہ ہیں حالانکہ عیسائی عقیدہ کی رو سے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا۔ (۸) آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اُمّی تھے بقول جان ڈیون پورٹ کے موسیٰ علیہ السلام بھی اُمّی تھے حالانکہ عیسیٰ علیہ السلام اُمّی نہ تھے چنانچہ لوقا (۴: ۱۶۔ ۱۷) میں وہ واقعہ درج ہے جب آپ نے سبت کے دن عبادت خانے میں جا کر یسعیاہ نبی کی کتاب کو کھڑے ہو کر پڑھا اور سب کو سنایا۔ (۹) ان دونوں باہم مشابہ پیغمبروں نے گلّہ بانی کی حالانکہ مسیح نے صرف استعارہ کے طور پر اپنے کو گڈریا کہا مگر کبھی گلہ بانی نہیں کی۔ (۱۰) دونوں پیغمبروں نے اغیار میں پرورش اور نشو و نما پائی۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین مکہ اور کعبہ کے بت پرستوں میں اور موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی صحبت میں۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام نے اپنوں میں ہی پرورش و تربیت و نشو و نما پائی (۱۱) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے جانشین فرمانروا ہوئے۔ موسیٰ علیہ السلام کے جانشین بھی یشوع کی کتاب اور قاضیوں کی کتاب کے مطابق فرمانروا ہوئے۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام کے تین سو برس بعد تک کوئی عیسائی بادشاہ نہ ہوا اور یہ تین سو برس کا وقفہ آپ کو مماثلت زیر بحث سے خارج کر دیتا ہے (۱۲) موسیٰ علیہ السلام کی اولاد کا ہنوں یعنی امامِ

کے زیر حکم رہی (مفتاح الکتاب صفحہ ۱۵)۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا مرتبہ بھی اس معاملہ میں اظہر من الشمس ہے۔ لیکن جناب مسیح کو اس مماثلت میں بھی کوئی دخل نہیں۔

(۱۳) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا یَا عَلِیُّ اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی - دنیا میں اور کوئی پیغمبر ایسا نہیں گزرا جس نے اپنے کو موسیٰ سے مشابہت دیکر اپنے بھائی کو اس طرح ہارون سے مشابہت دی ہو۔ (۱۴) عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی بت شکنی نہیں کی۔ موسیٰ علیہ السلام نے بچھڑے وغیرہ کو توڑا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کعبہ کے بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ (۱۵) عیسیٰ علیہ السلام کے پاس نبوت کا کوئی ظاہری نشان نہ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں ید بیضا تھا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پشت مبارک پر مہر نبوت تھی۔

بعض انبیاء میں دو ایک باتوں میں مشابہت باہمی کا ہونا اور بات ہے۔ مگر حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام میں اتنے بہت سے امور میں اس شدت کے ساتھ مشابہت و مماثلت عیاں ہے کہ اسکی نظیر اور پیغمبروں میں ملتی ہی نہیں۔ لہذا توریت کی مندرجۂ بالا پیشنگوئی میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی بابت بشارت تھی اور یہودی اس بشارت کو آپ ہی کے متعلق سمجھتے تھے اور آپکے منتظر تھے اور اس کا چرچا اس قدر عام تھا اور یہ بات اتنی شہرت پائے ہوئے تھی کہ یہودیوں کو یحییٰ علیہ السلام سے سوال کرتے وقت کہ آپ ان میں صرف یہی اشارہ کر دینا کافی ہوا کہ کیا آپ "وہ نبی" ہیں۔ یحییٰ علیہ السلام نے بھی یہودیوں کے مافی الضمیر کو فی الفور سمجھ کر جواب دے دیا کہ میں وہ نبی نہیں ہوں۔ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ۔

یہودیوں کے سوال پر یحییٰ علیہ السلام کا یہ جواب اور بعد کے واقعات تفسیر ہیں اس آیت قرآنی کی کہ:-

وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ — اور گواہی دے چکا ایک گواہ بنی اسرائیل میں سے

مِّن مِّثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا	ایک ایسی کتاب کی پھر وہ یقین لایا اور تم نے تکبر کیا
يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۲۶:۱۰)	تحقیق اللہ ہدایت نہیں فرماتا ظالموں کی قوم کو۔

پیشینگوئی نمبر ۲ | قرآن شریف کی سورۃ الصف کے رکوع ا میں آیا ہے کہ :۔

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ	اور جب کہا عیسیٰ بن مریم نے کہ اے بنی اسرائیل
اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ	میں اللہ کا فرستادہ ہوں تمہاری طرف تصدیق
مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ	کرتا ہوں اپنے سے پہلے کی چیز توریت کی اور خوشخبری
وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي	سناتا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آویگا
اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ	اُس کا نام احمد ہے ؑ

انجیل یوحنا (۱۴:۱۶-۱۵:۲۶-۱۶:۷) میں یہ بشارت درج ہے مگر عیسائیوں نے اِسْمُهٗٓ اَحْمَدُ کے ہم معنی الفاظ میں تحریف لفظی اور تحریف معنی دونوں سے کام لیا ہے۔ قول مسیح ان آیات اناجیل میں یہ تھا کہ ”میں جاؤں گا تو تمہارے پاس فارقلیط آئے گا“۔ اس لفظ فارقلیط میں عیسائیوں نے بہت کچھ کتر بیونت کی ہے۔

فارقلیط عبرانی یا سریانی یا کلدانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ستودہ کے ہیں جو ٹھیک احمد یا محمد کے لغوی معنی کا ترجمہ ہے عیسیٰ علیہ السلام نے اس پیشینگوئی میں یہی لفظ استعمال فرمایا تھا یوحنا نے آپ کے کلمات کا اپنی انجیل میں یونانی زبان میں ترجمہ کیا تو لفظ فارقلیط کا ترجمہ پیریکلائیط یا پیریکلیط Periclyte یا پیراکلیوطا کیا جس کے معنی بھی وہی ستودہ یا احمد کے ہیں مگر عیسائیوں نے ان الفاظ میں تحریف کرکے انھیں پراکلیط Paraclete سے بدل دیا جس کے معنی تسلی دہندہ Comforter کے ہیں۔ یہ تو تحریف لفظی تھی۔ تحریف معنوی اس میں یہ کی کہ اس لفظ ”تسلی دہندہ“ کے معنی کو بھی بدل ڈالا اور اس سے کوئی شخص معہود و مخصوص مراد نہیں لیا۔ بلکہ روح حق اور روح القدس مراد لے کر

یوحنا (باب ۱۴ و ۱۵) میں "تسلی دینے والے" کے بعد بطور تفسیر کے "یعنی روح حق" کے الفاظ کو بڑھا کر داخل متن کر دیا۔

جن اناجیل کے قدیم نسخوں میں بقول عیسائی علماء ہی کے اختلافات کتابت لاکھوں تک پہنچے ہوں، جن کے چھٹی صدی عیسوی سے قبل کے نسخے سب کے سب مفقود ہو چکے ہوں، جن کے کاتبوں اور ناقلوں اور مفسروں کا یہ گمان ہو کہ اپنے مفروضہ مذہب کی تائید میں کذب و دروغ گوئی سے مدد لینا جائز ہے ان میں ذرا سے اختلاف اعراب یا ایک شوشہ کے بڑھا دینے یا گھٹا دینے سے پیریکلیط کو پراکلیط یا پاراکلیط بنا دینا کونسی بڑی بات ہے۔ مگر برنباس کی انجیل میں اس موقعہ پر پیریکلیط ہی آیا ہے جو کہ فارقلیط کا صحیح ترجمہ ہے۔ اگرچہ عیسائی اس سند کو تسلیم نہیں کرتے اور انجیل برنباس کو اب جعلی قرار دیتے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ دین مسیحی کے قدیم مصنفوں نے جو کہ عام طور پر ایماندار بھی تسلیم کیے گئے ہیں اس کتاب کو صحیح اور اصلی تسلیم کیا ہے اور اس کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا ہے اور اسے خوب رواج دیا ہے اور مشہور کیا ہے۔ متاخرین میں سے جارج سیل وغیرہ نے بھی جو کہ پکے عیسائی تھے اس امر کا صاف صاف اقرار کیا ہے کہ یہ کتاب بتمامہ جعلی نہیں۔ جب کتاب کے سچے ہونے کا انہیں اعتراف ہے تو کسی خاص متنازع فیہ لفظ کے جعلی ہونے کے متعلق ان کا صرف بلا دلیل بیان کافی نہیں تاوقتیکہ اپنے بیان کی تائید میں وہ کوئی ثبوت نہ پیش کریں۔ حالانکہ اب تک ان سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ وہ اپنے اس قول کی تائید میں کوئی ایک ہی قدیم مستند قلمی نسخہ انجیل برنباس کا پیش کرتے اور جعل کو ثابت کرتے۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی ہے جو خاص اہمیت رکھتی ہے۔ دیگر زبانوں میں انجیل کے ترجمہ ہونے کا زمانہ عیسائی علماء نے محض اپنی اٹکل سے تیسری صدی عیسوی کا ٹھیرایا ہے مگر عربی ترجمہ کا کوئی زمانہ نہیں ٹھیرایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں انجیل کا ترجمہ اس سے قبل وجود میں آچکا تھا اور اٹکل اور قیاس کا دور اس کے بعد شروع ہوا ہے ورنہ اس کے لیے بھی کسی زمانہ کی تخصیص کر دی جاتی

بہرحال اگر انجیل کا سب سے پہلا عربی ترجمہ دوسری زبانوں کے ترجموں میں سب سے زیادہ قدیم نہ ہو تب بھی وہ بہت پرانا ترجمہ ضرور ہے اور فارقلیط کے متعلق امتیاز اہل عرب سب سے زیادہ معتبر ہے۔ جب قرآن میں وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ نازل ہوا اُس وقت ملک عرب علمائے یہود و نصاریٰ سے بھرا ہوا تھا اور ہزارہا یہود و نصاریٰ اسلام کی حقانیت کو دیکھ کر اسلام قبول کر چکے تھے۔ واقف کار لوگوں کے سامنے خلاف واقعہ امر کے اظہار پر دلیری کرنا گویا زنبوروں کے چھتے کو چھیڑ دینا ہوتا۔ اگر اُس زمانہ میں انجیل کے عربی ترجمہ میں فارقلیط کا لفظ نہ ہوتا تو تمام یہود و نصاریٰ ٹوٹ پڑتے اور شور مچا دیتے کہ یہ بات (نعوذ باللہ) غلط ہے اور انجیل میں کہیں بھی احمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کا نام نہیں آیا اور وہ ہزاروں یہود و نصاریٰ جو اسلام قبول کر چکے تھے اسلام سے برگشتہ ہو گئے ہوتے۔ مگر ایسا نہ ہوا اور سب یہود و نصاریٰ دم بخود ہو کر رہ گئے اور کسی ایک نے بھی قرآن کے اس بیان کو چیلنج نہ کیا اور غلط نہ بتایا۔ چنانچہ زمانہ مابعد تک بھی سنہ ۱۶۷۱ء میں کلیسائے روم کی طرف سے عیسائی علماء نے انجیل کا جو عربی ترجمہ چھاپا ہے اُس میں بھی فارقلیط ہی کا لفظ چھپا ہے۔ اس عربی انجیل میں یوحنا (۱۴: ۱۶) کی عبارت یہ ہے:۔

وَاَنَا اَطْلُبُ مِنَ الْاٰبِ فَیُعْطِیْکُمْ فَارقلیطا اٰخر لِیَثْبُتَ مَعَکُمْ اِلَی الْاَبَدِ[1]

یوحنا (۱۶: ۷) کی عبارت یہ ہے:۔

لٰکِنِّیْ اَقُوْلُ لَکُمْ اِنَّهٗ خَیْرٌ لَّکُمْ اَنْ اَنْطَلِقَ لِاَنِّیْ اِنْ لَّمْ اَنْطَلِقْ لَمْ یَاْتِکُمُ الفارقلیطُ فَاِنِ انْطَلَقْتُ اَرْسَلْتُهٗ اِلَیْکُمْ۔

اور یوحنا (۱۵: ۲۶) میں بھی آیا ہے:۔ فَاِذَا جَاءَ فَارقلیطُ الخ بائیبل کے عربی ترجمہ مطبوعہ لندن ۱۸۳۱ء میں بھی عربی کی یہی عبارتیں درج ہیں۔

[1] ترجمان القرآن۔ حال میں جو عربی ترجمہ برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی نے شائع کیا ہے اس میں دونوں جگہ سے فارقلیط کا لفظ نکال کر مُعَزِّی کا لفظ لکھ دیا گیا ہے جس کے معنی وہی تسلی دہندہ کے ہیں۔

اگر عیسائیوں کے اس قول کو بھی مان لیا جائے کہ فارقلیت کے بجائے صحیح لفظ پراکلیت ہے جس کے معنی تسکین دہندہ کے ہیں تب بھی تسکین دہندہ رسول عربی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہو سکتے ہیں کہ روح القدس کیونکہ انجیل کی زبان میں روح القدس کے لیے نازل ہونا بیان کیا جاتا ہے نہ کہ آنا دیکھو اعمال ۸: ۱۶ - ۱۰: ۴۴ - ۱۱: ۱۵)۔

علاوہ بریں مسیح کی پیشینگوئی یہ ہے کہ میں جاؤں گا تب وہ آئے گا اور جب تک میں نہ جاؤں گا وہ نہ آئے گا حالانکہ روح القدس کے نزول کے لیے مسیح کے جانے کی شرط نہیں ہو سکتی کیونکہ روح القدس کا نزول مسیح کی موجودگی میں بھی ہو چکا ہے۔ اور مسیح سے قبل بھی تمام انبیاء علیہم السلام پر وہ روح نازل ہو چکی ہے۔ اور مسیح کے سامنے اور مسیح کے آسمان پر جانے کے وقت حواریوں پر بھی اس کا نزول ہوا۔

متی (۳: ۱۱) میں ہے کہ :۔ " وہ (یعنی مسیح) تمہیں روح القدس اور آگ سے بپتسمہ دے گا"

متی (۳: ۱۶) میں ہے کہ :" اور یسوع بپتسمہ پاکے وہیں پانی سے نکل کر اوپر آیا اور دیکھو کہ اس کے لیے آسمان کھل گیا اور اس نے خدا کی روح کو کبوتر کی مانند اترتے اور اپنے اوپر آتے دیکھا"

یوحنا (۲۰: ۲۱، ۲۲) میں ہے کہ :۔ " اور یسوع نے پھر انہیں (یعنی اپنے شاگردوں کو) کہا تم پر سلام جس طرح باپ نے مجھے بھیجا ہے میں بھی اسی طرح تمہیں بھیجتا ہوں۔ اس نے یہ کہہ کے ان پر پھونکا اور کہا کہ تم روح قدس لیو"۔

لوقا (۱: ۴۱) میں ہے کہ :۔ " اور ایسا ہوا کہ جو نہیں الیسبات نے مریم کا سلام سنا لڑکا اس کے پیٹ میں اچھل پڑا اور الیسبات روح قدس سے بھر گئی"

لوقا (۱: ۶۷) میں ہے کہ :۔ " اور اس کا باپ ذکریاہ روح قدس سے بھر گیا"۔

لوقا (۲: ۲۵) میں ہے کہ :۔ " اور روح قدس اس پر (یعنی شمعون پر) تھی"

پھر بھلا اس روح القدس کی نسبت مسیح کا وہ قول کیونکر صادق آ سکتا ہے کہ " اگر میں نہ

جاؤں تو تسلی دینے والا تم پاس نہ آوے گا پر اگر میں جاؤں تو میں اُسے تم پاس بھیجوں گا" (یوحنا ۱۶:۷)

وہ تسلی دینے والے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہیں جن کا آنا مسیح علیہ السلام کے جانے پر موقوف تھا۔ اقوال مسیح میں انجیل میں آنے والے فارقلیت یا تسلی دہندہ کے متعلق بالخصوص پانچ باتیں بیان کی گئی ہیں:۔

(۱) وہ دوسرا تسلی دینے والا ہوگا جو آئے گا (یوحنا ۱۴:۱۶) یعنی مسیح سے غیر ہوگا۔ اگر عیسائی عقیدہ کی رو سے باپ بیٹا اور روح القدس ایک ہی چیز ہیں اور تسلی دینے والے سے روح القدس مراد لی جاتی ہے تو وہ تسلی دہندہ دوسرا کیونکر ہو سکتا ہے؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ روح القدس نہیں ہے جو یہاں مقصود ہے بلکہ مسیح علیہ السلام کی طرح ایک پیغمبر ہیں جن کی بشارت دی جا رہی ہے۔

(۲) وہ مسیح کے جانے کے بعد آوے گا نہ کہ مسیح کی موجودگی میں (یوحنا ۱۶:۷) اس سے بھی یقین ہو گیا کہ وہ روح القدس یا روح حق نہیں جیسا کہ اوپر بیان گزر چکا ہے۔ جو لوگ روح حق اور روح القدس کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں غلطی پر ہیں کیونکہ بعض قابل ترجمہ کرنے والوں نے روح حق کا ترجمہ راستی کی روح اور صداقت کی روح کیا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جن فارقلیت یا تسلی دہندہ کی بابت پیشینگوئی کی گئی ہے وہ صداقت اور راستی ہی کی روح لے کر آئے۔

(۳) وہ مسیح کے لیے گواہی دیں گے (یوحنا ۱۵:۲۶)۔ اور مسیح کی بزرگی کریں گے (یوحنا ۱۶:۱۴)۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کسی نبی نے مسیح علیہ السلام کے پیغمبر ہونے کی شہادت نہیں دی اور کسی اور نبی نے آپ پر سے یہودیوں اور نصرانیوں کے لگائے ہوئے اتہامات کو دور کر کے آپکی بزرگی کو روشن نہیں کیا۔ یہودیوں نے جو آپ کی ولادت کے متعلق آپ کی شان اور آپ کی والدہ ماجدہ کی شان میں بیہودہ بکواس کی تھی اُس کی نہایت پر زور تردید رسول عربی ہی نے کی۔ عیسائیوں نے جو آپ کی تعلیم کو تثلیث سے متہم کیا اُس کی بھی نہایت زبردست تردید رسول عربی ہی نے کی۔ پھر عیسائیوں نے افسانۂ صلیب

تصنیف کرکے آپ کے حق میں جس ذلت کی موت کو شہرت دی اُس کی غلطی کا اظہار بھی رسول عربی ہی نے فرمایا۔ پولوس جوکہ اپنے آپ کو بہت بڑا مسیحی کہتا ہے گلتیوں (۳: ۱۳) میں لکھتا ہے کہ:-

"مسیح نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا کہ وہ ہمارے بدلے میں لعنتی ہوا کیونکہ لکھا ہے کہ جو کوئی کاٹھ پر لٹکایا گیا سو لعنتی ہے"

مگر حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا کو پکار پکار کر اللہ تعالیٰ کا یہ اعلان سناتے ہیں کہ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ۔ مختصر یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اور آپ کی بزرگی اور برگزیدگی کی تائید میں جو شہادت آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی وہ نہ یہودیوں کی جانب سے کبھی پیش ہوئی نہ خود عیسائیوں کی جانب سے۔ باوجود اس کے عیسائی علماء مسیح کی پیشینگوئی کا آپ کو مصداق قرار دینے میں بخل کرتے ہیں۔

(۴) وہ اپنی نہ کہیں گے لیکن جو کچھ وہ سنیں گے وہی کہیں گے (یوحنا ۱۶: ۱۳) یہ پورا پورا ترجمہ ہے اس آیہ مبارکہ کا کہ:- وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔ یہ وہی تعریف ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں فرمائی ہے۔

(۵) وہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گے (یوحنا ۱۴: ۱۶) ہمیشہ یعنی قیامت تک وہ اور اُن کا مذہب اور اُن کی ہدایت اور اللہ کا جو کلام اُن پر نازل ہوگا اور کلمات ہدایت جو اُن کی زبان سے نکلیں گے تمہارے ساتھ رہیں گے۔ یعنی پھر قیامت تک کسی دوسرے نبی کے آنے کی ضرورت نہ ہوگی اور وہ نبی آخر الزمان ہوں گے اور اُن کی شریعت کی، قرآن کی، حدیث کی، آخر تک محافظت کی جائے گی اور توریت و انجیل و اقوال انبیاء کے ساتھ لوگوں نے جو سلوک از راہِ تحریف و الحاق کیا ہے وہ قرآن و حدیث کے ساتھ نہ ہو سکے گا اور ایک جماعت حق پر ہمیشہ قائم رہے گی۔

مختصر یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کی یہ پیشینگوئی سوا رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی اور پر صادق

آتی نہیں سکتی۔

بعض عیسائیوں نے اعتراض کیا ہے کہ اگر فارقلیط سے نبی عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی مراد ہیں تو اس پیشینگوئی کے پورا ہونے میں چھ سو برس کا وقفہ کیوں ہوا؟ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ توریت و زبور وغیرہ میں جو پیشینگوئیاں عیسائیوں کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق ہیں ان کے پورا ہونے میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں برس کا وقفہ کیوں واقع ہوا؟ عیسائیوں ہی کی ایک کتاب میزان الحق مطبوعہ لندن بابت ۱۸۶۱ء کے صفحہ ۳۴۴ پر یہ عبارت درج ہے:۔

"کتنی ہی پیشینگوئیاں (توریت میں) بیان ہوتی ہیں اور وقوع واقعات سے سو سو اور ہزار ہزار سال پہلے خبر دی گئی اور تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہیں اور پھر وے سب پوری ہو کر صادق آئی ہیں۔"

بعض عیسائی علماء کا یہ قول ہے کہ عروج مسیح سے دس دن بعد پینٹی کاسٹ کی جو ضیافت ہوئی اس میں یہ روح القدس نازل ہوئی اور اس طرح مسیح کی پیشینگوئی عروج مسیح کے دس ہی دن بعد پوری ہو گئی۔ اس ضیافت کا حال کتاب اعمال کے باب دوم میں درج ہے مگر اس بیان میں نہ کہیں فارقلیط کا لفظ آیا ہے نہ تسلی دینے والے کا نہ یوحنا کی پیشینگوئی کا کچھ ذکر ہے جس کا پورا ہونا اس ضیافت میں بیان کیا جاتا ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ انجیل یوحنا واقعہ پینٹی کاسٹ کے ستر (۷۰) برس بعد لکھی گئی اگر ستر (۷۰) برس قبل یہ پیشینگوئی پوری ہو چکی ہوتی تو وہ اپنی انجیل میں ضرور لکھ دیتا کہ فلاں پیشینگوئی فلاں دن یا فلاں موقع پر پوری ہو گئی۔ مگر اس نے تو پینٹی کاسٹ تک کا ذکر نہیں کیا۔ فارقلیط کی آمد کا ذکر تو بڑی بات ہے۔

اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ضیافت پینٹی کاسٹ کے بعد بھی عیسائی لوگ فارقلیط کی آمد کے منتظر رہے اور اب تک منتظر ہیں مگر آج کل ان کا انتظار اسی نوعیت کا ہے جس

نوعیت کا انتظار یہودیوں کو عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اب تک چلا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے فارقلیط ہونے کے جھوٹے دعوے بھی کئے چنانچہ سنہ ۔۔۔ میں مونٹانس نے بھی فارقلیت ہونے کا دعوےٰ کیا اور چند فاضل اور لکھے پڑھے لوگوں کی جماعت بھی اس کی پیرو بن گئی۔ اگر اس زمانہ میں بھی علماء اور عوام کا یہ خیال ہوتا کہ مسیح کی پیشینگوئی صرف نزولِ روح القدس سے متعلق ہے تو مونٹانس جو کہ ایک انسان تھا فارقلیط ہونے کا دعویٰ کیسے کرتا اور لوگ اس کے پیچھے کیوں ہو جاتے۔ معلوم ہوا کہ خواص و عوام ایک انسان کے منتظر تھے جو فارقلیط کے اوصاف سے مزین ہو۔ گاڈ فرے ہیگنس ایک فاضل عیسائی ہیں جو اپنی کتاب اپالوجی مطبوعہ لندن ۱۸۲۹ء میں فارقلیط کے مسئلہ پر نہایت تفصیلی اور فاضلانہ بحث کرتے ہیں۔ وہ سوا مونٹانس کے اور بھی لوگوں کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے فارقلیط ہونے کا جھوٹا دعوےٰ کیا اور جماعتیں بنا لیں اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ :

"مسلمان یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ مشہور بات ہے کہ بہت سے عیسائیوں کو بموجب پیشینگوئی کے ایک شخص کا انتظار تھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو بناوٹ رومی پادریوں اور پروٹسٹنٹوں نے قوانین مذہبی کی اس عبارت پر کرلی وہ عام نہ تھی"

پھر آگے چلکر ایک موقع پر گاڈ فرے ہگنس تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"عیسائی اپنے آپ کو اندھا کرنے کے لیے اس خیال کو کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم شخص موعود تھے جس قدر چاہیں مضحکہ میں اڑا لیں مگر اس سے یہ حقیقت نہ بدلیگی کہ پندرہ کروڑ اشخاص محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ایسا ہی خیال کرتے تھے اور اب بھی خیال کرتے ہیں۔ میں نے کتابوں میں دیکھا ہے کہ جب چالیس ہزار مفسر قرآن کی تفسیر کر رہے تھے تو خیال نہ کیا جا سکتا تھا کہ ہر ایک چیز جو اہل عرب کے ہنر اور دانائی سے ایجاد ہو سکی ہو نہ کی گئی ہو۔ یہ مقصود نہیں ہو سکتا کہ لفظ

فارقلیط کے باب میں بحث کما حقہ نہ ہوئی ہو۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا اور نہ کیا جائے گا کہ دنیا کے معاملات کو ایک نہایت عجیب طور پر عیسیٰ (علیہ السلام) کے مذہب محرف کے لیے ایک مصلح کی حاجت تھی اور غالباً کروڑوں نے ان لوگوں میں سے جو محمد (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مانتے تھے ہماری انجیل اور توارین کے لفظوں کو روح قدس کی بابت کبھی نہ سنا ہو گا اور اگر سنا بھی ہو گا تو ان کی تصدیق سے انکار ہو گا مگر انھوں نے اگر تسلیم بھی کیا ہو تو ایک مختصر جواب زعمت سے سننے والوں کا اطمینان کر دے گا۔ وہ یہ ہے کہ تم کہتے ہو کہ عہد جدید میں ہدایت ہے کہ روح الصدق آوے گی۔ یہ درست ہے کہ روح الصدق آئی مگر محمد (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں آئی جن کو روح الصدق سے الہام ہوتا تھا۔ پس یہی تمہاری پیچیدہ عبارت کے صحیح معنی ہیں اور صرف یہی درستگی کے ساتھ ہو سکتے ہیں"۔

(باقی)

تنزیل و تاویل

سورۃ البقرہ

(۲)

(از جناب مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی)

ایمان کے لیے کفر سے برأت اور بیزاری شرط ہے

امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس اللہ روحہ و نور ضریحہ ومتعنا بعلومہ و برکاتہ اپنے ایک طویل مکتوب میں جو عقائد اسلامیہ کی تحقیق میں قلم مبارک سے نکلا ہے فرماتے ہیں :-

ایمان عبارت از تصدیق قلبی است
بانچہ از دین بطریق ضرورۃ و تواتر بما رسیدہ است
واقرار لسانی نیز رکن ایمان گفتہ اند کہ احتمال سقوط دارد
وعلامت این تصدیق تبری است از کفر و بیزاری از
کافری وانچہ در کافری است از خصائص و لوازم آن
ہمچناں بستن زنار و مثل آن واگر عیاذاً باللہ سبحانہ
با دعوای این تصدیق تبرا از کفر نماید مصدق دینین
است کہ برائے ارتداد متسم است و فی الحقیقت حکم او

ایمان ان چیزوں کی تصدیق قلبی کا نام ہے جو
امور دین کے طریق بداہت و تواتر ہم تک پہنچی
ہیں - علماء اقرار لسانی کو بھی ایمان کا رکن بتلاتے
ہیں مگر یہ رکن بعض حالات میں مثلاً حالت اکراہ وجبر
میں ساقط ہوجاتا ہے - کفر اور کافری اور اس کے
خصائص و لوازم جیسے زنار باندھنا ان سب سے تبری
اور بیزاری ایمان اور تصدیق کی علامت ہے اور اگر
کوئی شخص باوجود اس تصدیق کا دعویٰ کرنے کے کفر سے

حکم منافق است لا الیٰ ہٰؤلاء ولا الیٰ ہٰؤلاء۔ پس در تحقیق
ایمان از تبری کفر چارہ نبود و ادنائی آن تبری قلبی است
و اعلائے آن تبری قلبی و قالبی و تبری عبارت از دشمنی
است با دشمنان حق جل و علا آں دشمنی خواہ بقلب
بود اگر خوفی از ضرر ایشان داشتہ باشد خواہ بقلب
و قالب ہر دو در وقت عدم آن خوف کریمہ
یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ جَاہِدِ الْکُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ
وَاغْلُظْ عَلَیْہِمْ مؤید این معنی است چہ محبت
خدائے عز و جل و محبت رسول او علیہ و علیٰ آلہ الصلوٰۃ
والتسلیمات بے دشمنی دشمنان صورت نہ بندد ع
تولّٰی بے تبری نیست ممکن
این جا صادق است۔

حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ
والسلام اینہمہ بزرگی کہ یافت و شجرۂ انبیا گشت
بواسطہ تبری از دشمنان او تعالیٰ بودہ قال اللہ تعالیٰ
قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْۤ اِبْرٰہِیْمَ
وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِہِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا
مِنْکُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کَفَرْنَا
بِکُمْ وَ بَدَا بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃُ وَ الْبَغْضَآءُ

تبری اور بیزاری نہ ظاہر کرے تو وہ دو متضاد دینوں کی
تصدیق کرنے والا ہے جو داغ ارتداد سے آلودہ ہے اور درحقیقت
شخص منافق کے حکم میں ہے نہ اِدھر نہ اُدھر۔ پس ایمان کے ثابت کرنے کے
لیے کفر سے تبری ضروری اور لازمی ہے جس کا ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ
دل سے تبری اور بیزاری ہو اور تبری کا اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ
وہ تبری قلب اور قالب یعنی زبان اور اظہار اور جان دونوں سے ہو
اور تبری کے یہ معنی ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ کے دشمنوں کے
ساتھ دشمنی کرنا خواہ وہ دشمنی فقط قلب سے ہو اگر کافروں
کے ضرر کا اندیشہ ہو اور خواہ قلب اور قالب یعنی زبان
اور دل دونوں سے وہ دشمنی ہو جبکہ ان کے ضرر کا کوئی
اندیشہ نہ ہو اور یہ آیت کریمہ (اے نبی تم کافروں اور
منافقوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو) اس معنی کی
مؤید ہے اس لیے کہ خدائے عز و جل اور اس کے
رسول کی محبت اس کے دشمنوں سے عداوت اور دشمنی
کے بغیر متصور اور ممکن نہیں (مصرع)
تولّٰی بے تبری ہو نہیں سکتا
یہاں بالکل راست آتا ہے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ
والسلام نے یہ جو کچھ بزرگی پائی اور شجرۂ انبیاء ہوئے

أَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ ۔ یہ سب حق تعالیٰ کے دشمنوں سے تبری اور بیزاری
(مکتوبات دفتر اول ص ۳۲۵ مکتوب ۲۶۶) ہی کی وجہ سے اُن کو حاصل ہوئی حق تعالیٰ فرماتے ہیں

تحقیق تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں میں اسوۂ حسنہ ہے جبکہ انھوں نے اپنی قوم سے یہ کہا کہ ہم بالکل بری ہیں تم سے اور ان چیزوں سے جن کی تم پرستش کرتے ہو سوائے خدا کے اور ہم تمہاری تکذیب کرتے ہیں اور ظاہر ہوگئی ہمارے اور تمہارے درمیان میں عداوت اور بغض ہمیشہ کے لیے تاوقتیکہ تم تصدیق کرو اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی۔

یہ آیتیں سورۂ ممتحنہ کی ہیں۔ یہ سورت بظاہر اسی مسئلہ کی تحقیق کے لیے نازل ہوئی ہے حاطب بن ابی بلتعہ، جو صحابۂ بدریین اور مہاجرین میں سے ہیں اُن کے اہل و عیال مکہ میں رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے متعلقین کی حفاظت کی خاطر اہل مکہ کو ایک خط لکھ کر خفیہ طور پر روانہ کیا جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس راز کی خبر دی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل مکہ پر حملہ کا ارادہ فرما رہے ہیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی کے اس خط کی اطلاع ہوگئی اور وہ خط پکڑا گیا۔ حاطب بلائے گئے تو آپ نے یہ عذر کیا کہ یا رسول اللہ! قسم ہے عالم الغیب والشہادہ کی یہ فعل میں نے مسلمانوں کی بدخواہی کے خیال سے نہیں کیا۔ بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ مہاجرین کی تو مکہ میں قرابت اور رشتہ داری ہے اس قرابت کی وجہ سے اُن کے مال و اولاد مکہ میں محفوظ ہیں مگر اہل مکہ سے میری کوئی قرابت نہیں میں دوسری جگہ کا باشندہ ہوں اس لیے میں نے یہ چاہا کہ ظاہری طور پر اہل مکہ کے ساتھ احسان کروں تاکہ اس صلہ میں وہ میرے اہل و عیال کی حفاظت کریں۔ باقی اس کا مجھ کو یقین کامل ہے کہ اللہ ہی کا کلمہ بلند ہوگا اور اس کا رسول ہی مظفر و منصور اور فتحیاب ہوگا اور اس کا سچا دین ہی سب دینوں پر غالب ہوگا۔ میرے اس خط سے اسلام کا تو ذرہ برابر کوئی نقصان نہ ہوگا۔ اور میرا ایک کام نکل آئے گا۔ اس پر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کی طرف مخاطب ہو کر یہ ارشاد فرمایا:۔

اِنَّهٗ قَدْ صَدَقَكُمْ (بخاری ص ۲۶۱) یقیناً اس نے بلا شبہ تم سے سچ کہا ہے۔

اس پر یہ سورت نازل ہوئی :-

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ	اے مومنو تم میرے اور اپنے دشمنوں کو ہرگز ست دوست
وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَیْھِمْ بِالْمَوَدَّۃِ	بناؤ کہ تم ان سے دوستی کا اظہار کرنے لگو۔

حاطب بن ابی بلتعہ مہاجری اور بدری ہونے کی وجہ سے بلا شبہ جنتی اور بہشتی ہیں بمقتضائے بشریت اُن سے یہ لغزش ہوگئی، اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے نہایت تاکیدی الفاظ کے ساتھ اُن کا صادق العقد ہونا بھی بیان فرما دیا، یعنی انہ قد صدقکم میں ان کے صدق کو دو حرف تحقیق ایک ان اور دوسرے قد کے ساتھ ظاہر فرما دیا۔ مگر با ایں ہمہ حق تعالیٰ شانہٗ کو کفار کے ساتھ اُن کی یہ محض ظاہری اور صوری موالاۃ ناپسند ہوئی اور یہ سورت نازل فرما کر بتلا دیا کہ کفار کے ساتھ یہ صوری اور ظاہری موالاۃ بھی نہ چاہیئے بلکہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان پر ایمان لانے والوں کی طرح کفار سے تبرّی اور بیزاری اور بغض اور عداوت کا اعلان ضروری اور لازم ہے یہ سورت اول سے آخر تک خدا کے دشمنوں سے تبرّی اور بیزاری ہی کے احکام پر مشتمل ہے۔ قال تعالیٰ :-

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا	کیا تو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دعوے کرتے
بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ	ہیں کہ وہ ایمان لائے ہیں اس پر جو تیری طرف اتارا
یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ	گیا ہے اور اس پر جو تجھ سے پہلے اتارا گیا تھا، مگر
وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ ۔	چاہتے ہیں کہ اپنا معاملہ فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کے

پاس لے جائیں۔ حالانکہ اُن کو حکم دیا گیا ہے کہ طاغوت کا انکار کریں۔

اس آیت شریفہ سے صراحۃً یہ معلوم ہوتا ہے کہ تصدیق کے بعد طاغوت کے ساتھ کفر اور اس کی تکذیب اور اس سے برات اور بیزاری کا بھی حکم ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص رات کو سوتے ہوئے بیدار ہو جائے اگر وہ دس بار بسم اللہ اور دس بار سبحان اللہ اور دس بار اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَکَفَرْتُ بِالطَّاغُوْتِ (تصدیق

ہیں نے اللہ کی اور تکذیب کی ہیں سے طاغوت یعنی شیطان کی) پڑھے تو وہ ہر خوفناک چیز سے محفوظ رہیگا۔

(رواہ الطبرانی فی الاوسط عن ابن عمر) حصن حصین ص۶۷

اس حدیث شریف سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا منشا رمبارک یہ ہے کہ اللہ عزوجل کی تصدیق اور اس کے دشمنوں سے برات اور بیزاری قلب میں ایسی راسخ ہو کہ ایسی غفلت کے وقت میں بھی اُس سے ذہول اور غفلت نہ ہونے پائے۔

وقال تعالیٰ شانہٗ

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ (سورۃ مومن)	جب انھوں نے ہماری قوت کا مظاہرہ دیکھا تو پکار اُٹھے کہ ایمان لائے ہم خدائے واحد پر اور کفر کیا ہم نے اُن چیزوں سے جن کو ہم شریک کرتے تھے۔ مگر ہماری قوت کا مظاہرہ دیکھنے کے بعد ان کا ایمان لانا ان کے لیے ہرگز نافع نہ تھا۔ یہ اللہ کی سنت ہے جو اس کے

بندوں میں رہی ہے۔ چنانچہ اس جگہ کافر نامراد ہوئے۔

اس آیت شریفہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شرک اور مشرکین سے تبری اور بیزاری اگر مشاہدۂ عذاب سے پہلے کرتے تو وہ ان کے لیے مفید اور نافع ہوتی مشاہدۂ عذاب کے بعد اب اس کا وقت نہیں رہا۔

حق جل شانہٗ نے قرآن کریم میں جابجا مہاجرین کی جو ثنا۔ و تعریف فرمائی ہے وہ بھی اسی تبری اور کفر سے بیزاری کی بدولت ہے کہ کفر سے اس قدر بیزار ہوئے کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں اپنے وطن مالوف اور آباء و ابناء اور اخوان و خلان اور ازواج و قبائل سب ہی سے الگ ہو گئے اور علیٰ ہذا اصحاب کہف کا سوائے ہجرت اور اعتزال عن الکفار کے کوئی اور عمل ایسا نمایاں نہیں کہ اسکی جانب اس منقبت کبریٰ اور نعمت عظمیٰ کو منسوب کیا جا سکے۔ اصحاب کہف کو یہ تمام درجات و فضائل صرف دشمنان حق جل و علیٰ سے ہجرت کی بدولت حاصل ہوئے ہیں۔

غلبۂ اعدا اور ہجوم دشمن کے وقت سپاہیوں کی معمولی نقل وحرکت بھی بہت وقعت رکھتی ہے بخلاف زمانۂ امن وسکون کے کہ اُس وقت کی غیر معمولی نقل وحرکت بھی کسی شمار میں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عنفوان شباب کی عبادت زمانۂ پیری کی عبادت سے ہزار درجہ افضل ہے۔ اس لیئے کہ زمانۂ شباب میں دشمنان دین یعنی نفس امّارہ اور شیطان لعین کا غلبہ اور ہجوم ہوتا ہے۔ شیاطین اور شہوات کا لشکر ہر طرف سے اس کو گھیرے ہوئے ہوتا ہے۔ دشمنان دین کے مقابلہ ہی کی وجہ سے زمانۂ شباب کی عبادت پر عرش کے سایہ میں جگہ دینے کا وعدہ آیا ہے کہ جس دن سوائے عرش رحمن کے سایہ کے کوئی سایہ نہ ہوگا۔ اس عظیم الشان مسئلہ کے متعلق دل چاہتا ہے کہ کچھ اور لکھا جائے مگر اس اندیشہ سے کہ یہ تطویل موجب ملال نہ ہو اس لیے اس شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

اندکی پیش تو گفتم غم دل ترسیدم
که دل آزرده شوی ورنہ سخن بسیارست

ایمان کی صورت اور اسکی حقیقت | حضرات صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ ایمان کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت تصدیق بالقلب اور اقرار باللسان ایمان کی صورت ہے۔ اور اطمینان نفس یعنی نفس کا مطمئن ہو جانا یہ ایمان کی حقیقت ہے۔ اطمینان نفس سے یہ مراد ہے کہ مقتضائے شریعت مقتضائے طبیعت بن جائے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے:۔

لا یؤمن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ	تم میں سے کوئی مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسکی طبعی خواہش میری شریعت کے تابع نہ ہو جائے

اس حدیث میں ایمان سے یہی اطمینان نفس مراد ہے یعنی نفس اس درجہ مطمئن ہو جائے کہ اللہ اور اس کے رسول کا ہر حکم اُس کو لذیذ اور شیریں معلوم ہو اور اسکی معصیت اور نافرمانی کا ادنیٰ سا خیال اور معمولی سا وسوسہ بھی آگ میں جلنے سے بدرجہا زائد اسپر شاق اور گراں ہو۔ ایمان کی اسی کیفیت اور حالت کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ذاک صریح الایمان (یہی کھلا ہوا ایمان) فرمایا ہے۔

حاشا وکلا نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ہرگز ہرگز یہ مراد نہیں کہ معصیت کا وسوسہ صریح ایمان ہے ورنہ ہم فاسق اور بدکاروں کے ایمان کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان سے زیادہ صریح اور جلی ہونا لازم آئے گا اس لیے کہ ہمارے نفوس تو ہر وقت اسی معصیت کے لیے جولانگاہ بنے رہتے ہیں بلکہ معصیت کے وسوسہ اور خیال کا قلب پر اس درجہ شاق اور گراں ہونا کہ آگ میں جل جانا اس سے آسان معلوم ہو معصیت کی اسی گرانی اور ناگواری کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صریح ایمان فرمایا ہے۔ قال تعالیٰ :-

ذٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اتَّبَعُوا مَا أَسْخَطَ اللّٰهَ وَ كَرِهُوا رِضْوَانَهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ۔

اس وجہ سے کہ انھوں نے اُس چیز کا اتباع کیا جو خدا کی ناراضی کی موجب ہے اور خدا کی رضامندی کو مکروہ سمجھا اور اس سے نفرت کی۔ حق تعالیٰ نے ان کے تمام اعمال حبط کر دیئے۔

پس جس طرح خدا کی رضا اور اطاعت سے کراہت اور ناگواری اور اس سے نفرت تمام اعمال کو حبط کر دیتی ہے۔ اسی طرح خدا کی معصیت اور اسکی نافرمانی کی کراہت اور اس کے وسوسہ اور خیال ہی سے نفرت اور بیزاری ایمان کو صریح اور روشن اور جلی بناتی ہے۔ اس قسم کا ایمان خاص صحابہ کرام علیہم الرحمۃ والرضوان کا حصہ تھا جس کو حق جل شانہ نے بطور امتنان ذکر فرمایا ہے :-

وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللّٰهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ أُولٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ۔

اور جان لو کہ تم میں اللہ کا رسول ہے اگر وہ بہت سے امور میں تمہاری بات مانے تو تم مشقت میں پڑ جاؤ لیکن اللہ نے تمہاری طرف ایمان کو محبوب بنا دیا اور تمہارے دلوں میں اسکو مزین کر دیا اور کفر اور فسق اور نافرمانی کی کراہت اور طبعی ناگواری تمہارے دلوں میں ڈال دی ایسے ہی لوگ بھلائی پانیوالے ہیں محض اللہ کے فضل اور احسان سے اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے

حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو یہ یقین ہو کہ اس سوراخ میں اژدہا ہے تو ہرگز اُس میں انگلی نہ ڈالے گا۔ اور اگر کوئی شخص سوراخ پر انگلی رکھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو اژدہے کے ہونے کا یقین نہیں۔ اسی طرح اگر کسی کو یہ یقین ہوجائے کہ اس معصیت اور اس گناہ سے جہنم کے سانپ اور اژدہے اس کو ڈسیں گے تو پھر اس سے معصیت کا صدور ناممکن اور محال ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی معصیت کرتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس کو خدا کی وعید اور عذاب پر پورا یقین نہیں۔

حدیث میں ہے کہ لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مومن۔ زانی ہرگز زنا نہیں کرسکتا جبکہ وہ مومن ہو۔ یعنی اگر اُس کو اس عذاب الٰہی اور عقاب خداوندی کا جو زناکاروں کے لیے مقرر ہے پورا پورا یقین اور کامل اطمینان اور انکشاف ہوجائے تو پھر اس سے زنا کا صادر ہونا ناممکن اور محال ہے۔

اور حدیث میں ہے کہ اذا زنی العبد خرج منہ الایمان بندہ جب زنا کرتا ہے تو ایمان نکل جاتا ہے۔ اس حدیث میں ایمان سے اسی یقین اور اطمینان کا زائل ہونا مراد ہے۔ اور حق جل شانہٗ کے اس ارشاد میں:۔

یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ — اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اسکے رسول پر

ایمان اول سے تصدیق قلبی مراد ہے اور دوسرے ایمان سے ایمان نفس یعنی نفس کا مطمئن ہوجانا مراد ہے۔ کما قال تعالیٰ یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ۔

حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے فضل عمیم سے ایمان بمعنی یقین و اطمینان کو نجات کا مدار نہیں قرار دیا بلکہ اپنی بے پایاں رحمت سے ایمان کی صورت یعنی تصدیق بالقلب اور اقرار باللسان ہی کو قبول فرمایا اور فقط تصدیق قلبی اور اقرار لسانی پر جہنم سے نجات اور دخول جنت کا وعدہ فرمایا۔ ہاں تقرب اور وصول الی اللہ کا مرتبہ بغیر اطمینان نفس اور یقین کامل کے حاصل نہیں ہوسکتا۔

ایمان صوری اور ظاہری اگرچہ ایمان حقیقی کے لحاظ سے بہت معمولی اور ادنےٰ شے ہے مگر

کفر اور شرک کے اعتبار سے بہت اعلیٰ اور ارفع ہے۔

آسماں نسبت بعرشش آمد فرود ورنہ بس عالیست پیش خاک تود

اسی وجہ سے حدیث میں ہے من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ وان زنی وان سرق
جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا وہ داخل ہوا جنت میں اگرچہ زنا اور چوری کرے۔ معاذ اللہ اس حدیث سے زنا
اور سرقہ کی اجازت اور اباحت مقصود نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ اے لوگو! تم کسی طرح لا الٰہ الا اللہ کہہ کر
کفر اور شرک کے دائرہ سے نکل آؤ۔ زنا اور سرقہ اگرچہ فی حد ذاتہ کتنے ہی برے کیوں نہ ہوں مگر کفر اور
شرک کے سامنے یہ تمام کبائر اور فواحش سب ہیچ ہیں۔ بخار اور زکام اگرچہ فی حد ذاتہ مرض اور بیماری ہے
مگر سل اور جذام کے مقابلہ میں صحت اور عافیت ہے۔ لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مومن،
اور اذا زنی العبد خرج منہ الایمان میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے بخار کی طرح زنا کا فی حد ذاتہ
مرض ہونا بیان فرمایا۔ ومن قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ وان زنی وان سرق میں زنا
اور سرقہ کا کفر اور شرک کے لحاظ سے ناقابل التفات ہونا بیان فرمایا ہے۔ یعنی زنا اور سرقہ کو کفر اور شرک
کے ساتھ وہی نسبت ہے جو بخار اور زکام کو سل اور جذام کے ساتھ ہے۔

ہرقل شاہ روم نے جب ابوسفیان سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے حالات دریافت کئے
تو اس میں یہ بھی دریافت کیا کہ کیا کوئی شخص آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد آپ کے دین سے
بیزار ہو کر مرتد بھی ہو جاتا ہے؟ ابوسفیان نے کہا نہیں۔ اس پر ہرقل نے کہا:

وَكَذٰلِكَ الْاِيْمَانُ حِيْنَ تُخَالِطُ بَشَاشَتُهُ الْقُلُوْبَ (بخاری شریف) ایمان کی یہی حالت ہے جب اس کی بشاشت اور اس کی فرحت اور مسرت قلوب میں سرایت کر جاتی ہے۔

اس جگہ بشاشت سے وہی اطمینان نفس اور انشراح صدر مراد ہے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں
یہی حقیقی ایمان ہے جس کے بعد انسان کا مرتد ہونا ناممکن اور محال ہے۔ صوری اور مجازی ایمان کے بعد مرتد ہونا

ممکن ہے مگر حقیقی ایمان کے بعد مرتد ہونا ممکن نہیں۔ چنانچہ حضرات صوفیہ کرام کا ارشاد ہے:۔

اِنَّمَا رَجَعَ مَنْ رَجَعَ مِنَ الطَّرِیْقِ، یعنی جز این نیست کہ جو شخص واپس ہوتا ہے وہ راستہ ہی سے واپس ہوتا ہے۔ منزل مقصود پر پہونچ جانے کے بعد واپسی ناممکن ہے۔ اور اس دعاء ماثور اللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ اِیْمَانًا لَّا یَرْتَدُّ (اے اللہ میں تجھ سے ایسے ایمان کا سوال کرتا ہوں کہ جس کے بعد ارتداد نہ ہوسکے) میں اسی خاص ایمان کی طرف اشارہ ہے ورنہ ایمانًا کے بعد لایرتد کی قید لگانے کی کیا حاجت تھی۔

علامہ نظام الدین نیشاپوری اپنی تفسیر غرائب القرآن میں فرماتے ہیں کہ ایمان کے تین وجود ہیں۔ ایک وجود عینی۔ دوسرا وجود ذہنی۔ تیسرا وجود لسانی۔ اصل ایمان وجود عینی ہے۔ جب بندہ اور خدا تعالیٰ میں حجابات مرتفع ہوجائیں، اُس وقت مومن کے قلب میں ایک نور حاصل ہوتا ہے وہی نور ایمان کا وجود عینی ہے کما قال تعالیٰ:۔

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوْرِ — اللہ دوست ہے اُن لوگوں کا جو ایمان لائے نکالتا ہے ان کو تاریکیوں سے نور کی طرف۔

جب کوئی جدید حجاب مرتفع ہوتا ہے اتنا ہی یہ نور کامل اور قوی ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسلام کے متعلق اسکو شرح صدر ہوجاتا ہے اور نبی کریم اور تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا صدق اس کے نزدیک آفتاب سے زائد بدیہی اور روشن اور جلی ہوجاتا ہے کما قال تعالیٰ:۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ فَھُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّہٖ — جس شخص کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا وہ اپنے پروردگار کی جانب سے ایک نور پر ہے۔

اور یہی نور قیامت کے دن صراط پر رہنمائی کریگا۔ کما قال:۔

نُوْرُھُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَبِاَیْمَانِھِمْ — ان کا نور ان کے سامنے اور داہنی جانب دوڑتا ہوگا۔

ایمان کا نور ہونا اہل ایمان قیامت کے دن محسوس کریں گے اور جو لوگ اس دار دنیا میں نور ایمان سے محروم اور ظلمات کفر میں گھرے ہوئے ہیں وہ قیامت کے دن بھی اس نور سے محروم رہیں گے

کما قال تعالیٰ:۔

وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ — جسکو خدا نے نور نہیں دیا پھر اسکے لیے کہیں نور نہیں۔

قیامت کے دن تو ایمان کا نور ہونا سب ہی کو معلوم ہوجائے گا مگر اس دار دنیا میں جب کبھی کسی عارف اور صاحب بصیرت کو ایمان رویائے صالحہ یا کشف سے مکشوف ہوا ہے تو وہ نور ہی کی شکل میں مکشوف ہوا۔

فلسفی کو منکر حنانہ است — از حواس انبیاء بیگانہ است

اور اس نور کا مطالعہ اور تصور یہ ایمان کا وجود ذہنی ہے اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دینا یہ ایمان کا وجود لسانی ہے۔ ایمان کا محض لسانی وجود بغیر اس نور کے مفید اور کارآمد نہیں۔ جیسا کہ پیاسے کے لیے آب زلال کا فقط تلفظ کافی نہیں جب تک کہ اس سے سیراب نہ ہو (باقی)

حاملانِ قرآن

حضرت داؤد عمادیؒ

(جناب مولوی محمد عثمان صاحب عمادی بی، اے بی سی، علیگ)

اُولٰئِكَ اٰبَائِیْ فَجِئْنِیْ بِمِثْلِهِمْ
إِذَا جَمَعَتْنَا يَا جَرِيْرُ الْمَحَافِلُ

نہایت متبحر علامہ، صاحب الفضل والکرامہ۔ علوم قرآن وحدیث میں یگانہ، ادب ولغت میں یکتائے زمانہ، تفقہ فی الدین میں فرد کامل، استنباط احکام میں مشار بالانامل۔

اسم شفا | ایک شخص کو حضرت سے انکار تھا اور اس میں سخت اصرار تھا، ایک شب درد شکم میں مبتلا ہوا جس قدر تدبیریں کی گئیں درد بڑھتا ہی گیا، اُسی گھر میں حضرت کے ایک ارادت مند بھی فروکش تھے بجز طبیب دفقرا ری مریض پران کو رحم آیا۔ ورد مند کو سیدھا لٹایا، بِسْمِ اللّٰهِ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ کے بعد "حضرت سید داؤد طعام بانی ہضم" کہتے جاتے تھے اور اس کے شکم پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے، چند دقیقے میں درد جاتا رہا اور شفا ہو گئی، یہ کلمات اُسی زمانہ سے آل عماد میں معمول بہ ہیں اور ہزار بار تجربہ میں آچکے ہیں۔

مزار مبارک | رود دلیصو سے کسی زمانہ میں میرزا جیون بیگ نے ایک آبگیر نکالی تھی جسے "پوکھر" کہتے ہیں اس کے دہانہ پر ایک مزرعہ ہے جو بہرۂ آب ہونے کے باعث بہرہ مشہور تھا اور اب اسی کو سوقیت نے

اشباع کے ساتھ بہارہ بنا دیا ہے، بہروا آگیر کے مابین ایک افتادہ و بلند قطعہ ہے جس کے گوشہ میں حضرت محوخواب ہیں: اور وہیں حضرت قطب بھی آسودۂ استراحت ہیں؛ رضی اللہ عنہما۔

مجلس درس | مجلس درس ایک خیار وریس میں ہوتی تھی جس کا اثاث تک مدرس تھا، بیرون خیار کچھ برقع پوش نیک عورتیں بھی سماعت درس کے لیے حاضر تھیں اور حاضرین کی خواہش تھی کہ ان جواہر لآلی سے کسی کے دامان گوش خالی نہ رہیں، افتتاح خطاب کے ساتھ ہی ایک صاحب نے عرض کی:۔ یا حضرت ان نیچی نظر والوں کو اونچا سنائی دیتا ہے، کوئی اطرش ہے کوئی بہرا، کوئی حِسّ سمع سے بے بہرہ، لہذا ضروری ہے کہ صوت خطاب جہوری ہو۔ فرمایا:۔

کوئی گونگا ہے نہ بہرا۔ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا ۔

حزنِ یعقوب | بہانہ جویوں کو موقع مل گیا، فوراً بول اٹھے:۔ یا حضرت، اسی کے بعد جو آیت ہے اس میں حضرت یعقوب ؑ کا براحال دکھایا ہے کہ فراق یوسف ؑ میں اُنکی آنکھیں جاتی رہیں، اندھے ہوگئے، یہ تو پیغمبروں کی شان نہیں۔

لِانَّ هٰذا اظهارٌ للجزع، وجارٍ مجرى الشكاية من الله، وَانَّهٗ لا يحسن بالانبياء الذين يجب عليهم ان يفوضوا امورهم الى الله فى البأساء والضرّاء وحين البأس ۔	یہ تو جزع و فزع کا اظہار ہے، اس سے تو اللہ کی شکایت نکلتی ہے۔ پیغمبروں کے لیے یہ مناسب نہیں، اُن پر تو یہ لازم ہے کہ رنج و غم و ضرر و زحمت ہر حال میں اپنے تمام معاملات کو اللہ ہی کے سپرد کیے رکھیں۔

فرمایا، پوری آیت یوں ہے:۔

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يَا أَسَفٰى عَلٰى يُوسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ	یعقوب ؑ نے اپنے بال بچوں سے منہ موڑ لیا اور کہا: یوسف پر ہائے افسوس، اور رنج سے یعقوب ؑ

كَظِيمٌ۔ قَالُوا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوسُفَ حَتّٰى تَكُونَ حَرَضًا اَوْ تَكُونَ مِنَ الْهَالِكِينَ قَالَ اِنَّمَا اَشْكُوا بَثِّي وَحُزْنِي اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ، يَا بَنِيَّ اذْهَبُوا فَتَحَسَّسُوا مِنْ يُوسُفَ وَاَخِيهِ وَلَا تَيْاَسُوا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهُ لَا يَيْاَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ،

کی دونوں آنکھیں سفید ہو گئیں۔ با ایں ہمہ وہ غم کو کھائے اور رنج کو دبائے رہتے، سب نے کہا، تو یوسف کو یاد کرنے سے باز نہ آئے گا جب تک کہ تیرے جسم و عقل میں فساد نہ آئے یا تو ہلاک ہونے والوں میں داخل ہو جائے، یعقوبؑ نے کہا میں تو صرف اللہ ہی کی جناب میں اپنی شکایت اور اپنے رنج کو پیش کرتا ہوں اور اللہ کی نسبت جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے، اے میرے بچو، جاؤ جا کے یوسف اور اس کے بھائی کی آہٹ لو، اللہ کے فضل سے ناامید نہ ہو، اللہ کے فضل سے بجز ان لوگوں کے جو کافر ہیں اور کوئی ناامید نہیں ہوتا۔

فرمایا۔ سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ واللہ اکبر

کیا غم ہے مزہ کا کہ طبیعت نہیں بھرتی

فراق میں نالہ، رنج و غم اللہ کے حوالہ، کلام اللہ کی یہی آیتیں یعقوب علیہ السلام کی کیا کیا شانیں دکھاتی ہیں ؎

با خدا باش و ہر چہ خواہی کن

اللہ تعالیٰ نے انھیں کظیم فرمایا ہے یعنی رنج و غم سے زار و نزار تھے۔ اس پر بھی نہ بے صبر تھے نہ بے قرار تھے۔

عرض حال کرتے ہیں تو اسی معبود مطلق سے، استغاثہ ہے تو خدائے برحق سے۔ مخلوق سے استغنا، غیر اللہ سے سروکار، نبوت کی بارگاہ ہے جہاں اللہ ہی اللہ ہے،

اللہ کے فضل پر اتنا وثوق ہے کہ یوسف کی سنائی سبھی سناتے ہیں مگر وہ کسی پر یقین نہیں لاتے

ذو فضل کی فراوانی بحر کرم کی بے پایانی پر جس کی نظر ہو وہ کسی بات سے کیوں مضطر ہو۔ سالہا سال گزر چکے ہیں گم گشتہ کا نشان تک مفقود ہے پھر بھی اللہ کے فضل سے ناامید نہیں ہوتے۔ ع

نومید مشو کہ ناامیدی کفر است

لان الیاس من رحمۃ اللہ تعالیٰ لا	اللہ کی رحمت سے ناامیدی اسی وقت ہوگی
یحصل الا اذا اعتقد الانسان :-	جب انسان اعتقاد کرے کہ :-
ان الالٰہ غیر قادر علی الکمال	اللہ اس کام کے پورے کرنے پر قادر نہیں
او غیر عالم بجمیع المعلومات	یا تمام معلومات پر حاوی نہیں
او لیس بکریم بل ھو بخیل	یا اللہ کریم نہیں بخیل ہے (معاذ اللہ)
وکل واحد من ھذہ الثلاثۃ یوجب الکفر	ان تینوں باتوں میں سے ہر ایک بات موجب کفر ہے
فاذا کان الیاس لا یحصل الا عند حصول	جب ناامیدی انھیں تینوں باتوں میں سے
احد ھذہ الثلاثۃ وکل واحد منھا	کسی ایک کا ثمرہ ہے تو ظاہر ہے کہ ناامیدی ہوگی
کفر ثبت ان الیاس لا یحصل الا لمن	جو کافر ہو اور خدائی کا منکر
کان کافراً	ہو ۔

فرمایا :- یعقوب علیہ السلام کی اس شان اور اس علوِ ایمان سے اللہ تعالیٰ مومنین کو تعلیم دیتا ہے کہ خواہ کیسا ہی ابتلا نازل ہو مگر مومن کی یہی شان ہے کہ کسی حال میں بھی اللہ سے غافل نہ ہو۔

دلم زساکن بیت الحزن عجب دارد ! کہ رو بحضرت حق در ہوائے فرزند است

عرض کی یا حضرت ایک کے لئے تمام اولاد سے منہ موڑ لینا اور پھر وا اسفا بن یامین کا پیش آئے اور وا اسفا یوسف پر ہو اس کے کیا معنی ؟

رونے سے ہیں کام کسی کی خبر آئے

فرمایا:۔ الا سی یبعث الا سی متمم اپنے بھائی مالک بن نویرہ کے مرثیہ میں کہتا ہے:۔

لقد لامنی عند القبور علی البکا رفیقی لتذراف الدموع السوافك

(قبروں کے پاس رونے سے میرے ساتھی نے مجھے ملامت کی کہ اس اشک خون ریزی سے کیا فائدہ)

فقال أتبكي كل قبر رأيته لقبر ثوی بین اللوی والدکادك

(اس نے کہا کہ کیا بات ہے کہ تو ایک خاص قبر کے لئے جو مقامات لوی ودکادک کے درمیان ہے جس قبر کو دیکھتا ہے رونے لگتا ہے) فقلت له ان الاسی یبعث الاسی فدعنی فهذا کله قبر مالك

(میں نے جواب دیا کہ رنج سے رنج برانگیختہ ہوتا ہے مجھے نہ چھیڑو میرے نزدیک تو یہ سب قبریں مالک ہی کی ہیں)

حقیقت استرجاع | عرض کی:۔ کیا یہ مناسب نہ تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام پر شدید مصیبت نازل ہوئی تھی تو بجائے اظہار اسف وحزن کے إنا للہ وانا الیہ راجعون کہتے کہ پروردگار کی جانب سے صلوات ورحمت کے مستحق ٹھہرتے اور مہتدی بنتے۔

فرمایا:۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ استرجاع (انا للہ وانا الیہ راجعون کہنا) خصیصۂ امت محمدیہ ہے لیکن یہ روایت قوی نہ ہوگی اس لئے کہ إنا للہ سے مراد یہ ہے کہ انا مملوکون للہ وہو الذی خلقنا واوجدنا (ہم اللہ ہی کی ملکیت ہیں اسی نے ہمیں پیدا کیا اور وہی وجود میں لایا) اور انا الیہ راجعون (ہم اسی اللہ کی جانب لوٹنے والے ہیں) اس میں حشر اور قیامت کی جانب اشارہ ہے۔

کوئی خدا پرست قوم ممکن نہیں کہ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ کے مفہوم سے بے خبر ہو

میں تو سمجھتا ہوں کہ حضرت یعقوب علیہ الصلاۃ والسّلام کے ان اقوال میں :-

(۱) فصبرٌ جمیل -

(۲) عسَی اللہ ان یاتِینی بھم جمیعًا -

(۳) انہ ھو العلیم الحکیم -

(۴) انما اشکوا بثّی وحزنی الی اللہ -

(۵) واعلم من اللہ ما لا تعلمون -

(۶) لا تیأسوا مِن روح اللہ

(۷) لا ییأس من روح اللہ اِلّا القوم الکافرون -

اِنّا للہِ وَ اِنّا اِلیہِ رَاجعُونْ کا پورا مفہوم موجود ہے -

سفیدی چشم یعقوبؑ | رہی یہ بات کہ حضرت یعقوب علیہ السّلام کی آنکھیں فرطِ گریہ سے اندھی ہو گئی تھیں تو یہ بھی خلاف واقع ہے' کلام اللہ میں غلبۂ بکا سے آنکھوں کے سفید ہو جانے کا تذکرہ ہے' اندھے ہونے کا تذکرہ نہیں ہے'۔

وعند غلبۃ البکاء یکثر الماء فی العین فتصیر العین کانھا ابیضت من بیاض ذلِکَ المآء	جب گریہ غالب ہوتا ہے تو آنکھ میں آنسو بھر جاتا ہے' اس حالت میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سفیدیٔ آب دیدہ کے باعث گویا دیدے سفید ہو گئے ہیں -
وقولہ وابیضت عیناہ من الحزن کنایۃٌ عن غلبۃ البکاء	اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ یعقوبؑ کی دونوں آنکھیں حُزن سے سفید ہو گئیں بطور کنایہ اس سے غلبۂ بکا ہی مراد ہے -
وَالدلیل علی صحۃ ھذا القول ان تاثیر الحزن فی غلبۃ البکاء لا فی حصول العمی	اس بات کے درست ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حزن کی تاثیر گریہ غالب ہونے میں ہے' نابینا ہو جانے میں نہیں ہے'

فالاحسن ان یحمل الابیضاض علی غلبة البکاء ولا علی العمی ۔	اس لئے بہتر یہی ہے کہ آنکھوں کے سفید ہو جانے کو غلبۂ بکا پر محمول کیا جائے نابینائی پر محمول نہ کیا جائے۔

ردّ بصر | عرض کی :۔ فراق یوسف میں اگر یعقوب اندھے نہیں ہوئے تو قمیص یوسف کے لیجانے اور اس کے باعث دوبارہ بصیر ہو جانے کے کیا معنی ؟

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۔	یوسفؑ نے بھائیوں سے کہا میرے اس قمیص کو لے جا کے میرے باپ کے منہ پر ڈال دو، ان میں بصارت آ جائیگی اور تم لوگ اپنے تمام گھر والوں کو لے کے میرے پاس آ جاؤ۔
وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَا اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ۔	جب قافلہ جدا ہوا یعنی مصر سے کنعان کو چلا تو یعقوبؑ نے اپنے گھر والوں سے کہا :۔ مجھے تو حقیقت میں یوسفؑ کی ہوا آ رہی ہے اُن کی خوشبو پا رہا ہوں اگر تم مجھے خرافت سے منسوب نہ کرو ۔
فَلَمَّا اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا	جب بشارت دینے والا آیا یوسفؑ کے قمیص کو یعقوبؑ کے منہ پر ڈال دیا تو پھر سے بصارت آ گئی۔
قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔	یعقوبؑ نے کہا :۔ کیا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ اللہ کی نسبت جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

تحقیق ردّ بصر | فرمایا :۔ آیات و روایات کے درمیان توفیق و تطبیق دی جا چکی ہے :۔

علم یوسف ان اباہ ما صار اعمی الا انہ من کثرة البکاء و ضیق القلب ضعف بصرہ فاذا القی علیہ قمیصہ	یوسفؑ کو علم تھا کہ یعقوبؑ اندھے نہیں ہوئے البتہ کثرت گریہ و تنگدلی سے بصارت میں ضعف آ گیا ہے، میرا قمیص اگر ان پر ڈال دیا گیا تو ان کے

فلا بدان ینشرح صدرہ وان یحصل فی قلبہ الفرح الشدید وذلک یقوی الروح ویزیل الضعف عن القوی فحینئذٍ یقوی بصرہ ویزول عنہ ذلک النقصان	سینہ میں انشراح پیدا ہوگا اور لامحالہ ان کے دل کو نہایت فرحت ہوگی جس سے روح میں طاقت آئیگی اور قوتوں میں جو ضعف آگیا ہے وہ زائل ہوجائیگا نتیجہ یہ ہوگا کہ بصارت قوی ہوجائیگی اور یہ نقصان جو بینائی میں اس وقت آچلا ہے جاتا رہیگا۔
وقولہ فارتد بصیرا ای لما القوا القمیص علی وجہہ وبشر بحیاۃ یوسف علیہ السلام عظم فرحہ وانشرح صدرہ وزالت احزانہ فعند ذلک قوی بصرہ وزال النقصان عنہ۔	اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ یعقوب کو پھر سے سوجھنے اور دکھائی دینے لگا اس کے یہ معنی ہیں کہ یعقوب علیہ السلام کے منہ پر جب قمیص کو ڈالا اور یوسف علیہ السلام کی زندگی کی انہیں خبر ہوئی تو بہت ہی خوش ہوئے سینہ جو منقبض ہو رہا تھا کھل گیا، رنج وغم جاتے رہے جب یہ کیفیت ہوئی تو بصارت میں بھی قوت آگئی اور قلت بصارت کی شکایت جاتی رہی۔

جب گلے سے مل گئے سارا گلا جاتا رہا

عبادت تا بہ یقین | فرماتے تھے کائنات کی ہر شئے مظنون ہے یقین صرف موت کا نام ہے، حیف ہے کہ انسان ظن کے درپے رہے اور یقین سے غافل ہوجائے۔

مستفیدین نے سند پوچھی تو فرمایا:-

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۔	اپنے پروردگار کی اس وقت تک عبادت کرتے رہو جب تک کہ یقین نہ آجائے۔

عرض کی ایک جماعتِ صوفیہ تو اسی سے استدلال کرتی ہے کہ شانِ ربوبیت کے

کے متعلق انسان جب درجۂ یقین تک پہونچ جائے تو عبادات کی تکلیف ساقط ہو جاتی ہے۔

فرمایا:-

(۱) یقین جو ظن کے بالمقابل ہے اُس کے لئے "اِتیان" نہیں لاتے۔

(۲) کلام عرب میں موت کو یقین بھی کہتے ہیں۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہاں یقین کی تفسیر موت سے کی ہے۔

(۴) القرآن یُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا۔ دیکھو کفار جہنم میں مبتلائے عذاب ہیں۔ پوچھا جاتا ہے' مَا سَلَكَكُمْ فِىْ سَقَرَ ، تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی ؟ عرض کرتے ہیں :- لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ' ہم نماز گزاروں میں سے نہ تھے' وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ 'محتاج کو کھلاتے نہ تھے' وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ۔ اور خوض کرنے والوں کے ساتھ ہم بھی اسی دھن میں لگے رہتے تھے' حَتّٰٓى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں موت آگئی' دیکھو یقین کے معنی بجز موت کے یہاں کچھ اور ہو ہی نہیں سکتے۔

رسائل و مسائل

تعلیمات قرآن کے متعلق بحث

از

جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز۔ بی۔ اے ہوم ڈیپارٹمنٹ نئی دہلی

[ابتداءً جب تعلیمات قرآن پر نقد کیا گیا تھا اس وقت بحث کو زیادہ طول دینے کا خیال نہ تھا۔ اس لئے صرف اشارات پر اکتفا کیا گیا۔ پھر مولانا اسلم جیراج پوری کے جواب پر نظر کرتے ہوئے ذرا تفصیل سے کام لینا پڑا۔ مگر اب جناب پرویز نے ایک مفصل مضمون لکھ کر دعوت دی ہے کہ ان تمام مسائل پر وضاحت کے ساتھ بحث کی جائے جو تعلیمات قرآن پر تنقید کے سلسلہ میں چھڑ گئے تھے۔ چوہدری صاحب کا مضمون کافی طویل ہے۔ اور جواب اس سے بھی زیادہ طویل ہوتا نظر آتا ہے۔ لہٰذا ان کے مضمون کو باقساط شائع کیا جائے گا اور ہر قسط کا جواب بھی ساتھ ساتھ درج ہوگا۔ اگرچہ یہ بحث طویل ہے لیکن اُمید ہے کہ ناظرین اس کو دلچسپ اور مفید پائینگے۔ ایڈیٹر]

بحث و نظر میں مقصود اگر تحقیق حق ہو اور روش میں رہے متانت و سنجیدگی تو ایسے اختلافات فی الواقع رحمت کے موجب ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنے مضمون (مطبوعہ ترجمان القرآن بابتہ ربیع الاول ۱۳۵۳ھ) میں تعلیمات قرآن کا اجمالی سا تعارف کرایا تھا کہ میرے پیش نظر محض اس اسلوب کو نمایاں کرنا تھا جس کے مطابق ہمیں قرآن کریم کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ آپ (مدیر ترجمان) نے اس پر استیعاباً تبصرہ فرمایا۔ چنانچہ آپ کی تنقید۔ صاحب تعلیمات کے جواب اور پھر آپ کی تنقید پر جواب

بہت سے ایسے مباحث سامنے آگئے جن سے قلوب سلیم نے کافی استفاضہ کیا اور ایسے ہی ہیں وہ اختلافات جنہیں رحمت کہا جاتا ہے۔ ورنہ ہندوستان کی عام علمی فضا میں بالعموم اور مذہبی حلقوں میں بالخصوص اختلاف و مخالفت میں کوئی فرق ہی نہیں کیا جاتا اور بحث کا طریقہ بالکل ایسا ہو جاتا ہے گویا بچے کنکوؤں پر لڑ رہے ہیں۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ ترجمان نے اس باب میں نہایت سنجیدہ روش کا ثبوت دیا ہے۔

میں نے اس بحث کو دلچسپی سے پڑھا ہے۔ معلوم نہیں کہ صاحب تعلیمات اب آپ کی تنقید پر جواب کے بعد پھر کچھ تحریر فرمائینگے یا نہیں۔ ان کے سابق طرز عمل سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ بحث و مجادلہ میں طوالت کو پسند نہیں فرماتے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر یہ بحث یوں ہی چھوڑ دی گئی تو اس کے متعدد گوشے تشنۂ تکمیل رہ جائیں گے۔ لہٰذا میں نے جسارت کی ہے کہ ایسے مقامات جن سے کم از کم میں ابھی تک مطمئن نہیں ہو سکا۔ ترجمان کے صفحات پر پھیلا دوں تاکہ مزید تفحص و تدبر میرے اور میرے جیسے دیگر قلوب کے لئے اطمینان و ایقان کا موجب ہو سکے۔ ان فی ذالک لآیٰت لاولی الابصار۔

جن و انس | جنوں کے متعلق قرآن کریم میں یہ صراحت موجود ہے کہ وہ آتشیں مخلوق ہیں۔ انسانوں سے بالکل الگ۔ اس میں کسی شبہ یا اختلاف کے گنجائش نہیں۔ البتہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے معماروں، غوطہ خوروں اور غوطہ خوروں کے متعلق تعلیمات قرآن میں یہ حاشیہ دیا گیا ہے کہ "خیال ہو سکتا ہے کہ وہ انسانوں کا ایک طبقہ ہے"۔ اس کے خلاف ترجمان نے دو وجہیں بیان کی ہیں۔

(۱) غیر مادی مخلوق کو اللہ نے یہ قدرت عطا فرمائی ہے کہ وہ بشری شکل میں متشکل ہوں اور مرئی و محسوس بن جائیں۔ چنانچہ فرشتے حضرت ابراہیمؑ و حضرت لوطؑ اور حضرت مریمؑ کے سامنے انسانی شکل میں متشکل ہوئے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس سے آپ نے جو نتیجہ مستنبط فرمایا ہے کہ جن بھی بشری شکل میں متمثل ہو سکتے ہیں۔ یہ کیسے ثابت ہوگیا۔ اول تو حیرت ہے کہ جنوں کو آپ نے غیر مادی کیسے قرار دے دیا حالانکہ اُن کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے۔ اور آگ مادہ ہے۔ اور عناصر اربعہ مادیہ میں سے ایک عنصر۔ دوسرے یہ کہ قرآن کریم نے اُن کو غیر مرئی بتایا ہے۔

اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (۷: ۳)	حقیقت یہ ہے کہ وہ (ابلیس) اور اُس کا قبیلہ تم کو وہاں سے دیکھتا ہے جہاں سے تم اُس کو نہیں دیکھتے

اس لئے قرآن پاک کی اس شہادت کے خلاف محض فرشتوں کے پیکر بدلنے پر جنوں کو مرئی خیال کرنا جس کی کوئی مثال مثل تبدیل پیکر فرشتگان، قرآن نے نہیں دی، درست نہیں ہوگا۔ لہذا جب تک جنوں کا مرئی ہونا ثابت نہ ہو جائے، جنود سلیمانی کی مرئی و محسوس ہستیوں کو آتشیں جن ماننے کا قیاس مرجح نہیں ہو سکتا۔

(۲) دوسری وجہ یہ لکھی گئی ہے کہ ملکۂ سبا کے تخت حاضر کر دینے کا جس نے دعوٰے کیا تھا وہ آتشیں جن تھا۔ کیوں کہ انسان اس پر قادر نہیں کہ ایک گھڑی بھر کے عرصہ میں اتنے فاصلہ سے تخت لاسکے۔

لیکن انسان کے عدم قدرت کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے دراں حالیکہ قرآن کریم کے تمام شارحین اس شخص کو جس نے ملکۂ سبا کا تخت ایک لمحے میں منگا دیا تھا، جن نہیں قرار دیتے، انسان ہی قرار دیتے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ (۲۷: ۳)	اور اس شخص نے جس کے پاس کتاب کا علم تھا کہا کہ میں اس تخت کو آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے لادوں گا

اگر طرفۃ العین میں تخت لا دینے والا انسان ہو سکتا ہے تو گھڑی بھر میں لانے والا انسان کیوں نہیں ہو سکتا۔

ان توجیہات کی روشنی میں کیا آپ اس پر مزید غور فرمائینگے؟ اتنا اور بھی گذارش کر دوں کہ اگرچہ صاحب تعلیمات نے اپنے جواب میں شیطان اور ابلیس کے فرق کو واضح کر کے یہ بتایا تھا کہ ابلیس یقیناً جن ہے، لیکن چونکہ ہر شیطان ابلیس نہیں، اس لئے ہر شیطان جن بھی نہیں۔ شیاطین کا لفظ قرآن کریم میں انسانوں کے لئے بھی مستعمل ہوا ہے۔ لیکن آپ اپنی تنقید مزید میں والشیاطین کل بناء وغواص، کے ترجمہ میں شیاطین (یا جن) لکھ کر مفہوم پھر جنوں کے متعلق لے گئے ہیں۔ اگر ان شیاطین کو ہم انسان ہی مان لیں تو ان کے مرئی ہونے کی وجہ سے کیا یہ خیال قرآن کریم سے زیادہ قریب نہیں ہوگا؟ (باقی)

الجواب

حقیقت جن جنّ کی حقیقت کے متعلق شبہات کی ابتدا دور جدید میں غالباً انیسویں صدی کے وسط آخر میں ہوئی ہے۔ اس زمانہ میں محض کسی مذہبی کتاب کی سند پر کسی ایسی شئے کو موجود ماننا جس کے وجود کا کوئی سائنٹفک ثبوت موجود نہ ہو بڑے شرم کی بات ہو گئی تھی، اور ایسی شرمناک بات کا ارتکاب صرف وہی شخص کر سکتا تھا جو اس زمانہ کے اہل علم کی نگاہوں میں تاریک خیال اور توہم پرست کٹھ ملا بننے کے لئے تیار ہوتا۔ ان حالات میں ان مسلمانوں نے جو اپنی دنیوی ترقی کے لئے اپنے غیر مسلم آقاؤں اور پیشواؤں کی نگاہوں میں روشن خیال اور عقل پرست بننا ضروری سمجھتے تھے ایک نئی نگاہ سے قرآن مجید کا مطالعہ شروع کیا، اور ہر اس مسئلہ کو جسے ماننے کے لئے

انیسویں صدی کے مادّہ پرست بندگان حواس و پرستاران عادت آمادہ نہ ہوسکتے تھے ایسے عجیب طریقوں سے تاویل کے خراد پر چڑھایا کہ وہ مسئلہ قرآن سے خارج بھی نہ ہوا اور اُن لوگوں کے افکار و تخیلات کے مطابق ڈھل بھی گیا جو قرآن کی روح اور اس کے اصولِ اولیّہ سے بنیادی اختلاف رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں جن قرآنی ارشادات کو توڑا مروڑا گیا انہی میں سے ایک وہ ارشادات ہیں جو ابلیس، شیاطین اور جنوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کہا گیا کہ ان الفاظ سے کوئی ایسی مخلوق مراد نہیں ہے جو انسان سے الگ کوئی فوق الطبیعی وجود رکھتی ہو، بلکہ اُن سے کہیں تو انسان کی اپنی ہی قوتیں مراد ہیں، جنہیں شیاطین کہا گیا ہے، اور کہیں ان سے مراد وحشی اور جنگلی اور پہاڑی قومیں ہیں، اور کہیں اُن سے وہ لوگ مراد ہیں جو چھپ چھپ کر قرآن مجید سنا کرتے تھے۔ یہ تاویلات اتنی رکیک ہیں کہ اُن کا ارتکاب صرف وہی شخص کرسکتا ہے جو یا تو عربی زبان اور قرآن مجید کا تھوڑا سا علم بھی نہ رکھتا ہو، یا پھر اس کے دل میں خدا اور یوم آخر کے خوف سے زیادہ دنیا اور اہل دنیا کا خوف ہو لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جن حالات سے ہندوستان کے مسلمان گزرے ہیں ان میں یہ دونوں باتیں جمع ہوگئی تھیں، اس لئے ایسی اور اس سے بھی زیادہ رکیک تاویلات قرآن مجید میں کی گئیں اور طرفہ ماجرا یہ ہے کہ ادّعائے علم و حمایت اسلام کے ساتھ کی گئیں!

جس طرح انسان پر بہت سے دور گذر چکے ہیں اسی طرح یہ دور بھی گزر گیا۔ اب خود یورپ میں بھی ایک بڑا گروہ ایسا پیدا ہو چکا ہے جو روحانیت کا قائل ہے، اور اس محسوس و مرئی دنیا کے علاوہ ایک ایسے عالم کے وجود کو بھی مانتا ہے جو ہمارے حواس سے پوشیدہ ہے۔ اس لیے اب جن اور شیاطین کے مستقل وجود کو تسلیم کرنا اتنا خطرناک نہیں رہا ہے جتنا اب سے بیس پچیس برس پہلے تھا۔ تاہم ابھی اس دور کے اثرات بالکل زائل نہیں ہوئے ہیں، اور ابھی تک محض قرآن کی سند پر کسی ایسی بات کو ماننے سے دماغ انکار کر رہے ہیں جو فوق الطبیعی ہونے کے ساتھ خارق عادت

بھی ہو۔ یہ اسی دور کے بچے کھچے اثرات تھے جو تعلیمات قرآن میں ہم کو نظر آئے۔ مولانا اسلم جیراج پوری قرآن کے صریح ارشادات کو دیکھ کر یہ تو ماننے پر مجبور ہو گئے کہ "جن" سے مراد ایک آتشیں مخلوق ہے جو انسان سے علیحدہ وجود رکھتی ہے۔ لیکن قرآن میں جگہ جگہ جنوں کی طرف جو امور منسوب کیے گئے ہیں وہ چونکہ خارق عادت ہیں، اور ان کو بعینہٖ اس طرح ماننا جس طرح قرآن میں وہ بیان ہوئے ہیں، اقتضائے عقلیت کے خلاف محسوس ہوتا ہے، اس لیے انہوں نے کسی نہ کسی طرح تاویل کر کے جنوں کی دو قسمیں قرار دے لیں۔ ایک وہ مخصوص نوع کی مخلوق جو ناری الوجود ہے اور انسان سے اصلاً مختلف ہے۔ دوسرے انسانوں کا کوئی خاص طبقہ جس کے متعلق نہ وہ خود جانتے ہیں نہ کسی حوالہ سے بتا سکتے ہیں کہ وہ کون سا طبقہ ہے اور کس بنا پر "جن" کے نام سے موسوم ہو گیا؟

ہمارے دوست چوہدری غلام احمد صاحب پرویز الحمد للہ ان اثرات سے محفوظ ہیں مگر پھر بھی ایک مقام پر ان کو "جن" کے انسان ہونے کا شبہ ہو ہی گیا۔ وہ مولانا اسلم جیراج پوری کے اس خیال سے تو متفق نہیں ہیں کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں جن اور انس کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں جن سے مراد آتشیں جن نہیں بلکہ انسانوں ہی کا ایک طبقہ ہے، لیکن خاص کر حضرت سلیمان کے جنوں پر ان کو بھی شبہ ہے کہ وہ انسان ہی تھے آتشیں نہ تھے کیونکہ نظر آتے تھے اور انسانوں کی طرح غوطے لگاتے اور برتن بناتے تھے۔

ایک قاعدہ اس مسئلہ کی تحقیق میں آگے قدم بڑھانے سے پہلے ایک قاعدہ ذہن نشین کر لیجیے۔ اللہ تعالیٰ جب اپنی معلومات میں سے کسی ایسی شئے کو جو ہمارے دائرۂ علم و ادراک سے خارج ہے ہمارے علم میں لانا چاہتا ہے، تو لامحالہ وہ اس شئے کو ہماری زبان کے کسی ایسے ہی لفظ سے تعبیر کرتا ہے جس کو ہم نے اس معلوم الٰہی کے ساتھ قریب تر مناسبت رکھنے والی کسی چیز کے لئے وضع

کیا تھا تاکہ ہم اس شئے کا کسی حد تک صحیح تصور کر سکیں جو اللہ کے علم میں ہے اور ہمارے علم میں نہیں ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ حق تعالیٰ کسی چیز کو یونہی کسی مناسبت اور ربط معنوی کے بغیر کسی خاص لفظ سے موسوم کر دے، درانحالیکہ اس چیز کے لیے دوسرے الفاظ کو چھوڑ کر اس خاص لفظ کو ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو جس چیز کو "جنت" سے تعبیر کیا گیا ہے اس کے لیے لفظ "جنت" بمقابلہ "جہنم" کے اولیٰ نہ ہوتا، اور جس چیز کو "نور" سے تعبیر کیا گیا ہے اس کے لیے "نار" کا استعمال بھی اسی طرح جائز ہوتا۔

"جن" کی لغوی تحقیق

اس قاعدہ کے مطابق ہم کو سب سے پہلے لفظ "جن" کی تحقیق کرنی چاہیے کہ کلام عرب میں اس کو کس معنی کے لیے وضع کیا گیا تھا اور حق تعالیٰ نے جو اس کو اپنی ایک خاص مخلوق کے لیے دوسرے الفاظ کے مقابلہ میں ترجیح دی تو کس مناسبت کی بنا پر دی۔

"جن" کا مادہ ج ن ن ہے۔ اس مادہ کا مرکزی تصور "پوشیدگی" ہے، اور اس کے تمام مشتقات میں کسی نہ کسی طور پر یہ تصور ضرور پایا جاتا ہے۔ اصل الجن ستر الشئ من الحاسہ۔ (راغب) کل شئ ستر عنک فقد جن عنک (جمہرۂ ابن درید و لسان العرب)۔

اسی بنا پر جنان ہر چیز کے جوف کو کہتے ہیں جو نظر نہیں آتا۔ روح کو جنان اسلیے کہتے ہیں کہ جسم اسکو چھپائے ہوئے ہے۔ دل کو جنان اسلیے کہتے ہیں کہ وہ صندوق سینہ میں مستور ہے۔ حریم خانہ کو جنان اس لیے کہتے ہیں کہ وہ چہار دیواری سے چھپا ہوا ہے۔ باغ کو جنت اس لیے کہتے ہیں کہ درختوں کے جھنڈ اس کی زمین کو چھپا لیتے ہیں۔ اگر باغ میں یہ صفت نہ ہو تو اس کو جنت نہیں کہہ سکتے۔ بچہ جب تک ماں کے پیٹ میں ہے جنین ہے۔ رحم کو بھی جنین کہتے ہیں۔ میت جب دفن کر دی جائے تو وہ بھی جنین ہے۔ حتیٰ کہ ہر چیز جو چھپی ہوئی ہے اس پر جنین کا اطلاق ہوگا۔ چنانچہ چھپے ہوئے کینے کو حقد جنین کہا گیا ہے۔ قبر کو جنن کہتے ہیں۔ کفن کے لیے بھی یہ لفظ آیا ہے۔ دفن کرنے کے لیے اِجنان کا لفظ آتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے

ولی دفنه صلی اللہ علیہ وسلم و اجنانہ علی والعباس۔ پردے اور آڑ کو جُنّۃ کہتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے اتخذوا ایمانھم جُنّۃ "انہوں نے اپنی قسموں کو اس نفاق کے لیے پردہ بنالیا ہے جو وہ اپنے دلوں میں لیے ہوئے ہیں"۔ جنہ و جن علیہ، چھپالیا اس کو چنانچہ قرآن میں ہے فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْہِ اللَّیْلُ جب رات کی تاریکی اس پر چھا گئی۔

اِجنان کے معنی چھپا دینا اور استجنان کے معنی چھپ جانا۔ جنّ اللیل وجنان اللیل وجنون اللیل رات کی شدید تاریکی جو پردہ پوش ہوتی ہے۔ چنانچہ دُرید بن الصمہ کہتا ہے

ولولا جنون اللیل ادرک رکضنا

اور ہذلی کہتا ہے۔

حتی یجئ وجن اللیل یوغلہ

راز اور پوشیدگی کو بھی جن کہتے ہیں۔ مثل ہے لاجن بھذا الامر یعنی اس معاملہ میں کوئی راز نہیں ہے۔ جنّ الناس اور جنانُ الناس آدمیوں کی اُس بھیڑ کو کہتے ہیں جس میں اگر کوئی آدمی گھر جائے تو پتہ نہ چل سکے کہ کہاں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جنّ کے نام سے جس نوع مخلوقات کو موسوم کیا جائیگا وہ لازمی طور پر غیر محسوس یا کم از کم مستور ہونی چاہیے۔ جس مخلوق میں مستوری کی صفت نہ پائی جائے اُس کو اس نام سے کبھی موسوم نہ کیا جائیگا۔ تمام اکابر اہل لغت نے بالاتفاق یہی بات جنوں کی وجہ تسمیہ میں لکھی ہے۔ چنانچہ جمہرۂ ابن درید مفردات امام راغب صحاح قاموس لسان العرب تاج العروس غرض عربی زبان کی کسی مستند لغت کو اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ سب میں یہی لکھا ملیگا کہ "جن" اس نام سے اس لیے موسوم ہوئے کہ وہ نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں۔

کلام عرب کی شہادت لغت کے بعد کلام عرب پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ قرآن مجید نے

بطور خود یہ کوئی نئی اصطلاح وضع نہیں کی تھی۔ بلکہ اہل عرب پہلے سے ایک ایسی فوق الطبیعی مخلوق کو جن کے نام سے یاد کرتے تھے جو بالاصل غیر مرئی و غیر محسوس تھی مگر کبھی کبھی ان کو مختلف شکلوں میں نظر آتی تھی، اور جس کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ وہ غیر معمولی افعال پر قادر ہے، اور عالم طبیعت و اجسام پر مختلف طریقوں سے اثر انداز ہوتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ خاص خاص مقامات پر یہ مخلوق قابض ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایسے مقامات کو وہ ارض مجنۃ کہا کرتے تھے خالی مکانوں کے متعلق ان کا اعتقاد تھا کہ ان میں جنوں کا تسلط ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جو شخص کسی خالی مکان میں رات گذارتا تو اس کو کہتے کہ وہ رات جنوں کا مہمان تھا۔ اخطل کہتا ہے :-

وبتنا کاناً ضیف جن بلیلۃ

جہلائے عرب جب کوئی نیا مکان بنواتے تو پہلے وہاں جنوں کے لئے قربانی کرتے تاکہ وہ ساکنین مکان کو نہ ستائیں۔ اسی کی طرف حدیث میں اشارہ ہے کہ انہ نھیٰ عن ذبائح الجن "یعنی آپ نے جنوں کے لیے قربانی کرنے کی ممانعت کر دی"۔ جب کوئی انسان پاگل ہو جاتا تو یہ لوگ سمجھتے کہ اس پر جن مسلط ہو گیا ہے۔ اسی لیے اس کو مجنون کہتے تھے۔ قرآن مجید میں بھی ان کے اس خیال کو بیان کیا گیا ہے کہ افتریٰ علے اللہ کذباً ام بہ جنۃ (۳۴:۸) جب گائے پانی نہ پیتی تو اس کے نر کو مارا جاتا تھا۔ کیونکہ اعتقاد یہ تھا کہ جن اس کے سر پر سوار ہو جاتا ہے اور وہ مادہ کو پانی پینے سے روکتا ہے۔ ان کا وہم تھا کہ ایک جن ہر انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کو وہ "تابع" یعنی ہمزاد کہا کرتے تھے۔ ہر غیر معمولی چیز جنوں کی طرف منسوب کی جاتی تھی۔ چنانچہ جو شخص کام میں بہت تیز ہوتا اس کے متعلق وہ سمجھتے کہ جن اس میں سما جاتا ہے اس لئے اس کو جِنّی (یعنی منسوب بہ جن نہ کہ خود "جن") کہا جاتا تھا۔ ہر شاعر کا ایک خاص "جن" ہوتا تھا اور وہی اس کو شعر کہوایا کرتا تھا۔ جب کسی شخص کا زور ٹوٹ جاتا تو کہتے کہ نفث جنۃ

یعنی اس کا جن جس کے زور سے وہ کام کر رہا تھا، بھاگ گیا۔ جو عورت بہت جمیل ہوتی اس کو مجازاً جنیہ یعنی "پری" کہتے کیونکہ جنیات کا جمال ان کے نزدیک فوق الانسانی جمال تھا۔ وہ جنوں کی انہی فوق الانسانی صفات اور قدرتوں کی بنا پر خدا سے ان کا نسب ملاتے تھے چنانچہ قرآن میں ہے وجعلوا بینه وبین الجنة نسباً (۳۷: ۲) ان کو عبادت میں شریک کرتے بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ أَكْثَرُهُم بِهِم مُّؤْمِنُونَ (۳۴: ۵) وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوا لَهُ بَنِينَ وَبَنَاتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ (۶: ۲) مصیبت اور خوف کے وقت ان سے پناہ مانگتے تھے كان رجال من الانس يعوذون برجال من الجن (۷۲: ۱)۔ وہ ملائکہ کو بھی "جن" کہتے تھے۔ چنانچہ اعشیٰ کا قول ہے

وسخر من جن الملائك تسعة | قياما لديه يعملون بلا اجر

ان کے متعلق جہلائے عرب کا خیال تھا کہ یہ خدا کی بیٹیاں ہیں چنانچہ اسکی طرف متعدد مقامات پر قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً۔ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ إِنَاثًا (۴۳: ۲) اور أَفَأَصْفَاكُمْ بِالْبَنِينَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ إِنَاثًا (۱۷: ۴) ان قوی و کثیر شہادتوں کے مقابلہ میں ایک شہادت بھی کلام عرب سے ایسی نہیں دکھائی جا سکتی جس میں "جن" کا اطلاق حقیقی معنوں میں انسان پر کیا گیا ہو۔ بلکہ اس کے برعکس کلام عرب سے صریح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ عرب "جن" اور "انس" کو دو مختلف نوع کی مخلوقیں سمجھتے تھے۔ مثال کے طور پر بدر بن عامر کہتا ہے:۔

ولقد نطقت قوافیا انسیة | ولقد نطقت قوافی التجنین

اور عمران بن حطان الحروری کہتا ہے:۔

قد کنت عندك حولا لا يروعني | فيه روائع من انس ولا جان

اس کے بعد ائمہ لغت کی متفقہ شہادت ملاحظہ ہو۔ جوہری اپنی کتاب الصحاح میں کہتا ہے:۔
"الجن خلاف الانس سمیت بذلك لانها تخفی ولا تری۔"
ابن سیدہ کہتا ہے۔ الجن نوع من العالم سموا بذلك لاجتنانهم عن الابصار ولانهم استجنوا من الناس فلا یرون

ابن درید کہتا ہے :۔ "والجنُّ خلاف الانس"۔

چند مقدمات یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے چند باتیں واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں :۔

ایک یہ کہ لغت عرب میں لفظ جن کے وہی معنی ہیں جو ہماری زبان میں "چھپے ہوئے" اور "پوشیدہ" کے ہیں اس لفظ کو جب انواع مخلوقات میں سے کسی نوع کے لیے بطور اسم استعمال کیا جائیگا تو ضرور ہے کہ وہ کوئی ایسی نوع ہو جو عادتاً مخفی و مستور ہو حتیٰ کہ اس کا ظاہر اور نمایاں ہونا خرق عادت میں سے شمار کیا جائے نہ یہ کہ وہ عادتاً ظاہر اور نمایاں ہو جیسے انسان۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ لفظ سیّال کا اطلاق ہمیشہ ایسی ہی چیز پر کیا جائیگا جو عادتاً بہنے والی ہو، اور اگر کبھی وہ جامد پائی جائے تو اس کا جمود خلاف معمول شمار کیا جائے (مثلاً پانی) لیکن اگر کوئی شخص لفظ سیال کا اطلاق کسی ایسی چیز پر کرے جو عادتاً جامد ہو (مثلاً پتھر) اور جس کا جامد ہونا نہیں بلکہ سیّال ہونا خلاف معمول ہو تو آپ یقیناً حکم لگادیں گے کہ وہ شخص لفظ سیال کے معنی سے ناواقف ہے، اور لفظ کو اس کے غیر معنی موضوع لہ میں استعمال کر رہا ہے۔ اسی طرح اگر قرآن مجید میں لفظ "جن" (مخفی و مستور) کا اطلاق کسی ایسی مخلوق پر کیا جاتا جو عادتاً مخفی و مستور نہیں ہے، بلکہ اپنی فطرت کے اعتبار سے مرئی اور محسوس ہے (مثلاً انسان) تو نعوذ باللہ یہ اس بات کی دلیل ہوتی کہ اس کتاب کو پیش کرنے والا یا تو مجنون ہے یا لفظ "جن" کے معنی سے ناواقف ہے۔ یقین مانیے کہ ایسی صورت میں خواہ تمام عجم قرآن پر ایمان لے آتا مگر کوئی عرب تو کبھی اس پر ایمان نہ لاتا، کیوں کہ وہ "جن" کا بطور معجزہ وخرق عادت مرئی و محسوس بن جانا تو مان سکتا ہے، مگر یہ کبھی نہیں مان سکتا کہ مرئی و محسوس انسان کو "جن" کے لفظ سے تعبیر کیا جائے۔ جس وقت کفار عرب نے کہا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کوئی عجمی شخص قرآن سکھاتا ہے، تو اپنے اس دعویٰ کی تائید میں وہ کوئی دلیل پیش نہ کرسکے، اور جب قرآن نے ان کے اس الزام کا یہ جواب دیا کہ لِسَانُ الَّذِی یُلْحِدُونَ اِلَیْہِ

اعجمی وھذا لسان عربی مبین (۱۶ : ۱۴)
جس شخص کو یہ سکھانے والا بتاتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے حالانکہ قرآن جس زبان میں ہے وہ عربی مبین ہے" تو اس جواب کو سن کر تمام عرب کی زبانیں بند ہو گئی تھیں لیکن اگر کہیں اس وقت کفار عرب کو قرآن میں ایک مثال بھی ایسی مل گئی ہوتی جس میں لفظ "جن" کا اطلاق انسان پر کیا گیا ہوتا تو وہ پلٹ کر جواب دیتے کہ یہ کہاں کی لسان عربی مبین ہے جس میں "جن" کا اطلاق انسان پر کیا جارہا ہے۔

دوسرے یہ کہ عرب میں پہلے سے "جن" کا نام ایک ایسی فوق الطبیعی غیر جسمانی مخلوق کے لیے موضوع اور شائع و متعارف تھا جو عادتاً محسوس نہ ہوتی تھی جس کو کبھی کبھی وہ "سعالی" اور "غول" وغیرہ کی شکل میں دیکھتے تھے، اور جس کے متعلق ان کا اعتقاد تھا کہ وہ فوق الطبیعی انداز سے ان پر اثر انداز ہوتی ہے۔ پس جب قرآن نے اس شائع شدہ لفظ کو استعمال کیا تو لامحالہ اس کے معنی وہی لیے جائیں گے جن کے لیے وہ پہلے سے وضع کیا ہوا تھا اور شائع تھا۔ قرآن کا دعویٰ یہ تھا کہ "وہ عربی میں اتارا گیا ہے تاکہ عرب جو اس کے اولین مخاطب ہیں اس کو سمجھ سکیں" اِنَّا اَنزَلنٰہُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ (۱۲:۱)
یہ دعویٰ اسی صورت میں سچا ہو سکتا تھا کہ قرآن میں وہی الفاظ اور اصطلاحات اور انداز بیان استعمال کیے جاتے جو عرب میں رائج اور معروف تھے اور اگر اہل عرب کی زبان کے کسی لفظ کو معلوم و متعارف معنی کے سوا کسی خاص معنی میں استعمال کیا جاتا تو وہ اصل لغت کے خلاف نہ ہوتا اور اس خاص معنی کی تشریح کر دی جاتی کہ عرب اس کو سمجھ سکتے۔ لیکن آپ لفظ "جن" کے جو معنی بیان کرتے ہیں وہ نہ تو اصل لغت کے مطابق ہیں، نہ کلام عرب میں معلوم و متعارف ہیں اور نہ ان کی کوئی ایسی تشریح قرآن میں ملتی ہے جس سے واضح طور پر معلوم ہو جائے کہ اس نام کا وہ مسمّیٰ مراد نہیں ہے جو اہل عرب نزول قرآن کے وقت اس سے مراد لیتے تھے۔ کیا یہ بات قرآن کے اس دعویٰ کی تکذیب کو متضمن نہیں ہے

تیسرے قرآن میں جگہ جگہ عربوں کے اس اعتقاد باطل کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ جن اور ملائکہ کو خدائی میں شریک کرتے خدا سے ان کا نسب جوڑتے ان سے پناہ مانگتے اور ان کی عبادت کرتے تھے۔ پھر اس اعتقاد کا ابطال اس طرح کیا گیا ہے، کہ "جن" خدا کے شریک نہیں ہیں نہ اس کی اولاد ہیں، بلکہ وہ بھی اسی طرح کی ایک مخلوق ہیں جس طرح انسان اس کی مخلوق ہے۔ فرق یہ ہے کہ انسان مٹی کے ست سے پیدا کیا گیا ہے، اور "جن" آگ کی پھونک سے۔ مگر احکام خداوندی کے مخاطب دونوں ہیں، خدا کے سامنے جواب دہ ہونے میں دونوں برابر کے شریک ہیں، اور نافرمانی کی سزا دونوں کے لیے یکساں ہے۔ پس انسان کا ان کی عبادت کرنا محض ایک جاہلانہ فعل ہے۔ بلکہ اس میں انسان کے لیے ذلت بھی ہے، اس لیے کہ انسان ایک بالاتر نوع ہے۔ جنوں کے نمائندے ابلیس کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا، اور انکار کرنے پر راندۂ درگاہ کیا گیا، انسان کو رسالت کے بلند منصب پر سرفراز کیا گیا اور جنوں کو اس کے ذریعہ سے ہدایت دی گئی (واذ صرفنا الیک نفرا من الجن ۔ الآیہ (۴۶: ۴) قل اوحی الی انہ استمع نفر من الجن (۷۲: ۱)) انسانوں ہی میں سے ایک برگزیدہ ہستی (سلیمان علیہ السلام) کو یہ شرف عطا ہوا کہ جن اس کے تابع کیے گئے۔ یہ تمام باتیں عربوں کے اُن اعتقادات باطلہ کی تردید اسی صورت میں ہوسکتی ہیں جبکہ ان میں "جن" سے مراد وہی مخلوق ہو جس کو وہ خدائی میں شریک اور عبادت میں خدا کا ساجھی بناتے تھے لیکن اگر ان میں جن سے مراد انسان ہوں تو پھر یہ کسی طرح بھی ان اوہام کا ابطال کرنے والی نہ ہونگی، اور عربوں کے وہ اعتقادات اپنی جگہ پر رہیں گے جو وہ اپنے متصور جنوں کے متعلق رکھتے تھے۔

چوتھے اگر "جنوں" کے ذکر سے کسی خاص مقام یا بعض مخصوص مقامات پر قرآن کا مقصود در اصل انسانوں یا ان کے کسی خاص گروہ کا ذکر کرنا تھا، تو ان کو لفظ "جن" سے تعبیر کرنے کے لیے کونسی ضرورت داعی ہوئی تھی؟ کیوں نہ اُن کو لفظ انسان ہی سے تعبیر کیا گیا؟ خواہ مخواہ ایسے الفاظ استعمال کرنے کی کیا حاجت پیش آئی تھی جن سے ناری جن اور خاکی جن کے درمیان التباس واقع ہوتا؟ یہ وہ

بات ہے جس کو ہمارے زمانے کے اکثر اہل تاویل قرآنی الفاظ کے معنی بیان کرتے وقت نظر انداز کر جاتے ہیں۔ وہ اس پہلو پر کبھی غور نہیں کرتے کہ جب کسی خاص معنی کو بیان کرنے کے لیے معروف اور شائع الفاظ موجود ہیں اور خود قرآن نے بھی اس معنی کو بیان کرنے کے لیے حسب موقع وہی الفاظ استعمال کیئے ہیں، تو آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ کسی خاص مقام پر اُسی معنی کو بیان کرنے کے لیے (اگر واقع میں اس کا مقصود وہاں وہی معنی بیان کرنا ہو) بعض دوسرے الفاظ استعمال کرتا دراں حالیکہ وہ الفاظ اس معنی کے لیے شائع اور متعارف نہ تھے اور نہ ہیں۔ مثال کے طور پر اگر واقعہ یہی تھا کہ حضرت سلیمانؑ کو مصر سے یا دوسرے مقامات سے اعلیٰ درجہ کے غواص، ظروف ساز، معمار اور سنگ تراش آدمی فراہم کر کے دیے گئے تھے تو یہی کہہ دینے میں کونسا امر مانع تھا کہ ہم نے سلیمان علیہ السلام کو ایسے اور ایسے آدمی فراہم کر دیے تھے۔ کیا اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے پاس الفاظ کا کافی ذخیرہ موجود نہ تھا کہ مجبوراً اس کو "جن" اور "شیاطین" کے الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئی؟ کیا خود اللہ تعالیٰ نے آدمیوں کا ذکر کرنے کے مواقع پر ان کو انسان یا بنی آدم کے الفاظ سے تعبیر نہیں کیا ہے؟ اور اگر ان خاص آدمیوں میں کوئی خصوصیت ایسی تھی کہ اس کو "جن" اور "شیاطین" کے استعاروں میں ادا کرنا ضروری تھا تب بھی اس تصریح میں کیا چیز مانع تھی کہ یہ "جن" "بنی آدم" سے تھے؟

قرآن میں معنی جن کی تصریح

ان مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب دیکھیے کہ قرآن مجید نے لفظ "جن" کو کس معنی میں استعمال کیا ہے۔ آپ تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن میں "جن" اور "انسان" کی تخلیق الگ الگ بیان کی گئی ہیں، اور بالفاظ صریح ایک جگہ نہیں، متعدد جگہ بتایا گیا ہے کہ "جن" ایک ناری الاصل مخلوق ہے اور "انسان" ارضی الاصل ہے۔ لفظ "جن" کو استعمال کرنے کے ساتھ جب اس کے معنی کی یہ تصریح بھی خود قرآن ہی نے کر دی ہے تو عقل یہ چاہتی ہے کہ جہاں کہیں وہ لفظ استعمال ہو، وہاں اس کے وہی معنی لیے جائیں جن کی تصریح

کی جا چکی ہے[1]۔ اس کے خلاف کوئی اور معنی لینے کے لیے ضروری ہے کہ یا تو اس دوسرے معنی کی بھی کوئی ویسی ہی تصریح قرآن میں موجود ہو، یا پھر آپ کے پاس ایسے قوی دلائل ہوں جن کی بنا پر قرآن کی تصریح کے خلاف معنی میں اس لفظ کو لینا جائز ہو۔ اگر پہلی صورت ہے تو براہ کرم کوئی ایک ہی آیت ایسی پیش فرمائیے جس میں "جن" بہ معنی "انسان" کی ویسی ہی تصریح ہو جیسی کہ "جن" بہ معنی مخلوق آتشیں کی تصریح ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ہم کو حق ہے کہ آپ کے دلائل کا جائزہ لیکر دیکھیں کہ آیا وہ اس حد تک قوی ہیں کہ قرآن نے "جن" کے جس معنی کی تصریح کی ہے اُس کو چھوڑ کر آپ کے تجویز کردہ معنی کو قبول کیا جائے؟

جن بہ معنی انسان کی پہلی دلیل

مولانا اسلم جیراج پوری نے جس بنا پر "جن" کے انسان ہونے کا گمان کیا ہے وہ خود ان کے الفاظ میں یہ ہے:۔

> "جن کا لفظ قرآن میں صرف مکی سورتوں میں آیا ہے۔ مدنی سورتوں میں کہیں نہیں آیا۔ اور انس کا لفظ بلا جن کے سارے قرآن میں کہیں مستعمل نہیں ہوا ہے۔ اس سے خیال ہو سکتا ہے کہ جن وانس کے الفاظ جہاں جہاں ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں جن کے معنی اس آتشیں جن کے نہیں ہیں بلکہ انسانوں ہی کے ایک طبقہ کے ہیں۔"

میں پوچھتا ہوں کیا یہ کوئی دلیل ہے؟ کسی سورت کے مکی یا مدنی ہونے اور جن کے ساتھ انس کا لفظ آنے یا نہ آنے کو لفظ "جن" کے معنی میں آخر کس قسم کا دخل حاصل ہے؟ آپ ان تمام آیتوں کو

---

[1] بلاشبہ قرآن میں دو جگہ "جان" کا لفظ "سانپ" کے معنی میں بھی آیا ہے، لیکن اول تو خود قرآن ہی میں دوسری جگہ اس چیز کیلئے ثعبان اور حیۃ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن سے معلوم ہو گیا کہ وہاں جان کا لفظ کس معنی میں آیا ہے۔ دوسرے لفظ جان بمعنی سانپ عربی میں مشہور

نکال کر دیکھ لیجیے جن میں "جن" اور "انس" کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں کسی جگہ بھی آپ کوئی اشارہ ایسا نہ پائینگے جو انس کے عام اور جن کے خاص ہونے پر دلالت کرتا ہو۔ جہاں کہیں جن اور انس کے الفاظ معطوف و معطوف علیہ کی حیثیت سے آئے ہیں وہاں حرف عطف نہ تو عطف العام علی الخاص یا عطف الخاص علی العام کے طور پر آیا ہے اور نہ عطف الشئ علی مرادفہ کے طور پر۔ ان تینوں قسموں میں سے کسی قسم کے عطف کا حکم لگانے کے لئے ضروری ہے کہ سامع کو پہلے سے اس کا علم ہو کہ معطوف و معطوف علیہ میں سے ایک عام ہے اور دوسرا خاص یا دونوں مرادف ہیں۔ مثلاً رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ میں سامع خود سمجھ سکتا ہے کہ عطف، عطف العام علی الخاص کے قبیل سے ہے۔ یا وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ۔ میں صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ عطف الخاص علی العام کے قبیل سے ہے۔ یا الفی قولہ کذباً و مینًا میں عطف کا عطف الشئ علی مرادفہ کے قبیل سے ہونا ہر وہ شخص جانتا ہے جو "کذب" اور "مین" کے معنی سے واقف ہے۔ پس جب جن و انس میں یہ تینوں صورتیں نہیں ہیں تو لامحالہ یہ ماننا پڑیگا کہ ان دونوں کے درمیان واو عطف مطلق معیت کے لیے ہے۔ کیونکہ لغت سے یا عرف سے یا کسی قرینۂ عقلی سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان دونوں کے درمیان عموم و خصوص یا ترادف کا تعلق ہے۔ اگر قرآن کی اصطلاح خاص میں ان دونوں کے درمیان عموم و خصوص کا تعلق ہوتا اور پھر بغیر کسی تصریح کے وہ ان دونوں کے درمیان محض واو عطف استعمال کرتا تو یہ اس کے بیان کا نقص ہوتا۔ اس مقصد کے لیے اس کو کم از کم الانس والجن منہم ہی کہنا چاہیے تھا کہ سامعین کو معلوم ہو جاتا کہ جن کے نام سے جس گروہ کو یاد کیا جا رہا ہے وہ لغت اور عرف عام کے خلاف، انسانوں ہی کا ایک گروہ ہے۔

لیکن ہم کو عطف و معطوف کی بحث میں بھی پڑنے کی ضرورت نہیں۔ مدعی کا دعویٰ ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں جن اور انس کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں جن سے مراد انسانوں

ہی کا ایک طبقہ ہے۔ اب آپ ان تمام آیات کو پڑھ جائیے جن میں یہ دونوں لفظ ایک جا استعمال ہوئے ہیں اگر خود انہی میں متعدد آیتیں آپ کو ایسی مل جائیں جن میں ان دونوں گروہوں کی مغایرت صاف نظر آتی ہو تو یہی کا دعویٰ آپ باطل ہو جائیگا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ مِن نَّارِ السَّمُومِ (۱۵: ۳)	ہم نے انسان کو کالے سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا اور اس سے پہلے جنوں کو ہم نے لُو کی گرمی سے پیدا کیا تھا۔
خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ وَخَلَقَ الْجَانَّ مِن مَّارِجٍ مِّن نَّارٍ (۵۵: ۱)	اس نے انسان کو ٹھیکری کی طرح کی بجتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا اور جنوں کو آگ کی لپٹ سے
فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْأَلُ عَن ذَنبِهِ إِنسٌ وَلَا جَانٌّ (۵۵: ۲)	بس اس روز اس کے گناہ کی بابت نہ کسی انسان سے پوچھا جائیگا اور نہ کسی جن سے
لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ (۵۵: ۳)	ان سے پہلے اُن حوروں کو نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہوگا اور نہ کسی جن نے۔
كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (۷۲: ۱)	انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ پکڑتے تھے۔
وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلَائِكَةِ أَهَٰؤُلَاءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ ۔ قَالُوا سُبْحَانَكَ أَنتَ وَلِيُّنَا مِن دُونِهِم ۔ بَلْ كَانُوا	جس روز اللہ تعالیٰ اُن سب کو جمع کریگا پھر ملائکہ سے پوچھے گا کیا یہ لوگ تمہیں کو پوجا کرتے تھے؟ وہ عرض کرینگے تو پاک ہے ہمارا ولی تو ہے نہ کہ یہ۔ دراصل یہ لوگ ہماری نہیں بلکہ جنوں کی پرستش کیا کرتے تھے اور

يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ۔ (۵:۳۴)۔	ان میں سے اکثر درحقیقت انہی پر ایمان رکھتے تھے۔
وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (۵:۳۷)۔	اور انہوں نے خدا کے اور جنوں کے درمیان رشتہ جوڑ رکھا تھا۔
وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ وَقَالَ اَوْلِيٰٓـؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا (۵:۶)۔	اور جس دن خدا ان سب کو جمع کریگا تو فرمائے گا اے گروہ جن تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنے دام میں گرفتار کرلیا۔ اور انسانوں میں سے جو اُن کے دوست ہیں وہ کہیں گے کہ پروردگار ہم میں سے بعض نے بعض سے خوب فائدہ اٹھایا اور اب ہم اس مدت کو پہنچ گئے جو تونے ہمارے لیے مقرر کی تھی۔

ان آیات سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہ کہ جن اور انس دو الگ اور متباین الحقیقت گروہ ہیں؟ یا یہ کہ ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کا ایک جزء ہے؟

دوسری دلیل دوسری دلیل جس میں آپ اور مولانا اسلم جیراج پوری متفق ہیں یہ ہے کہ ابلیس اور اس کی ذریت کو جو حسب تصریح قرآن "جن" ہیں، اللہ تعالیٰ نے غیر مرئی بیان کیا ہے۔ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (۷:۳) بخلاف اس کے حضرت سلیمان کے پاس جو جن تھے، وہ نظر آتے تھے اور انسانوں کے سے کام کرتے تھے۔ لہٰذا حضرت سلیمانؑ والے جن وہ آتشیں جن نہیں ہیں، بلکہ انسان ہیں۔

اس کے جواب میں بڑی آسانی کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ والے جنوں کے متعلق

قرآن میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ وہ نظر آتے تھے، انسانی شکل میں تھے، اور حضرت سلیمانؑ کے علاوہ عام لوگ بھی ان کو دیکھتے تھے لہٰذا قرآن کی جو آیت آپ پیش فرما رہے ہیں وہ اُن آیات کے خلاف نہیں ہے جن میں حضرت سلیمان والے جنوں کا ذکر آیا ہے۔ رہا آپ کا یہ گمان کہ وہ انسانوں کے سے کام کرتے تھے، تو یہ بھی قرآن سے ثابت نہیں۔ قرآن میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ وہ انسانوں کی طرح پانی میں غوطے لگاتے تھے، یا انسانوں کی طرح برتن اور عمارتیں بناتے تھے، یا انسانوں کی طرح باندھے جاتے تھے۔ وہاں تو مطلقاً غواصی اور ظروف سازی اور معماری وغیرہ کا ذکر ہے، اور محض اس ذکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ غواصی وغیرہ انسانوں کی سی غواصی وغیرہ تھی، تاوقتیکہ یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ غواصی بغیر اس طریقے کے ممکن نہیں ہے جس طریقہ سے انسان غوطہ لگاتا ہے، اور ظروف سازی وغیرہ امور انہی طریقوں میں منحصر ہیں جنہیں انسان استعمال کرتے ہیں۔ اگر محض یہ بات کہ جو فعل انسان کرتا ہے وہ کسی ہستی کی طرف منسوب کیا گیا ہے، یہ حکم لگانے کے لیے کافی ہو کہ وہ ہستی لامحالہ انسان ہی ہونی چاہیے، تو ایک شخص نعوذ باللہ خود اللہ تعالیٰ کو انسان کہہ سکتا ہے، کیوں کہ قرآن میں بعض وہ افعال جو انسان کرتے ہیں، خدا کی طرف منسوب کیے گئے ہیں۔ مثلاً بولنا۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر اس پہلو سے قطع نظر کر کے یہ بھی مان لیا جائے کہ وہ انسانوں کی طرح نظر آتے تھے، اور انسانوں ہی کی طرح وہ سب افعال کرتے تھے جن کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے، تب بھی جو آیت آپ پیش فرما رہے ہیں اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس گروہِ مخلوقات سے خارج تھے جو نظر نہیں آتا، اس لیے کہ کسی مخلوق کا ایسا ہونا کہ وہ انسان کو نظر نہ آئے، اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ اس کا نظر آنا ممکن ہی نہ ہو، اور بطورِ خرقِ عادت بھی وہ نظر نہ آ سکے۔ قرآن مجید میں شیاطین جن کے غیر مرئی ہونے کی صفت تو صرف ایک ہی جگہ بیان ہوئی ہے۔ مگر ملائکہ

کی اس صفت کا متعدد مقامات پر ذکر آیا ہے مثلاً

إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ (۸: ۶)	یعنی شیطان نے اپنے اولیار سے کہا کہ میں فرشتوں کی وہ فوجیں دیکھ رہا ہوں جو تم کو نظر نہیں آتیں۔
فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا (۹: ۶)	پھر اللہ نے اپنی سکینت اُس پر اتاری اور ایسے لشکروں سے اس کی تائید کی جن کو تم نہ دیکھتے تھے۔
وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا (۹: ۴)	اور وہ لشکر اُتارے جن کو تم نہ دیکھتے تھے۔
إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا (۳۳: ۲)	جب تم پر فوجیں حملہ آور ہوئیں تو ہم نے ان پر آندھی بھیجی اور وہ لشکر بھیجے جو تم کو نظر نہ آتے تھے
يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلَائِكَةَ لَا بُشْرَىٰ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِينَ (۲۵: ۳)	جس روز یہ لوگ ملائکہ کو دیکھینگے اس روز مجرموں کی خیر نہ ہوگی۔

اس کے باوجود متعدد مواقع پر قرآن مجید ہی نے بیان کیا ہے کہ ملائکہ انسانی شکل میں آئے ہیں، نہ صرف انبیا بلکہ عام انسانوں تک نے ان کو دیکھا ہے اور ان کی باتیں سنی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان بہت سی مستثنیٰ مثالوں کو دیکھ کر آپ نے ملائکہ کے متعلق بھی کیوں نہ کہہ دیا کہ ان سے مراد بھی انسانوں ہی کا ایک طبقہ ہے؟ غیر مرئی ہونے میں دونوں برابر۔ انسانی شکل میں ظاہر ہونے کے واقعات ملائکہ میں متعدد اور جنوں میں صرف ایک، باوجود اس کے تعجب ہے کہ آپ ملائکہ کے متعلق تو تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے بطور معجزہ وخرق عادت بار بار وہ انسانی صورت اختیار کرتے رہے ہیں لیکن جنوں کے متعلق اس قسم کا ایک واقعہ سن کر آپ کا ذہن اس طرف نہیں جاتا کہ حضرت سلیمانؑ کی غیر معمولی دعا کو قبول کرکے جس طرح اللہ تعالیٰ نے

خرق عادت کے طور پر ہوا اور پرندوں کو اُن کے تابع کیا تھا اور اُن کو جانوروں کی بولیاں سکھائی تھیں اُسی طرح بطور خرق عادت اس نے جنوں کو بھی مرئی اور محسوس بنا دیا ہوگا۔ بلکہ اس کے برعکس آپ قرآن کی تمام تصریحات اور لغت عرب کے خلاف یہ تاویل کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں کہ صرف اس خاص موقع پر انسانوں کو "جن" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور مولانائے جیراج پوری تو اس ایک مثال سے فائدہ اٹھا کر انسانوں کی ایک مستقل قسم کا نام ہی جن فرض کر لیتے ہیں درآں حالیکہ اس کے لیے کوئی قوی ثبوت اُن کو قرآن سے نہیں ملا اور اس کے خلاف قرآن مجید کی صریح آیات اور کلام عرب کی واضح شہادتیں موجود ہیں اتنی بڑی ذمہ داری کا بار اٹھانے سے پہلے کیا اس بات پر غور کر لینا بہتر نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا ایک غیر مرئی مخلوق کو مرئی بنا دینا کونسا ایسا مستبعد اور محال امر ہے کہ اس سے بچنے کے لئے اتنی مشقت اور اتنے تکلف کی حاجت پیش آئے؟ جب آپ نے ملائکہ جیسی لطیف مخلوق کا مرئی ہو جانا مان لیا تو شیاطین جیسی کثیف مخلوق کے مرئی ہو جانے میں آپ کو اتنا استبعاد کیوں محسوس ہوتا ہے؟ قرآن مجید میں جنوں کی جو کچھ حقیقت بیان کی گئی ہے وہ اس سے زیادہ نہیں کہ وہ ایک آتشیں مخلوق ہیں لیکن جبریل فرشتے کے متعلق تو یہ کہا ہے کہ وہ "روح" اور وہ بھی روح اللہ ہیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۹:۳)۔	پھر ہم نے اس کے پاس اپنی روح کو بھیجا اور وہ اس کے سامنے اچھے خاصے آدمی کی شکل میں نمودار ہوئی
وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ (۲۶:۱۱)۔	یہ قرآن رب العالمین کا اتارا ہوا ہے۔ اس کو لیکر روح الامین اترا ہے۔

جب "روح اللہ" جیسی مجرد از عوارض مادّہ شئے کا باذن الٰہی مرئی ہو جانا ممکن ہے تو "نار السموم" جیسی چیز کا جو مادّے اور مادّی تکاثف سے قریب تر

لئے[1] جسمیت اختیار کر لینا کیوں ناممکن یا بعید از عقل وقیاس ہے کہ اس سے بچنے کی خاطر قرآن میں تاویلات بعیدہ کا دروازہ کھولا جائے۔ قرآن کی رو سے تو صرف باری تعالیٰ ہی کی ذات ایسی ہے کہ انسان کی نگاہیں اس دنیا میں اس کو نہیں دیکھ سکتیں، لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ (۶: ۱۰۳) اور قَالَ رَبِّ أَرِنِي أَنْظُرْ إِلَيْكَ قَالَ لَنْ تَرَانِي (۷: ۱۴۳) یہ صفت بالذات صرف خدائے تعالیٰ کے لیے ہے۔ باقی جتنی مخلوقات ہیں ان میں سے کسی کے لئے بھی یہ صفت بالذات نہیں ہے۔ البتہ بعض کو اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ عادۃً وہ نظر نہیں آتیں لیکن اگر خدا چاہے تو وہ اس پر قادر ہے کہ خواہ اُن کو مرئی کردے یا ہماری نظروں کو اتنا تیز کر دے کہ ان کی لطیف تر صورتوں کو دیکھ سکیں۔

تیسری دلیل | آپ نے اور مولانا اسلم جیراج پوری نے اس بات سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے پاس جو غوطہ خور اور معمار وغیرہ تھے ان کو "شیاطین" کہا گیا ہے۔

---

[1] جنوں کی تخلیق جس آگ سے ہوئی ہے وہ میرے نزدیک وہ آگ نہیں ہے جو کیمیاوی استحالات سے مادی اجسام میں پیدا ہوتی ہے، بلکہ وہ ایک خاص طور کی آگ ہے ہماری ان مادی آگوں سے مختلف چونکہ انسانی زبان میں اس کو تعبیر کرنے کے لیے "نار" سے زیادہ اقرب کوئی لفظ نہ تھا اس لئے حق تعالیٰ نے اس کو اس لفظ سے تعبیر فرمایا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اللّٰهُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ سے مراد وہ شعاع نہیں ہے جو مادی نیرات سے نکلتی ہے، بلکہ ایک غایت درجہ مجرد اور منزہ حقیقت ہے جس کے تصور سے انسان کے ذہن کو روشن کرنے کے لیے لفظ "نور" سے زیادہ اقرب اور کوئی لفظ نہیں۔ تاہم اگر آپ کی یہ رائے مان لی جائے کہ "جن" اسی مادی آگ کے بنے ہوئے ہیں جو عناصر اربعہ میں سے ایک ہے، تو روحانی فرشتوں کے مقابلہ میں ان مادی جنوں کا مرئی محسوس بن جانا تو اور بھی زیادہ قریب از عقل وقیاس ہے۔

اور شیاطین کا اطلاق جنوں کی طرح انسانوں پر بھی کیا گیا ہے، اس لئے آپ کہتے ہیں کہ ان معماروں اور غوطہ خوروں کو ان کے مرئی ہونے اور انسانوں کے سے کام کرنے کی بنا پر شیاطین الانس کیوں نہ سمجھا جائے؟

اس کو دلیل کے بجائے میں صرف غلط فہمی کہوں گا۔ اول تو قرآن مجید میں حضرت سلیمانؑ کے کاریگروں اور خادموں کے لیے صرف شیاطین ہی کا لفظ نہیں آیا ہے بلکہ "جن" کا لفظ بھی آیا ہے مثلاً

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ (۲۷: ۲) ۔	اور سلیمان کے لئے اس کے لشکر از قسم جن وانس وپرند جمع کیے گئے ۔
وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ..... يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ..... فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ (۳۴: ۲) ۔	اور جنوں میں سے جو اس کے (یعنی حضرت سلیمانؑ) کے آگے اس کے رب کے اذن سے کام کرتے تھے ..... جو کچھ وہ چاہتا وہ اس کے لیے بناتے تھے، بڑی بڑی عمارتیں اور مورتیں اور لگن کی طرح کے حوض اور ایک جگہ جمی رہنے والی بھاری دیگیں ..... جب ہم نے سلیمانؑ پر موت کا فیصلہ کر دیا تو ان کو اس کی موت کی خبر جس چیز نے دی وہ کچھ اور نہ تھا محض زمین کا کیڑا تھا جو سلیمان کے عصا کو کھا رہا تھا جب سلیمان گر پڑے تب ان جنوں پر یہ راز کھلا کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اتنی مدت تک اس ذلت غلامی کے عذاب میں نہ رہتے ۔

ــــــــ

لـه یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں "جن" کے ساتھ انس کا لفظ نہیں آیا ہے۔ اور یہ بھی اشارہ ہے کہ (بقیہ نوٹ صفحہ ۵۶ ملاحظہ ہو)

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ غوطہ خور اور معمار شیاطینِ جن کی قسم سے تھے شیاطین الانس نہ تھے۔

دوسرے یہ بات آپ کی اور مولانا کی نظر سے پوشیدہ رہ گئی کہ قرآن مجید میں کہیں مطلقاً الشیطان اور الشیاطین بول کر انسان مراد نہیں لئے گئے ہیں، بلکہ ابلیس اور اس کی ذریت مراد لی گئی ہے۔ ہاں اگر کہیں انسانوں کے کسی گروہ کے لیے شیاطین کا لفظ بطور صفت استعمال کیا گیا ہے، تو ایسے ہر موقع پر صراحتہً یا کنایتہً یہ بتا دیا گیا ہے کہ وہاں شیاطین سے مراد انسان ہیں جیسے جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ (۶: ۴) اور وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ (۲: ۲)۔

ایمان بالکتاب کا مقتضیٰ

اس بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ کوئی ایسی قوی دلیل موجود نہیں ہے جس کی بنا پر سیدنا سلیمان علیہ السلام کے قصہ میں یا کسی دوسرے مقام پر لفظ "جن" کے معنی متعین کرنے میں اُس معنی سے انحراف کرنا جائز ہو جس کی تصریح خود قرآن مجید متعدد مواقع پر کر چکا ہے۔ اور جب ایسا نہیں ہے تو کسی شخص کے لیے جو قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے پر ایمان رکھتا ہو، یہ جائز نہیں کہ جس کو خدا نے "جن" کہا ہے اور آدمی نہیں کہا اس کو وہ اپنے قیاس سے

یہی وہ جن تھے جن کو غیب دانی کا گھمنڈ تھا۔ انہی جنوں میں سے ایک گروہ بعد میں نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سن کر اپنے دوسرے ہم قوموں سے کہتا ہے کہ اب ہمارے غیب دانی کے وسائل ہم سے چھن گئے ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ وَأَنَّا لَمَسْنَا السَّمَاءَ فَوَجَدْنَاهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيدًا وَشُهُبًا وَأَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَسْتَمِعِ الْآنَ يَجِدْ لَهُ شِهَابًا رَصَدًا (۷۲: ۱)۔ اس آیت میں غیب کی خبریں حاصل کرنے کی جو صورت بیان کی گئی ہے وہ انسان کی سمجھ میں بھی نہیں آتی کجا کہ کوئی انسان اس پر قادر ہو۔

آدمی کہہ دے ایسا قیاس کرنے کے لیے اگر کوئی سبب داعی ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ عادت جاریہ جس کا مشاہدہ اور ادراک کرنے کے ہم خوگر ہیں اُن واقعات کے خلاف ہے جو بعض مواقع پر قرآن مجید میں جنوں کی طرف منسوب کیے گئے ہیں لیکن اسی طرح آگ کا ایک خاص شخص کے لیے سرد ہو جانا لکڑی کا ایک خاص موقع پر اژدہا بن جانا دریا کا ایک خاص وقت میں پھٹ کر راستہ دے دینا ایک شخص کا مٹی کے پرند بنا کر اُن میں جان ڈال دینا اور مردوں کو زندہ کر دینا چند آدمیوں کا ایک غار میں ۳۰۹ برس تک پڑے سوتے رہنا اور پھر بھی زندہ رہنا ایک شخص کا مرنے کے سو برس بعد جی اٹھنا اور اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو جوں کا توں بالکل تازہ حالت میں پانا ایک شخص کا ساڑھے نو سو برس تک زندہ رہنا اور وہ بھی یوگ کی مشقوں سے نہیں بلکہ ایک منکر قوم کے مقابلہ میں تبلیغ دین کی تھکا دینے والی مشقتوں کے ساتھ یہ اور ایسے ہی متعدد واقعات ہیں جو قرآن مجید میں بیان کیے گئے ہیں اور سب اُس عادت جاریہ کے خلاف ہیں جس کو دیکھنے کے ہم خوگر رہے ہیں۔ اگر ہم قرآن کو خدائے علیم و خبیر اور قادر و توانا کا کلام نہ مانیں تو سرے سے ان واقعات کی تاویل ہی کرنے کی ضرورت نہیں محض اس بنیاد پر ہی ان سب کو جھٹلایا جا سکتا ہے کہ ایسا ہوتے ہم نے کبھی نہیں سنا اور نہ دیکھا۔ اور اگر ہم یہ مان لیں کہ قرآن اُس خدا کا کلام ہے۔ جو ازل سے ابد تک عالم وجود کے ہر چھوٹے بڑے واقعہ کا حقیقی علم رکھتا ہے اور خدا وہ خدا ہے جس کے معجزے ہم کو سورج اور سیاروں اور زمین اور خود اپنے وجود میں ہر آن نظر آرہے ہیں، تو ہمیں کسی غیر معمولی اور خلاف عادت واقعہ کو بعینہٖ اُسی طرح تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہو سکتا جس طرح وہ قرآن میں بیان ہوا ہے۔ یہ واقعات تو کیا چیز ہیں، اگر قرآن میں کہا گیا ہوتا کہ ایک وقت میں چاند کو ماؤنٹ ایورسٹ پر لا کر رکھ دیا گیا تھا اور کسی وقت خدا نے سورج کو مشرق کے بجائے مغرب سے نکالا تھا تب بھی ایک مومن صادق کو اس بیان کی صداقت میں ایک لمحہ کے لیے شک نہ ہو سکتا تھا، اور نہ کسی طرح تاویل کر کے اس کو عادت جاریہ کے مطابق

ثابت کرنے کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔ اس لئے کہ یہ کائنات جس کی وسعت کا تصور کرنے سے ہمارا دماغ تھک جاتا ہے، اور اس کائنات کی ہر شئے حتیٰ کہ گھاس کا ایک تنکا اور کسی جانور کے جسم کا ایک بال بھی اپنی پیدائش میں درحقیقت اُتنا ہی حیرت انگیز اور اعجاز نما ہے جتنا چاند کا الٹ جانا اور سورج کا مغرب سے طلوع ہونا۔ فرق اگر کچھ ہے تو صرف یہ کہ ایک قسم کے واقعات کو دیکھنے کی ہمیں عادت ہوگئی ہے، اس لیئے ہم کو اُن کے معجزہ ہونے کا شعور نہیں ہوتا، اور دوسری قسم کے واقعات شاذ ہیں اس لیے اُن کی خبر جب ہم کو دی جاتی ہے تو ہمیں اچنبھا ہوتا ہے اور ہماری عقل جو صرف مشاہدات و تجربات پر اعتماد کرنے کی خوگر ہوگئی ہے ان کو باور کرنے میں جھجکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے واقعات کے متعلق جب ہم کو کوئی خبر دی جائے تو ہمیں حق ہے کہ ان کے وقوع کے متعلق قابل وثوق شہادت طلب کریں لیکن ایک مومن کے لیے قرآن سے بڑھ کر قابل وثوق شہادت اور کوئی نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ اس پر ایمان رکھتا ہے کہ یہ کتاب خدا کا کلام ہے، اور خدا کے فعل پر خود خدا ہی کی شہادت سب سے زیادہ معتبر ہے۔ البتہ جو شخص قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں شک رکھتا ہو اس کو حق ہے کہ قرآن کے ہر بیان میں شک کرے، خواہ وہ عادت جاریہ کے موافق ہو یا مخالف۔ (باقی)

فہرست مضامین

ماہ ذی القعدہ ۱۳۵۳ھ جلد ۵ عدد ۵

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

قوم دو طبقوں پر مشتمل ہوا کرتی ہے۔ ایک طبقۂ عوام، دوسرا طبقۂ خواص۔ طبقۂ عوام اگرچہ کثیر التعداد ہوتا ہے، اور قوم کی عددی قوت اسی طبقہ پر مبنی ہوتی ہے، لیکن سوچنے اور رہنمائی کرنے والے دماغ اس گروہ میں نہیں ہوتے۔ نہ یہ لوگ علم سے بہرہ ور ہوتے ہیں، نہ ان کے پاس مالی قوت ہوتی ہے، نہ یہ جاہ و منزلت رکھتے ہیں، نہ حکومت کا اقتدار ان کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ اس لیے قوم کو چلانا ان لوگوں کا کام نہیں ہوتا، بلکہ محض چلانے والوں کے پیچھے چلنا ان کا کام ہوتا ہے۔ یہ خود راہیں بنانے اور نکالنے والے نہیں ہوتے بلکہ جو راہیں ان کے لیے بنا دی جاتی ہیں انہی پر چل پڑتے ہیں۔ راہیں بنانے اور ان پر پوری قوم کو چلانے والے دراصل خواص ہوتے ہیں، جن کی ہر بات اور ہر روش اپنی پشت پر دماغ، دولت، عزت اور حکومت کی طاقتیں رکھتی ہے، اور قوم کو طوعاً و کرہاً انہی کی پیروی کرنی پڑتی ہے۔ پس یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ قوم کی اصلی طاقت اس کے عوام نہیں بلکہ خواص ہوتے ہیں۔ انہی پر قوم کے بننے اور بگڑنے کا مدار ہوتا ہے۔ ان کی راست روی پوری قوم کی راست روی اور ان کی گمراہی پوری قوم کی گمراہی پر منتج ہوتی ہے۔ جب کسی قوم کی بہتری کے دن آتے ہیں تو ان میں ایسے خواص پیدا ہوتے ہیں جو خود راہ راست پر چلتے اور پوری قوم کو اس پر چلاتے ہیں۔ وَجَعَلۡنٰھُمۡ اَئِمَّۃً یَّھۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡھِمۡ فِعۡلَ الۡخَیۡرٰتِ (۲۱:۵)۔ اور جب کسی قوم کی تباہی کا زمانہ آتا ہے تو اس کے بگاڑ کی ابتدا اس کے خواص سے ہوتی ہے، جن کی گمراہی اور فساد اخلاق سے آخر کار ساری

قوم ضلالت اور بدعملی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ وَإِذَآ أَرَدْنَآ أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا۟ فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا ٱلْقَوْلُ فَدَمَّرْنَٰهَا تَدْمِيرًا (۱۷: ۲)

قرآن نے خواص قوم کو "مترفین" کہا ہے، یعنی وہ لوگ جن کو اللہ نے اپنی نعمتوں سے خوب سرفراز کیا ہو۔

اللہ کی سنت کے مطابق ہماری قوم کا بگاڑ بھی ہمارے مترفین ہی سے ہوا۔ ان لوگوں نے اس طریقے کو جو احکام الٰہی کے مطابق ہدایت کرنے والے ائمہ کا طریقہ تھا چھوڑ دیا اور شیطانی طریقوں کی پیروی شروع کر دی۔ انہی نے نفس پرستی کے لیے شریعت کی بندشیں ڈھیلی کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ انہی نے فراعنہ اور قیاصرہ کی طرح خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرانی شروع کی اور اپنی قوم کو خدا پرستی کی جگہ بادشاہ پرستی اور امرا پرستی کا خوگر بنایا۔ انہی نے ان گردنوں کو بندوں کے آگے جھکنا سکھایا جنھیں صرف خدا کے آگے جھکنے کی تعلیم دی گئی تھی۔ انہی نے خوشنما لباسوں اور شاندار محلوں میں معاصی اور جرائم کا ارتکاب کر کے اپنی قوم کے لیے معاصی و جرائم کو خوش نما بنایا۔ انہی نے حرام کے مال کھا کر اپنی قوم کو حرام کھانے اور حرام کھلانے کی عادت ڈالی۔ انہی نے علم کو ضلالت کے لیے، عقل و فکر کو شرارت کے لیے، ذہانت کو مکر و فریب اور سازشوں کے لیے، دولت کو ایمان خریدنے کے لیے، حکومت کو ظلم و جور کے لیے، اور طاقت کو تکبر کے لیے استعمال کیا۔ یہ یہی ہیں جنھوں نے حقوق اور منافع تک پہنچنے اور ترقی کرنے کے اکثر جائز راستے بند کر دیے اور لوگوں کو مجبور کر دیا کہ خوشامد، رشوت، جھوٹ، سازش اور ایسے ہی دوسرے ذلیل راستوں سے اپنے مقاصد کو پہنچیں۔ غرض اخلاق و اعمال کا کوئی فساد ایسا نہیں ہے جس کا آغاز ان مترفین سے نہ ہوا ہو۔ ان کو اللہ نے جو نعمتیں عطا کی تھیں ان کو انھوں نے غلط طریقوں سے استعمال کیا، خود بھی بگڑے، اور اپنے ساتھ اپنی قوم کو بھی بگاڑا۔

یہ سب کچھ صدیوں سے ہو رہا تھا، اور اخلاقی فساد کا گھن مسلمانوں کی قومی طاقت کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا، مگر اس کے باوجود دلوں میں کم از کم ایمان کی روشنی موجود تھی۔ احکام خدا و رسول کی پابندی چاہے نہ ہو مگر خدا و رسول کی عظمت دلوں میں باقی تھی، قانون اسلام کی خلاف ورزی چاہے کتنی ہی کی گئی ہو مگر قانون کے احترام سے دل خالی نہ ہوئے تھے، اسلام کی حکومت سے انحراف خواہ کتنا ہی بڑھ گیا ہو، مگر اس کے مقابلے میں بغاوت کی جرأت کبھی نہ ہوئی تھی۔ جس کو اسلام نے حق کہا تھا اس کو حق ہی مانا جاتا تھا، اگرچہ اس کو چھوڑ کر باطل کی پیروی میں کتنا ہی غلو کیوں نہ کیا گیا ہو۔ لیکن یہ جسارت کسی میں نہ تھی کہ اسلام کے بتائے ہوئے حق کو باطل، باطل کو حق، فرض کو لغو و مہمل، جائز کو مکروہ، حرام کو حلال بلکہ مستحسن اور گناہ کو صواب کہا جاتا یا سمجھا جاتا۔ گناہوں کا ارتکاب بےشک ہوتا، جرائم سے بلاشبہ دامن آلودہ ہوتے، شریعت کی حدود سے بہت کچھ تجاوز کیا جاتا، قوانین اسلامی کی خلاف ورزی حد سے گذر جاتی، مگر دل ان پر شرمسار بھی ہوتے تھے، ندامت سے گردنیں جھک بھی جاتی تھیں، کم از کم دل اس کے معترف ہوتے تھے کہ وہ خدا و رسول کی نافرمانی کر رہے ہیں۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ عقائد کی کمزوری اور اعمال کی خرابی کے باوجود مسلمانوں کی تہذیب انہی قواعد و ارکان پر قائم تھی جو اسلام نے تعمیر کیے تھے۔ یونان و ایران کے افکار کی درآمد نے اگرچہ بہت کچھ گمراہی پھیلائی لیکن انھیں کبھی یہ کامیابی نہ ہوئی کہ مسلمانوں کے زاویۂ نگاہ کو پھیر دیتے، ان کی ذہنیت کے سانچے کو اسلام سے بالکل منحرف کر دیتے، اور ان کی عقل و فکر و تمیز کی قوتوں کو یہاں تک متاثر کر دیتے کہ وہ مسلمان کی سی نظر سے دیکھنا اور مسلمان کے سے دماغ سے سوچنا بالکل ہی چھوڑ دیتے۔ اسی طرح تمدن و تہذیب کا ارتقاء اگرچہ بیرونی اثرات کے تحت اسلام کی متعین کی ہوئی راہوں سے بہت کچھ منحرف ہوا، لیکن جن اصولوں پر اس تہذیب و تمدن کی بنا رکھی گئی تھی وہ بدستور اس کی بنیاد میں موجود تھے، اور کسی دوسری مخالف تہذیب کے اصولوں نے ان کی جگہ نہ لی تھی۔ مسلمانوں کی تعلیم کا نظام بہت کچھ بگڑا، مگر علوم دینی کو اس میں بہرحال ایک ممتاز جگہ حاصل تھی اور

کوئی تعلیم یافتہ مسلمان اسلامی عقائد اور احکام شریعت اور قومی روایات سے کم از کم ابتدائی علم سے بے بہرہ نہ ہوتا تھا۔ مسلمانوں کی عملی زندگی پر قانون اسلام کی بندشیں بہت کچھ ڈھیلی ہوئیں مگر پھر بھی مسلمانوں کے جملہ معاملات پر ایک ہی قانون نافذ تھا اور وہ اسلام کا قانون تھا۔ غرض تمام خرابیوں کے باوصف مسلمانوں کے تخیلات اخلاق اور اعمال پر اسلام کا ایک گہرا اثر تھا۔ اس کے اصولوں پر وہ یکسوئی کے ساتھ ایمان رکھتے تھے کم از کم ان کے ایمان کی سرحدیں مخالف اسلام اصولوں کو داخل ہونے کا موقع نہ ملتا تھا اور اخلاق و اعمال کی جو قدریں اسلام نے متعین کی تھیں وہ اس حد تک تغیر پذیر ہوئی تھیں کہ بالکل منقلب ہوجاتیں اور ان کے خلاف کچھ دوسری قدریں ان کی جگہ لے لیتیں۔

لیکن انیسویں صدی میں حکومت کو ہاتھ سے کھو دینے کے بعد جب ہماری قوم کے مترفین نے دیکھا کہ حکومت کے ساتھ جاہ و منزلت، عزت و حرمت، مال و منال سب ہی کچھ ہاتھ سے نکلے جارہے ہیں اور غلامی کی حالت میں ان کو محفوظ رکھنے اور مافات کی تلافی کرنے کا کوئی ذریعہ بجز مغربی تہذیب اور علوم سے آراستہ ہونے کے نہیں ہے، تو ان کی روش میں ایک دوسرا تغیر ہوا جو صحیح معنوں میں محض تغیر ہی نہیں بلکہ ایک "انقلاب" تھا۔ تغیر کے معنی محض بدل لئے گئے ہیں مگر انقلاب الٹ جانے کو کہتے ہیں، اور فی الواقع اس دوسری کروٹ میں وہ ایسا الٹ گئے کہ ان کا قبلۂ مقصود الٹ گیا، ان کی ذہنیت الٹ گئی، ان کی نظریں الٹ گئیں، اور ان کا رخ اسلام سے فرنگیت کی طرف پھر گیا جو اسلام کے عین مخالف سمت میں واقع ہوئی ہے۔

یہ انقلاب جب شروع ہوا تو وہ شرمساری اور ندامت آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگی جو قوانین اسلامی سے انحراف کرتے وقت پہلے محسوس کی جاتی تھی، بلکہ سرے سے یہ احساس ہی مٹنے لگا کہ شریعت کی حدود سے تجاوز کرکے وہ کسی گناہ اور کسی جرم کا ارتکاب کررہے ہیں۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ شرمندگی و ندامت

کی جگہ ڈھٹائی اور بے حیائی نے لے لی علانیہ ہر قسم کی قانون شکنی کی جانے لگی، اور شرم کے بجائے اس پر فخر کا اظہار ہونے لگا۔ مگر انقلاب کی رو اس حد پر بھی جا کر نہ رکی۔ اب جو باتیں فرنگیت مآب لوگوں کی مجلسوں میں سنی اور دیکھی جا رہی ہیں، وہ بے حیائی سے گذر کر اسلام کے خلاف صریح بغاوت کے آثار ظاہر کرتی ہیں۔ اب یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ ایک شخص جو اسلامی قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے، وہ اپنے جرم پر نادم ہونے کے بجائے، اس شخص کو الٹا شرمندہ کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس پرانے قانون کی اب تک پابندی کیے جا رہا ہے گویا اب مجرم اور گنہگار وہ نہیں ہے جو اسلامی قانون کو توڑتا ہے، بلکہ وہ ہے جو اس کی پیروی کرتا ہے۔ اب صرف نماز روزے سے پرہیز ہی نہیں کیا جاتا، بلکہ اس پر فخر بھی کیا جاتا ہے، ترک صوم و صلوٰۃ کی تبلیغ کی جاتی ہے، روزے رکھنے اور نمازیں پڑھنے والوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے، یہ امید کی جاتی ہے کہ پابند صوم و صلوٰۃ لوگ (خصوصاً جب کہ وہ تعلیم یافتہ ہوں) اپنے فعل پر الٹے شرمندہ ہوں گے، یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نماز روزے کو چھوڑنا نہیں بلکہ اس کی پابندی کرنا وہ عیب ہے جس پر کسی کو شرمندہ ہونا چاہیے، حد یہ ہے کہ اگر کسی نمازی کا کوئی عیب ظاہر ہوتا ہے تو اس کی تمام کمزوریوں کو نظر انداز کر کے کہا جاتا ہے کہ "آخر وہ حضرت نمازی ہیں نا!" یعنی اس سے عیب کے سرزد ہونے کا اصلی سبب کچھ اور نہیں بلکہ صرف وہ عمل ہے جس کو اللہ نے مانع فحشاء و منکر قرار دیا ہے، اور جسے رسول اللہ نے تمام اعمال سے افضل ٹھیرایا ہے!

یہ بغاوت صرف نماز روزے تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ قریب قریب زندگی کے تمام معاملات میں پھیل گئی ہے۔ اب اسلامی احکام کی پابندی کو "ملّائیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور "ملائیت" ہمارے نئے زمانے کی اصطلاح میں تنگ نظری، تاریک خیالی، جہالت، دقیانوسیت، اور بے عقلی کے سب سے زیادہ شدید مرکب کا نام ہے۔ گویا یوں سمجھیے کہ راسخ العقیدہ اور متبع شریعت مسلمان کا نام مُلّا ہے، اور مُلّا وہ ہے جو تہذیب اور روشن خیالی سے کوسوں دور ہو، اور مہذب سوسائٹی میں کسی طرح نہ کھپ سکتا ہو!

آج کسی قول یا فعل کی تائید میں یہ دلیل کوئی دلیل ہی نہیں ہے کہ وہ قرآن وحدیث کے مطابق ہے۔ غیر مسلم نہیں بلکہ ایک مسلمان جو بدقسمتی سے "تعلیم یافتہ" اور "روشن خیال" ہوگیا ہے، بلاتکلف قرآن وحدیث کی سند کو رد کر دیتا ہے اور اس پر ذرا نہیں شرماتا، بلکہ توقع رکھتا ہے کہ اسلامی قانون کی سند لانے والے کو الٹا شرمندہ ہونا چاہیے۔ قرآن وحدیث کا مستند ہونا تو درکنار، ہم نے تو یہ حال دیکھا ہے کہ جب بات کو اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا ہے، اس کے خلاف فوراً ایک تعصب سا پیدا ہوجاتا ہے۔ وہی بات اگر عقلی استدلال کے ساتھ پیش کی جائے، یا کسی مغربی مصنف کے حوالے سے بیان کی جائے تو آمنا وصدقنا، لیکن اسلام کا نام آتے ہی ہمارے فرنگیت مآب "مسلمانوں" کے دماغوں میں اس کے خلاف طرح طرح کے شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں، اور انھیں شک ہوجاتا ہے کہ اس بات میں ضرور کوئی کمزوری ہے۔ گویا اب قرآن وحدیث کی سند ان لوگوں کی نظر میں کسی بات کو قوی نہیں کرتی بلکہ اس کو الٹا کمزور اور محتاج دلیل بنا دیتی ہے!

چند سال پہلے تک یہ وبا صرف ہمارے مردوں میں پھیلی ہوئی تھی، اور ہماری عورتیں اس سے محفوظ تھیں کم از کم اسلامی تہذیب کی حد تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ "حرم" وہ آخری جائے پناہ ہے جہاں اسلام اپنے تمدن اور اپنی تہذیب کی حفاظت کرتا ہے۔ عورت کو جن مصلحتوں کی بنا پر اسلام نے حجاب شرعی میں رکھا ہے ان میں سے ایک بڑی مصلحت یہ بھی ہے کہ کم از کم وہ سینہ نور ایمان سے منور رہے جس سے ایک مسلمان بچہ دودھ پیتا ہے، کم از کم وہ گود کفر وضلالت اور فساد اخلاق واعمال سے محفوظ رہے جس میں ایک مسلمان بچہ پرورش پاتا ہے، کم از کم اس گہوارے کے ارد گرد خالص اسلامی فضا چھائی رہے جس میں مسلمان کی نسل زندگی کی ابتدائی منزلوں سے گذرتی ہے، اور کم از کم وہ چار دیواری بیرونی اثرات سے محفوظ رہے جس میں مسلمان بچے کے سادہ دل ودماغ پر تعلیم وتربیت اور مشاہدات کے اولین نقوش ثبت ہوتے ہیں۔ پس "حرم" دراصل اسلامی تہذیب کا سب سے زیادہ مستحکم قلعہ ہے، جس کو اس لیے تعمیر کیا گیا تھا کہ یہ تہذیب

اگر کبھی شکست کھا کر پسپا بھی ہو تو یہاں پناہ لے سکے، مگر افسوس کہ اب یہ قلعہ بھی ٹوٹ رہا ہے، مغربیت کی وبا اب گھروں کے اندر بھی پہنچ رہی ہے، ہمارے فرنگیت مآب مترفین اب اپنی خواتین کو بھی کھینچ کھینچ کر باہر لا رہے ہیں تاکہ وہ بھی انہیں زہریلے اثرات سے متاثر ہوں جن سے خود وہ مسموم ہو چکے ہیں، اور ہماری قوم کی لڑکیاں اب ان تعلیم گاہوں میں گمراہی اور بد اعتقادی اور فساد اخلاق اور فرنگی تہذیب کے سبق لینے کے لئے بھیجی جا رہی ہیں، جو اس سے پہلے ہمارے لڑکوں کو یہ سب کچھ سکھا کر اسلام سے باغی بنا چکی

یہ آخری حرکت ہمارے نزدیک اس انقلاب کی تکمیل کر دینے والی ہے جس کا ابھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ ہمارا صرف قیاس نہیں ہے، بلکہ تکمیل انقلاب کے آثار کو یہ بدنصیب آنکھیں دیکھ چکی ہیں، اور یہ بدقسمت کان سن چکے ہیں۔ اب یہ نوبت پہنچی ہے کہ ایک مسلمان عورت قرآن وحدیث کے صریح احکام کی خلاف ورزی کرکے، اپنی زینت کا اظہار کرتی ہوئی نکلتی ہے، انگریزی ہوٹلوں میں جاکر لنچ اور ڈنر کھاتی ہے، سینما ہال میں جاکر مردوں کے درمیان بیٹھتی ہے، بازاروں میں پھر کر شاپنگ کرتی ہے، اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ قانون اسلامی کے خلاف یہ تمام افعال کرنے پر شرمندہ اور نادم ہونے کے بجائے فخر کے ساتھ اپنے ان کارناموں کو بیان کرتی ہے، اور الٹا اس بےچاری عفیفہ کو قابل ملامت ٹھیراتی ہے جس نے قانون اسلام کی پیروی میں حجاب شرعی کو چھوڑنے سے انکار کیا، جسے مردوں کے درمیان بے حجابانہ تماشہ بنی کرتے ہوئے شرم آئی، جس کو بازاروں کے چکر لگانا، تاج اور گرین کے مزے چکھنا، سیرگاہوں کی ہوائیں کھانا، اس چار دیواری کی بےلطفیوں کے مقابلہ میں پسند نہ آیا جس کی حدود میں رہنے کا اس کے خدا اور اس کے رسول نے اسے حکم دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کے خلاف بغاوت کی اسپرٹ مردوں سے گذر کر عورتوں تک بھی پہنچتی جا رہی ہے، اور وہ بھی اسلام کے قوانین کی خلاف ورزی کو نہیں بلکہ اس کی پیروی کو اس قابل سمجھنے لگی ہیں کہ ایک مسلمان عورت

اس پر شرمندہ و نادم ہو۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔ خدا را بتاؤ کہ پرانی دیندار خاتونوں کی گودوں میں پرورش پانے کے باوجود جب تمہارا یہ حال ہوا ہے تو جب تمہاری عورتیں بھی غیرت ایمانی سے بیگانہ اور اطاعت خدا و رسول کی حدود سے باہر ہو جائینگی تو ان نسلوں کا کیا حشر ہوگا جو ان نئی فرنگیت مآب خواتین کی گودوں میں پرورش پاکر نکلینگی؟ جو بچے آنکھ کھولتے ہی اپنے گرد و پیش فرنگیت ہی فرنگیت کے آثار دیکھینگے، جن کی معصوم نگاہیں اسلامی تہذیب و تمدن کی کسی علامت سے آشنا نہ ہوں گی، جن کے کانوں میں کبھی خدا و رسول کی باتیں نہ پڑیں گی، جن کے دل و دماغ کی لوح سادہ پر ابتدا ہی سے فرنگیت کے نقوش ثبت ہو جائیں گے، کیا یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے جذبات، خیالات، اخلاق، اعمال، غرض کسی حیثیت سے بھی مسلمان ہوں گے؟

جرم کا پہلا مرتبہ یہ ہے کہ انسان جرم کرے مگر اُس کو جرم سمجھے اور اُس پر شرمندہ ہو۔ اس قسم کا جرم محض اپنی حیثیت کے لحاظ سے سزا کا مستوجب ہوتا ہے، بلکہ توبہ اور اظہار ندامت سے معاف بھی کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ایسا جرم صرف انسان کی فطری کمزوری پر محمول کیا جائیگا۔

جُرم کا دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ انسان جرم کرے اور اس کو جرم نہ سمجھے، نہ اس پر شرمندہ ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ شخص اس قانون کو تسلیم نہیں کرتا جس نے اس فعل کو جُرم قرار دیا ہے۔

جُرم کا تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ انسان جرم کرے اور اس کو عیب کے بجائے خوبی سمجھے، اور فخر کے ساتھ اس کا علانیہ اظہار کرے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس شخص کے دل میں اُس قانون کا کوئی احترام بھی نہیں ہے جو اس فعل کو جرم قرار دیتا ہے۔

جُرم کا آخری مرتبہ یہ ہے کہ انسان نہ صرف ایک قانون کے خلاف جرم کا ارتکاب کرے، بلکہ ایک دوسرے مخالف قانون کے لحاظ سے اُس جرم کو جائز اور عین صواب سمجھے، اور جو قانون اس فعل کو جرم ٹھیراتا ہے اس کا مذاق اڑائے، اور اس کی پیروی کرنے والوں کو خطاکار سمجھے۔ ایسا شخص صرف قانون کی خلاف ورزی

ہی نہیں کرتا، بلکہ اس کی تحقیر کرتا ہے اور اس کے خلاف بغاوت کا مرتکب ہوتا ہے۔

ہر شخص جس میں تھوڑی سی عقل سلیم بھی ہوگی، یہ تسلیم کرے گا کہ جب انسان اس آخری مرتبہ پر پہنچ جائے تو وہ اس قانون کی حدود میں نہیں رہ سکتا جس کے خلاف اس نے علانیہ بغاوت کی ہے۔ مگر کس قدر مردود ہے وہ شیطان جو تم کو یقین دلاتا ہے کہ تم اسلامی قوانین کی تحقیر کر کے، اس کا مذاق اڑا کر، اور اس کی پیروی کو عیب ٹھیرا کر، اور اس کی خلاف ورزی کو صواب قرار دے کر بھی مسلمان رہ سکتے ہو۔ ایک طرف تو تمہارا یہ حال کہ خدا اور رسول جس کو اچھا کہیں اس کو تم برا کہو، وہ جس کو برا کہیں اس کو تم اچھا کہو، وہ جس کو گناہ ٹھیرائیں اس کو تم صواب قرار دو، وہ جس کو صواب ٹھیرائیں اس کو تم گناہ سمجھو، وہ جو حکم دیں اس کا تم مذاق اڑاؤ، وہ جو قانون بنائیں اس کی خلاف ورزی پر شرمانے کے بجائے تم الٹا اس شخص کو شرمانے کی کوشش کرو جو ان کے قانون کی پیروی کرتا ہے۔ اور دوسری طرف تمہارا یہ دعویٰ کہ تم خدا اور رسول پر ایمان رکھتے ہو، اور ان کی عظمت تمہارے دل میں ہے، اور ان کے پسندیدہ دین یعنی اسلام کے تم پیرو ہو۔ کیا کوئی صاحب عقل انسان تسلیم کر سکتا ہے کہ اس طرز عمل کیساتھ یہ دعویٰ صحیح ہے؟ اگر ایمان کیساتھ انکار جمع ہو سکتا ہے اگر تعظیم کیساتھ تحقیر جمع ہو سکتی ہے، اگر یہ ممکن ہے کسی کا احترام بھی دل میں ہو اور اس کا مذاق بھی اڑایا جائے، اگر یہ معقول ہے کہ خلاف ورزی پر فخر کرنے والا، اور پیروی کو ملامت کے قابل سمجھنے والا بھی پیرو اور مطیع ہو، تو پھر یہ ماننا پڑیگا کہ بغاوت ہی عین اطاعت ہے، اور تحقیر ہی عین تعظیم ہے، اور انکار ہی کا نام ایمان ہے، جو تمہیں ٹھوکر مارتا ہے وہی دراصل تمہاری تعظیم کرتا ہے، جو تمہارا مذاق اُڑاتا ہے وہی دراصل تمہارا احترام کرتا ہے، اور جو تمہیں جھوٹا کہتا ہے وہی دراصل تمہاری تصدیق کرنے والا ہے!

اسلام بجز اطاعت کے اور کسی چیز کا نام نہیں ہے، اور حقیقی اطاعت ایمان کے بغیر متحقق نہیں ہوتی، اور ایمان کا اولین اقتضاء یہ ہے کہ جب خدا اور رسول کا حکم کسی کو پہنچے تو اس کی گردن جھک جائے، اور وہ اُسکے

مقابلے میں سر نہ اٹھا سکے:۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۲۴ : ۷)	مومنوں کا قول تو یہ ہونا چاہیے کہ جب ان کو بلایا جائے اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

پھر یہ گردن جھکانا بھی بکراہت نہیں بطوع ورغبت ہونا چاہیے حتیٰ کہ حکم خدا اور رسول کے خلاف دل میں بھی کوئی تنگی اور ناراضی چھپی ہوئی نہ ہو۔ جس شخص کی گردن محض ظاہر میں جھک جائے مگر دل میں اس کے خلاف تنگی محسوس کر رہا ہو وہ مومن نہیں بلکہ منافق ہے:۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ...... فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۔ (۴ : ۹)۔	اور جب ان سے کہا گیا کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ نے اتارا ہے اور آؤ رسول کی طرف تو تم دیکھتے ہو کہ منافقین تمہاری طرف آتے ہوئے جی چراتے ہیں پس قسم ہے تیرے پروردگار کی کہ وہ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے اختلافات میں تجھ کو فیصلہ کرنے والا تسلیم نہ کرلیں، پھر جو کچھ تو فیصلہ کرے، اس پر اپنے دلوں میں تنگی بھی نہ پائیں بلکہ سر تسلیم خم کردیں

لیکن جو شخص علانیہ حکم ماننے سے انکار کردے، اور خدا اور رسول کے قانون کو چھوڑ کر دوسرے قوانین کی پیروی کرے، اور انہی قوانین کو درست اور حق سمجھے اور ان کی پیروی کرتے ہوئے خدا اور رسول کے قانون کا مذاق اڑائے اور اس کی اطاعت کو عیب ٹھہرائے، وہ تو کسی طرح بھی مومن نہیں ہو سکتا، خواہ وہ زبان سے اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو اور مسلمانوں کے سے نام سے موسوم ہو اور مردم شماری میں اس کو مسلمان لکھا گیا ہو۔ انسان گناہ کر کے مومن رہ سکتا ہے بشرطیکہ گناہ کو گناہ سمجھے اور اس پر نادم ہو، اور اس قانون کو تسلیم کرے

جس کے خلاف محض اپنی فطری کمزوری سے اس نے ایک فعل کا ارتکاب کیا ہے لیکن جب گناہ کے ساتھ بے شرمی اور ڈھٹائی بھی ہو، اور اس پر فخر بھی کیا جائے، اور اس کو صواب سمجھ کر اس شخص کو ملامت بھی کی جائے جو اس کا ارتکاب نہیں کرتا، تو خدا کی قسم ایسے گناہ کے ساتھ ایمان کبھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اس مرتبے میں داخل ہونے سے پہلے ہی آدمی کو قطعی فیصلہ کر لینا چاہیے کہ آیا وہ مسلمان رہنا چاہتا ہے یا اسلام سے نکل کر اس قانون کی اطاعت میں داخل ہو جانا پسند کرتا ہے جس کی پیروی میں اس کو شرح صدر حاصل ہو رہا ہے۔

خدا کے فضل سے ابھی تک مسلمانوں کے عوام اس فرنگیت اور ملحدانہ بغاوت کی رو سے محفوظ ہیں۔ ابھی تک ان کے دلوں میں خدا اور رسول کے احکام کا احترام باقی ہے اور قوانین اسلامی کی پابندی تھوڑی بہت انہی میں نظر آتی ہے لیکن خواص کی روش جس طرح پہلے ان کے اخلاق اور معاملات پر اثر انداز ہو چکی ہے، اسی طرح اندیشہ ہے کہ یہ نئی روش کہیں ان کے ایمان پر بھی رفتہ رفتہ اپنا مہلک اثر نہ ڈال دے۔ عامۂ مسلمین میں جس رفتار سے ساتھ ترک صوم وصلوٰۃ، منکرات و منہیات کا ارتکاب فرنگی اطوار کی تقلید کا شوق اور فرنگی تہذیب کو خوشنما بنا کر دکھانے والے کھیل تماشوں کی طرف میلان بڑھ رہا ہے۔ وہ دراصل اس آنے والے خطرے کا الارم ہے اگر ہمارے مترفین کے خیالات کی اصلاح نہ ہوئی اور اسلام کی صراط مستقیم سے ان کا انحراف اسی طرح جاری رہا تو وہ دن دور نہیں جب ساری قوم اس ضلالت میں مبتلا ہو جائے گی اور اللہ کی سنت پوری ہو کر رہے گی کہ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ۔

مقالات

کتب سماوی پر ایک نظر

توریت و انجیل پر اسلامی رائے

۱۲

از جناب وقی شاہ صاحب

ابتک توریت و انجیل کے متعلق ان مضامین میں جو کچھ لکھا گیا وہ بیشتر یا تو علمائے اہل کتاب کے اقوال تھے یا وہ نتائج جو اُن اقوال سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ ناقص اور یہ تبصرہ ناتمام رہے گا اگر علمائے اسلام کی تحقیقات کے نتائج سے بھی یہاں بحث نہ کی جائے کیونکہ مسلمانوں کو بھی توریت و انجیل سے بہت قوی تعلق ہے اور اُن کا اسلام پر ایمان لانا توریت، زبور، انجیل وغیرہم پر بھی ایمان لانے کو مستلزم ہے۔ قرآن میں کم از کم ایک سو اکتیس (۱۳۱) جگہ ان کتب سماوی کا ذکر آیا ہے کہیں فرداً فرداً اور کہیں مجموعاً۔ جن مقامات پر یہود و نصاریٰ یا انبیائے سلف کا ذکر بغیر تذکرۂ کتب مقدسہ آیا ہے اُن کا شمار اس کے علاوہ ہے مثلاً۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (۵: ۳) — اور یہود و نصاری دعوی کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔

یہاں توریت و انجیل کا ذکر نہیں صرف یہود و نصاریٰ ہی کا ذکر ہے۔

شہادت قرآنی کی مثالیں | جن آیات میں کتب سماوی کا ذکر مجموعاً آیا ہے اُن کی ایک مثال یہ ہے :-

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ يُقَاتِلُوْنَ — "بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے اُن کی جان و مال کو خرید لیا ہے کہ اُن کے لیے جنت ہے وہ لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ وَعْ	جس میں قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں اس پر
وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىۃِ وَ	سچا وعدہ کیا گیا ہے توریت میں اور انجیل میں اور
الْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ (۹: ۱۱۴)	قرآن میں۔

یہاں توریت و انجیل و قرآن کا ایک ساتھ ذکر آیا ہے۔

جن آیات میں ان کتابوں کا فرداً فرداً ذکر آیا ہے اُن کی دو مثالیں یہ ہیں:۔

وَلَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّکْرِ	اور تحقیق ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں بعد نصیحت کے
اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ (۲۱: ۱۰۵)	کہ میرے صالح بندے زمین کے وارث بنیں گے"۔
مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىۃَ ثُمَّ لَمْ	"جن لوگوں کو توریت پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا پھر انہوں
یَحْمِلُوْھَا کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا	نے اُس پر عمل نہ کیا ان کی مثال اُس گدھے کی سی ہے
(۶۲: ۵)	جس پر کتابوں کا بوجھ لادا جاتا ہے"۔

پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کتابوں پر ایمان لانے کا بھی حکم دیا ہے اور ان کتابوں کے منکروں کو گمراہ بتایا ہے اور ان پر عتاب نازل کیا ہے:۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ	"اے ایمان والو! (یعنی اے مسلمانو) یقین لاؤ اللہ پر
وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَ	اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے نازل
الْکِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ	فرمائی اپنے رسول پر اور اُس کتاب پر جو اللہ نے نازل
یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ	فرمائی قبل اس کے اور جو کوئی یقین نہ رکھے اللہ پر اور اس کے
وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا۔	فرشتوں پر اور اُس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر
(۴: ۱۳۶)	اور آخرت کے دن پر وہ شخص یقیناً گمراہی میں بہت دور جا پڑا"
اَلَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِالْکِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا	"جنہوں نے جھٹلایا اُس کتاب کو اور اس چیز کو جسے

بِهٖ رُسُلَنَا قف فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ يُسْحَبُوْنَ ۝ فِی الْحَمِيْمِ ثُمَّ فِی النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ۝ (۴۰: ۸)

ہم نے اپنے پیغمبروں کے ساتھ بھیجا انھیں البتہ معلوم ہو جائیگا (یعنی حقیقت حال اُن پر کھل جائیگی) جبکہ طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں انھیں گھسیٹتی ہوئی کھولتے پانی میں ڈال دیں گی پھر وہ آگ میں جھونک دیے جائیں گے۔"

یہ ہیبت ناک سزائیں صرف انہیں کے لیے نہیں ہیں جو قرآن کے منکر ہیں بلکہ ان کے لیے بھی ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے صحیفوں کے منکر ہیں۔

مگر یہ ساری تاکید اُس چیز پر ایمان لانے سے تعلق ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السّلام پر نازل فرمائی اور جس پر صحیح طور سے وَالْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ اور وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا کا اطلاق ہوتا ہو نہ کہ اُن تحریروں کے متعلق جن کی بابت اللہ تعالیٰ نے خود خبر دی ہے کہ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ جہاں قرآن نے اللہ تعالیٰ نے صحف سماوی پر ایمان لانا مسلمانوں کے لیے ضروری قرار دیا ہے وہاں اس بات کو بھی واضح فرمادیا ہے کہ توریت و انجیل میں اہل کتاب نے تحریفیں کی ہیں۔

تحریف کے متعلق شہادت قرآنی | توریت و انجیل میں تحریف اور تبدیلیوں کے واقع ہونے کی اطلاع اللہ تعالےٰ نے صاف صاف قرآن مجید میں دے دی فرماتا ہے:۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (۲: ۹)

"(مسلمانو!) کیا تمھیں یہ امید ہے کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) تمہاری تصدیق کریں گے حالاں کہ ان میں تو ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کا کلام سنتے تھے پھر جان بوجھ کر اس کو بدل ڈالتے تھے۔"

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا (۲:۹)	"پس خرابی ہے اُن کے لئے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب (آیات والفاظ کتاب) لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں تاکہ اس کے بدلے تھوڑا سا دنیوی فائدہ کرلیں"
مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا۔ (۴:۷)	"یہودیوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے بول (یعنی آیات وکلمات) کو اپنے ٹھکانے سے بدل دیتے ہیں اور (منہ سے) کہتے ہیں ہمنے سنا اور (دل سے) کہتے ہیں ہمنے نہیں مانا"
فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ (۵:۳)	"یہودیوں کی عہد شکنی کے سبب ہمنے اُن کو پھٹکارا اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا ہے وہ خدا کے بول اپنے ٹھکانے سے بدلتے ہیں اور نصیحت سے فائدہ اٹھانا بھول گئے ہیں تو ہمیشہ ان کی خیانت (یعنی کتاب میں رد و بدل کرتے رہنا) دیکھتا رہیگا بجز ان میں سے تھوڑے لوگوں کے"
وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ لَمْ يَاْتُوْكَ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ (۶:۵)	"یہودیوں میں بعض جاسوسی کرتے ہیں جھوٹ بولنے کیلئے وہ جاسوس ہیں دوسری جماعت کی طرف سے جو تجھ تک نہیں آئی وہ کلام کو بدل ڈالتے ہیں اُس کے اصلی ٹھکانے سے"

یعنی جب قرآن میں اس قدر وضاحت کیساتھ توریت وانجیل میں تحریف کا واقع ہونا بیان کیا گیا ہے تو کسی مسلمان کے لئے کیسے ممکن ہے کہ اس تحریف کے وقوع سے انکار کرے لہذا نفس تحریف پر مسلمانوں کا اتفاق ہے اس امر پر البتہ مسلمانوں میں بحث رہی ہے کہ کتب مذکورہ میں تحریف لفظی واقع ہوئی ہے یا تحریف معنوی یا دونوں۔ بکثرت علمائے اسلام کی تحقیقات یہ ہے کہ توریت اور انجیل میں دونوں قسم کی تحریفیں ہوئی ہیں الفاظ

بھی بدل دیئے گئے ہیں اور باطل تاویلوں سے معانی بھی بگاڑ دیئے گئے ہیں۔ لیکن امام بخاری صرف تحریف معنوی کے قائل ہیں۔ وہ صحیح بخاری کے آخری حصہ میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک اور لفظ "رقیب" کی تفسیر نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ "یحرفون" کے معنی "یزیلون" کے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب اپنی کتابوں سے کچھ نکال ڈالتے یا اس میں کچھ ملا دیتے۔ اس کے بعد امام بخاری لکھتے ہیں:۔

ولیس احد یزیل لفظ کتاب من کتب اللہ ولکنھم یحرفونہ یتاولونہ علیٰ غیر تاویلہ (بخاری صفحہ ۱۱۲۷)	کتاب اللہ کے الفاظ کو کوئی شخص کتاب سے نکال نہیں سکتا ان کے ارادے یہی مراد ہے کہ وہ لوگ اس میں ایسی تاویل کرتے ہیں جو درحقیقت صحیح تاویل نہیں ہوتی

یہ قول درحقیقت امام بخاری کا ہے مگر بعض حضرات کو یہ اشتباہ و مغالطہ ہوا کہ یہ قول حضرت ابن عباس کا ہے حالانکہ آپکا قول "یحرفون بمعنی یزیلون" پر ختم ہو گیا اور اس کے بعد کا یہ قول جو اوپر نقل کیا گیا ہے امام بخاری کا اپنا قول ہے۔

"یحرفون بمعنی یزیلون" سے ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابن عباس تحریف لفظی کے قائل نہ تھے کیونکہ آپکے قول کی یہی اور صحیح تفسیر یہ ہو سکتی ہے کہ اہل کتاب الفاظ توریت و انجیل کو توریت و انجیل سے نکال دیتے تھے اور ان کی جگہ دوسرے الفاظ اپنی طرف سے داخل کر دیتے تھے۔ اس کی تائید حضرت ابن عباسؓ کا وہ قول بھی کرتا ہے جو اسی صحیح بخاری کی کتاب التوحید اور کتاب الاعتصام اور کتاب الشہادت میں امام بخاری ہی نے نقل کیا ہے

ان ابن عباس قال یا معشر المسلمین کیف تسئلون اھل الکتب عن شئی وکتابکم الذی انزل علیٰ نبیکم احدث الاخبار باللہ محضا لم یشب وقد حدثکم اللہ ان اھل الکتب	ابن عباس نے کہا اے مسلمانو! تم اہل کتاب سے کیوں باتیں پوچھتے ہو حالانکہ تمہاری کتاب جو تمہارے نبی پر نازل ہوئی ہے خدا کی طرف سے بعد میں آئی یعنی جدید ترین ہے، وہ خالص ہے اس میں کوئی آمیزش نہیں ہوئی۔ اہل کتاب کی نسبت خدا نے تمکو یہ خبر دی

بدلوا کتاب اللہ وغیرہ وکتبوا	ہے کہ انہوں نے اپنی کتابوں کو بدل دیا ہے۔ اپنے ہاتھ
بایدیھم الکتب وقالوا ھو من	سے کچھ لکھا اور کہدیا کہ یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ
عند اللہ لیشتروا بہ ثمنا قلیلا الا	اس کے بدلے تھوڑا سا مول لے لیں کیا جو تمکو خدا نے
ینھکم ما جاءکم من العلم عن مسألتکم	علم دیا ہے وہ تمکو اہل کتاب سے استفسار میں مانع نہیں ہوتا؟
لا واللہ ما راینا منھم رجلا یسألکم	بخدا ان میں کوئی ایسا نہیں ہے جو تمہارے دین کی بات
عن الذی انزل علیکم (بخاری ص ۳۶۹ ج ۱۰۹۲ / ۱۱۱۲)	تم سے پوچھتا ہو (یعنی پھر تم اُن کے دین کی باتیں اُن سے
	کیوں پوچھتے ہو؟)

یہ قول فیصل ہے اس بارہ میں کہ حضرت ابن عباس تحریف لفظی اور تحریف معنوی دونوں کے قائل ہیں امام بخاری ہی صرف تنہا وہ بزرگ ہیں جو توریت وانجیل میں تحریف لفظی کے قائل نہیں مگر اُنکا قول اس باب میں حجت وسند نہیں۔ حدیث کی تصحیح وتضعیف اور رجال کی جرح وتعدیل میں البتہ اُنکا قول مستند مانا جاتا ہے لیکن فنون حدیثیہ کے علاوہ دیگر فنون ومسائل میں تنہا اُن کا کوئی قول جمہور علماء کے اقوال کے مقابلہ میں مستند نہیں سمجھا جاسکتا بالخصوص اُس حالت میں جبکہ وہ قول محض ظن اور قیاس پر مبنی ہو اور اس کی تائید میں وہ کوئی سند یا دلیل نہ رکھتے ہوں۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں سلف میں بہت لوگ ایسے گذرے ہیں جو ایک فن کے امام تھے مگر دوسرے فنون سے ناآشنا تھے۔ ذہبی نے طبقات الحفاظ میں لکھا ہے کہ:۔

> بہت لوگ ایسے گذرے ہیں جو ایک فن میں ماہر اور دوسرے فنون میں قاصر تھے مثلاً سیبویہ علم نحو میں امام تھے مگر یہ نہ جانتے تھے کہ حدیث کیا شئے ہے وکیع حدیث میں امام تھے مگر عربیت (یعنی علم ادب) نہ جانتے تھے۔ ابو نواس شاعری کا رئیس تھا مگر دیگر فنون سے عاری تھا۔ عبدالرحمن بن مہدی حدیث مین امام تھے اور یہ نہ جانتے تھے کہ طب کیا ہوتی ہے محمد بن حسن

فقہ میں امام تھے اور نہ جانتے تھے کہ فن قرأت کیا شئے ہے۔ امام حفص قرأت کے امام تھے اور حدیث سے تہی دست سچ ہے کہ میدان کارزار میں مرد میدان خاص ہی لوگ ہوتے ہیں جو لڑنے میں شہرت رکھتے ہیں"

اس طرح امام بخاری اگر توریت وانجیل پر غائر نظر نہ رکھتے ہوں تو یہ نہ کوئی تعجب کا محل ہے۔ فن حدیث میں جو وہ بلند مرتبہ رکھتے ہیں اس میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے بجز روایت و تحقیق حدیث و تنقید رجال کے کسی اور فن میں ان کا خجیل ہونا اور مشغول رہنا ثابت نہیں محض ظن کی بنا پر انہوں نے یہ فرمایا کہ کتاب اللہ کے الفاظ کو کون بدل سکتا ہے"ان کی نظر غالباً اُن الفاظ پر نہیں پڑی جو اُن کتابوں میں موجود ہیں مگر کسی طرح خدا کے کلمات نہیں ہو سکتے۔ اور نہ ان کی نظر اس جانب گئی کہ ظالموں نے خدا کی کتاب کو جلا دیا، خدا کے نبیوں کو تہ تیغ کیا، اور خدا کے نبیوں پر اتہامات لگائے۔ کتاب کی عبارتوں میں ردوبدل کر دینا اور لفظی و معنوی تحریفوں کا عمل میں لانا تو ایسے لوگوں کے لیے ایک ہلکا اور آسان کام تھا۔

علماء اسلام نے نہایت شدومد کے ساتھ امام بخاری کے اس قول کا مقابلہ کیا ہے اور ان کی ظنی دلیل کا کافی جواب دیا ہے اور واقعات تاریخی سے ثابت کیا ہے کہ ان کتابوں میں لفظی او معنوی دونوں تحریفیں موجود ہیں۔ ان میں سے نمونہ کے طور پر بعض علماء کے چند اقوال ہم ذیل میں درج کرتے ہیں ان سے موجودہ توریت وانجیل کے متعلق عام اسلامی رائے کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔

اقوال علماء | قسطلانی نے شرح صحیح بخاری میں امام بخاری کے اس قول کے مقابلہ میں فرمایا ہے کہ:-

"بہت سے علماء اسلام نے بتصریح کہا ہے کہ یہود و نصاریٰ نے بہت سے الفاظ توریت و انجیل کو بدل دیا ہے بعض کا قول ہے کہ انہوں نے ان کتابوں کو بالکل ہی بدل ڈالا ہے، اور اس خیال سے وہ ان کتابوں کی بے ادبی کرنے کو جائز سمجھتے ہیں مگر یہ قول محل اعتراض ہے۔ بہت سی آیات و احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کتابوں کی بہت سی چیزیں اپنی اصل پر ہیں جیسے رجم

وغیرہ بعض کا قول ہے کہ تھوڑے الفاظ میں تبدیلی ہوئی ہے بعض کا قول ہے کہ صرف معانی میں تبدیلی ہوئی ہے نہ کہ الفاظ میں چنانچہ بخاری نے یہی لکھا ہے مگر یہ قول بھی محل اعتراض ہے ان کتابوں میں ایسے الفاظ موجود ہیں جو خدا کی طرف سے ہرگز نہیں ہو سکتے بعض علماء نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ ان کتابوں کا شغل رکھنا اور ان کو لکھنا دیکھنا جائز نہیں ہے.... مگر اس باب میں بہتر قول یہ ہے کہ جو شخص صاحب تمیز و بصیرت نہ ہو اس کو ان کتابوں کا شغل جائز نہیں اور جو صاحب تمیز ہو اور علم و دین میں مضبوط ہو اس کے لیے جائز ہے خصوصاً اس حالت میں جبکہ مخالفین اسلام کو ان کتابوں کی مدد سے جواب دینا پڑے اس پر دلیل یہ ہے کہ علمائے قدیم سے اب تک علماء توریت سے ایسی باتیں نکالتے آئے ہیں جن سے منکرین نبوت محمدیہ کو الزام دیتے چلے آرہے ہیں۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری شرح صحیح بخاری میں امام بخاری کے قولِ مذکور کے تحت میں لکھا ہے کہ:

"ہمارے شیخ ابن ملقن نے فرمایا کہ یہ جو بخاری نے تفسیر آیۂ "یحرفون" کے بارے میں کہا ہے یہ ایک قول ہے جس کو امام بخاری نے پسند کیا ہے مگر ہمارے اکثر علماء نے تصریح کی ہے کہ یہود و نصاریٰ نے الفاظ توریت و انجیل کو بدل ڈالا ہے اور اس پر انہوں نے یہ مسئلہ متفرع کیا ہے کہ ان کتابوں کی بے ادبی کرنی جائز ہے لیکن یہ بات قول بخاری کے مخالف ہے۔"

پھر آگے چل کر ابن حجر تحریر فرماتے ہیں۔

"بعض متاخر شارحین بخاری نے کہا ہے کہ اس مسئلہ تحریف میں کئی اقوال ہیں۔ ایک یہ ہے کہ توریت و انجیل سب کی سب بدل گئی ہیں۔ ان کتابوں کی بے ادبی کا جواز اسی قول کا مقتضیٰ ہے مگر یہ زیادتی ہے اور اس قول کی یہ تاویل ضروری ہے کہ تحریفِ کل سے اکثر حصہ کی تحریف مراد ہے ورنہ یہ بے فائدہ کا جھگڑا ہوگا۔ کیونکہ بہت سی آیات و احادیث سے ثابت ہے کہ ان کتابوں میں بہت سی چیزیں اپنی اصل پر ہیں جن میں تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ ایک آیت میں

ارشاد ہے اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ یعنی وہ جو رسول کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ اپنے پاس توریت میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وازانجملہ قصہ رجم ہے جسمیں مذکور ہے کہ توریت میں حکم رجم موجود ہے۔ اس امر کا مؤید خدا کا یہ قول ہے فَأْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَا اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ یعنے توریت لاؤ اور اس کو پڑھو اگر تم سچے ہو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ تحریف ان کتابوں کے اکثر حصہ میں ہوئی ہے۔ اس قول کے دلائل (یعنی شواہد وامثال) بکثرت موجود ہیں۔ اور پہلے قول کو اسی قول کے معنی میں لینا اَنسب ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اکثر حصہ ان کتابوں کا محفوظ ہے۔ تھوڑے حصہ میں تبدیلی ہوئی ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ تبدیلی صرف معنی میں ہوئی ہے۔ الفاظ سب محفوظ ہیں۔ صحیح بخاری کے اس مقام میں یہی قول بیان ہوا ہے۔ ابن تیمیہ سے اس مسئلہ کی بابت سوال ہوا تو انہوں نے اس کے جواب میں ایک فتویٰ لکھا جس میں کہا کہ اس باب میں علماء کے دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ الفاظ میں بھی تبدیلی ہوئی ہے۔ دوسرا یہ کہ صرف معانی میں ہوئی ہے"۔

اس کے بعد ابن حجر نے ابن تیمیہ کی طرف سے اُن دلائل کا رد نقل کیا ہے جو مجوزان تحریف معانی پیش کیا کرتے ہیں۔ پھر علامہ ابن حزم کی کتاب الملل والنحل کی وہ عبارت نقل کی ہے جس میں انہوں نے توریت کی اُن باتوں کی جانب اشارہ کیا ہے جو حق تعالیٰ کا کلام نہیں ہوسکتیں۔ مثلاً یہ کہ (نعوذ باللہ) لوط علیہ السلام کی بیٹیوں نے اپنے باپ لوط کو شراب پلائی پھر اُنسے بدفعلی کراکے حاملہ ہوئیں۔ اس کے بعد ابن حجر علامہ ابن حزم کی مندرجہ ذیل عبارت نقل کرتے ہیں:۔

"بعض مسلمانوں سے ہم کو یہ خبر پہنچی ہے کہ وہ توریت وانجیل میں لفظی تحریف واقع ہونے سے منکر ہیں۔ حالانکہ قرآن وحدیث میں آچکا ہے کہ "یہود ونصاریٰ خدا کے کلام کو بدل ڈالتے ہیں۔

اور خدا پر دیدہ و دانستہ جھوٹ باندھتے ہیں کہ یہ بات خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتی۔ اور وہ حق بات کو چھپاتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ وہ حق ہے۔" منکرین تحریف کے جواب میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں اصحاب نبوی کے حق میں فرمایا ہے کہ ان کا حال اور ان کی صفت توریت و انجیل میں یوں موجود ہے کہ "وہ ایک کھیتی کے مانند ہیں جس نے نکالا اپنا پٹھا" (تا آخر سورۃ الفتح) اگر اب توریت و انجیل میں اصحاب کی یہ صفت مذکور نہیں ان منکرین تحریف سے جن کا قول یہ ہے کہ جب توریت بنقل متواتر منقول ہے تو اس میں تحریف کیونکر ممکن ہے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہود و نصاریٰ اس بات پر متفق ہیں کہ توریت و انجیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا ذکر موجود نہیں۔ اب اگر تم اُن کی اس کتاب کی (جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا ذکر نہیں) تصدیق کرو گے تو تم کو اس امر کی بھی تصدیق کرنی پڑے گی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اصحاب کا ذکر توریت میں نہیں ہے (جس سے تصدیق قرآن فوت ہوگی) اور اگر اس امر کی تصدیق کرو گے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ باقی سب کتاب کی تصدیق کرو اور اس کو تحریف سے محفوظ مان لو کیونکہ وہ سب یکساں ہے۔"

حافظ ابن القیم حنبلی نے بھی کتاب اغاثۃ اللہفان میں اس مسئلہ پر طول طویل بحث کی ہے اور امام بخاری کے قول کے جواب میں ابن تیمیہ کی لمبی چوڑی عبارت اُن کی تالیف "الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح" سے نقل کی ہے۔ پھر اہل کتاب نے جو تحریفات لفظی و معنوی کی ہیں انہیں بیان کیا ہے اور اُن کے تحریف سمجھے جانے کے وجوہ بیان کیے ہیں۔ انہوں نے اور دیگر علمائے اسلام نے تحریف لفظی کی دس مثالیں پیش کی ہیں تحریفات کا شمار تو اس سے بہت زیادہ ہے مگر مسلمان علماء نے مثال کے طور پر صرف انہیں تحریفوں پر زور دیا ہے۔ جن کا تحریف ہونا قرآن و حدیث سے ثابت ہے وہ دس مثالیں یہ ہیں:-

(۱) موجودہ توریت میں بجائے اسمٰعیل علیہ السلام کے اسحٰق علیہ السلام کو ذبیح اور ابراہیم علیہ السلام کا پہلوٹھا یا اکلوتا بیٹا قرار دیا ہے، اس قول کے غلط ہونے کے ابن القیم نے دس وجوہ بیان کیے ہیں۔

(۲) لوط علیہ السلام پر اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ زنا کی تہمت اور ان دونوں بیٹیوں کا زنا سے حاملہ ہو جانا اور ان سے حرامی اولاد کا پیدا ہونا۔

(۳) یعقوب علیہ السلام کے بیٹے یہودا پر اپنی بہو سے زنا کی تہمت، اس کا حاملہ ہونا اور حرامی بچہ جننا اور اس حرامی بچہ کی نسل سے داؤد علیہ السلام کا پیدا ہونا۔

(۴) ہارون علیہ السلام کو گوسالہ پرستی کا بانی قرار دینا۔

(۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر اور آپ کے متعلق پیشینگوئیوں کو اہل کتاب کا اپنی کتابوں سے نکال دینا۔ علمائے اسلام نے اس پر نہایت شرح وبسط کے ساتھ بڑی فاضلانہ بحثیں کی ہیں۔

(۶) سورۃ الفتح کے آخر میں اصحاب رسول اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں اور جن کی بابت اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے۔ کہ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ ان اوصاف کا ان کتابوں سے خارج کر دینا۔

(۷) عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل میں بذریعہ تحریف لفظی ابن اللہ بنا دینا اور بذریعہ تحریف معنوی اس ابنیت کو حقیقی قرار دینا۔

(۸) انجیل میں ایسے الحاقی الفاظ داخل کر دینا جن پر عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کی بنیاد قائم کی گئی ہے

(۹) عیسیٰ علیہ السلام کی صلیب پر موت اور دوبارہ زندگی۔

(۱۰) عیسیٰ علیہ السلام کی اس موت کو قربانی اور دوسروں کا کفارہ قرار دینا۔

بعض لوگوں کو امام رازی کے متعلق بھی یہ التباس ہوا ہے کہ مثل امام بخاری کے یہ بھی تحریف لفظی

کے قائل نہیں۔ مگر بات صرف اتنی ہے کہ جن آیات قرآنی میں تحریف معنوی کی جانب اشارہ ہے وہاں وہ اپنی تفسیر میں تحریف معنوی کا مراد ہونا بیان کرتے ہیں اور اُس کو اصح کہتے ہیں۔ اور جہاں تحریف لفظی کی جانب اشارہ ہے وہاں تحریف لفظی کا بخوبی اثبات کرتے ہیں اور اس کو بہتر قرار دیتے ہیں۔ جن لوگوں نے صرف ایک ہی قسم کے قول یعنی کلام مثبت تحریف معنوی کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکال لیا کہ امام صرف تحریف معنوی ہی کے قائل ہیں انہوں نے غلط نتیجہ نکالا۔ سورہ بقرہ کی آیت (جو اوپر درج ہو چکی ہے) کی تفسیر میں امام رازی کہتے ہیں کہ:

"یہ تحریف لفظ میں ہے یا معنی میں لیکن لفظی تحریف کی تجویز معنوی تحریف کی تجویز سے بہتر ہے کیونکہ اگر کلام الٰہی اپنی اصلی صورت پر باقی رہے اور صرف اُس کے معنی میں تاویل کی جائے تو اُس صورت میں وہ لوگ کلام الٰہی کے بدلنے والے نہ کہلاتے بلکہ صرف اس کے معنی کے محرف بنتے (حالانکہ وہ کلام الٰہی کے بدلنے والے ٹھیرائے گئے ہیں)۔ اس تحریف سے یہ معنی (یعنی تحریف لفظی کے) مراد لیے جائیں تو بہتر ہے جیسا کہ ابن عباس سے مروی ہے کہ: "اہل کتاب نے ان کتابوں میں کمی وبیشی کی ہے" یہ معنی نہ ہوسکیں تب تحریف معنوی مراد لینا واجب ہے۔" (تفسیر کبیر صفحہ ۵۰۷ جلد اول)۔

آیت سورۃ النسار کی تفسیر میں امام رازی لکھتے ہیں کہ:-

"خدا تعالیٰ نے یہاں "عن مواضعہ" فرمایا ہے۔ اور سورۃ المائدہ میں "من بعد مواضعہ" فرمایا۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ سورۃ النسار کے الفاظ سے تاویل مراد ہے اور اُس آیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ آیات توریت وغیرہ کی باطل تاویلیں کرتے ہیں۔ اس میں یہ بیان نہیں ہے کہ وہ ان الفاظ کو کتاب اللہ سے نکال دیتے ہیں۔ اور جو الفاظ سورۃ المائدہ میں ہیں اُنسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں تحریفیں عمل میں لاتے ہیں۔ تاویل باطل بھی کرتے ہیں اور الفاظ بھی بدل ڈالتے ہیں۔ اس آیت میں "یحرفون الکلم" سے تاویل باطل کی طرف اشارہ ہے

اور "من بعد مواضعہ" میں الفاظ کو کتاب میں سے نکال ڈالنے کی طرف اشارہ ہے"۔

تفسیر کبیر صفحہ ۳۴۸ جلد ۳۔

پھر امام رازی اپنی تفسیر میں یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ جس کتاب کے حروف وکلمات کی شہرت حد تواتر تک پہنچ چکی ہو اُس کے حروف وکلمات میں تبدیلی کیوں کر ممکن ہے۔ تو اُس کا جواب یہ ہے کہ جس وقت اُس کی تبدیلی ہوئی تھی اُس وقت شاید اُس قوم میں قلت ہو اور توریت کے جاننے والے علما، اور بھی کم ہوں۔ اس لیے وہ لوگ اس تحریف وتبدیل پر قادر ہو گئے"

(تفسیر کبیر صفحہ ۳۴۸ جلد ۳)

ان کتابوں کی شہرت "حد تواتر" تک پہنچنے کی بابت بھی علمائے اسلام نے بہت کافی حد تک تنقید کی ہے وہ کہتے ہیں کہ ان کتابوں کا جمیع الفاظ واجزاء متواتر ہونا ثابت نہیں۔ اول تو ان کتابوں کے تعین مصنفین اور تعین زمانہ تصنیف میں خود اہل کتاب کے نزدیک اختلاف ہے اور ان کتابوں کے بہت سے الفاظ وفقرات وابواب کا مصنفین کتب سے بتواتر منقول ہونا اور کمی بیشی سے محفوظ ہونا وہ خود تسلیم نہیں کرتے اور ان کتابوں میں کمی بیشی و تغیر و تبدل کے وہ صاف صاف معترف ہیں۔ اہل اسلام کے نزدیک نقل متواتر کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کی ابتدا اور وسط میں بھی ویسی ہی کثرت ہو جیسی کہ انتہا میں اور کسی درجہ میں ایسی قلت نہ ہو جس سے اس کے ناقلین کا کذب پر اتفاق ممکن ہو۔ حالانکہ ہمارے مضامین سلسلہ ہذا کے گذشتہ نمبر ثابت کر چکے ہیں کہ توریت وانجیل کو یہ تواتر حاصل نہیں ہوا۔ دوم یہ کہ عہد جدید کے متعلق یہ امر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے کہ اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ کتب عہد جدید پر کسی وقت بھی کوئی زوال نہیں آیا اور جن لوگوں کی طرف یہ کتابیں منسوب ہیں (مثلاً متی یوحنا پولوس وغیرہم) انہی سے ان کتابوں کا ہر جزء بہ نقل متواتر ہم تک پہونچا ہے تب بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کتابوں میں جو تعلیم وہدایات ومضامین درج

وہ عیسیٰ علیہ السلام سے (جن پر انجیل کا نازل ہونا مسلمانوں کے نزدیک مسلم ہے) بتواتر منقول ہوں لہذا اس تواتر مفروض الوجود کا سلسلہ متی وغیرہ ہی پر ختم ہوتا ہے اور ان لوگوں کا صاحب الہام یا خدا کی طرف سے رسول ہونا مسلمان تسلیم نہیں کرتے نہ عیسائی اسے ثابت کر سکتے ہیں مسلمانوں کے نزدیک وہی انجیل واجب التسلیم والایمان ہے جو کہ عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی نہ کہ موجودہ مجموعہ عہد جدید جسے اور لوگوں نے تصنیف کیا۔ اس امر کی بابت ۱۲۸۵ھ سے قبل علما دہلی نے ایک فتوی شائع کیا تھا جس پر متعدد علماء کی مہریں ثبت تھیں۔ اس کی پوری عبارت کے یہاں درج کرنے میں طوالت ہوگی اس لیے اس میں سے دو اقتباسات ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

"نزد اہل اسلام انجیل عبارت از کلام الٰہی تبارک و تعالیٰ است کہ بر حضرت عیسیٰ علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام نازل شدہ بود مشتمل بر ہدایت و نور و مصدق احکام توریت و نصیحت برائے پرہیزگاران نہ از این مجموعہ عہد جدید"

دوسرا اقتباس یہ ہے:-

"بودن این تراجم مذکورہ یا اصل آنہا ہم اگر مطابق ہمیں تراجم مسطورہ است ہمان انجیل یعنی کلام ربانی کہ او تعالیٰ جلشانہ بانزال فرمودن آن بر حضرت عیسیٰ علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام در قرآن خبر دادہ نزد علماء شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ بخبر آحاد ہم مروی و محفوظ نیست چہ جاکہ خبر مشہور باشد و اعمال حواریین کہ تصنیف لوقا تابعی است و ہمچنین نامجات پولوس وغیرہ بر مذہب ما داخل نیستند بلکہ انجیل نزد ما فقط عبارت از آن کلام حضرت عیسیٰ بود کہ موافق وحی ربانی ارشاد آن فرمودہ پس اطلاق کلام ربانی بر این مجموعہ بلا سند شرعی چگونہ کردہ شود۔ بلکہ اطلاق کلام ربانی بر اصل توریت کہ بزبان عبرانی بودہ بر مجموعہ اہل انجیل بسبب تحریفات کثیرہ ہم نتواند شد زیرا کہ تحریفات بیشتر در

اصل ہر دو کتاب توریت و انجیل از ایشان واقع شدہ قرآن شریف بر تحریفات اینہا ناطق است "

مسلمان علماء کے نزدیک موجودہ توریت و انجیل کا مرتبہ بلحاظ صحت و ثبوت احادیث صحیحہ متواترہ سے گھٹا ہوا ہے بلکہ خبر واحد کے بھی برابر نہیں۔ صحیح اور متواتر احادیث نبوی وہ سمجھی جاتی ہیں جن کی ہر زمانہ میں بکثرت روایت کی گئی ہو اور عقل اُن کے کذب کو محال جانے اخبار آحاد کا اطلاق ان احادیث پر ہوتا ہے جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے صرف ایک یا دو یا چار اصحاب نے نقل کیا ہو گو بعد میں اُنکی نقل میں تواتر ہو گیا ہو۔ عیسائی محققین کی عینک سے بھی دیکھا جائے تو یہ کتابیں آحاد کے مرتبہ تک نہیں پہنچتیں کیونکہ ان کے ابتدائی راویوں ہی کے وجود میں اختلاف و شکوک واقع ہو چکے ہیں۔

باقی

اہل کتاب اور ایمان بالرسالت

(از جناب پرویز بی اے ہوم ڈیپارٹمنٹ نئی دہلی)

آزادی فطرت انسانی کا تقاضا ہے لیکن جس طرح فطرت کے ہر عطیہ سے صحیح صحیح فائدہ حاصل کرنے کے لیے تعین حدود و شرائط ضروری ہے اسی طرح آزادی بھی صحیح معنوں میں اسی صورت میں نفع بخش ہو سکتی ہے جب اسے بھی حدود و قیود سے محصور کیا جائے۔ یہی تعیین حدود مذہب کا منصب ہے۔ سلیم الفطرت طبائع تو اس تحدید کو آیۂ رحمت سمجھتی ہیں کہ وہ انہیں ہلاکت و بربادی کے عمیق غاروں سے بچاتی ہے لیکن سرکش طبائع کی یہ حالت ہے کہ وہ ہمیشہ اس حدود شکنی اور قیود فراموشی میں ہی لطف زندگی محسوس کرتی ہیں اور ان کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان کی طبعی جولانیوں اور نفسانی کامجوئیوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے حتی کہ تعینات کے تمام پردے اٹھ جائیں اور حدود و شرائع کے امتیازی خطوط یوں مٹتے چلے جائیں کہ جائز وناجائز کی تمیز ان کی اپنی عقل کے تابع ہو جائے۔ اور کفر و ایمان، حلال و حرام کی کچھ بحث ہی باقی نہ رہے اسلام کی یہ ایک امتیازی خصوصیت ہے کہ اس نے اس حدود بندی میں کہیں ایسی سخت گیری سے کام نہیں لیا جو انسان کے لیے غیر فطری کہلائی جا سکے لیکن اس کی پابندی بھی تو سلیم الفطرت طبائع ہی کے لیے خوش آیند ہوتی ہے، سرکش طبائع کی تو یہ کیفیت ہے کہ:-

فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ إِن تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَث (۷: ۲۲)

اس کی مثال کتے کی سی ہے کہ اگر اس پر تو بوجھ رکھے تب بھی ہانپے۔ اور اگر چھوڑ دے تب بھی ہانپے۔

ان میں سے بعض لوگ تو مذہب کے خلاف علانیہ علم بغاوت بلند کر کے کامل آزادی حاصل کر لیتے ہیں لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اسلام کی طرح ان کے کفر کی وفاداری مشروط بہ استواری نہیں ہو

وہ خواہشات انسانی کی کامرانیوں میں "دل کی حکومت" پر کسی اور قوت کا (Control) بھی گوارا نہیں کرنا چاہتے اور ساتھ ہی ساتھ بعض مصالح کے بنا پر مذہب سے اپنا رشتہ بھی منقطع نہیں کر سکتے۔ ایک طرف وہ یہ بھی اعلان کرتے رہتے ہیں کہ اسلام دنیا کا مکمل ترین مذہب ہے اور نوع انسانی کی فلاح و بہبود اسی کے ساتھ وابستہ ہے اور دوسری طرف اپنی بارگاہ جبروت سے یہ فتویٰ بھی شائع کرتے رہتے ہیں کہ حصول مقاصد کے لیے عقیدہ کوئی شئے نہیں۔ "ایک مشرک کو محض اس لیے جہنم میں کیوں ڈال دیا جائے کہ اس نے خدا کے سوا کسی اور کے سامنے بھی اپنا سر جھکا دیا تھا"۔ کوئی معاملہ اعمال سے متعلق ہو یا عقائد سے، جب ان کے سامنے آتا ہے تو وہ کبھی یہ نہ دیکھیں گے کہ خدا اور رسول کا اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ بلکہ وہ ہمیشہ اسے اس خیال کے تابع دیکھیں گے کہ ایسے یوں ہونا چاہیے۔ یہ گروہ تو بحیثیت مسلمان قابل تخاطب ہی نہیں۔ اس لیے کہ جو شخص شرک اور توحید کے عقیدہ میں کوئی فرق نہیں سمجھتا، جو کسی معاملہ کے فیصلہ میں اپنی عقل کو ہی حکم تسلیم کرتا ہے اس کے سامنے قرآنی استدلال پیش کرنا خود اپنی حماقت کا ثبوت دینا ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآن کریم میں آئین و ضوابط، عبادات و مناسک، شرائع و مناہج کے صرف اصول مذکور ہیں۔ اُن کی تفصیل و تبیین، تشکیل و تعمیل ہیں اس "صراط مستقیم" میں ملیگی جس کی نسبت خود خدائے تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ تمہارے لیے ایک بہترین نمونہ ہے (لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ) لہذا ایک گروہ نے تکلیفات شرعیہ سے بچنے کے لیے یہ راہ نکالی کہ اوامر و نواہی میں قرآنی اجمال ہی واجب الاتباع ہے، شریعت میں اسوۂ رسول اللہ کی کوئی حیثیت نہیں۔ لیجیے ایک "ذرا سی" تبدیلی سے ہزاروں پابندیاں اٹھ گئیں۔ ان میں سے بعض کا تو یہ خیال ہے کہ قرآن کریم میں عبادات وغیرہ کے لیے جو اجمالی احکام ہیں ان کی تفصیل بھی خود قرآن ہی کے اندر موجود ہے۔ اور اس تفصیل کی تلاش میں پھر وہ بڑی بڑی نادر تاویلات تصنیف کرلاتے ہیں کہ اللہ کی پناہ! لیکن بعض حضرات ان سے بھی چار قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ نہیں قرآن کریم میں الصلوٰۃ اور الزکوٰۃ وغیرہ کے الفاظ معروف بہ لام عہدی ہیں جس سے مطلب

کہ جس قسم کی صلوٰۃ یا زکوٰۃ مسلمانوں کے لیے فرض قرار دی گئی ہے، مخاطبین کے سامنے اس وقت اس کی عملی صورتیں موجود تھیں یعنی امم سابقہ کے پیروان کو اسی صورت اُسی ہیئت سے بجالاتے تھے جو مسلمانوں میں رائج ہوگئیں، لہٰذا جس چیز کی تفصیل مخاطبین کے سامنے موجود تھی، اس کی مزید وضاحت کی قرآن میں کیا ضرورت تھی؟ آپ شائد حیران ہوں کہ ایسا دعویٰ کس طرح سے پیش کیا جاسکتا ہے کہ جس کی تکذیب خود قرآن میں موجود ہے (کہ اس وقت کے مخاطبین کی نماز کے بارے میں خود قرآن گواہ ہے کہ وہ کعبہ کے گرد سیٹیاں بجانا اور ننگے ناچ کرنا تھا) اور تاریخ بھی ان کو باطل ٹھیراتی ہے (کہ تمام اہل کتاب کی نمازیں ہمارے سامنے ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی تو مسلمانوں کی نماز سے مشابہ نہیں۔ چہ جائیکہ بالکل یکساں ہو) لیکن اس کا کیا علاج کہ ایسے حضرات موجود ہیں جن کا دعویٰ یہی ہے۔

یہ گروہ چونکہ ایک مستقل فرقہ بن چکا ہے۔ اور اس کے عقائد کے متعلق بہ حیثیت ایک فرقہ کے ایک عرصہ سے بحث و مباحثہ ہوتا چلا آرہا ہے اس لیے اس مقالہ میں ہمارا تخاطب ان سے بھی نہیں۔

البتہ ایک تیسرا گروہ ہے جس کا دعویٰ ہے کہ چونکہ ہر قوم میں کوئی رسول ضرور مبعوث ہو چکا ہے، نجات و سعادت کے لیے کسی خاص شرع و منہاج کی ضرورت نہیں۔ ایک یہودی یا نصرانی، گبر و برہمن اپنے اپنے عقیدے پر قائم رہتے ہوئے اسی طرح نجات حاصل کرسکتا ہے جس طرح ایک مومن قرآن اور رسول اللہ کے اتباع سے حاصل کرسکتا ہے۔ اگرچہ ان کا یہ دعویٰ تو ایک بڑے وسیع دائرہ کو محیط ہے، لیکن اس کی مخصوص شکل یوں سمجھیے کہ ان کے نزدیک اہل کتاب کے لیے یعنی ان اقوام کے لیے جنہیں دعویٰ ہے کہ وہ کسی نہ کسی پیغمبر کی شریعت اور کتاب کے حامل ہیں، قرآن اور رسول اللہ پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ اس مقالہ میں صرف انہی مسلمان حضرات کو مخاطب کیا جا رہا ہے جن کا یہ عقیدہ ہے، اور کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کریم کے واضح اور منصوص احکام اس بارے میں ان کے سامنے رکھ دیے جائیں تاکہ وہ خود فیصلہ کرسکیں کہ ان کا یہ عقیدہ کس حد تک قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہے۔ اور کس حد تک اس میں ان کی مزعومہ

اور رواداری کا دخل ہے جس کے متعلق وہ اکثر محسوس نہیں کرتے کہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ جس شخص کا قرآن پاک کی حقانیت پر ایمان ہے، قرآن کریم کا کھلا کھلا فیصلہ سامنے آ جانے کے بعد اس کے لیے سرتابی ورد گردانی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اہمیت اس موضوع کی اس لیے زیادہ ہے کہ چند سال ادھر سے اس عقیدہ کی ایک عام رو پھیلتی چلی جا رہی ہے، اور معترضین کے اس دعوے کے ثبوت میں جسقدر دلائل نظر سے گذر رہے ہیں وہ عام طور پر قرآن کریم کی صحیح تعلیم سے بے خبری پر مبنی ہوتے ہیں۔ یوں بھی تمام مذہبی نظام میں ایمان بالرسالت ایک نہایت اہم اور نہایت نازک مقام ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہی وہ مرکز اور وہ قطب ہے جس کی بنا پر یہ نظام قائم ہے۔ لہذا اس کے متعلق ایک صحیح، واضح، غیر مشکوک اور غیر متزلزل ایمان ہمارے قلوب میں مرتسم ہونا چاہیے کہ یہی وہ پل صراط ہے جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے، اور جس کے پائے استدلال میں اس پر ذرا بھی لغزش ہوئی، ضلالت و گمراہی کے ابدی جہنم میں گر گیا وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ۔

جس شخص نے قرآن کریم کا ایک بار بھی مطالعہ کیا ہے اس پر اس حقیقت کے واضح کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں کہ قرآن کریم نے عمل صالح کو ایمان سے مشروط رکھا ہے۔ و اذا فات الشرط فات المشروط۔ ایمان ہی نہ ہوا تو عمل صالح کس طرح ہو سکتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ایمان کے بارے میں قرآن کریم کا کیا مطالبہ ہے اور اس کی رو سے ایمان کن اجزاء لاینفک پر مشتمل ہے۔ قرآن پاک کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ اجزائے ایمان قرآن کی رو سے پانچ ہیں۔ اللہ۔ ملائکہ۔ کتب۔ رسل۔ یوم آخر۔ اس کی تصریح کئی مقامات پر مذکور ہے۔ مثلاً۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (۲: ۲۲)

بلکہ نیکی اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر، اور یوم آخر پر، اور ملائکہ پر اور کتاب پر اور نبیوں پر۔

انہی اجزائے ایمانیہ کے انکار کا نام کفر اور صریح گمراہی ہے۔

وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا۔ جو کوئی انکار کرے اللہ سے۔ اور ملائکہ سے۔ اور کتابوں سے اور رسول سے اور قیامت کے دن سے تو وہ بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا۔ (۴: ۲۰)

لیکن قرآن کریم کا اسلوب بیان یہ ہے کہ وہ مناسب مقامات پر تو تفصیل دیتا ہے لیکن جب دیگر مختلف مقامات پر اس تفصیل کے حوالہ کی ضرورت ہوتی ہے تو صرف اجمالاً اس کا ذکر کرتا جاتا ہے۔ چنانچہ اجزائے ایمان کے متعلق بھی یہی انداز و اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ تفصیلاً اجزائے ایمان بیان کر دینے کے بعد اب جہاں جہاں جس جزو پر زور دینے کی ضرورت ہوتی ہے، یا اس تفصیل کا حوالہ مقصود ہوتا ہے، وہاں ایک ایک دو دو اجزا کا ذکر کرتا جاتا ہے اور باقی اجزاء چھوڑتا جاتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ صرف ایمان باللہ کا ہی ذکر ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ (۴۱: ۴) جن لوگوں نے اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر ثابت قدم رہے تو ان پر فرشتے نازل ہوں گے۔

متعدد مقامات پر محض اللہ اور آخرت پر ایمان کا ہی ذکر ہے:۔

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ (۲: ۸) جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لایا اور اعمال صالح کیے۔ ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔

کہیں خدا اور رسول پر ایمان کی دعوت دی گئی ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ (۳: ۱۸) پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔

ایک جگہ اللہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم۔ اور قرآن پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے:۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا (۶۴) پس ایمان لاؤ اللہ پر۔ اور اس کے رسول پر۔ اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔

غرض کہ مختلف مقامات پر مختلف اجزاے ایمان کا ذکر ہے اور اس سے ہرگز ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ ایمان کے اجزا ایک دوسرے سے الگ کیے جاسکتے ہیں اور صرف ایک یا دو اجزا پر ایمان لانا مومن ہونے کے لیے کافی ہے۔ اجزاء ایمان کو بعض مقامات پر الگ الگ بیان کرنے سے مقصود صرف یہ ہے کہ موقع و محل کی مناسبت سے بعض اجزائے پر خاص طور سے زور دیا جائے۔ ورنہ دراصل مطالبہ تمام اجزاے ایمان کا مشترک طور پر ہے اور ان میں سے کسی ایک کا کفر بھی سب کا کفر ہے مثلاً سورۂ توبہ میں ان منافقین کے مقابلہ میں، جو مختلف حیلہ جوئیوں اور عذر تراشیوں سے کسی نہ کسی طرح جہاد سے بچکر نکل جانے کی سوچ میں رہا کرتے تھے، اُن مومنین کا ذکر ہے جو میدان جہاد میں جم کر کھڑے ہوتے اور کبھی واپس آنے کی اجازت نہ مانگتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہی مسلمان تھے جن کا خدا و آخرت کے ساتھ، قرآن اور رسول اللہ پر محکم ایمان تھا، لیکن ان کے متعلق فرمایا:-

لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ۔ اِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ۔ (۹: ۷)	جو لوگ اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اپنے مال و جان سے جہاد کرنے کے بارے میں آپ سے اجازت نہ مانگیں گے اور اللہ متقیوں کو جانتا ہے۔ جہاد میں نہ جانے کے لیے صرف وہی لوگ آپ سے رخصت مانگیں گے جو اللہ پر اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ سو وہ اپنے شک ہی میں حیران و سرگرداں ہیں۔

ظاہر ہے کہ اگرچہ ذکر صرف ایمان باللہ اور آخرت کا ہے لیکن مقصد ایسے ہی ایمان سے ہے جیسا ان مجاہد مسلمانوں کا تھا۔ اور ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں کہ قرآن پاک نے جہاں ایجاز و اختصار سے بھی کام لیا ہے، وہ بھی اس کے حکیمانہ انداز بیان پر دلالت کرتا ہے مطلب اس سے یہ ہے کہ اگرچہ قرآن کریم میں ایمان

اجزاے ایمان میں سے ذکر کسی ایک یا ایک سے زیادہ کا ہو لیکن مقصود ہمیشہ تمام اجزاے ایمان ہوں گے ایک کی کمی بھی کفر لازم کر دے گی۔

ان اجزاے ایمان میں سے جہانتک ہمارے موضوع کا تعلق ہے، ایمان باللہ و ملائکہ و یوم آخر محل نظر نہیں کیونکہ یہ اجزاے ایمان اہل کتاب کے ہاں بھی موجود ہیں خواہ کیسی ہی مسخ صورت میں ہوں (اور یہ ایک جداگانہ مسئلہ ہے) زیر بحث مسئلہ صرف کتابوں اور رسولوں پر ایمان ہے۔ ہمارے تجدد پسند طبقے کا خیال ہے کہ اہل کتاب اپنے اپنے رسول اور اپنی اپنی کتاب پر ایمان رکھتے ہوے اور انہی کے مطابق عمل پیرا ہوتے ہوے، انہی ثمرات ایمان و عمل سے بہرہ اندوز ہوسکتے ہیں جو قرآن کریم اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے، اور شریعت اسلامی کے مطابق عمل کرنے سے حاصل ہوتے ہیں یعنی بحث صرف اتنی رہ جاتی ہے کہ کتب و رسل میں قرآن پاک اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا بھی شامل ہے یا نہیں۔ اور ان کے بغیر ایمان ممکن ہوسکتا ہے یا نہیں۔ یہ امر بدیہی ہے کہ کتب اور انبیاء پر ایمان لانے سے مقصد وحید یہی ہے کہ ان کو منجانب اللہ مان کر ان کے احکام کی اطاعت اور ان کے طریقے کی پیروی کی جائے اور نہ ان پر محض ایمان لے آنا۔ تو کچھ معنی نہیں رکھتا۔ (جیسا ہمارے ہاں برہمو سماج والے ایمان رکھتے ہیں)۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللهِ۔ (۴:۹) — اور کسی رسول کو ہم نے نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ بحکم الٰہی اس کی اطاعت کیجائے۔

اور قرآن کریم کے متعلق فرمایا۔

اِتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ (۷:۳) — جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اسی کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے اولیا کی پیروی نہ کرو

اصل بحث تک آنے سے پیشتر ایک نظریہ بھی دیکھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم جس چیز کو دین یا اسلام

کے نام سے پیش کرتا ہے اسکی اصلیت کیا ہے۔ قرآنی تعلیم کا اس باب میں مفہوم یہ ہے کہ اسلام اس ہدایت اور روشنی کا نام ہے جو نوع انسانی کو ہلاکت و بربادی سے بچاکر ایک ایسے سیدھے راستے پر لگا دے جو اسے اس منزل مقصود تک بلا خوف و خطر پہنچا دے جو حیات انسانی کا منتہی ہے۔ یہ روشنی مختلف زمانوں میں مختلف اقوام عالم کے اندر حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے اہل عالم تک پہنچتی رہی لیکن یا تو انسانی دسیسہ کاریوں کی وجہ سے اس کی صورت مسخ ہو جاتی رہی یا نسیان کی بدولت فراموش کر دی جاتی رہی، حتیٰ کہ خدائے واحد کا سچا پیغام وحید رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے قرآن کی صورت میں دنیا میں آیا۔ اور اس کی حفاظت خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لی۔ گویا قرآن کریم قانون الٰہی کے صحائف کی (Latestedition) ہے اور ایسی ایڈیشن ہے کہ اس کے بعد اس میں نہ تو کسی تغیر و تبدل کی ضرورت ہے اور نہ تحریف و الحاق کا امکان ہے۔ ظاہر ہے کہ نزول قرآن کے وقت دنیا میں بہت سی ایسی قومیں موجود تھیں جن کے پاس یہ روشنی اس سے قبل آچکی تھی اور وہ کسی نہ کسی منہاج و شریعت آئین و قانون کی حامل ہونے کی مدعی بھی تھیں لیکن قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ جس روشنی کو یہ لوگ شمع الٰہی کی کرنیں اور سراج منیر کی شعاعیں سمجھ رہے ہیں، اس پر ذہن انسانی کے رنگین فانوس چڑھے ہوئے ہیں، اس لیے وہ اپنے اصلی رنگ اور حقیقی پیکر میں دنیا کی کسی قوم کے پاس موجود نہیں، بنی اسرائیل اس دعوے میں جملہ اقوام عالم کے پیش پیش تھے۔ اُن کے متعلق جا بجا قرآن کریم میں مذکور ہے کہ انہوں نے توریت میں اختلافات ڈالے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيهِ (۱۱:۴۱) ہم نے موسیٰ کو کتاب دی۔ سو اس میں اختلافات ڈالے گئے تحریفات کیں کچھ حصہ بھلا بھی دیا۔

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ (۵:۱۳) وہ کلمات کو ان کی جگہ سے پھیر دیتے ہیں اور جو کچھ ان کو یاد دلایا گیا تھا اس میں سے ایک حصہ انہوں نے بھلا دیا۔

کتمان حقیقت بھی کی جاتی تھی۔

تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا - (۶: ۱۱)	تم اس کو الگ الگ ورق بنا رکھتے ہو کچھ ظاہر کرتے ہو اور زیادہ تر چھپاتے ہو ۔

الحاق بھی کرتے تھے ۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا - (۲: ۹) -	افسوس ہے ان پر جو کتاب اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس سے تھوڑی سی قیمت حاصل کریں ۔

قرآن کا ہر دعوی حقیقت پر مبنی ہے۔ آج جبکہ دنیا میں اس قدر علمی ریسرچ ہو رہی ہیں۔ دس دس ہزار سال پیشتر کی تہذیب و تمدن کے آثار کھود کھود کر نکالے جا رہے ہیں، دنیا کی کوئی قوم اپنی کوئی مذہبی کتاب ایسی نہیں پیش کر سکی جس کے متعلق وہ خود حتمی طور پر کہہ سکے کہ اس مذہب کے بانی نے اسے اسی شکل میں دنیا کو دیا تھا یورپ نے آج ان زبانوں تک کی تحقیق کر لی ہے، جن کا سمجھنے والا دنیا میں کوئی باقی نہیں رہا ۔ اور باوصف اس امر کے کہ مذہب عیسائیت، اسلام کے سوا، دنیا میں قریب ترین زمانے کا مذہب ہے، انجیل کا اصل نسخہ آجتک ان کے ہاتھ نہیں لگا۔ یورپ کے پاس سب سے پرانی کتاب وہی ہے جسے سال گذشتہ روس سے لاکھوں روپے کے عوض خریدا گیا ہے لیکن وہ بھی جناب مسیح علیہ السلام سے تین سو برس بعد کی لکھی ہوئی ہے۔ باقی اقوام عالم کا اس سے اندازہ لگا لیجیے۔ ایک طرف تو دنیا کی مذہبی کتابوں کی یہ حالت اور دوسری طرف غیر مسلم مورخین تک کی شہادت موجود ہے کہ قرآن کریم اپنے ایک ایک لفظ اور ایک ایک نقطہ کی صحت کے ساتھ دنیا میں چلا آ رہا ہے ۔

یہ ہے وہ ایمان جو کتب و رسل کے بارے میں قرآن کریم پیش کر رہا ہے۔ جو لوگ دنیا میں ہدایت انسانی کے لیے کسی آسمانی روشنی کی ضرورت کے قائل نہیں، ان سے تو مخاطب نہیں لیکن جو لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ انسانی سعادت و نجات کے لیئے وحی ربانی کی ضرورت لاینفک ہے، وہ ذرا غور فرمائیں کہ جب تمام اقوام عالم معترف ہیں کہ ان کے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس کی بنا پر وہ وثوق کے ساتھ کہہ سکیں کہ ان کے پاس جو تعلیم

وہ بلا تحریف و الحاق آسمانی ہے تو ایسی مشکوک تعلیم نجات و سعادت کی کفیل کیسے ہو سکتی ہے اس کے برعکس قرآن اپنے دعوے کے ثبوت میں خود ایک زندہ شہادت دنیا کے سامنے موجود ہے اور بجز قرآن کے سوا جتنی مذہبی کتابیں آج دنیا میں موجود ہیں کسی ایک میں بھی یہ دعویٰ نہیں ملتا کہ ان کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہو۔

اس مقدمہ کو پیش کرنے کے بعد اسلام کا یہ مطالبہ ہے کہ قطعی و یقینی علم آچکنے کے بعد۔ (وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ ۶۹ : ۲ -اور بے شک یقینی حق ہے) ظنی اور قیاسی تعلیم کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ (وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۱۰ : ۴ -اور حق کے مقابلہ میں ظن و قیاس کچھ فائدہ نہیں دے سکتا)۔ اس لیے یہ ماننا ہوگا کہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام اپنے اپنے وقتوں میں خدا ہی کی طرف سے یہ پیغامات لائے تھے جو دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکے۔ قرآن کریم پر اس لیے ایمان لانا ضروری ہے کہ اس میں وہ تمام پیغامات اپنے اصلی اور حقیقی رنگ میں موجود ہیں۔

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (۵ : ۴۸) اور ہم نے تجھ پر حق کے ساتھ کتاب اتاری جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور ان کی محافظ بھی

یہ ہے قرآن کریم کا ایمان کتب و رسل سے مفہوم

بعض حضرات کہا کرتے ہیں کہ جب قرآن اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے تو پھر ان کو منسوخ العمل کیوں قرار دیتا ہے لیکن وہ اس امر کو نہیں سمجھتے کہ قرآن تصدیق تو کرتا ہے ان اصلی پیغامات کی جو حضرات انبیائے کرام علیہ السلام دنیا میں لاتے رہے اور تنسیخ کرتا ہے ان کتابوں کی جو انسانی ہاتھوں نے اصلی کتابوں کے نام سے دنیا میں پیش کر رکھی ہیں۔ ورنہ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ قرآن ان کتابوں کی بھی تصدیق کر رہا ہے جو اہل کتاب کے پاس موجود ہیں تو ایسے کس طرح سے تسلیم کیا جائے گا کہ ایک طرف تو وہ اہل کتاب کے خلاف ان پر الزام عائد کیے جا رہا ہے (جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں) کہ وہ تحریفات کرتے ہیں، اختلافات ڈالتے ہیں،

چھپاتے ہیں، الحاق کرتے ہیں، اور دوسری طرف انہی تحریف شدہ صحائف کی تصدیق بھی کر رہا ہے ایک طرف تو اس کا دعویٰ ہے کہ یہ لوگ خود اپنے ہاتھوں سے لکھ کر پھر غلط دعویٰ کرتے ہیں ھذا من عند اللہ (یہ اللہ کی طرف سے ہے) اور دوسری طرف انہی کے لکھے ہوئے پر مہر تصدیق بھی ثبت کر رہا ہے کہ فی الحقیقت یہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ قرآن ایسی شاعری سے بلند ہے۔ یہ محض ذہن انسانی کا ہی فریب ہے۔

اب دیکھیے کہ قرآن کریم جس ایمان کا مطالبہ کرتا ہے وہ یہی ہے یا اس یکی کا استثنا بھی ہے۔ قرآن کریم کا پہلا ورق الٹیے۔ فاتحۃ الکتٰب کے بعد سب سے پہلے رکوع میں بتا یا گیا ہے کہ مفلحون کون ہیں؟ یعنی فلاح و نجات۔ کامیابی اور کامرانی کن کے لیے ہے۔ فرمایا۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (۲: ۱) اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے اور اس پر جو تجھ سے پہلے نازل کیا گیا ہے۔

اس میں اہل کتاب اور غیر اہل کتاب کی کوئی تخصیص نہیں۔ اس کے بعد دیکھیے کہ خاص اہل کتاب کے متعلق فرمایا۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ (۲: ۱۱) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اس پر جو اللہ تعالےٰ نے نازل کیا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اس پر ایمان لائیں گے جو ہم پر نازل کیا گیا ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس سے انکار کرتے ہیں۔

ان سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم سے تمام برکات اس لیے چھن گئی ہیں کہ توریت و انجیل تو تمہارے پاس رہی نہیں جس پر تم قائم رہتے۔ اور قرآن پر تم ایمان نہیں لاتے۔ اگر توریت و انجیل ہی محفوظ ہوتیں تو ان پر قائم رہنے سے یہ برکات بھی باقی رہتیں۔ لیکن اب تو سوائے قرآن کریم پر ایمان لانے کے، جو توریت و انجیل کی بھی سچائیوں پر مشتمل ہے، اور کوئی ذریعہ کامیابی نہیں ہو سکتا۔

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ حَتّٰى	کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب تم کسی دین پر نہیں ہو تا وقتیکہ
تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ	توریت کی اور انجیل کی اور جو کتاب تمہارے رب کی
مِّنْ رَّبِّكُمْ (۵: ۱۰)	طرف سے نازل کی گئی ہے اس کی پابندی نہ کرو۔

اور دوسری جگہ ہے کہ۔

وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ	اگر یہ لوگ توریت و انجیل کی اور جو کتاب اُن کے رب کی
وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ	طرف سے ان پر نازل کی گئی ہے اس کی پابندی کرتے تو
فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (۵: ۹)	یہ لوگ اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے خوب فراغت سے کھاتے

حقیقت یہ ہے کہ اگر توریت و انجیل کی سچی تعلیم پر یہ لوگ کاربند رہتے تو نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کر لیتے کیونکہ ان کتابوں میں صریح پیش گوئیاں موجود تھیں کہ نبی آخر الزمانؐ عرب میں مبعوث ہوں گے اور حکم دیا گیا تھا کہ جب وہ نبی تشریف لے آئیں تو ان کی پیروی کرنا۔ یہ ہے توریت و انجیل پر قائم رہنے کا مطلب۔

پھر مومن کی تعریف ہی یہ فرمائی کہ جو قرآن کریم پر ایمان رکھتا ہو۔ اور اس کی تخصیص فرمادی

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوْا	اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے اور
بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ	جو اس پر ایمان لائے جو محمدؐ پر نازل کیا گیا ہے کہ وہی ان کے
كَفَّرَ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَ اَصْلَحَ بَالَهُمْ	رب کی طرف سے حق ہے اللہ ان کے گناہ ان پر سے اتار دیگا
(۴۷: ۱)	اور ان کی حالت درست رکھے گا۔

یہ ظاہر ہے کہ حقائق دنیا میں کبھی مختلف نہیں ہوا کرتے۔ دو اور دو آج بھی اسی طرح چار ہیں جس طرح فیثا غورث کے زمانے میں تھے ایرانی بھی اس کے اسی طرح قائل ہیں جس طرح سے یونانی۔ اختلافات اس لیے موجود تھے کہ ان کے پاس حقیقت موجود نہ تھی۔ اور قرآن کا۔ بہ حیثیت حقیقت یہ منصب ہے کہ وہ ان

اختلافات کو مٹائے۔ فرمایا۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۲۷:۶)

بیشک یہ قرآن بنی اسرائیل پر اکثر ان باتوں کی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔

ایک بنی اسرائیل ہی نہیں تمام اقوام عالم کے اختلافات مٹانے کے لیے بھی ایک حقیقت ہے۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (۱۶:۸)

اور ہم نے یہ کتاب تیری طرف صرف اس لیے اتاری ہے کہ جن چیزوں میں انھوں نے اختلاف کیا ان کی حقیقت ظاہر کر دے

اختلافات لاعلمی کے اندھیرے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔"

اور قرآن ایک مشعل علم و حقائق ہے اس لیے وہی تمام نوع انسانی کو (بلا تمیز اہل کتاب و غیر اہل کتاب) اس اندھیرے سے روشنی کی طرف لانے والا ہے۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴:۱)

یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تیری طرف اتارا ہے کہ تو لوگوں کو تاریکی سے روشنی کی طرف نکال لائے۔

کتب سماویہ کے حامل اپنی تعلیم کو خاص اقوام اور خاص ممالک تک محدود سمجھتے ہیں۔ برہمن اس شودر کے کان میں سیسہ گلا کر ڈال دیتا ہے جو وید (بلکہ سنسکرت) کا ایک لفظ بھی سن پائے۔ توریت صرف بنی اسرائیل کے لیے ہے۔ انجیل بیٹوں کی روٹی کتوں کے آگے نہیں ڈالنا چاہتی اور جناب مسیح علیہ السلام صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لیے بتائے جاتے ہیں لیکن قرآن کی دعوت مکان و زمان کی حدود سے مقید نہیں۔ اس کا اعلان ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا (۲۵:۱)

برکت والی ہے وہ ذات جس نے یہ فیصلہ کرنے والی کتاب اپنے بندے پر نازل کی ہے کہ وہ تمام جہان والوں کے لیے ڈرانے والا ہو۔

دوسری جگہ ہے:۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا۔ (۴:۲۴)	اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل آچکی ہے۔ اور ہم نے تمہارے پاس ایک صاف روشنی بھیجی ہے۔ جو لوگ اللہ پر ایمان لائیں اور اس کو مضبوط پکڑیں، ان کو اللہ اپنی رحمت اور فضل میں داخل کریگا اور اپنے تک انکو سیدھا راستہ بتادیگا۔

دیکھیے اس میں تمام نوع انسانی کو مخاطب کیا گیا ہے اور خدا تک پہنچنے کا راستہ قرآن کریم سے اعتصام ہی بتایا گیا ہے۔ سورہ یونس میں ہے۔

قُلْ يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (۱۰:۱۱)	کہدیجیے کہ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے حق پہنچ چکا ہے پس اب جو شخص راہ راست پر آجائیگا وہ اپنے نفع کے واسطے راہ راست پر آئیگا اور جو گمراہ ہوگا اس کا وبال اُسی پر پڑیگا۔

کتاب پر ایمان اور رسول پر ایمان دراصل ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص قرآن کریم کو تو منجانب اللہ مانے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول نہ مانے۔ یا رسول اللہ کو مامور من اللہ تسلیم کرے اور قرآن کو خدا کی کتاب نہ جانے۔ اس لیے کہیں تو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت ہے اور کہیں رسول پر۔ اور کہیں دونوں مذکور ہیں۔ پھر مخاطب اس دعوت کے اہل کتاب اور غیر اہل کتاب سب ہیں اسی دعوت کو دعوت اسلام قرار دیا گیا ہے۔

وَقُل لِّلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوا	اے محمد ان سے بھی کہو جو اہل کتاب ہیں اور ان سے بھی جو ان پڑھ ہیں یعنی غیر اہل کتاب کہ کیا تم اسلام لائے ہو؟ اگر وہ اسلام لے آئے تو راہ راست پر آگئے

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ (۳: ۲۰) اور اگر انہوں نے روگردانی کی تو تمہارا اوپر صرف پیغام پہونچا دینے کی ذمہ داری ہے

اب دیکھیے کہ اسلام کیا ہے اور قرآن کی رو سے مُسلم کی کیا تعریف ہے؟ اسی سورۃ آل عمران کے نویں رکوع میں فرمایا ہے:۔

"جب اللہ نے انبیاء سے عہد لیا کہ جو کچھ میں تم کو کتاب اور علم دوں، پھر تمہارے پاس وہ پیغمبر آئے جو مصدق ہو اس کا جو تمہارے پاس ہے۔ تو تم ضرور اس پر ایمان بھی لانا اور اس کی مدد بھی کرنا۔ فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کیا؟ اور اس پر میرا عہد قبول کیا؟ وہ بولے ہم نے اقرار کیا۔ ارشاد ہوا کہ گواہ رہنا۔ اور میں بھی اس پر تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔ سو جو شخص اس کے بعد روگردانی کرے گا، تو ایسے لوگ فاسقین میں سے ہیں۔ تو کیا پھر یہ لوگ دین خداوندی کے سوا کسی اور دین کو چاہتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کے سامنے سب سر جھکائے ہوئے ہیں جتنے آسمان اور زمین میں ہیں، طوعاً و کرہاً۔ اور سب خدا ہی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ فرما دیجیے کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا ہے اور اس پر جو ابراہیم و اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولاد یعقوب کی طرف بھیجا گیا۔ اور اس پر بھی جو موسیٰ اور عیسیٰ اور تمام انبیاء کو دیا گیا ان کے رب کی طرف سے ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ ہی کے لیے مسلم ہیں۔ اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کریگا تو وہ اس سے مقبول نہیں کیا ہوگا۔ اور وہ آخرت میں سخت نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔"

انبیاء سے عہد لینے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی وساطت سے ان کی امتوں سے عہد لیا گیا چنانچہ کتب سماوی کے جو حصے آج بھی ملتے ہیں ان سے بھی پتا چلتا ہے کہ ہر نبی نے اپنی امت کو قرآن اور رسول عربی پر ایمان لانے کی تاکید کی تھی انجیل برنباس (جسے عیسائی دنیا ایک مدت تک چھپاتی رہی ہے اور بالآخر ایک عجیب طریقے سے باہر آئی ہے) میں تو حضور کا اسم گرامی اور جملہ حالات تک موجود ہیں پھر اسلام کے ایمان میں تمام انبیاء و کتب سماوی پر ایمان

لانے کی شرط ہے۔ اس کا ایک جزبھی ساقط ہو جائیگا تو ایمان نہیں رہیگا۔ کفر ہو جائیگا۔ اہل کتاب قرآن اور محمد پر ایمان لانے کے لیے کب تیار ہیں؟ اور اگر وہ ایمان لے آئیں تو پھر جھگڑا ہی کیا باقی رہ جاتا ہے۔ اہل کتاب یہی کرتے ہیں نا کہ وہ بعض پیغمبروں پر ایمان لاتے ہیں اور بعض پر نہیں لیکن دیکھیے قرآن کریم اس قسم کے ایمان کے متعلق کیا فرماتا ہے:-

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا (۴: ۲۱)	جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور چاہتے یہ ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعضوں پر تو ایمان لاتے ہیں اور بعضوں پر نہیں لاتے اور یوں چاہتے ہیں کہ اس کے بین بین کوئی راہ تجویز کریں ایسے لوگ پکے کافر ہیں اور کافروں کے لیے ہم نے رسواکن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے سب رسولوں پر اور ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے ان لوگوں کو ضرور اللہ ان کے اجر عطا کرے گا۔ اور اللہ بڑی مغفرت والا مہربان ہے۔

خیال فرمایا آپ نے کہ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا (یہ لوگ بلاشک وشبہ پکے کافر ہیں) کن کے متعلق ہے؟ ان کے نہیں جو دنیا میں کسی پیغمبر کی امت نہیں ہیں بلکہ ان کے لیے ہے جو کسی نہ کسی پیغمبر پر تو ایمان رکھتے ہیں، لیکن باقی پیغمبروں پر ایمان نہیں رکھتے اور اس طرح خدا کے رسولوں میں تفریق کرتے ہیں۔ یہ نہ صرف رسولوں کا ہی انکار ہے بلکہ خود خدا کا انکار ہے کہ بھیجنے والا تو کہہ رہا ہے کہ یہ ہماری طرف سے مرسل برحق ہے اور یہ اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ رسول کی تکذیب خود اس کے بھیجنے والے کی تکذیب ہے۔ خدا کو خدا اور رسول کو رسول سمجھنا یہ تفریق تو البتہ ضروری ہے۔ لہذا محمد صدر آیات میں

جس تفریق کو کفر کہا گیا ہے اس سے مراد یہ تفریق ہے کہ یا تو تمام رسولوں کو چھوڑ کر صرف خدا کی وحدانیت کا اقرار کیا جائے۔ یا بعض رسولوں کو چھوڑ کر بعض کی رسالت کا اقرار کیا جائے۔ یہی تفریق کفر صریح ہے۔

بعض لوگ کہدیا کرتے ہیں کہ جس طرح مسلمان حضرت موسیٰ و عیسیٰ و دیگر انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ منجانب اللہ تھے لیکن اتباع صرف محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی کرتے ہیں، اسی طرح عیسائی اور موسائی اگر محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو منجانب اللہ سمجھیں لیکن اتباع اپنے ہی مذہب کا کرتے رہیں تو اس میں کیا فرق ہے؟ بظاہر یہ اعتراض معقول نظر آتا ہے مگر غور کرنے سے اس کی غلطی بآسانی واضح ہو جاتی ہے اول تو یہ کہ قرآن کریم نے ان انبیاء کرام اور ان کی کتب کے متعلق صرف تصدیق و ایمان کا حکم دیا ہے اتباع کا حکم نہیں دیا اس لیے کہ وہ کتابیں دنیا سے ناپید ہیں جس ایمان میں اتباع شامل ہے وہ ایمان صرف قرآن و محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی ہے اور تمام انبیاء کرام کی امتوں کے لیے حکم ہے کہ وہ قرآن ہی کا اتباع کریں کیونکہ نیا قانون پاس ہونے کے بعد پرانا قانون اور نیا وائسرائے آنے کے بعد پرانا وائسرائے قابل اطاعت نہیں رہتا۔ دوسرے یہ کہ عیسائی اور موسائی اگر اتباع کر رہے ہیں تو خود ساختہ اپنے بنائے ہوئے دین کا اتباع کر رہے ہیں نہ کہ حضرت عیسےٰ و موسیٰ علیہما السلام کا جیسا کہ خود قرآن اور تاریخ سے ثابت ہے موسیٰ علیہ السلام و عیسیٰ علیہ السلام کا دین تو قرآن ہی کے اندر ہے اس کے باہر کہیں اور موجود نہیں لہٰذا نزول قرآن کے بعد انبیاء سابقین پر ایمان کے معنی ہی یہ ہوں گے کہ قرآن پر ایمان لایا جائے اور اسی کا اتباع کیا جائے اگر ایسا نہ کیا جائے تو تمام انبیاء سے کفر ہے حضرت عیسیٰؑ و موسیٰؑ کی طرف محض نسبت کر لینے سے تو ان پر ایمان نہیں آسکتا۔ اگر ایک عیسائی سمجھتا ہے کہ نبی اکرمؐ بھی خدا کی طرف سے ایسے ہی سچے پیغمبر ہیں جیسے حضرت عیسیٰؑ تھے تو پھر اسے نبی کریم کی تعلیم سے نفرت کیوں ہو اور حالانکہ خود اس کی علمی ریسرچ آسے بار بار یقین دلا رہی ہو کہ عیسیٰ مسیح کی تعلیم مسخ ہو گئی اور قرآن اپنی اصل شکل میں ہے، بلا شائبہ تحریف و الحاق موجود ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ کہدینا کہ ایک عیسائی یا یہودی نبی اکرمؐ کو اسی طرح منجانب اللہ مانتے

جس طرح ایک مسلمان حضرت عیسیٰؑ اور موسیٰؑ کو مانتا ہے، ایک مفروضہ ہی مفروضہ ہے جس کی تصدیق کسی زمانے میں کسی متنفس نے نہیں کی عیسائی مصنفین نے زیادہ سے زیادہ حضور کو ایک "راستباز انسان" قرار دیا ہے لیکن آپ کو ایک "راستباز انسان" ماننا اور آپ کے دعوائے رسالت کو نہ ماننا صریح تناقض ہے۔ جو لوگ آپ کے اس دعویٰ کو نہیں مانتے وہ درحقیقت آپ کو راستباز کیا معنیٰ دنیا کا سب سے بڑا جعلساز قرار دیتے ہیں اگرچہ زبان سے آپ کی راستبازی کا وہ کتنا ہی اقرار کرتے ہوں۔ پھر اسی طرح وہ قرآن کی بھی کھلی ہوئی تکذیب کرتے ہیں کیونکہ قرآن تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا دعویٰ بڑے زور سے پیش کرتا ہے اور اس پر ایمان لانے کا سخت مطالبہ کرتا ہے

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِنْ رَبِّكُمْ فَآمِنُوا خَيْرًا لَكُمْ وَإِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (۴: ۱۷۰)

اے لوگو! یہ رسول تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ٹھیک ٹھیک حق لے کر آیا ہے۔ اب اگر تم ایمان لے آؤ تو تمہارے ہی لیے بہتر ہوگا اور اگر تم منکر ہے تو خدا تعالیٰ کی تو ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے (اس کا تمہارے کفر سے کیا نقصان ہوگا۔

دوسری جگہ رسالت نبی اکرم کے متعلق ارشاد ہے:۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (۷: ۲۰)

کہدیجیے کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین پر ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی مارتا ہے وہی زندہ کرتا ہے پس ایمان لاؤ تم اللہ پر اور اس کے رسول نبی امّی پر جو خود اللہ پر اور اس کے کلام پر ایمان رکھتا ہے، اور اس کا اتباع کرو۔ تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔

نوع انسانی کو خطاب ہے رسالت نبی امّیؐ کی دعوت تمام افراد انسانی کے لیے ہے اور اللہ کے ساتھ ہی ساتھ نبی پر بھی ایمان لانے کا حکم ہے۔ ایمان ایسا جس میں اتباع ضروری ہے کہ اصل ہدایت صرف اسی نبی امّیؐ کے

اتباع سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ کیا اس سے بھی زیادہ کوئی اور واضح حکم مطلوب ہے۔

اب خاص اہل کتاب کو مخاطب کیا گیا ہے۔ فرمایا:۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ	اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارے یہ رسول آئے ہیں۔
لَكُمْ كَثِيرًا مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ	تم کتاب میں سے جن باتوں کو چھپاتے ہو ان میں سے بہت
وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللَّهِ	سی باتوں کو صاف طور پر تمہارے سامنے کھول
نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ يَهْدِي بِهِ اللَّهُ	دیتے ہیں اور بہت سے احکام سے معاف بھی کر دیتے ہیں تمہارے
مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم	پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور کتاب مبین آئی ہے
مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ	کہ اس کے ذریعہ سے اللہ ایسے شخصوں کو جو رضائے حق کے
إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (۵:۳)	طالب ہوں سلامتی کی راہ بتاتا ہے اور اس کو اپنی توفیق

سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتا ہے اور ان کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

اہل کتاب کے لیے رسول اللہ پر ایمان لانا کس قدر ضروری ہے اس کا اندازہ قرآن کریم کی ان آیات سے کیجیے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا مانگی ہے کہ اے اللہ میری قوم کو اس دنیا میں بھی خیر و برکت عطا فرما اور آخرت میں بھی نجات و سعادت۔ جواب ملا کہ ہماری رحمت ہر چیز کو محیط ہے لیکن ورود رحمت کے لیے کچھ شرائط بھی مقرر ہیں۔ اور وہی لوگ اس سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں جو ان شرائط کو پورا کرتے ہیں۔ فرمایا:۔

فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ	وہ رحمت تو میں ان لوگوں کے لیے لکھوں گا جو خدا سے
الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُم بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ	ڈرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور ہماری آیتوں پر ایمان
الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ	لاتے ہیں یعنی وہ لوگ جو نبی امی کا اتباع کریں جس کو
....	وہ لوگ توریت و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ ان کو
.... مُفْلِحُونَ۔ (۷:۱۹)	نیک باتوں کا حکم دیتا ہے، بری باتوں سے منع کرتا ہے

پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتا ہے اور گندی چیزوں کو ان پر حرام کرتا ہے، اور ان لوگوں پر سے جو بار تھے اور جو پھندے ان پر پڑے ہوئے تھے ان کو دور کرتا ہے سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی حمایت کرتے ہیں، اور اس کی مدد کرتے ہیں۔ اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

کس قدر صاف اور مبین احکام ہیں اور کتنا کھلا ہوا اسلوب بیان ہے۔ واضح کر دیا گیا کہ اہل کتاب اگر اپنی ہی کتابوں کو دیکھیں تو بایں ہمہ تحریف و کتمان، اس میں رسول اکرم کی تشریف آوری کی پیشین گوئیاں موجود ہیں۔ بعثت نبوی کے بعد رحمت الٰہی کا نزول اتباع رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشروط ہو چکا ہے اور اہل کتاب کو اس کی اطلاع بھی دی جا چکی ہے۔ پھر اتنا ہی نہیں کہ صرف ایمان لانے کا ہی ذکر ہو۔ بلکہ حلال و حرام میں اتباع رسول ضروری قرار دیا گیا ہے، اور قرآن کریم کی پیروی سے فلاح و نجات وابستہ کر دی گئی ہے ایسے واضح احکام کی کیا تاویل ہو سکتی ہے؟ اور معترضین ان آیات سے کیا مفہوم لیتے ہیں؟ اگر اس کے بعد بھی کوئی شبہہ باقی رہ جاتا ہے تو فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ۔

(باقی)

تنزیل و تاویل

عالم برزخ

از

از جناب مولانا اسلم جیراج پوری

اس عنوان پر میں نے اپنی کتاب "تعلیمات قرآن" سے اخذ کرکے ایک مضمون سال گزشتہ رسالہ جامعہ میں شائع کیا تھا بعض حضرات نے رسالہ معارف اعظم گڑھ میں اس کے جوابات لکھے لیکن انہوں نے بجائے اس کے کہ قرآن کریم کی تعلیمات کی روشنی میں بحث کرتے محض اپنے تقلیدی خیال کی حمیت میں اس کی تردید کی کوشش کی اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ ہر زمانہ میں زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنے مروجہ آبائی خیالات کو برحق سمجھتے ہیں۔ قرآن میں ہے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے اتارا ہے اس کی قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا پیروی کرو تو وہ کہتے ہیں بلکہ ہم تو اس کے پیچھے چلیں گے جس پر ہم نے اپنے بزرگوں کو پایا ہے۔ ۲۱/۳۱

مگر مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ آپ "ترجمان القرآن" کے مدیر اور قرآن کی حمایت و نصرت و اشاعت کا دعویٰ رکھتے ہوئے بھی انھیں لوگوں کے ہم خیال ہیں اور ان کے جوابوں کے ساتھ اتفاق رکھتے ہیں۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ ان قرآنی تعلیمات کو پھر ایک بار وضاحت مگر اختصار کے ساتھ لکھ کر

ؐ ہر جگہ اوپر آیۃ کا شمار ہے نیچے سورۃ کا

اپکے رسالہ میں بھیجوں تاکہ آپ ان کو غور سے دیکھ لینے کے بعد ان پر علی وجہ البصیرۃ بحث کر سکیں۔

رسالہ معارف کے جوابات پر میں نے کچھ لکھنا اس وجہ سے پسند نہیں کیا کہ ان میں سے کسی کا طرز نگارش جس سے آپ نے بھی نفرت کا اظہار کیا ہے اس قابل نہ تھا کہ ان سے قرآنی بحثیں کی جائیں۔

چونکہ اس بحث کا عنوان یہ ہے کہ "برزخ کے متعلق قرآن کریم کیا تعلیم دیتا ہے" اس لیے اس پر جو کچھ لکھا جائیگا خالص قرآن ہی سے لکھا جائیگا۔

برزخ کا لفظ قرآن میں روک یا آڑ کے معنی میں مستعمل ہے۔

وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا ۵۳/۲۵ اور اللہ نے ان دونوں (شور و شیریں سمندروں) میں آڑ رکھدی اور رکاوٹ کی اوٹ۔

دوسری جگہ بجائے برزخ کے حاجز کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۶۱/۲۰ اور اللہ نے دونوں سمندروں میں آڑ رکھدی ہے تاکہ وہ دونوں اپنے اپنے حدود سے آگے نہ بڑھیں۔

بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ ۲۰/۵۵ دونوں (سمندروں) کے درمیان آڑ ہے جس سے تو آگے نہیں بڑھتے

یہی معنے برزخ کے اس آیت میں ہیں۔

وَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۱۰۰/۲۳ اور ان مرنے والوں کے آگے آڑ ہے اس دن تک کہ جس دن وہ اٹھائے جائیں گے۔

یعنے برزخ کی مدت مرنے والوں کی موت سے لیکر حشر تک ہے کہ اس میں وہ اپنے رب کی حضوری سے آڑ میں رکھے جائیں گے اور جب حشر ہوگا اللہ کے سامنے حاضر کر دیے جائیں گے۔

إِن كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ ۵۳/۳۶ بس ایک شور ہوگا اور ہمارے پاس وہ سب کے سب حاضر کر دیے جائیں گے۔

شہداء یعنے مقتولین "فی سبیل اللہ" جن کی زندگی کی قرآن نے تصریح فرما دی ہے وہ برزخ یعنے آڑ میں نہیں بلکہ "عند ربہم" اپنے رب کی حضوری میں ہیں جہاں ان کو نئی زندگی ملگئی ہے اور وہ روزی پاتے ہیں۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۳

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ ہرگز نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کی حضوری میں روزی پاتے ہیں

یہ عالم برزخ جس میں شہداء کے سوا باقی مردے رکھے جاتے ہیں قرآن کے نزدیک مطلق عالم ممات ہے جس میں حیات کا کوئی شائبہ نہیں۔ چنانچہ ان اولیاء اور بزرگان کی نسبت جن کو مشرکین پوجتے ہیں قرآن کہتا ہے

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ۔ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۱۶/۲

اور وہ اللہ کے ماسوا جن کو پکارتے ہیں۔ وہ کوئی شئے پیدا نہیں کرتے ہیں بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔ وہ مردہ ہیں زندہ نہیں ہیں۔ اور اتنی بھی خبر نہیں رکھتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔

اس آیت میں جن معبودان ماسوی اللہ کا ذکر ہے وہ بت یا شجر یا شمس یا قمر وغیرہ بے جان چیزیں نہیں۔ کیوں کہ ان چیزوں کے لیے نہ اموات کا لفظ مستعمل ہو سکتا ہے نہ احیاء کا بلکہ یہ وہی ان کے بزرگان دین ہیں جن کو مقبول بارگاہ اور متصرف مان کر وہ پوجتے ہیں۔ دوسری آیت میں یہ امر اور بھی واضح ہے

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۔ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۔ ۴۶

اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اللہ کے سوا ان لوگوں کو پکارتا ہے جو قیامت کے دن تک بھی اس کو جواب نہیں دینے کے۔ اور وہ ان کی پکار سے بے خبر ہیں اور جب لوگ (حشر کے لیے) اٹھائے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی پرستش کا انکار کر دیں گے۔

اس سے جہاں اس بات کی تصریح نکلی کہ معبودان غیر اللہ پکارنے والوں کی پکار سے بے خبر ہیں

وہاں یہ بھی ثابت ہوگیا کہ یہ معبودان بت وغیرہ بیجان چیزیں نہیں ہیں بلکہ وہی بزرگان دین اور مقبولان بارگاہ ہیں۔ جو قیامت کے دن ان کی پرستش کا انکار کردیں گے کیونکہ بیجان چیزوں میں انکار کی قدرت نہیں ہے۔

تیسری آیت میں انھیں معبودان غیر اللہ یعنے بزرگان دین کی سماعت کا انکار ہے۔

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۝ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۱۴/۳۵

اور اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں ہیں تم اگر ان کو پکاروگے تو وہ تمہاری پکار نہیں سنیں گے اور جو سنتے بھی تو جواب نہ دیتے اور قیامت کے دن تمہارے شرک کا انکار کریں گے

اس انکار کی کیفیت قرآن میں کئی جگہ بیان کی گئی ہے۔

وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۔ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۔ ۸۶/۱۶

اور جب مشرکین قیامت میں اپنے شرکاء کو دیکھیں گے کہ اے ہمارے رب! یہی وہ شرکاء ہیں جن کو ہم تیرے سوا پکارتے تھے وہ (شرکاء) اُن کو جواب دیں گے کہ تم بالکل جھوٹے ہو۔

دوسری جگہ ہے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ۔ فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ۲۹/۱۰

اور جس دن سب کو ہم جمع کریں گے تو مشرکوں سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے شرکاء اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے ہوجاؤ پھر ان کے تعلقات کو ہم منقطع کردیں گے ان کے شرکاء کہیں گے کہ تم ہم کو نہیں پوجتے تھے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان میں اللہ شہادت کیلئے کافی ہے کہ ہم تمہاری پرستش سے بےخبر تھے

ان آیات سے جہاں اس امر کا بین ثبوت ملتا ہے کہ وہ مشرکین کے معبودان غیر اللہ ان کے مردہ اولیاء اور بزرگان دین ہی ہیں جن کو وہ مقبولان بارگاہ اور صاحبان قدرت سمجھکر پوجتے تھے وہاں یہ بھی تصریحاً ثابت ہوتا ہے کہ تمام مردے جو برزخ میں ہیں ان میں نہ علم ہے نہ احساس نہ شعور نہ سماعت اور بالکل غافل اور بے خبر ہیں اور قیامت کے دن اپنے پوجنے اور پکارنے والوں کو صاف جواب دینگے کہ نہ ہم کو تمہاری پرستش کی خبر تھی نہ تمہاری پکار کی۔

اب ایک دوسری حیثیت سے دیکھیے۔ قرآن کی رو سے انسان کے لیے دو ہی موتیں اور دو ہی زندگیاں ہیں۔ چنانچہ قیامت کے دن کفار کہیں گے۔

أَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَأَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا فَهَلْ إِلَىٰ خُرُوجٍ مِّن سَبِيلٍ ۝ (اے رب) تونے ہم کو دوبار موت دی اور دوبار زندہ کیا ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں کیا جہنم سے نکلنے کی کوئی سبیل ہے۔ ۱۱/۴۰

یہ اگرچہ کفار کا قول ہے لیکن حقیقت ہے کیونکہ سورہ بقر میں اللہ فرماتا ہے۔

كُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝ تم مردہ تھے اس نے تمکو زندگی بخشی پھر وہ تم کو موت دیگا پھر تم کو زندہ کرے گا۔ پھر تم اس کے پاس لوٹائے جاؤگے۔ ۲۸/۲

دنیاوی زندگی سے پہلے کی حالت موت سے تعبیر کی گئی ہے جس کے بعد یہ زندگی ملی ہے۔ پھر موت آئے گی پھر اس کے بعد دوسری زندگی ملے گی جس کے لیے موت نہیں ہے۔ اب یہ دوسری زندگی کس دن ملے گی؟ قبر میں یا حشر کے دن؟

قرآن تبلاتا ہے کہ یہ دوسری زندگی حشر کے دن ملے گی۔

ثُمَّ إِنَّكُم بَعْدَ ذَٰلِكَ لَمَيِّتُونَ ۝ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ ۝ پھر تم اس کے بعد مرنے والے ہو۔ پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤگے۔ ۱۶/۲۳

یعنے انسان کی دوسری زندگی جس کو قرآن میں جا بجا اعادہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے قیامت کے دن ملے گی۔

یَوْمَ نَطْوِی السَّمَآءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْکُتُبِ کَمَا بَدَأْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُہٗ ۔ ۱/۲۱

جس دن ہم آسمان کو خط کے طومار کی طرح لپیٹ لیں گے اس دن تم کو جس طرح پہلی بار پیدا کیا تھا دوبارہ پیدا کریں گے۔

کفار اسی کو مستبعد سمجھتے تھے۔

قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَھِیَ رَمِیْمٌ قُلْ یُحْیِیْھَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَھَآ اَوَّلَ مَرَّۃٍ ۲۹/۳۶

اس نے کہا کہ کون زندہ کرے گا ہڈیوں کو جب کہ وہ گل چکی ہوں گی۔ کہدے اے پیغمبر کہ وہی ان کو زندہ کریگا جس نے ان کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔

مندرجہ ذیل آیت میں اس کی مزید تصریح ہے۔

قُلْ کُوْنُوْا حِجَارَۃً اَوْ حَدِیْدًا اَوْ خَلْقًا مِّمَّا یَکْبُرُ فِیْ صُدُوْرِکُمْ فَسَیَقُوْلُوْنَ مَنْ یُّعِیْدُنَا قُلِ الَّذِیْ فَطَرَکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ فَسَیُنْغِضُوْنَ اِلَیْکَ رُءُوْسَھُمْ وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی ھُوَ قُلْ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنَ قَرِیْبًا یَوْمَ یَدْعُوْکُمْ فَتَسْتَجِیْبُوْنَ بِحَمْدِہٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا ۔ ۵۲/۱۵

کہدے کہ تم (مرنے کے بعد) پتھر یا لوہا یا اور کوئی چیز جو تمہارے خیال میں بڑی ہو بنجاؤ۔ پھر وہ پوچھینگے کہ کون ہم کو دوبارہ پیدا کرے گا۔ کہدے کہ وہی جس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا ہے۔ پھر وہ تیری طرف سر ہلائیں گے اور پوچھینگے کہ کب؟ کہدے کہ عجب نہیں کہ (وہ دن) قریب ہو جس دن کہ وہ تمکو پکاریگا اور تم حمد کرتے ہوئے جواب دوگے اور خیال کروگے کہ بہت تھوڑے عرصہ رہے۔

اس آیت میں دوبارہ زندہ کرنے کا دن بتلایا گیا کہ جس دن تم پکارے جاؤگے اور اس پکار کی تعمیل کروگے اور جس دن کہ تم گمان کروگے کہ نہیں رہے مگر تھوڑی دیر تک۔ یہ دن حشر کا دن ہوگا۔

یَوْمَ یَدْعُ الدَّاعِ اِلٰی شَیْءٍ نُّکُرٍ خُشَّعًا

جس دن پکارنے والا ایک ان دیکھی چیز کو پکاریگا

اَبۡصَارُهُمۡ يَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ كَاَنَّهُمۡ جَرَادٌ مُّنۡتَشِرٌ ۵۴ — تو ان کی آنکھیں خوف زدہ ہونگی اور یہ قبروں سے اسطرح نکلیں گے جیسے بکھری ہوئی ٹڈی۔

وَيَوۡمَ يَحۡشُرُهُمۡ كَاَنۡ لَّمۡ يَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ ۱۰ — اور جس دن انسان کو اٹھائیگا وہ خیال کرینگے کہ نہیں رہے مگر دن کی ایک گھڑی۔

اس لیے یہ متعین ہوگیا کہ دوسری زندگی جو انسان کو ملے گی وہ حشر کے دن ملے گی نہ کہ قبر میں لہذا اس دنیاوی زندگی کے منقطع ہوجانے کے بعد اہل برزخ میں مطلقاً زندگی کا کوئی شائبہ نہیں ہے اور زمانہ چونکہ اعتباری شئے ہے اور اہل برزخ میں شعور اور احساس نہیں ہے اس وجہ سے زمانہ کا بھی ان کو احساس نہیں ہے۔ چنانچہ قیامت کے دن جب وہ اٹھائے جائیں گے تو اپنے خیال میں اپنے آپ کو اسی ساعت اور اسی لمحہ میں سمجھیں گے جس میں ان کی جان نکلی تھی۔ اور کہنے لگیں گے۔

يَا وَيۡلَنَا مَنۡۢ بَعَثَنَا مِنۡ مَّرۡقَدِنَا ۳۶ — ہائے ہماری شامت! کس نے ہمکو ہماری خوابگاہ سے اٹھا دیا۔

یعنے حشر کے وقت وہ اپنے آپکو اپنی خوابگاہ ہی میں سمجھتے ہوں گے جہاں مرض الموت میں مرے تھے اور ان کو اپنے گاڑے یا جلائے جانے کی بھی خبر نہ ہوگی۔ مرقد کے معنے اس آیت میں قبر کے نہیں ہیں جس میں اردو شعرا اسکو استعمال کرتے ہیں۔ بلکہ بستر خواب کے ہیں۔ کیونکہ رقاد کے حقیقی معنے نیند کے ہیں۔ قرآن کریم میں اصحاب کہف کے قصہ میں یہ لفظ آیا ہے۔

وَتَحۡسَبُهُمۡ اَيۡقَاظًا وَّهُمۡ رُقُوۡدٌ ۱۸/۱۵ — اور تو ان کو بیدار خیال کریگا۔ حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔

الغرض یہ امر قرآن کے نصوص صریحہ سے روز روشن کی طرح ثابت ہوگیا کہ موت اور حشر میں مردوں کے لیے فصل زمانی نہیں ہے۔ یعنی ان کو اس برزخ کے زمانہ کا مطلق احساس نہ ہوگا۔ اور جب وہ محشور ہوں گے تو اپنے خیال میں اسی ساعت اور اسی لمحہ میں اپنے آپ کو سمجھتے ہوں گے جس میں ان کی جان نکلی تھی۔ دوسری آیت میں زمانۂ برزخ کی مقدار بمنزلہ ایک گھڑی کے بتائی گئی ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ۴۵	اور جس دن اللہ ان کو اٹھائیگا گویا کہ وہ نہیں رہے تھے مگر دن کی ایک گھڑی اور وہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچانتے
كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ۳۵	جس دن وہ اس (حشر) کو دیکھینگے جس سے ان کو ڈرایا جاتا ہے (وہ خیال کریں گے) کہ گویا وہ نہیں رہے مگر دن کی ایک گھڑی۔

ان کا یہ گمان محض تبدیلی حالت کی وجہ سے ہوگا۔ ورنہ وہ حقیقت میں ایک گھڑی بھی نہیں رہے جیسا کہ آیت "یا ویلنا من بعثنا من مرقدنا" سے ثابت کیا جا چکا ہے یہی وجہ ہے کہ ان آیات میں کَاَنَّ "گویا" کا لفظ تشبیہ مستعمل ہوا ہے۔ یعنے حقیقتاً تو وہ اپنے علم میں ایک لمحہ بھی برزخ میں نہیں رہے صرف ایسا خیال کریں گے کہ ہم ایک گھڑی رہے ہیں۔ کیونکہ حالت بدلی ہوئی ہوگی۔

مجرمین جن کی نسبت لوگ سمجھتے ہیں کہ برزخ میں رات دن ان پر گرز کی مار پڑتی رہتی ہے اور آگ میں جلتے رہتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کے اوپر یہ مدت برزخ بیمار کی رات کی طرح جو بہت دراز ہوتی ہے کروروں سال کی ہونی چاہیے تھی وہ بھی یہی کہیں گے۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ - وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۵۶	اور جس دن قیامت قائم ہوگی مجرم قسم کھائینگے کہ وہ تو بس ایک گھڑی رہے اسی طرح وہ بھٹکائے جاتے تھے۔ اور جن کو علم اور ایمان دیا گیا ہے وہ کہینگے کہ تم اللہ کے نوشتہ میں رہے قیامت تک۔ سو یہ قیامت کا دن ہے مگر تم نہیں جانتے تھے

مجرم تو حشر کے دن قسم کھا کر کہینگے کہ وہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے مگر اہل علم و ایمان

ان سے کہیں گے کہ تم اللہ کے نوشتہ میں قیامت تک رہے لیکن تم کو خبر نہ تھی۔ یہ تصریح ہے اُن کے عدم احساس دماغی کی۔ خود ان مومنوں کو بھی احساس نہ تھا جیسا کہ ہم اوپر کی آیتوں سے ثابت کرچکے ہیں مگر اپنے یوم البعث پر عقیدہ رکھنے کے باعث وہ قیامت کے دن کو پہچان لینگے اور کہنے لگینگے کہ برزخ کی طویل مدت تم پر گزر چکی ہے مگر تم کو علم نہ تھا۔

یہ ساری تمام بحث انسانی جسم کے متعلق نہیں ہے جو سڑ کر اور گل کر عناصر میں ملجاتا ہے بلکہ اس کی روح کے متعلق ہے۔ عالم برزخ میں روح کے بقاء کے متعلق جو کچھ قرآن میں کہا گیا ہے وہ یہی ہے کہ اس کا علم اللہ کے نوشتہ میں ہے جیسا کہ آیت بالا میں اہل ایمان وعلم کے قول سے ظاہر ہوتا ہے۔

دوسری آیت ہے۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتَابٍ ۚ — فرعون نے پوچھا کہ گذشتہ نسلوں کی کیا حالت ہے موسیٰ نے کہا کہ انکا علم میرے رب کے پاس نوشتہ میں ہے۔

اس کی تصریح پارہ عم میں ہے۔

اِنَّ كِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ كِتَابٌ مَّرْقُوْمٌ — گنہگاروں کا اندراج سجین میں ہے اور تجھے کیا خبر کہ سجین کیا ہے۔ وہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔

اِنَّ كِتَابَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ كِتَابٌ مَّرْقُوْمٌ — نیکوکاروں کا اندراج علیین میں ہے اور تجھے کیا معلوم کہ علیین کیا ہے وہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔

اسی کو سابقہ آیات میں لَبِثْتُمْ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ کہا گیا ہے جس سے مراد قیام برزخ کی مدت ہے۔ دوسرا لفظ لبثتم فی الارض ہے جس سے مراد روئے زمین پر رہنے کی مدت یعنی دنیاوی زندگی ہے اس کا بھی قیامت کے دن سوال ہوگا۔ اس کے جواب میں لوگ ایک گھڑی نہیں بلکہ ایک دن کہیں گے۔

قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ قَالُوْا — اللہ پوچھیگا کہ تم زمین میں کتنے سال رہے وہ کہیں گے

لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَاسْئَلِ الْعَادِّيْنَ — ایک دن یا اس سے بھی کم ان لوگوں سے پوچھ جو شمار رکھتے

دوسری آیت میں دس دن کا بھی ذکر ہے۔

يَتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا — وہ آپس میں چپکے چپکے کہیں گے کہ تم نہیں رہے مگر دس

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ — دن۔ ہم جانتے ہیں جو کچھ وہ کہیں گے۔ جو سب سے زیادہ

طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ۔ — راہ پر ہوگا وہ کہیگا کہ تم تو صرف ایک دن رہے۔

ان تمام تفصیلات کے بعد ہم حسب ذیل نتائج پر پہونچتے ہیں جو قرآن کریم سے تصریحاً ثابت ہوئے

(۱) عالم برزخ عالم ممات ہے جس میں نہ مُردوں میں شعور ہے نہ احساس نہ علم نہ سمع نہ حیات کا کوئی شائبہ

(۲) انسان کے لیے دو ہی زندگیاں ہیں اور دو ہی موتیں پہلی زندگی یہ دنیاوی زندگی ہے اور دوسری زندگی حشر کے دن ملیگی۔ برزخ میں زندگی نہیں ہے۔

(۳) اہل برزخ کو زمانہ کا مطلق احساس نہیں ہے۔ اسلئے یہ سمجھنا چاہیے کہ مرنے والے کے لیے موت ہی کا دن اس کے حشر کا دن ہے۔

ان تصریحات کے ہوتے ہوئے برزخ میں عذاب یا ثواب کا خیال بھی نہیں کیا جاسکتا چنانچہ قرآن کریم میں جہاں جہاں عذاب یا ثواب کا ذکر ہے وہاں صرف دنیاوی اور اخروی عذاب و ثواب کا ذکر ہے برزخ کا کہیں نام تک نہیں آیا ہے۔

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ — جن لوگوں نے احسان کیا ہے ان کے لیے اس دنیا میں

وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ — بھلائی ہے اور دار آخرة تو سب سے بہتر ہے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا — اور جو لوگ ستائے گئے اور اس کے بعد انھوں نے اللہ کیلئے

لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ — اپنے گھر بار کو چھوڑ دیا ان کو ہم دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا

اَكْبَرُ — دیں گے۔ اور آخرت کا اجر اس سے بھی بڑا ہوگا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ١١/٢٢

اور بعض آدمی ہیں جو ایک کنارے پر اللہ کی بندگی اختیار کرتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی بھلائی پہونچگئی تو مطمئن ہو گئے اگر کوئی آزمایش ان پر پڑی تو اپنے رخ پلٹ گئے۔ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں خسارہ میں رہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِى اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ثَانِىَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهٗ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ٩/٢٢

اور بعض آدمی ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں بلا کسی علم اور بلا کسی روشن کتاب کے جھگڑتے ہیں اپنے پہلو کو موڑے ہوئے تاکہ اللہ کی راہ سے گمراہ کردیں ایسوں کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور قیامت کے دن ہم ان کو دوزخ کا عذاب چکھائیں گے

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاۗءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْىٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ٨٥/٢

کیا تم اللہ کی کتاب کی بعض باتوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے۔ جو کوئی تم میں سے ایسا کریگا اس کا بدلہ دنیا میں رسوائی ہے اور قیامت کے دن ایسے لوگ سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا اُولٰۗىِٕكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَاۗىِٕفِيْنَ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ١١٤/٢

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اسکا نام لینے سے روکے اور ان کو اجاڑنے کی کوشش کرے۔ یہ لوگ ان میں داخل نہیں ہونے پائیں گے مگر ڈرتے ہوئے۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ لَهُمْ عَذَابٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ٣٤/١٣

اور جس کو اللہ گمراہ کردے اس کو کوئی راہ دکھانے والا نہیں ایسوں کو دنیاوی زندگی میں عذاب ہے اور آخرت کا عذاب اور گراں ہے۔

یہ سب آیتیں مختلف قسم کے مجرموں کے عذاب کے متعلق ہیں مگر کسی میں سوائے دنیا اور آخرۃ کے عذاب کے برزخ کے عذاب کا مطلقاً ذکر نہیں۔ اور ہو کیسے جبکہ نہ برزخ میں حیات کا کوئی شائبہ ہے نہ زمانہ نہ عذاب و ثواب کے اثر پذیری کی کوئی صلاحیت۔ یہی وجہ ہے کہ بجز ان چند انفرادی اور اجتماعی اعمال کے جن کی جزا یا سزا لازمی طور پر دنیا میں بھی مل جاتی ہے اور جن کی تصریح مذکورۂ بالا آیات اور نیز دیگر آیات قرآنی میں کر دی گئی ہے قرآن کریم نے صاف صاف اعلان کر دیا ہے کہ دار الجزاء آخرت ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۔ ۱۶/۶۱ — اور اگر اللہ لوگوں کا ان کے گناہوں پر مواخذہ کرنے لگتا تو زمین میں کوئی جاندار نہ چھوڑتا لیکن اس نے لوگوں کو ایک مقررہ مدت تک مہلت دے رکھی ہے۔

یہ "اجل مسمیٰ" کونسا دن ہے؟ اس کی تصریح کسی جگہ قرآن میں کر دی گئی ہے۔

لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ۱۳/۱۲ — کس دن کے لیے مہلت دی گئی ہے فیصلہ کے دن کیلیے۔

یہ فیصلہ کا دن قیامت کا دن ہے۔

وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۔ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۲۱/۲۰ — اور کافر کہیں گے کہ اے ہماری شامت!! یہ انصاف کا دن ہے۔ (ہاں) یہی وہ فیصلہ کا دن ہے جس کو تم جھٹلاتے تھے

اس لیے دنیا کے بعد حساب و کتاب و عذاب و ثواب کا دن قیامت ہی کا دن ہے برزخ نہیں ہے۔ یہاں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اللہ کے یہاں انصاف ہے۔ یہ کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ جس نے حضرت نوحؑ کا انکار کیا وہ پانچ ہزار برس پہلے سے عذاب سہے اور برزخ میں جلے اور جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا وہ پانچ ہزار یا دس ہزار برس بعد۔ قرآن کی رو سے دونوں کے لیے فیصلہ کا ایک ہی دن مقرر ہے۔ اسی دن ان کے اعمال نامے نکالے جائیں گے اور حساب وکتاب ہوگا۔ اور جزا و سزا دی جائے گی۔ برزخ کے زمانے کا دونوں میں سے کسی کو احساس نہ ہوگا۔

اب میں ان چند آیات کو بھی لکھدیتا ہوں جن سے لوگوں نے غلط فہمی سے برزخ کا عذاب سمجھا ہے۔

اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَیِّبِیْنَ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ — جن کو فرشتے اس حالت میں وفات دیتے ہیں کہ وہ پاک ہوتے ہیں (تو ان سے) کہتے ہیں کہ تمہارے اوپر سلامتی ہو تم جنت میں داخل ہو ان کاموں کے عوض جو تم کرتے تھے۔

یہ آیت میرے جواب میں ثواب برزخ کے ثبوت میں مولوی ابوالوفا ثناء اللہ صاحب مدیر اخبار اہل حدیث امرتسر نے لکھی ہے۔ جو قرآن کریم کی دو تفسیریں لکھ چکے ہیں۔ مگر انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ یہ آیت خاص دار آخرت کے متعلق ہے۔ برزخ سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ قرآن کا سلسلہ بیان یہ ہے۔

وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِیْنَ جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِیْهَا مَا یَشَآءُوْنَ كَذٰلِكَ یَجْزِی اللّٰهُ الْمُتَّقِیْنَ۔ اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَیِّبِیْنَ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۱۶-۳۲ — اور بے شک آخرت کا گھر بہتر ہے اور کیسا اچھا گھر ہے۔ پرہیزگاروں کا ہمیشہ رہنے والے باغات میں وہ داخل ہونگے جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی۔ ان میں جو کچھ وہ چاہیں گے ان کو وہ ملے گا۔ اسی طرح اللہ ان پرہیزگاروں کو بدلہ دیگا جن کی جانیں ملائکہ نے اس حالت میں قبض کی ہیں جبکہ وہ پاک تھے کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو اپنے عمل کے بدلے جنت میں داخل ہو۔

دوسری آیت جس سے لوگوں کو عذاب برزخ کا خیال ہوا ہے یہ ہے۔

وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ۔ ترجمہ — اور آل فرعون کو برے عذاب آگ نے گھیر لیا جس پر وہ صبح اور شام پیش کیے جائینگے اور قیامت کے دن کہا جائیگا کہ) آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں ڈال دو۔

آیت کا مفہوم یہ سمجھا گیا ہے کہ آل فرعون غرق ہونے کے بعد روزانہ صبح اور شام آگ پر پیش کیے

جاتے ہیں یہ عذاب برزخ ہے پھر جب قیامت کا دن ہوگا تو فرشتوں کو حکم دیا جائے گا کہ ان کو سخت ترین عذاب میں داخل کر دو۔

یہ مفہوم ان تمام قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے جو پہلے بدلائل بیان کر دی گئی ہیں۔ کیونکہ اگر برزخ میں آل فرعون روزانہ صبح اور شام کو آگ پر پیش کیے جاتے ہیں تو ان میں زندگی اور عذاب کی اثر پذیری کی صلاحیت یعنی شعور واحساس بھی ہونا چاہیے جن سے قرآن تصریحاً انکاری ہے۔ اور قرآنی تعلیمات میں اختلاف ہو نہیں سکتا۔ یہ در اصل ساری خرابی اس وجہ سے ہے کہ "یعرضون" کے معنے یہاں حال کے لیے گئے ہیں۔ یعنی وہ پیش کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہاں اس کے معنی استقبال کے ہیں کیونکہ کفار جن میں آل فرعون بھی شامل ہیں ان کی آگ پر پیشی قیامت ہی کے دن ہوگی۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا - ۲۰/۴۶ اور جس دن کفار آگ پر پیش کیے جائیں گے (ان سے کہا جائیگا) کہ تم اپنی لذتیں اپنی دنیاوی زندگی میں لے چکے

اس سے ثابت ہوگیا کہ آگ پر پیشی دوسری زندگی میں ہوگی جو حشر کے دن ملے گی چنانچہ سورہ ہود میں اس کی تصریح موجود ہے۔

يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۹۸/۱۱ فرعون اپنی قوم کے آگے آگے آئیگا قیامت کے دن اور انکو آگ میں اتارے گا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ برزخ کا غیر زمانی ہونا ہم ثابت کر چکے ہیں اس میں نہ صبح ہے نہ شام اور اس آیت میں "غُدُوًّا وَعَشِيًّا" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کیونکہ اسی طرح جس طرح جنت کے لیے "بُكْرَةً وَعَشِيًّا" کا لفظ آیا ہے جس کے معنی مفسرین اور اہل سنت نے دوام کے لکھے ہیں۔

وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا ۶۲/۱۹ اور جنتیوں کو ان کی روزی اس میں صبح اور شام ملتی رہے گی جو صبح اور شام جنت میں ہے وہی دوزخ میں ہوگی خواہ اس کے معنی دوام کے بیان کیا جائے

اب اس طرح آیت کا دوسرا حصہ پہلے حصہ کی تشریح ہوگا۔ یعنے آل فرعون کو آگ کا دائمی عذاب جو دیا جائیگا وہ اس طرح ہوگا کہ فرشتوں کو حکم ملے گا کہ ان کو سخت عذاب میں ڈالدو۔

وَاَتْبَعْنَاهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ هُمْ مِنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ۲۸/۴۲	اور ہم نے اس دنیا میں آل فرعون کے پیچھے لعنت لگا دی اور قیامت کے دن وہ بُرے حال میں ہوں گے۔

دنیا میں ان کے ملعون اور قیامت میں مقبوح ہونے کی تصریح کی گئی ہے مگر برزخ کا نام نہیں لیا گیا۔ اصلیت یہ ہے کہ قرآن کریم میں جابجا موت کے ساتھ ہی ساتھ عذاب یا ثواب کا ذکر جو آتا ہے وہ قیامت کے دن کا عذاب یا ثواب ہے برزخ کا نہیں ہے کیونکہ موت اور قیامت میں مردوں کے لحاظ سے فصل زمانی نہیں ہے۔ لوگوں کی نظر چونکہ اس نکتہ پر نہ تھی اس وجہ سے انہوں نے عام اعتقاد کے مطابق اس عذاب یا ثواب کو موت کے بعد یعنی برزخ کا سمجھ لیا۔

جو حال آل فرعون کا ہے بعینہٖ وہی حال قوم نوح کا ہے یعنی وہ بھی قیامت ہی کے دن آگ میں داخل کیئے جائیں گے۔

اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۷۱/۲۵	وہ غرق کیے گئے اور آگ میں داخل کر دیے گئے۔

کیونکہ سورۂ ابراہیم میں قوم نوح۔ عاد۔ اور ثمود وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد جنہوں نے انبیاء و رسل کا انکار کر دیا تھا۔ ان کے عذاب کے متعلق اللہ فرماتا ہے۔

وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ مِّنْ وَّرَائِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّاءٍ صَدِيْدٍ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۱۴/۱۶	اور ناکام رہا ہر سرکش ظالم۔ اس کے آگے جہنم ہے جس میں اس کو پیپ کا پانی پلا دیا جائیگا۔ وہ اس کو گھونٹ گھونٹ پیئے گا۔ اور گلے سے اتار نہ سکے گا۔ اور اس پر ہر طرف سے موت آئے گی مگر وہ مرنے والا نہیں۔

یعنی ان اقوام کو جہنم میں عذاب ملے گا جو قیامت کے دن سامنے لائی جائے گی۔ وعرضنا جہنم

يَوْمَئِذٍ لِّلْكَافِرِيْنَ " اور اسی دن جہنم کو ہم کافروں کے سامنے لائیں گے۔ یہی وہ زندگی ہے جس میں موت نہ ہوگی۔

یہاں یہ بھی ذکر کر دینا ضروری ہے کہ قرآن میں جنت کے ثواب اور جہنم کے عذاب کے متعلق جا بجا ماضی ہی کے صیغے استعمال کیے گئے ہیں کیونکہ اللہ جو زمانہ سے بری ہے اس کے سامنے یہ سب واقعات حاضر ہیں۔ مثلاً حشر کے متعلق ہے۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا ۲۱/۱۴ — اور وہ سب اللہ کے سامنے حاضر ہوئے اور کمزوروں نے ان لوگوں سے کہا جو بڑے بنتے تھے۔

یا جہنمیوں کے بارے میں ہے۔

فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ۲۲/۱۹ — جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کے کپڑے ترشوائے گئے۔

یا جنتیوں کے متعلق ہے۔

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ۳۷/۵۱ — جنتیوں میں سے ایک نے دوسرے کی طرف سوال کرتے ہوئے رخ کیا۔ ایک کہنے والے نے کہا کہ میرا دنیا میں ایک ساتھی تھا۔

اس لیے قوم نوح کے متعلق "قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ" میں جو ماضی کے صیغے مستعمل ہوئے ہیں یہ قیامت کے دن کے لیے ہیں کیونکہ دوسرے مقامات میں فیصلہ حساب و کتاب اور عذاب و ثواب کے دن کی تصریح کر دی ہے کہ وہ یوم الحشر ہے۔ لہٰذا ماضی کے صیغوں سے استدلال صحیح نہیں۔

تیسری آیت جو برزخ کے عذاب کے ثبوت میں پیش کی گئی ہے یہ ہے۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ — اور تو دیکھتا جب یہ ظالم موت کے سکرات میں ہوتے ہیں اور فرشتے اپنا ہاتھ پھیلائے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنی جانیں

اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۔ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۹۴/۶

نکال دو آج کے دن تمکو ذلت کا عذاب دیا جائیگا۔ اس لیے کہ تم اللہ پر جھوٹ بولتے تھے اور تم ہمارے پاس اکیلے آئے جس طرح کہ ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا اس کو پیچھے چھوڑ آئے اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو نہیں دیکھتے جن کی بابت تم گمان رکھتے تھے کہ تمہارے امور میں وہ ہمارے ساجھی ہیں۔

اس آیت میں الیوم کے لفظ سے لوگوں نے سمجھا ہے کہ یہ برزخ کا عذاب ہے، مگر جب یہ ثابت ہو چکا کہ برزخ غیر زمانی ہے اور موت اور قیامت کے دن میں مردوں کے لحاظ سے فصل نہیں، تو یہ آج یعنی موت کا دن بعینہٖ قیامت کا دن ہے۔ چنانچہ آیت میں "اَوَّلَ مَرَّةٍ" (جیسا کہ ہم نے تمکو پہلی بار پیدا کیا تھا) کا لفظ صاف تصریح کر رہا ہے کہ یہ حیات اُخروی کا واقعہ ہے۔ دوسری جگہ اسی آیت کے ساتھ حشر کی تصریح کر دی گئی۔

وَحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ۚ وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۴۸/۱۸

اور ہم ان کو حشر میں اٹھائیں گے اور ان میں سے ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے اور وہ صف بستہ تیرے رب کے سامنے پیش کیے جائیں گے اور (ان سے کہا جائیگا) کہ تم ہمارے پاس اکیلے آئے جسطرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔

اس میں باوجود اس کے کہ سارے صیغے ماضی کے مستعمل ہوئے ہیں تصریح کی گئی ہے کہ یہ سوال وجواب حشر کے دن کا ہے۔

اس موقع پر یہ ذکر بھی اہل علم کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ رسالہ معارف کے مدیر شہیر نے

آیتہ مذکورہ کے متعلق میرے جواب میں لکھا ہے کہ :-

" اس آیت میں تصریح ہے کہ موت کے وقت یہ سوال ہوتا ہے ۔ قیامت کے دن کا یہاں نام نہیں ۔ یہ اس وقت کا حال ہے جب خدا کے سامنے ایک ایک کر کے لوگ آتے ہیں جس طرح ایک ایک کرکے پیدا ہوئے ہیں قیامت کے دن لوگ اکٹھے ہو کر خدا کے سامنے جائیں گے ۔ اس لیے یہ موت کے وقت کا حال ہے ۔ نہ کہ قیامت کا " رسالہ معارف اعظم گڈھ ۔ مئی ۳۴ء صفحہ ۳۵۶ ۔

مدیر معارف کے استدلال کی بنیاد " فرادیٰ " کے لفظ پر ہے ۔ انکا خیال یہ ہے کہ ایک ایک کرکے لوگ برزخ میں جاتے ہیں اور قیامت کے دن ایک ایک کرکے نہیں جائیں گے بلکہ جھنڈ کے جھنڈ جائیں گے اس لیے اس لفظ سے ظاہر ہو گیا کہ یہ برزخ کا عذاب ہے ۔ غالباً انہوں نے قرآن میں قیامت کے دن کے متعلق صرف یہی دیکھا ہے کہ ۔ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ۔ یعنے تم جھنڈ کے جھنڈ آؤ گے اور اس پر نظر نہیں پڑی کہ كُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ۱۹/۹۶ ان میں سے ہر ایک اللہ کے پاس قیامت کے دن اکیلا آئیگا " فرادیٰ " کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اکیلے آئینگے نہ ان کے ساتھ مال و اولاد ہوگی نہ اعوان و انصار جیسا کہ تفصیل کے ساتھ ہم نے اس کو اپنی کتاب تعلیمات قرآن میں بیان کردیا ہے ۔ اور " افواجاً " سے مراد یہ ہے کہ سب ساتھ مل کر آئینگے ۔

ترجمان القرآن ۔ جناب مولانا اسلم جیراج پوری کا یہ مضمون تبصرے کا متقاضی ہے مگر جگہ کی قلت کے سبب سے تبصرہ اس کے ساتھ شائع نہ کیا جاسکا ۔ انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں اس پر مختصراً اظہار رائے کیا جائیگا ۔

رسائل و مسائل

تعلیمات قرآن کے متعلق بحث

(۲)

از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز بی۔ اے

مفہوم خلافت اس میں کوئی کلام نہیں کہ حضرت انسان کو اللہ تعالیٰ نے تمام موجودات عالم پر تشریف و تکریم سے سرفراز فرمایا ہے۔ (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ) اور جملہ مخلوقات اس کے تابع فرمان بنائی ہیں۔ (وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِيْعًا)۔ اور اس اعتبار سے انسان کو جملہ کائنات پر ایک خاص تفوق و برتری حاصل ہے۔ لیکن چونکہ اس تفوق کے خیالات ذہن انسانی میں خود مالک و مختار بن بیٹھنے کا امکان ہے، اس لیے آپ اس خطرہ کو اس طرح سے دور کرتے ہیں کہ انسان بلاشبہ ہر شئے پر حاکم و ذی اقتدار ہے لیکن خدا کا نائب ہونے کی حیثیت سے نہ کہ خود مالک ہونے کے اعتبار سے یعنی ان اشیاء میں تصرف وہ اپنے اختیار و ارادے سے نہیں کر سکتا بلکہ ان قوانین کے ماتحت کر سکتا ہے جو اس کے حاکم اعلیٰ کی طرف سے اسے ملیں جس کا وہ نائب ہے لیکن شاید آپ نے غور نہیں فرمایا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنے مقابلہ میں انسان کو مخاطب کیا ہے، وہاں لفظ عَبْد استعمال کیا ہے جس کے معنی بندہ و غلام کے ہیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ جو خطرہ آپ انسان کو نائب کی حیثیت دیکر مٹانا چاہتے تھے، قرآن کریم نے اسے عَبْد کی حیثیت دیکر اس سے کہیں زیادہ مضبوط دیواروں سے اس کا سدباب کیا ہے۔ یعنی تمام مخلوقات کا حاکم، لیکن خدا کا غلام۔ اور اس کی سند ہمیں قرآن کریم سے صاف صاف ملتی ہے۔ برعکس اس کے خلیفۃ اللہ کے لیے بڑی دقت یہ پیش آتی ہے کہ قرآن کریم میں خلافت آدم کی نسبت کہیں خدا یا اللہ کی طرف نہیں کی گئی۔ اور نیابت کا تو لفظ ہی کہیں قرآن میں آدم کے لئے استعمال نہیں ہوا۔ اور اس میں

شبہ نہیں کہ نیابت کے مفہوم میں ذہن اس طرف ضرور منتقل ہو جاتا ہے جس کا صاحب تعلیمات نے ذکر کیا ہے خلافت کا مفہوم قرآن کریم میں ایک کی جگہ دوسرے کو جانشین بنانے کا ہی ہے۔ اور میں نے تو جہاں تک غور کیا ہے جہاں جہاں یہ لفظ کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت کے متعلق استعمال ہوا ہے، اس جانشینی میں حکومت و سلطنت کا انتقال ضرور شامل ہے۔ چنانچہ جو آیات آپ نے نقل کی ہیں خود ان سے بھی یہی مفہوم ثابت ہوتا ہے جو آپ کے مدعا کے خلاف ہے۔ مثلاً آپ نے لکھا ہے۔

عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّھْلِکَ عَدُوَّکُمْ وَیَسْتَخْلِفَکُمْ فِی الْاَرْضِ (۷: ۱۵) — قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمنوں کو ہلاک کر دے اور تم کو زمین میں جانشین (خلیفہ) فرمائے۔

اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جلد فرعونیوں کو ہلاک کر کے تم کو ان کا جانشین بنا دیگا یعنی ملک و حکومت ان کی ہلاکت کے بعد ان سے چھن کر ان کو مل جائیگی چنانچہ یہی ہوا۔

فَاَخْرَجْنٰھُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ وَّکُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ کَرِیْمٍ کَذٰلِکَ وَاَوْرَثْنٰھَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ - (۲۶: ۴) — سو ہم نے ان کو باغوں چشموں اور خزانوں اور عزت والے مقامات سے نکال یا اور ایسا ہی ہو۔ اور ان سب کا وارث ہم نے بنی اسرائیل کو بنا دیا۔

اس سے صاف واضح ہے کہ یہاں استخلاف فی الارض سے مراد جانشینی ہے نہ کہ نیابت۔ بنی اسرائیل فرعون کی ملک و حکومت کے وارث (اورثنا ہا) و جانشین بنائے گئے تھے۔ دوسری آیت آپنے یہ لکھی ہے۔

وَیَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَیْئًا - (۱۱: ۵) — اور میرا رب تمہارے سوا کسی دوسری قوم کو خلیفہ بنا دیگا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔

یہ حضرت ہود کا خطاب ہے اپنی قوم سے جس کو اللہ تعالیٰ نے قوم نوح کے بعد زمین کی بادشاہت دی تھی۔ چنانچہ حضرت ہود فرماتے ہیں۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (۷:۹) اور یاد کرو جب اللہ نے قوم نوح کے بعد تم کو خلیفہ بنایا

پھر جب قوم ہودؑ نے نافرمانی کی اور عذاب الٰہی سے ہلاک کیے گئے تو قوم ثمود ان کی جانشین ہوئی جس کو مخاطب کرکے حضرت صالحؑ فرماتے ہیں۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ (۷:۱۰) اور یاد کرو جب اللہ نے تم کو قوم عاد کے بعد جانشین بنایا اور تمہیں زمین میں تمکن کیا۔

یہی مفہوم اس آیت میں ہے جس کے الفاظ، جہاں تک جانشین اور نیابت کا تعلق ہے بالکل واضح ہیں

وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا (۹:۶) اور تمہاری جگہ دوسری قوم کو بدل دیگا اور تم اس کو ضرر نہ پہنچا سکو گے

اور اس آیت میں تو استخلاف کا مفہوم اور بھی زیادہ واضح ہے۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ (۶:۱۶) اگر اللہ چاہے تو تم کو لے جائے اور تمہارے بعد جس کو چاہے جانشین بنائے۔

اسی کی تفسیر دوسری آیت سے ہوتی ہے۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ (۴:۱۹) اگر اللہ چاہے تو اے لوگو تم کو لے جائے اور دوسروں کو لے آئے

ان آیات سے ظاہر ہے کہ ایک قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے بعد، یا ان سے غلبہ و استیلا اور ملک و حکومت چھین لینے کے بعد (کہ قوموں کی زندگی میں یہ عذاب بھی درحقیقت مٹا دینے کے مرادف بلکہ اس سے بھی زیادہ بلائے عظیم ہوتا ہے) کسی دوسری قوم کو ان کی جگہ مسلط و متمکن کرکے قوم ماسبق کا وارث و جانشین بنا دینے کو استخلاف کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے اور یہ جو آپ نے فرمایا ہے کہ استخلاف کے معنی ہی "اپنا خلیفہ بنانے" کے ہیں تو قرآن کریم میں علاوہ آیات محولہ بالا اور مقامات سے بھی اس کے خلاف شہادت ملتی ہے۔ مثلاً فرمایا۔

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ (حدید)

شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ تو اس وقت سامنے نہیں۔ شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے

"اور خرچ کرو اس چیز سے کہ کیا ہے تم کو جانشین پہلوں کا بیچ اس کے"

اب ظاہر ہے کہ جب مستخلف کے معنی "پہلوں کا جانشین" ہے تو استخلاف کے معنی صرف "اپنا خلیفہ" ہی کس طرح ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ مصرحہ صدر آیات "استخلاف" میں شاہ صاحب نے کہیں "اپنا خلیفہ" ترجمہ نہیں کیا۔

اب نفس خلیفہ کے معنی دیکھیے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۰:۲) پھر ہم نے تم کو ان کے بعد زمین میں خلیفہ (جانشین) بنایا تاکہ دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔

کس کا جانشین (خلیفہ) بنایا؟ اس کی تصریح اس سے پہلی آیت میں ہے۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا (۲:۱۰) بہت سی نسلوں کو جب انہوں نے ظلم کیا تم سے پہلے ہلاک کر ڈالا ہے

یعنی ان ہلاک کردہ قوموں کی جگہ پر اس زمین میں ہم نے تم کو بادشاہت دی ہے کہ دیکھیں تم کیسے کام کرتے ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب منوب عنہ کا ذکر نہ ہو تو اس سے مقصود خلیفہ ماسبق یعنی پہلوں کا جانشین ہوتا ہے۔

پھر قرآن کریم میں ہے۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ (۵:۳۴) اور جو کچھ تم خرچ کر ڈالتے ہو اللہ اس کی جگہ دوسرا مال تم کو دیتا ہے

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ خلیفہ کے معنی جانشین یعنے Successor کے ہیں اور خلف کے معنی کسی کا جانشین ہونا To succeed اور استخلاف کے معنی کسی کو جانشین بنانا To make successor ہے اب ان تصریحات کی روشنی میں آیت یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ کو دیکھیے۔ کہ جس سے آپ نے خَلِيْفَةً یعنی میرا نائب مراد لیا ہے تو واضح ہو جائے گا کہ لفظ خلیفہ کے استعمال کے بعد "لِلَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِكَ" یعنی اُن لوگوں کا جانشین کہ جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں" کے اضافہ کی ضرورت نہیں رہتی کہ یہ مفہوم خلیفہ کے اندر موجود ہے جس کے معنی ہی (Successor کسی ماسبق کا جانشین ہے۔ البتہ اگر مفہوم اس سے جداگانہ لینا ہو یا منوب عنہ کسی ماسبق کے علاوہ کوئی اور ہو تو اس وقت اس اضافہ کی ضرورت پڑتی ہے

جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور پر تشریف لے جاتے وقت اپنی عدم موجودگی میں جب حضرت ہارونؑ کو "اپنا" جانشین بنایا تو فرمایا۔

وَقَالَ مُوسیٰ لِاَخِیهِ هَارُونَ اخْلُفْنِی فِی قَوْمِی (۷: ۴) اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ میری قوم میں میرا جانشین (خلیفہ) بن

اب ظاہر ہے کہ اگر تنہا خلیفہ کے معنی "میرا جانشین" ہوتا۔ تو اخلفنی میں یائے متکلم بڑھانا خلاف بلاغت تھا۔

امید ہے ان تصریحات۔ اور جو کچھ اس عنوان کے شروع میں گذارش کیا گیا ہے اس کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ خلیفہ فی الارض سے مراد زمین کی سلطنت و حکومت کی جانشینی ہے۔ نہ کہ اللہ تعالیٰ کی جانشینی کہ اُس قادر مطلق معبود کو فی الحقیقت کسی نائب کی ضرورت نہیں کہ نائب ہمیشہ غائب کا ہوتا ہے، حاضر کا نہیں ہوتا۔

الجواب

ماہ گذشتہ کے پرچہ میں جناب پرویز کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے حقیقت جن پر جو بحث کی گئی تھی اس سے موصوف کو ایک شکایت پیدا ہوگئی ہے، لہٰذا اس دوسری قسط کا جواب عرض کرنے سے پہلے اس کو رفع کر دینا ضروری ہے۔ شکایت یہ ہے کہ میرے جواب کا انداز ایسا ہے جس سے لوگوں کو معترض کے متعلق یہ بدگمانی ہو سکتی ہے کہ وہ بھی اسی گروہ میں سے ہے جو قرآن مجید کے ارشادات کو دور جدید کے معقولات کی کسوٹی پر کستا ہے، اور حقیقت و صداقت کا معیار قرآن کو نہیں، خود اپنی عقل اور اپنے اکتسابی علم کو سمجھتا ہے، حالانکہ معترض خود اس گروہ پر اعتراض کرنے والوں میں سے ایک ہے اور اس کا مقصد اس بحث سے صرف قرآن مجید کے معانی کو سمجھنا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ میرے جواب کا انداز اور اس کی ہمہ گیری جس سے ان کو شکایت پیدا ہوئی ہے، دراصل ایک اور وجہ پر مبنی ہے اور اس کو یہاں وضاحت کے ساتھ بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ صرف

جناب پرویز بلکہ دوسرے حضرات بھی جو میرے پاس اکثر اپنے شبہات و اعتراضات بھیجتے رہتے ہیں، اس قسم کی بحثوں میں میرے مسلک کو سمجھ لیں اور آئندہ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔

میرا قاعدہ یہ ہے کہ جب میں کسی معترض کے اعتراض پر بحث کرتا ہوں تو اس بحث میں میرا خطاب تنہا اس معترض یا اس کے گروہ کی طرف نہیں ہوتا، بلکہ میں اس کے اعتراض کو محض ایک محرک قرار دے کر مسئلہ زیر بحث کے ان تمام پہلوؤں پر بیک وقت روشنی ڈال دینا چاہتا ہوں جن میں مسلمانوں کے مختلف گروہوں کو مختلف قسم کے شکوک لاحق ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ میں نے اس لیے اختیار کیا ہے کہ اگر ایک ایک شخص یا ایک ایک مذہب کی حد تک جواب کو محدود رکھا جائے تو ایک ہی مسئلہ پر کئی کئی مرتبہ بحث کرنی پڑے گی جس سے میرا اور عام ناظرین کا بہت وقت ضائع ہوگا۔ علاوہ بریں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ معترض جس گروہ سے تعلق رکھتا ہے وہ قلیل التعداد ہوتا ہے، اور ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے جو اس مسئلہ میں کسی دوسرے پہلو سے شکوک رکھتے ہیں۔ مثلاً جنوں کے متعلق شکوک رکھنے والوں میں وہ لوگ بہت کم ہیں جو محض قرآن مجید کے کسی ارشاد یا بعض ارشادات کی بنا پر شک کرتے ہیں۔ برعکس اس کے کثیر تعداد ایسے ہی لوگوں کی ہے جن کے شکوک کی بنیاد دور جدید کے معقولات، یا ان اثرات پر ہے جو غیر ارادی طور پر ان معقولات کی عام اشاعت سے دلوں میں سرایت کر گئے ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اگر تنہا چوہدری صاحب یا ان کی سی ذہنیت کے چند دوسرے حضرات تک خطاب محدود رہتا تو ان کثیر التعداد متشککین کے شکوک و شبہات بدستور باقی رہ جاتے۔ پس افادۂ عام کی خاطر یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معترض خاص کے جواب میں خطاب عام اور ہمہ گیر ہو تاکہ معترض اور اس کے گروہ کے علاوہ دوسرے گروہوں کے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس توضیح کے بعد میں امید کرتا ہوں کہ آئندہ کسی بحث کے دوران میں کوئی معترض تنہا اپنے آپ کو میرا مخاطب نہ سمجھے گا۔

آئیے اب ہم اپنے اصل مبحث کی طرف رجوع کریں۔

مفہوم خلافت خلافت کی بحث میں سب سے پہلے ہم کو لغت عرب کی توجہ کرنی چاہیے کہ قرآن کریم اسی لغت

میں اترا ہے اور الفاظ قرآنی کے صحیح معنی معلوم کرنے کے لیے اسی کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔
لغوی تحقیق: خلافت کے معنی لغت میں صرف جانشینی اور قائم مقامی کے نہیں ہیں جیسا کہ آپ نے سمجھا ہے بلکہ نیابت کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ امام راغب اصفہانی اپنی مفردات میں لکھتے ہیں۔

وَالخلافۃ نیابۃ عن الغیر اما لغیبۃ المنوب عنہ واما لموتہ واما لعجزہ واما لتشریف المستخلف۔	خلافت کسی دوسرے کی نیابت ہے، خواہ منوب عنہ کی غیر موجودگی کے سبب سے ہو یا اس کی موت کے سبب سے یا اس کے عجز کے سبب سے یا اس شخص کو بزرگی عطا کرنے کے لیے جسے خلیفہ بنایا گیا ہے۔

لین (Lane) نے اپنی مدالقاموس (Arabic english lexicon) میں خلیفہ کے معنی (Successor) کے علاوہ (Vicegerent) کے بھی لکھے ہیں۔ خلافت کے لیے ضروری نہیں ہے کہ منوب عنہ مر جائے یا غائب ہو۔ امام راغب لکھتے ہیں کہ خَلَفَ فلانٌ فلاناً قَامَ بِالأمرِ عنہُ اما معہ و اما بعدہُ "فلاں شخص فلاں شخص کا خلیفہ ہوا یعنی اس کی طرف سے کارپرداز ہوا خواہ اس کے ساتھ یا اس کے بعد"۔

اس مادے سے جو ابواب مشتق ہوئے ہیں، ان کی خاصیتوں سے اس کے معنی میں بھی تغیر واقع ہوتا ہے خَلَفَ خِلافۃً کے معنی خلیفہ ہونے یا بعد میں آنے یا پیچھے رہنے کے ہیں۔ خَلَفَہٗ خلافۃً کان خلیفتہٗ وبقی بَعْدہٗ وجاءَ بعدہٗ۔ (تاج العروس) قرآن مجید میں ہے فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِھِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْکِتٰبَ (۷ : ۲۱) یعنی ان کے بعد ایسے ناخلف آئے یا ان کے جانشین ہوئے جو کتاب کے وارث ہوئے۔ وَقَالَ مُوْسیٰ لِاَخِیْہِ ھٰرُوْنَ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ (۷ : ۱۷) اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ تو میری قوم کے بعد میرا جانشین یا نائب ہو۔ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِیْ مِنْ بَعْدِیْ (۷ : ۱۸)۔ "موسیٰ نے کہا کہ میرے بعد تم میرے بہت برے پس ماندہ رہے"۔ وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْکُمْ مَّلٰٓئِکَۃً فِی الْاَرْضِ

یَخْلُفُوْنَ (۴۳: ۶) اگر ہم چاہیں تو زمین میں تم میں سے ملائکہ پیدا کریں جو تمہاری جگہ آباد ہوں"

تخلف کے معنی پیچھے رہ جانے کے ہیں۔ مَا کَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ (۹: ۱۵)

اَخْلَفَ کے معنی کھوئی ہوئی چیز واپس دینے یا دلانے یا اس کا بدل عطا کرنے کے ہیں۔ اخلف اللہ لک وعلیک خیرًا ای ابدلک بما ذهب عنک وعوضک عنہ (نہایہ ابن اثیر) چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (۳۴: ۵) اور جو کچھ تم خرچ کروگے تو خدا وہ تمہیں پھر واپس دیگا (یا اس کا بدل عطا کرے گا) اور وہ بہترین رازق ہے" حدیث میں ہے۔ تکفل اللہ للغازی ان یخلف نفقتہ۔ اللہ نے غازی کے لیے ذمہ لیا ہے کہ جو کچھ وہ خرچ کرے گا۔ اللہ اس کا بدل عطا کرے گا۔

خَلَّفَ اور اِسْتَخْلَفَ کے معنی اپنا خلیفہ بنانے کے ہیں یقال خلف فلانا اذا جعلہ خلیفتہ کاستخلفہ (تاج العروس) اِسْتَخْلَفَ کیکر اگر منسوب عنہ کی تصریح نہ کیگئی ہو تو معنی یہ ہونگے کہ اپنا خلیفہ بنایا۔ استخلف فلانا ای جعلہ خلیفتہ اور اگر منسوب عنہ کی تصریح ہو تو پھر معنی یہ ہونگے کہ اس شخص کا جانشین بنایا جس کا ذکر کیا ہو۔ استخلف فلانا من فلان ای جعلہ مکانہ (اقرب الموارد) پس جہاں قرآن مجید نے محض استخلاف کا ذکر کیا ہے اور مستخلف لہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا مثلاً لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۲۴: ۷) میں تو وہاں استخلاف کے معنی خلافت الٰہی سپرد کرنے کے ہونگے اور جہاں مستخلف لہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہاں معنی یہ ہوں گے کہ دوسرے کی جگہ یا دوسرے کے بعد خلیفہ بنایا لیکن یہ واضح رہے کہ جب کبھی پچھلے نائب کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا نائب مقرر کرنے کا ذکر کیا جائیگا تو اس میں دونوں مفہوم شامل ہوں گے یعنی اسکا یہ مفہوم بھی ہوگا کہ حاکم اعلیٰ نے فلاں شخص کو فلاں کا جانشین بنایا اور یہ بھی کہ اس نے فلاں شخص کو اپنا نائب مقرر کیا مثلاً اگر کہا جائے کہ استخلف الملک اللورڈ اردن بعد اللورڈ ریڈنگ فی وکالتہ الهند

تو اس کے یہ معنی بھی ہوں گے بادشاہ نے لارڈ ارون کو لارڈ ریڈنگ کے بعد اس کی جگہ ہندوستان کا وائسرائے بنایا اور یہ بھی ہوں گے کہ اس نے ارون کو ریڈنگ کے بعد ہندوستان کی ولایت میں اپنا وائسرائے مقرر کیا۔ ان دونوں مفہوموں میں کوئی تضاد و تناقض نہیں ہے کہ بیک وقت صادق نہ آسکیں پس اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَاۗءُ کا یہ مفہوم بھی ہے کہ خدا تمہاری جگہ دوسروں کو دیدیگا اور یہ بھی کہ خدا تمہاری جگہ دوسروں کو خلیفہ بنالیگا۔ جہاں تک لغت کا تعلق ہے کوئی امر ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں مفہوم لینے میں مانع نہیں ہے۔

جَعَلَہٗ خلیفۃً کے معنی صرف خلیفہ بنانے کے ہیں خلیفہ کے معنی خواہ نائب کے ہوں یا جانشین کے دونوں صورتوں میں اس کا مفہوم ایک اضافی مفہوم ہے اور اس کا اتمام بغیر اس کے نہیں ہوسکتا کہ کوئی مستخلف لہٗ اور منوب عنہٗ بھی ہو، عام اس سے کہ مقدر ہو یا مذکور پس جس جگہ جعل خلیفہ کے ساتھ قرآن مجید نے مستخلف لہٗ کی تصریح کردی ہے وہاں تو مفہوم واضح ہے مثلاً وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاۗءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (۷: ۹) اور وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاۗءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ (۷: ۱۰) اور ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰۗىِٕفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۰: ۲) لیکن جہاں مستخلف لہٗ کی طرف قطعاً کوئی اشارہ نہیں ہے وہاں ایک مستخلف لہٗ مقدر ماننا پڑیگا مثلاً اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ (۳۸: ۲) اور وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاۗءَ الْاَرْضِ (۲۷: ۵) اور وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰۗىِٕفَ الْاَرْضِ (۶: ۲۰) اور اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (۲: ۴) سوال یہ ہے کہ وہ مقدر کون ہے۔ اگر آپ پچھلی قوموں یا پچھلے بادشاہوں کو مقدر مانتے ہیں۔ تو قطع نظر اس کے کہ یہ ایک تکلف ہے بعض آیتوں میں یہ معنے کھپتے ہی نہیں مثال کے طور پر وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاۗءَ الْاَرْضِ میں خلفاء کو زمین کی طرف مضاف کیا گیا ہے جس کا لفظی ترجمہ زمین کے خلفاء ہی ہو سکتا ہے۔ یہ معنے نکالنے کی کہاں گنجائش ہے کہ زمین پر پہلے جو لوگ متمکن تھے ان کے خلفاء پھر اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً کے معنی اگر یہ لیے جائیں کہ "میں پچھلے ساکنین ارض کا ایک خلیفہ بنانے والا ہوں" تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہیں ان ساکنین ارض کا ذکر کیا ہے جن کی خلافت انسان کے

سپرد کیگئی ہے؟ اگر کیا ہے تو حوالہ پیش کیجیے۔ اگر نہیں کیا تو فرمایئے کہ ایسی صورت میں محض زبان اور ادب کے نقطہ نظر سے اس فقرے کا یہ مفہوم زیادہ اقرب الی الفہم ہے کہ "میں پہلے مجہول الحال ساکنین ارض کا ایک خلیفہ بنانے والا ہوں" یا یہ کہ "میں زمین میں اپنا ایک نائب مقرر کرنے والا ہوں"؟ اگر سامع صرف عربی جانتا ہو اور ان عقلی مقدمات سے نا آشنائے محض ہو جنہیں مولانا اسلم جیراجپوری نے ترتیب دے کر ایک نتیجہ اخذ کیا ہے، تو وہ اس فقرے کو سن کر ان دونوں معنوں میں سے کونسا معنی مراد لے گا؟

خلافت میں فرمانروائی کا مفہوم | اس لغوی تحقیق کے بعد میں آپ کو دعوت دونگا کہ آپ خلافت کے اس مفہوم پر غور کیجیے جس کو خود آپ نے اور مولانا اسلم جیراجپوری نے مراد لیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ۔

"خلیفہ فی الارض سے مراد زمین کی سلطنت وحکومت کی جانشینی ہے"

مولانا اسلم جیراجپوری انی جاعل فی الارض خلیفۃ کا ترجمہ "میں زمین میں ایک بادشاہ بنانے والا ہوں" کرتے ہیں اور نوٹ میں لکھتے ہیں۔

"حضرت آدم اپنے سے پہلے ساکنان زمین کے بجائے بادشاہ بنائے گئے تھے"

غور فرمایئے کہ خلافت کے معنی تو محض جانشینی یا قائم مقامی یا بعد میں آنے کے ہیں۔ پھر اس میں بادشاہی اور فرمانروائی کا مفہوم کہاں سے آگیا؟ اگر نفس خلافت اس مفہوم سے خالی ہے اور یقیناً خالی ہے تو اس میں یہ مفہوم اس اعتبار ہی سے آسکتا ہے کہ خلیفہ کو خلافت کسی فرمانروا اور کسی سلطان سے ملی ہو۔ پھر جب انسان کو وہ خلافت ملی جس میں خود آپ کے اعتراف کے مطابق سلطنت و فرمانروائی کی جھلک ہے تو لامحالہ یہ ماننا پڑیگا کہ انسان جس کا خلیفہ ہوا وہ کوئی فرمانروا تھا۔ اب فرمایئے کہ کیا قرآن سے یا علمی تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان سے پہلے زمین پر کوئی ایسی مخلوق تھی جس میں فرمانروائی کی شان تھی؟ فرمانروائی کے لیے علم، حکمت، اختیار، ارادہ، قدرت وغیرہ صفات کا ہونا ضروری ہے کہ ان کے بغیر زمین اور اس کی موجودات پر فرمانروائی نہیں ہوسکتی۔ علمی تحقیقات سے ثابت ہوچکا ہے کہ اس کرۂ خاکی پر انسان سے پہلے

کوئی مخلوق ایسی موجود نہ تھی جو ان صفات سے متصف ہوتی ۔ اسی کی تصدیق قرآن بھی کرتا ہے وہ ہم کو بتاتا ہے کہ انسان سے پہلے خدا کی جو مخلوق سب سے افضل تھی یعنی ملائکہ جن کو عباد مکرمون کہا گیا ہے اس کا بھی یہ حال تھا کہ وہ علم اشیاء سے بے خبر تھی (ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (۲: ۴) اور ارادہ واختیار کی آزادی سے بالکل محروم تھی (لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۶۶: ۱) دوسری مخلوق جن تھے، سو ان کے متعلق کوئی بات قرآن مجید نے ایسی بیان نہیں کی جس سے معلوم ہوتا ہو کہ ان کو زمین کی فرمانروائی حاصل تھی ۔ رہے حیوانات و نباتات و جمادات، تو ان کا حال آپ جانتے ہیں پھر آخر وہ کونسی مخلوق تھی جس کی خلافت، زمین کی فرمانروائی کے اعزاز کے ساتھ انسان کو حاصل ہوئی؟

تاہم اگر مان لیا جائے کہ یہ پرانے ساکنین ارض ہی کی خلافت ہے اور وہ ساکنین ارض انسان سے پہلے زمین کے فرمانروا تھے، تو کیا وہ بالاصالت فرمانروا تھے، یا ان کی فرمانروائی بھی خلیفانہ تھی؟ پہلی شق تو آپ اختیار نہیں کر سکتے کیونکہ اسلامی عقیدہ کی رو سے بالاصل اور بالذات فرمانروا صرف حق تعالیٰ ہے، اور اس کے سوا سب کی فرمانروائی محض عطائی ہے ۔ اب رہی دوسری شق تو اس کو اختیار کرنے کی صورت میں یا تو آپ کو خلافت در خلافت کا ایک لامتناہی سلسلہ ماننا پڑیگا ۔ یا پھر یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ فرمانروائی کی شان خواہ یکے بعد دیگرے کتنے ہی خلفاء کو ملی ہو، بہرحال اس کا سرچشمہ وہی ذات حق تعالیٰ ہے ۔ اور خلافت میں بادشاہی کی جھلک اسی وقت آسکتی ہے جبکہ وہ خلافت الٰہی ہو ۔

قرآنی اشارات | اب میں آپ کو ان قرآنی اشارات کی طرف توجہ دلاؤں گا جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو جس خلافت سے سرفراز کیا گیا ہے، وہ دراصل خلافت الٰہی ہے ۔

قرآن مجید کا بیان ہے کہ خدا نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ

فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (۹۵) اس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔ قَالَ یٰٓاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ (۳۸: ۵) اس میں اپنی روح پھونکی ۔ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (۳۲: ۱) اس کو علم کی نعمت سے سرفراز کیا وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ (۲: ۴) اس کے لیے زمین و آسمان کی چیزوں کو مسخر کردیا وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ (۴۵: ۲) ان صفات کے ساتھ جب انسان کی تخلیق پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی تو فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کے آگے سجدہ کریں۔ سورۂ صٓ کے آخر میں اس حکم کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ خاص طور پر قابل غور ہے۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اِلَّآ اِبْلِیْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ قَالَ یٰٓاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِیْمٌ (۳۸: ۵)

جب کہ تیرے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں۔ پس جب میں اس کو پورا بنا لوں اور اس کے اندر اپنی روح میں سے کچھ پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدہ میں گر جانا۔ چنانچہ تمام ملائکہ نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے انکار اور استکبار کیا اور کافروں میں سے ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابلیس کس چیز نے تجھے اس کو سجدہ کرنے سے منع کیا جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے؟ تو نے آیا یہ تکبار کیا ہے یا تو واقعی بڑے لوگوں میں سے ہے؟ اس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے بنایا ہے۔ اس پر اللہ نے فرمایا کہ تو ہماری بارگاہ سے نکل جا کہ تو مردود ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم کو سجدہ کرنے کا جو حکم دیا گیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ نے

آدم کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا تھا یعنی وہ قدرت و صنعت الٰہی کا مظہر اتم تھا، اور اس کے اندر خود اپنی روح کا کچھ حصہ پھونکا تھا، یعنی ایک محدود پیمانے پر اس میں وہ صفات پیدا کر دی تھیں جو بدرجۂ فوق اتمام خود باری تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ اس شان اور ان صفات پر آدم کو پیدا کرنے کے بعد اعلان کیا گیا کہ ہم اس کو زمین میں خلیفہ بنانے والے ہیں جیسا کہ سورہ بقرہ کے چوتھے رکوع میں ارشاد ہوا ہے۔ فرشتوں نے اس کے مقابلہ میں اپنے حقوق پیش کیے تو ان کے سامنے آدم کی سب سے افضل صفت یعنی علم کا مظاہرہ کرایا گیا۔ اور جب خلافت کیلیے اس کا استحقاق ثابت کر دیا گیا تو فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ اس کی خلافت تسلیم کرو اور علامت تسلیم کے طور پر اسے سجدہ کرو۔ تمام فرشتوں نے اسے تسلیم کیا اور سربسجود ہو گئے مگر شیطان نے اس کی خلافت ماننے سے انکار کیا، اس لیے اس کو راندۂ درگاہ کر دیا گیا۔

یہ تمام اشارات کیا ظاہر کر رہے ہیں؟ تمام مخلوقات پر انسان کی فضیلت کا اظہار کیا جاتا ہے، عام مقابلہ میں اس کی فضیلت ثابت کی جاتی ہے، بتایا جاتا ہے کہ وہ ہماری صفات کا مظہر اتم ہے، اور ہم نے اس میں اپنی روح کا کچھ حصہ پھونکا ہے۔ حکم ہوتا ہے اور وہ بھی کس کو؟ فرشتوں کو کہ اس کو سجدہ کرو، ان سب باتوں کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم اس کو خلیفہ بنانے والے ہیں ان طیاریوں کے ساتھ جس خلیفہ کی خلافت کا اعلان کیا گیا، کیا وہ پرانے ساکنین ارض کا خلیفہ ہو سکتا تھا؟ اگر بات صرف اتنی تھی کہ پرانے بسنے والوں کی جگہ کسی دوسرے کو بسایا جا رہا تھا تو اس کے لیے فرشتوں کے سامنے خلافت کا اعلان کرنے، اور اس کی فضیلت کا مظاہرہ کرانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر ملائکہ کو یہ حکم کیوں دیا گیا کہ اس کرۂ خاکی کے نوآبادکار کو جو فقط دوسرے لوگوں کی جگہ لینے کے لیے جا رہا تھا، سجدہ کریں۔

خلافت الٰہی سے مراد کیا ہے؟ دوسری بات جو قرآن مجید میں ایک اور موقع پر ارشاد ہوئی ہے خلافت الٰہی کے مفہوم پر صاف روشنی ڈالتی ہے فرمایا کہ:۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں

وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَھَا وَاَشْفَقْنَ مِنْھَا وَحَمَلَھَا الْاِنْسَانُ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَھُوْلًا۔ (۹۔ ۳۳)

پیش کیا تھا مگر انہوں نے اس کا بار اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ بے شک وہ ظالم اور انجام سے بے خبر تھا۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہم اپنی مخلوقات میں سے کسی کو فرمانروائی کے اختیارات اور ذمہ داریاں تفویض کرنا چاہتے تھے۔ آسمانوں اور زمین میں جتنی مخلوقات تھیں انھوں نے زبان حال سے ظاہر کیا کہ وہ اس امانت کو اٹھانے کے اہل نہیں ہیں آخر کار انسان آیا اور اس نے یہ بار اٹھا لیا اس سے متعدد نکات نکلتے ہیں۔

(۱) انسان سے پہلے زمین و آسمان میں جتنی مخلوقات تھیں ان میں سے کوئی بار امانت کا متحمل نہ تھا انسان پہلی مخلوق ہے جس نے امانت الٰہی کا بار اٹھایا لہٰذا منصب امانت میں وہ کسی مخلوق کا جانشین (Successor) نہیں ہے۔

(۲) جس چیز کو سورۂ بقرہ میں خلافت کہا گیا ہے وہ یہی امانت ہے۔ کیونکہ وہاں فرشتوں پر ثابت کیا گیا تھا کہ تم خلافت کے اہل نہیں ہو، اس کا اہل انسان ہے اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ زمین و آسمان کی کوئی مخلوق ہماری امانت کا بار اٹھانے کی اہل نہ تھی۔ صرف انسان اس کا متحمل ہوا۔

(۳) خلافت کے مفہوم کو امانت کا لفظ واضح کر دیتا ہے، اور یہ دونوں لفظ، نظام عالم میں انسان کی صحیح حیثیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انسان زمین کا فرمانروا ہے مگر اس کی فرمانروائی بالاصالت نہیں ہے بلکہ تفویض کردہ (Delegated) ہے لہٰذا اللہ نے اس کے اختیارات مفوضہ (Delegated powers) کو امانت سے تعبیر کیا ہے، اور اس حیثیت سے کہ اس کی طرف سے ان اختیارات مفوضہ کو استعمال کرتا ہے اسے خلیفہ (Vicegerent) کہا ہے جس کے اصطلاحی معنے یہ ہیں کہ وہ شخص جو کسی کے بخشے ہوئے اختیارات کو استعمال کرے Person exercising delegated power

(باقی)

فہرست مضامین

ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۳ھ جلد ۵ عدد ۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

قرآن مجید میں ایک قاعدہ کلیہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالم نہیں ہے کہ کسی قوم کو خواہ مخواہ برباد کر دے درانحالیکہ وہ صالح اور نیکوکار ہو۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (۱۱ : ۱۰)

اور تیرا رب ایسا نہیں کہ بستیوں کو ظلم سے تباہ کر دے حالانکہ ان کے باشندے نیک عمل کرنے والے ہوں۔

ہلاک اور برباد کر دینے سے مراد صرف یہی نہیں کہ بستیوں کے طبقے الٹ دیے جائیں، اور آبادیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے بلکہ اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ قوموں کا شیرازہ بکھیر دیا جائے، ان کی اجتماعی قوت توڑ دی جائے ان کو محکوم و مغلوب اور ذلیل و خوار کر دیا جائے۔ قاعدۂ مذکورہ کی بنا پر بربادی اور ہلاکت کی جملہ اقسام میں سے کوئی قسم بھی کسی قوم پر نازل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ خیر و صلاح کے راستے کو چھوڑ کر، شرو فساد اور سرکشی و نافرمانی کے طریقوں پر نہ چلنے لگے اور اس طرح خود اپنے اوپر ظلم نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قاعدہ کو ملحوظ رکھ کر جہاں کہیں کسی قوم کو مبتلائے عذاب کرنے کا ذکر فرمایا ہے، وہاں اس کا جرم بھی ساتھ ساتھ بیان کر دیا ہے، تاکہ لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ وہ ان کی اپنی ہی شامت اعمال ہے جو ان کی دنیا اور آخرت دونوں کو

خراب کرتی ہے فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْبِهٖ ...... وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۔ (۲۹:۴)۔

دوسری بات جو اس قاعدہ سے نکلتی ہے، یہ ہے کہ ہلاکت و بربادی کا سبب انفرادی شر و فساد نہیں ہے بلکہ اجتماعی اور قومی شر و فساد ہے۔ یعنی اعتقاد اور عمل کی خرابیاں اگر متفرق طور پر افراد میں پائی جاتی ہوں، لیکن مجموعی طور پر قوم کا دینی و اخلاقی معیار اتنا بلند ہو کہ افراد کی برائیاں اس کے اثر سے دبی رہیں، تو خواہ افراد علیحدہ علیحدہ کتنے ہی خراب ہوں، قوم بحیثیت مجموعی بھلی رہتی ہے اور کوئی فتنہ عام برپا نہیں ہوتا جو پوری قوم کی بربادی کا موجب ہو۔ مگر جب اعتقاد اور عمل کی خرابیاں افراد سے گذر کر پوری قوم میں پھیل جاتی ہیں اور قوم کا دینی احساس اور اخلاقی شعور اس درجہ ماؤف ہو جاتا ہے کہ اس میں خیر و صلاح کے بجائے شر و فساد کو پھلنے اور پھولنے کا موقع ملنے لگے، تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت ایسی قوم سے پھر جاتی ہے اور وہ عزت کے مقام سے ذلت کی طرف گرنے لگتی ہے، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اللہ کا غضب اس پر بھڑک اٹھتا ہے اور اس کو بالکل تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔

قرآن حکیم میں اس کی بکثرت مثالیں بیان کی گئی ہیں ۔

قوم نوح کو اس وقت برباد کیا گیا جب اعتقاد و عمل کی خرابیاں ان کے اندر جڑ پکڑ گئیں اور زمین میں پھیلنے لگیں، اور یہ امید ہی باقی نہ رہی کہ اس شجر خبیث سے کبھی کوئی اچھا پھل بھی پیدا ہوگا۔ تب حضرت نوح نے بارگاہ رب العزۃ میں عرض کیا کہ:۔

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا	میرے پروردگار، زمین پر کافروں میں سے ایک کو بھی نہ چھوڑ، اگر تو نے ان کو
اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا	چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے
اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۔ (۷۱: ۲)	جو پیدا ہوگا بدکار اور حق کا منکر پیدا ہوگا۔

قوم عاد کو اس وقت تباہ کیا گیا جب شر اور فساد نے ان کے دلوں میں یہاں تک گھر کر لیا کہ شریر اور مفسد اور ظالم ان کی قوم کے لیڈر اور حاکم بن گئے، اور اہل خیر و صلاح کے لیے نظام اجتماعی میں کوئی گنجائش باقی نہ رہی:۔

وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ (۱۱:۵۹)

اور وہ عاد ہیں جنہوں نے اپنے رب کے احکام سے انکار کیا اور اسکے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر جبار دشمن حق کا اتباع کیا۔

قوم لوط کو اس وقت ہلاک کیا گیا جب ان کا اخلاقی شعور اتنا باطل ہو گیا، اور ان میں بے حیائی یہاں تک بڑھ گئی کہ علانیہ مجلسوں اور بازاروں میں فواحش کا ارتکاب کیا جانے لگا، اور فواحش کے فواحش ہونے کا احساس ہی باقی نہ رہا۔

أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ وَتَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنكَرَ (۲۹:۲۹)

(لوط نے کہا) کہ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس جاتے ہو راستوں میں لوگوں کو چھیڑتے اور ستاتے ہو اور اپنی محفلوں میں بُرا کام کرتے ہو۔

اہل مدین پر اس وقت عذاب نازل ہوا جب پوری قوم خائن اور بد معاملہ اور بے ایمان ہو گئی کم تولنا اور زیادہ لینا کوئی عیب نہ رہا، اور قوم کا اخلاقی احساس یہاں تک فنا ہو گیا کہ جب ان کو اس عیب پر ملامت کی جاتی تو شرم سے سر جھکا لینے کے بجائے وہ الٹا اس ملامت کرنے والے کو ملامت کرتے اور ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ اس میں کوئی ایسا عیب بھی ہے جو ملامت کے قابل ہو۔ وہ اپنی بدکاریوں کو بُرا نہ سمجھتے بلکہ جو انہیں بُرا کہتا اسی کو سر پھرا اور غلط اور لائق سرزنش خیال کرتے:۔

وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ..... قَالُوا يَا شُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ (۱۱:۸)

(شعیب علیہ السلام نے کہا) اور اے میری قوم کے لوگو! انصاف کیساتھ ناپو اور تولو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ ...... انھوں نے جواب دیا کہ اے شعیب! جو باتیں تو کہتا ہے ان میں سے تو اکثر ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور ہم تو تجھے اپنی قوم میں کمزور پاتے ہیں اگر تیرا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تجھے سنگسار کر چکے ہوتے

بنی اسرائیل کو ذلت و مسکنت اور غضب و لعنت الٰہی میں مبتلا کرنے کا فیصلہ اس وقت صادر ہوا جب انہوں نے بدی اور ظلم اور حرام خواری کی طرف لپکنا شروع کیا ان کی قوم کے پیشوا سلامت پرستی کے مرض میں مبتلا ہو گئے، ان میں گناہوں کے ساتھ رواداری پیدا ہو گئی، اور ان میں کوئی گروہ ایسا نہ رہا جو عیب کو عیب کہنے والا اور اس سے روکنے والا ہوتا۔

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۵:۹)

تو ان میں سے اکثر کو دیکھتا ہے کہ گناہ اور حد سے تجاوز اور حرام خوری کی طرف لپکتے ہیں کیسی بری حرکتیں تھیں جو وہ کر رہے تھے کیوں نہ ان کے مشائخ اور علماء نے ان کو بری باتیں کہنے اور حرام کے مال کھانے سے منع کیا؟ یہ بہت برا درگزر تھا جو وہ کرتے تھے

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِىْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ (۵:۱۱)

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کرائی گئی اس لیے کہ انہوں نے سرکشی کی اور وہ حد سے گذر جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو برے افعال سے نہ روکتے تھے۔

اس آخری آیت کی تفسیر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احادیث منقول ہیں وہ قرآن حکیم کے مقصد کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہیں۔ سب روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور نے فرمایا۔

> بنی اسرائیل میں جب بدکاری پھیلنی شروع ہوئی تو حال یہ تھا کہ ایک شخص اپنے بھائی یا دوست یا ہمسایہ کو برا کام کرتے دیکھتا تو اس کو منع کرتا اور کہتا کہ اے شخص خدا کا خوف کر۔ مگر اس کے بعد وہ اسی شخص کے ساتھ گھل مل کر بیٹھتا اور یہ بدی کا مشاہدہ اس کو اس بدکار شخص کے ساتھ میل جول اور کھانے پینے میں شرکت سے نہ روکتا۔ جب ان کا یہ حال ہو گیا تو ان کے دلوں پر

ایک دوسرے کا اثر پڑ گیا اور اللہ نے سب کو ایک رنگ میں رنگ دیا اور ان کے نبی داؤد و عیسیٰ بن مریم کی زبان سے ان پر لعنت کی۔"

راوی کہتا ہے کہ جب حضور سلسلۂ تقریر میں اس مقام پر پہنچے تو جوش میں آکر اٹھ بیٹھے اور فرمایا۔

"قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم پر لازم ہے کہ نیکی کا حکم کرو، بدی سے روکو اور جس کو برا فعل کرتے دیکھو اس کا ہاتھ پکڑ لو اور اسے راہ راست کی طرف موڑ دو اور اس معاملہ میں ہرگز رواداری نہ برتو، ورنہ اللہ تمہارے دلوں پر بھی ایک دوسرے کا اثر ڈال دیگا، اور تم پر بھی اسی طرح لعنت کرے گا جس طرح بنی اسرائیل پر کی۔"

اعتقاد اور عمل کے فساد کا حال وبائی امراض کا سا ہے۔ ایک وبائی مرض ابتدا میں چند کمزور افراد پر حملہ کرتا ہے اگر آب و ہوا اچھی ہو، حفظان صحت کی تدابیر درست ہوں، نجاستوں اور کثافتوں کو دور کرنے کا کافی انتظام ہو، اور مرض سے متاثر ہونے والے مریضوں کا بروقت علاج کر دیا جائے، تو مرض، وبائے عام کی صورت اختیار نہیں پاتا اور عام لوگ اس سے محفوظ رہتے ہیں لیکن اگر طبیب غافل ہوں حفظان صحت کا محکمہ بے پروا ہو، صفائی کے منتظم نجاستوں اور کثافتوں کے روادار ہو جائیں، تو رفتہ رفتہ مرض کے جراثیم فضا میں پھیلنے لگتے ہیں، اور آب و ہوا میں سرایت کر کے اس کو اتنا خراب کر دیتے ہیں کہ وہ صحت کے بجائے مرض کے لیے سازگار ہو جاتی ہے۔ آخر کار جب بستی کے عام افراد کو ہوا، پانی، غذا، لباس، مکان غرض کوئی چیز گندگی اور سمیت سے پاک نہیں ملتی تو ان کی قوت حیات جواب دینے لگتی ہے اور ساری کی ساری آبادی وبائے عام میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ پھر قوی سے قوی افراد کے لیے بھی اپنے آپ کو مرض سے بچانا مشکل ہو جاتا ہے، خود طبیب اور صفائی کے منتظم اور صحت عامہ کے محافظ بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور وہ لوگ بھی ہلاکت سے محفوظ نہیں رہتے جو اپنی حد تک حفظان صحت کی جملہ تدبیریں اختیار کرتے ہیں اور دوائیں استعمال کرتے رہتے ہیں کیونکہ ہوا کی سمیت، پانی کی

گندگی، وسائل غذا کی خرابی، اور زمین کی کثافت کا ان کے پاس کیا علاج ہو سکتا ہے۔

اسی پر اخلاق و اعمال کے فساد اور اعتقاد کی گمراہیوں کو بھی قیاس کر لیجیے۔ علما، قوم کے طبیب ہیں، حکام اور اہلِ دولت، صفائی اور حفظانِ صحت کے ذمہ دار ہیں۔ قوم کی غیرتِ ایمانی اور حاسۂ اخلاقی بمنزلۂ قوتِ حیات (Vitality) ہے، اجتماعی ماحول کی حیثیت وہی ہے جو ہوا، پانی، غذا اور لباس و مکان کی ہے، اور حیاتِ قومی میں دینی اخلاق کے اعتبار سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا وہی مقام ہے جو صحتِ جسمانی کے اعتبار سے صفائی و حفظانِ صحت کی تدابیر کا ہے۔ جب علما اور اولی الامر اپنے اصلی فرض یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو چھوڑ دیتے ہیں اور شر و فساد کے ساتھ رواداری برتنے لگتے ہیں تو گمراہی اور بد اخلاقی قوم کے افراد میں پھیلنی شروع ہو جاتی ہے اور قوم کی غیرتِ ایمانی ضعیف ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ سارا اجتماعی ماحول فاسد ہو جاتا ہے۔ قومی زندگی کی فضا خیر و صلاح کے لیے نامساعد اور شر و فساد کے لیے سازگار ہو جاتی ہے۔ لوگ نیکی سے بھاگتے ہیں، اور بدی سے نفرت کرنے کے بجائے اس کی طرف کھنچنے لگتے ہیں، اخلاقی قدریں الٹ جاتی ہیں، عیب ہنر بن جاتے ہیں اور ہنر عیب۔ اس وقت گمراہیاں اور بد اخلاقیاں خوب پھلتی پھولتی ہیں اور بھلائی کا کوئی بیج برگ و بار لانے کے قابل نہیں رہتا، زمین، ہوا اور پانی سب اس کو پرورش کرنے سے انکار کر دیتے ہیں، کیونکہ ان کی ساری قوتیں اشجارِ خبیثہ کو نشو و نما دینے کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ جب کسی قوم کا یہ حال ہو جاتا ہے، تو پھر وہ عذابِ الٰہی کی مستحق ہو جاتی ہے، اور اس پر ایسی عام تباہی نازل ہوتی ہے جس سے کوئی نہیں بچتا، خواہ وہ خانقاہوں میں بیٹھا عبادت گذاری ہی کیوں نہ کر رہا ہو۔

اس کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ:۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (۸:۲) بچو اس فتنہ سے جو صرف انہی لوگوں کو مبتلائے مصیبت نہ کرے گا جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا منشا اس سے یہ ہے کہ بدی کو اپنے سامنے دھیرنے دو کیونکہ اگر تم بدی سے رواداری کرو گے اور اس کو پھیلنے دو گے تو اللہ کی طرف سے عذاب عام نازل ہوگا اور اس کی لپیٹ میں اچھے اور برے سب آجائیں گے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تشریح اس طرح فرمائی ہے کہ:۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُعَذِّبُ الْعَامَّةَ بِعَمَلِ الْخَاصَّةِ	اللہ خاص لوگوں کے عمل پر عام لوگوں کو عذاب نہیں
حَتّٰى يَرَوُا الْمُنْكَرَ بَيْنَ ظَهْرَانَيْهِمْ وَهُمْ	دیتا۔ مگر جب وہ اپنے سامنے بدی کو دیکھیں اور اس کو روکنے
قَادِرُوْنَ عَلٰى أَنْ يُنْكِرُوْهُ فَلَا يُنْكِرُوْهُ	پر قدرت رکھنے کے باوجود اس کو نہ روکیں تو اللہ
فَإِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَذَّبَ اللّٰهُ الْخَاصَّةَ وَالْعَامَّةَ	خاص اور عام سب کو مبتلائے عذاب کر دیتا ہے۔

قوم کی اخلاقی اور دینی صحت کو برقرار رکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ اس کے ہر فرد میں غیرت ایمانی اور حاسۂ اخلاقی موجود ہو اجس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جامع لفظ "حیاء" سے تعبیر فرمایا ہے یہ حیاء، دراصل ایمان کا ایک جزء ہے جیسا کہ حضور نے فرمایا ہے إِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْإِيْمَانِ۔ بلکہ ایک موقع پر جب حضور سے عرض کیا گیا کہ حیاء، دین کا ایک جزء ہے، تو آپ نے فرمایا بَلْ هُوَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ، یعنی وہ پورا دین ہے۔

حیاء سے مراد یہ ہے کہ بدی اور معصیت سے نفس میں طبیعی طور پر انقباض پیدا ہو، اور دل اس سے نفرت کرے۔ جس شخص میں یہ صفت موجود ہوگی وہ نہ صرف قبائح سے اجتناب کرے گا بلکہ دوسروں میں بھی اس کو برداشت نہ کر سکے گا۔ وہ برائیوں کے دیکھنے کا روادار نہ ہوگا ظلم اور معصیت سے مصالحت کرنا اس کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ جب اس کے سامنے قبائح کا ارتکاب کیا جائے گا تو اس کی غیرت ایمانی جوش میں آجائے گی اور وہ اس کو ہاتھ سے یا زبان سے مٹانے کی کوشش کرے گا، یا کم از کم اس کا دل اس خواہش سے بے چین

ہو جائیگا کہ اس برائی کو مٹا دے۔

مَن رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان	تم میں سے جو کوئی بدی کو دیکھے وہ اسے اپنے ہاتھ سے مٹا دے اور اگر ایسا نہ کر سکتا ہو تو زبان سے اور اگر یہ بھی نہ کر سکتا ہو تو دل سے اور یہ ضعیف ترین ایمان ہے۔

جس قوم کے افراد میں عام طور پر یہ صفت موجود ہوگی اس کا دین محفوظ رہے گا اور اس کا اخلاقی معیار کبھی نہ گر سکے گا کیونکہ اس کا ہر فرد دوسرے کے لیے محتسب اور نگران ہوگا اور عقیدہ و عمل کے فساد کو اس میں داخل ہونے کے لیے کوئی راہ نہ مل سکے گی۔

قرآن مجید کا مقصد دراصل ایسی ہی ایک آئیڈیل سوسائٹی بنانا ہے، جس کا ہر ہر فرد اپنے قلبی رجحان اور اپنی فطری غیرت وحیا، اور خالص اپنے ضمیر کی تحریک پر احتساب اور نگرانی کا فرض انجام دے اور کسی اجرت کے بغیر خدائی فوجدار بنا پھرے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲: ۱۷)	اور اس طرح ہم نے تم کو ایک عادل و معتدل امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر نگران رہو اور رسول تم پر نگران رہے۔

اسی لیے بار بار مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا تمہارا قومی خاصہ ہے جو ہر مومن مرد اور عورت میں متحقق ہونا چاہیے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (۳: ۱۲)	تم بہترین قوم ہو جسے لوگوں کے لیے نکالا گیا ہے تم نیکی کا حکم کرتے ہو بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۤءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۹:۹)

مومن مرد اور عورت ایک دوسرے کے مددگار ہیں نیکی کا حکم کرتے اور بدی سے روکتے ہیں۔

اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ (۹:۱۴)

وہ نیکی کا حکم کرنے والے اور بدی سے روکنے والے اور حدود الٰہی کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (۲۲:۶)

یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ہم اگر زمین میں حکومت بخشیں گے تو یہ نماز قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

اگر مسلمانوں کا یہ حال ہو تو ان کی مثال اس بستی کی سی ہوگی جس کے ہر باشندے میں صفائی اور حفظان صحت کا احساس ہو۔ وہ نہ صرف اپنے جسم اور اپنے گھر کو صاف پاک رکھے' بلکہ بستی میں جہاں کہیں غلاظت اور نجاست دیکھے اس کو دور کردے' اور کسی جگہ گندگی و کثافت کے رہنے کا روادار نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی بستی کی آب و ہوا پاک صاف رہے گی۔ اس میں امراض کے جراثیم پرورش نہ پاسکیں گے اور اگر شاذ و نادر کوئی شخص کمزور اور مریض الطبع ہوگا بھی تو اس کا ہر وقت علاج ہو جائے گا؛ یا کم از کم اس کی بیماری محض شخصی بیماری ہوگی' دوسروں تک متعدی ہو کر وبائے عام کی صورت نہ اختیار کرسکے گی۔

لیکن اگر مسلمانوں کی قوم اس بلند درجہ پر نہ رہ سکے' تو قوم کی دینی و اخلاقی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے کم از کم ایک ایسا گروہ تو ان میں ضرور موجود رہنا چاہیے جو ہر وقت اپنی خدمت پر مستعد رہے اور اعتقاد کی گندگیوں اور اخلاق و اعمال کی نجاستوں کو دور کرتا رہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ

تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو بھلائی کی طرف

يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳:۱۰۴) بلانے والی ہو نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے۔

یہ جماعت علماء اور اولی الامر کی جماعت ہے جس کا امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں منہمک رہنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا شہر کے محکمۂ صفائی وحفظان صحت کا اپنے فرائض میں مستعد رہنا ضروری ہے اگر یہ لوگ اپنے فرض سے غافل ہو جائیں اور قوم میں ایک جماعت بھی ایسی باقی نہ رہے جو خیر وصلاح کی طرف دعوت دینے والی اور منکرات سے روکنے والی ہو تو دین واخلاق کے اعتبار سے قوم کی تباہی اسی طرح یقینی ہے جس طرح جسم وجان کے اعتبار سے اس بستی کی ہلاکت یقینی ہے جس میں صفائی وحفظان صحت کا کوئی انتظام نہ ہو۔ اگلی قوموں پر جو تباہیاں نازل ہوئی ہیں وہ اسی لیے ہوئی ہیں کہ ان میں کوئی گروہ بھی ایسا باقی نہ رہا تھا جو ان کو برائیوں سے روکتا اور خیر وصلاح پر قائم رکھنے کی کوشش کرتا۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِن قَبْلِكُمْ أُولُوا — تم سے پہلے کی قوموں میں کم از کم ایسے اہل فضل ہی
بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ — کیوں نہ ہوئے جو زمین میں فساد سے روکنے والے ہوتے
إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّنْ أَنجَيْنَا مِنْهُمْ (۱۱:۱۰) — بجز چند آدمیوں کے جن کو ہم نے ان میں سے بچا کر نکال لیا
لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَن — کیوں نہ ان کے علما اور مشائخ نے ان کو بری باتیں کہنے
قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ (۹:۵) — اور حرام خوری کرنے سے باز رکھا۔

پس قوم کے علما ومشائخ اور اولی الامر کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔ وہ صرف اپنے ہی اعمال کے جواب دہ نہیں ہیں بلکہ پوری قوم کے اعمال کی جواب دہی بھی ایک بڑی حد تک ان پر عائد ہوتی ہے۔ ظالم جفا کار اور عیش پسند امراء، اور ایسے امراء کی خوشامدیں کرنے والے علماء ومشائخ کا تو خیر کہنا ہی کیا ہے، ان کا جو کچھ حشر خدا کے ہاں ہو گا اس کے ذکر کی حاجت نہیں لیکن جو امراء اور علماء ومشائخ اپنے محلوں اور اپنے گھروں اور اپنی خانقاہوں میں بیٹھے ہوئے زہد وتقویٰ اور عبادت وریاضت کی داد دیتے رہے ہیں

وہ بھی خدا کے ہاں جوابدہی سے نہیں بچ سکتے۔ کیوں کہ جب ان کی قوم پر ہر طرف سے گمراہی اور بد اخلاقی کے طوفان امڈے چلے آرہے ہوں، تو ان کا کام یہ نہیں ہے کہ گوشوں میں سر جھکائے بیٹھے رہیں، بلکہ اُن کا کام یہ ہے کہ مرد میدان بن کر نکلیں اور جو کچھ زور اور اثر اللہ نے ان کو عطا کیا ہے اس کو کام میں لاکر اس طوفان کا مقابلہ کریں۔ طوفان کو دور کر دینے کی ذمہ داری بلاشبہ ان پر نہیں، مگر اس کے مقابلہ میں اپنی پوری امکانی قوت صرف کر دینے کی ذمہ داری تو یقیناً ان پر ہے۔ اگر وہ اس میں دریغ کریں گے تو ان کی عبادت و ریاضت اور شخصی پرہیزگاری ان کو یوم الفصل کی جوابدہی سے بری نہ کر دیگی۔ آپ محکمۂ صفائی کے اس افسر کو کبھی بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے جس کا حال یہ ہو کہ شہر میں تو وبا پھیل رہی ہو اور ہزاروں آدمی ہلاک ہو رہے ہوں، مگر وہ اپنے گھر میں بیٹھا خود اپنی اور اپنے بال بچوں کی جان بچانے کی تدبیر کررہا ہو۔ عام شہری اگر ایسا کریں تو چنداں قابل اعتراض نہیں لیکن محکمۂ صفائی کا افسر ایسا کرے تو اس کے مجرم ہونے میں شک نہیں کیا جاسکتا۔

مقالات

کتب سماوی پر ایک نظر

(۱۳)
توریت و انجیل پر اسلامی رائے

از جناب ذوقی شاہ صاحب

<u>فطرت انسانی کی ایک کمزوری</u>: جہاں فطرتِ انسانی میں اور کمزوریاں واقع ہوئی ہیں وہاں ایک قابلِ افسوس کمزوری یہ بھی ہے کہ وہ ہر چیز کے غلبۂ ظاہری سے بلا امتیازِ حق و باطل مرعوب و مغلوب ہو جاتی ہے مسلمانوں کو اس کمزوری پر غالب ہونا چاہیے۔ باطل کے ظاہری اور عارضی غلبہ سے کسی مسلمان کا مرعوب ہو جانا ضعفِ ایمانی کی دلیل ہے مثلاً آج کل دہریت اور الحاد کا زور ہے اور ناتمام ناقص اور غیر مکمل سائنس کی عام طور پر لوگوں کے دل و دماغ پر حکومت ہے۔ اس دہریت اور سائنس سے متاثر ہو کر بعض ضعیف الایمان مسلمانوں نے یہ روش اختیار کر رکھی ہے کہ وہ قرآن اور حدیث کی ہر بات کو تاویل باطل کے ذریعہ سے موجودہ سائنس کے مطابق ظاہر کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح اب سے تقریباً پچاس سال قبل ہندوستان میں پادری مبلغین کی مسیحیت کا زور و شور ہوا تھا اور اس زمانے کے بعض جدت پسند اور ہر نئی چیز سے جلد متاثر ہو جانے والے اور حکمران قوم کی ہر ادا پر فریفتہ ہونے والے اور مٹ جانے والے مسلمانوں نے توریت و انجیل کا مطالعہ اور ان پر تفسیریں لکھنا اور کتابیں شائع کرنا شروع کر دیا تھا۔ انہیں

سے بعض لوگ تو علانیہ عیسائی بن کر اور پادریوں کے زمرہ میں داخل ہو کر تبلیغ عیسویت میں ان کے مددو معاون بن گئے تھے۔ اور ان میں سے بعض مسلمانوں کو یہ خبط پیدا ہو گیا تھا کہ انہوں نے مسلمانوں میں اس نوع کے خیالات کی اشاعت شروع کر دی تھی کہ مسلمانوں کے لیے موجودہ توریت و انجیل بلا واسطۂ قرآن واجب العمل ہیں اور ان کتب میں اور قرآن مجید میں بلحاظ عمل و تمسک کوئی فرق نہیں ہے۔

ان کا مقولہ تھا کہ:۔

"مسلمان ان کتابوں کو ویسا ہی پڑھیں جیسا کہ قرآن مجید کو پڑھتے ہیں اور ان واقعات و حوادث میں جو ان کو روزمرّہ پیش آتے ہیں ان کتابوں سے فتوٰی لیں اور اخذ احکام کریں جیسا کہ قرآن سے اخذ احکام کرتے ہیں۔ خصوصاً ان مسائل میں جو قرآن میں نہیں ہیں اور ان کتابوں میں موجود ہیں۔"

ان میں سے بعض حضرات قرآن پر یہ مہربانی کرتے تھے کہ ان کتابوں کے رتبہ کو قرآن کے رتبے سے کمتر مگر حدیث کے رتبہ سے بڑھکر یا اس کے برابر خیال کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ:۔

"جو حکم قرآن سے نہ ملے وہ ان کتابوں سے اخذ کیا جائے اور ان کتابوں میں نہ ملے تب کتب حدیث سے لیا جائے۔ اور کم سے کم یہ ہو کہ ان کتب کو کتب حدیث کے برابر سمجھا جائے۔"

اگرچہ دہریت کے سیلاب نے اب اُس عیسویت کو بھی بہا دیا اور اس عیسویت پسندی کا بھی نام و نشان باقی نہ رکھا تاہم ضرورت ہے کہ عام مسلمانوں کے فائدہ کی غرض سے عمل بالتوراۃ والانجیل پر مستند عا مسلک یہاں بالصراحت بیان کر دیا جائے۔

عمل بالتوراۃ والانجیل زمانہ نبوت سے لیکر اس وقت تک موجودہ توریت و انجیل وغیرہ کی نسبت اہل اسلام کا یہ اعتقاد متواتر و متوارث چلا آ رہا ہے کہ ان کتابوں کے جو احکام منجانب اللہ ہیں اور منسوخ نہیں ہوئے یا سابق امتوں کے ساتھ مخصوص نہیں، وہ امت محمدیہ کے لیے واجب العمل ہیں۔ مگر ان احکام پر مسلمانوں کا

عمل قرآن پر عمل کے ضمن میں پایا جاتا ہے کیونکہ قرآن مجید تمام کتب سابقہ کے واجب العمل احکام کا جامع ہے اور جملہ کتب منزل من اللہ اصلاً اس میں شامل ہیں۔ حقیقتاً قرآن کی تعمیل کتب ماقبل کے احکام واجب التعمیل کی بھی تعمیل ہے۔ حدیث صحیح بھی قرآن کے حکم کے تحت میں ہے گو اس میں قطعیت وظنیت کا فرق ہے اس لیے جو حکم احادیث صحیح میں وارد ہے اس کو بھی مسلمان حکم قرآنی سمجھتے ہیں اور قرآن کی طرح واجب العمل جانتے ہیں اس بنا پر شرائع سابقہ کے جو احکام احادیث میں منقول ہیں ان کی تعمیل بھی گویا قرآن ہی کی تعمیل ہے۔

مگر یہ اعتقاد متقدمین و متاخرین میں سے کسی محقق سے منقول نہیں کہ موجودہ توریت وانجیل سے اخذ احکام بلاواسطۂ قرآن واجب ہے اور قرآن کی طرح ان کتابوں سے تمسک کرنا مسلمانوں کا فرض ہے نہ عمل ان سے مروی ہے کہ ان کتابوں پر بلاواسطۂ قرآن انہوں نے اعتماد کیا ہو اور واقعات روز مرہ میں ان کتابوں سے فتویٰ لیا ہو۔

احکام کتب سابقہ تین اقسام پر تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔

(۱) وہ احکام جو قرآن و حدیث کے مطابق ہیں۔ ان کی تعمیل قرآن کی تعمیل ہے۔

(۲) وہ احکام جو قرآن و حدیث کے خلاف ہیں ان کی تعمیل کا نہ کرنا ہی مسلمانوں پر لازم ہے اس قسم کے احکام یا تو وہ ہیں جو درحقیقت کتب قدیمہ میں تھے مگر اب شریعت محمدی نے انہیں منسوخ کر دیا یا وہ ہیں جو اہل کتاب کی طرف سے اُن کتابوں میں بڑھا گھٹا دیے گئے ہیں اور تحریف و الحاق کے تحت میں آتے ہیں۔

(۳) وہ احکام یا وہ امور جن کی بابت قرآن و حدیث میں نہ کوئی تائید و موافقت پائی جاتی ہے نہ تردید و مخالفت۔ ان کی بابت مسلمانوں کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ حکم ہے کہ "مسلمانو! تم اہل کتاب کی تصدیق کرو نہ تکذیب کرو اور یہ کہو کہ ہم اس چیز پر ایمان لائے

جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ یعنی جن امور پر قرآن و حدیث ساکت ہیں ان پر یہ شرطی اور اجمالی اعتقاد مسلمانوں کے لیے کافی ہے کہ اگر وہ بات منجانب اللہ ہے تو ہم نے اسے مانا اور تسلیم کیا۔

قسم اول یعنی احکام واجب التعمیل کے متعلق علماء نے بہت کچھ بحث کی ہے۔

صحیح بخاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل منقول ہے کہ آپ نے داؤد علیہ السلام کی موافقت میں سجدہ کیا۔

سنن نسائی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول منقول ہے کہ حضرت داؤد نے توبۃً سجدہ کیا تھا۔ اور ہم اُس کے شکریہ میں سجدہ کرتے ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس سے منقول ہے کہ اُن سے کسی نے پوچھا کہ آیا سورۂ صٓ میں سجدہ ہے؟ آپ نے فرمایا بے شک اس میں سجدہ ہے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سجدہ کرتے دیکھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے نبیوں کے فعل کی پیروی پر مامور تھے۔

انہی افعال و اقوال سے علماء نے یہ مسئلہ استنباط کیا ہے کہ جو فعل یا حکم انبیائے سابقین سے قرآن میں منقول ہو اور کوئی حکم اس کا مخالف یعنی ناسخ ہماری شریعت میں وارد نہ ہو وہ حکم اہل اسلام کے لیے لائق دستاویز ہے۔

تفسیر کبیر میں امام رازی نے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے تحت میں کہ "جن لوگوں کی ہم نے ہدایت کی ہے ان کی پیروی کرو"۔ تحریر فرمایا ہے کہ:۔

"ہدایت یافتہ لوگوں سے انبیاء مراد ہیں اور ان کی پیروی کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہوا ہے۔ جن امور میں پیروی کا یہ حکم وارد ہوا ہے ان کی تعیین میں علماء کے درمیان اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ اُن سے وہ امور مراد ہیں جن میں سب انبیاء کا اتفاق ہے مثلاً توحید الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات وافعال کی

نامناسب اعتقادسے پاک رکھنا وغیرہ۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ان امور سے اخلاقِ حمیدہ
اور صفات رفیعہ و کاملہ میں پیروی مراد ہے جیسے کہ سفہاء کی ایذا پر صبر اور ان کے
ساتھ عفو بعض کا یہ قول ہے کہ اس سے ان کے جملہ احکام شریعت مراد ہیں بجز اُن
احکام کے جن کو مستثنیٰ و مخصوص کر دیا گیا ہو۔ اس قول کی رو سے یہی شریعتیں ہمارے
لیے واجب العمل ٹھیرتی ہیں؛

مگر امام قرطبی اور دیگر علماء رفے متاخرہ بالا تیسرے قول کی تفصیل میں اس نہایت ضروری
شرط پر زور دیا ہے کہ شریعت سابقین آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ذریعہ سے معلوم ہوئی ہو اور وہ امت سابقہ
کے ساتھ مخصوص یا بعد میں منسوخ نہ ہوئی ہو کتب سابقہ میں تحریف و تبدیل کے وقوع یقینی نے اس شرط کو بہت ضروری بنا دیا ہے
بعض علماء کا یہ قول ہے کہ ہمارے لیے ان شریعتوں کی پیروی واجب نہیں ہے کیونکہ اللہ
تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا (ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے
ایک ایک شریعت بنادی ہے) اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پہلی شریعتیں خاص خاص اوقات
ومقامات کے لیے مخصوص رہی ہیں اور ان اقوال خداوندی میں جن سے پیروی کا لزوم ثابت کیا جاتا
ہے مثلاً فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ اور مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ اصول اعتقادی مراد ہیں نہ فروعِ عملی
بعض علماء کا یہ قول ہے کہ وہ شریعتیں ہمارے لیے واجب العمل ہیں مگر نہ اس اعتقاد سے
کہ وہ پہلوں کی شریعتیں ہیں بلکہ اس اعتقاد سے کہ وہ اب ہمارے لیے شریعت بن گئی ہیں۔ کیونکہ
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا یعنی پھر ہم نے کتاب
کا وارث اُن لوگوں کو بنایا جن کو ہم نے چن لیا (یعنی مسلمان بنالیا) اور ظاہر ہے کہ جو چیز کسی کی وراثت
میں آتی ہے وہ اسی کی ملک ہو جاتی ہے۔ مورث سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔ لہٰذا ہم ان شریعتوں
پر اس اعتقاد سے عمل کریں گے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہی کی شریعت ہے۔ اس کی نظیر

تائید میں وہ اس قول نبوی کو بھی پیش کرتے ہیں کہ "اگر اس وقت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو وہ بھی میری ہی پیروی کرتے" علماء کا یہ گروہ پہلی شریعتوں کو جو اپنی شریعت قرار دیتا ہے تو وہ صرف اصول دینی ہی کو نہیں لیتا بلکہ پوری شریعتوں کو لیتا ہے جن میں فروع بھی شامل ہیں۔ ان میں سے جو احکام منسوخ ہو چکے ہیں اُن کی بابت یہ گروہ کہتا ہے کہ اس سے شریعت بدل نہیں گئی بلکہ ان احکام کی تعمیل کی مدت معینہ ختم ہو چکی۔

اس نوع کے اختلافات محض لفظی ہیں۔ بات ایک ہی ہے۔ صرف انداز بیان میں فرق ہے پرانی شریعتوں کو خواہ اپنا قرار دیا جائے یا انبیاء قدیم کا، مسلمانوں کے لیے واجب التعمیل وہ اُسی صورت میں ہو سکتی ہیں جبکہ وہ قرآن وحدیث کی وساطت سے پہنچیں یا قرآن وحدیث کے مطابق ہوں۔ موجودہ توریت وانجیل سے براہ راست تمسک کا نہ سلف میں کوئی قائل ہے نہ خلف میں امام رازی کے قول کو بھی مزید اطمینان کے لیے ملاحظہ فرمائیے جو انہوں نے اپنی کتاب المحصل میں اپنے اس دعوے کی تائید میں بیان کیا ہے کہ: "پچھلی کتابوں کا اتباع ہم پر واجب نہیں" :-

> "دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان شریعتوں کی (یعنی جو ان کتابوں میں پائی جاتی ہیں) پیروی کرتے تو ہر زمانے کے علماء پر یہ امر واجب قرار پاتا کہ وہ اپنے واقعات وحوادث پیش آمدہ میں ان کتابوں کی طرف مراجعت کریں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فعل کی پیروی اُن پر واجب ہے اور جب انہوں نے یقیناً ایسا نہیں کیا تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی وقوع میں نہیں آیا۔ اس سے ان کتابوں کا واجب العمل ہونا باطل ہوا۔
>
> تیسری دلیل۔ اگر وہ کتابیں ہمارے لیے لائق دستاویز ہوتیں تو ان کتابوں کو یاد کرنا

ہمارے لیے فرض کفایہ ہوتا جیسا کہ قرآن و حدیث کا یاد کرنا فرض کفایہ ہے اور
علماء باہمی اختلاف کے مواقع پر ان کتابوں کی طرف رجوع کرتے جبکہ ان کو بعض مسائل
میں اشتباہ ہوا تھا۔ مثلاً فرائض کا مسئلہ عول اور جدّہ و وزن مفوضہ (یعنی وہ عورت
جس کا مہر بوقت نکاح مقرر نہ ہوا اور اس کے شوہر نے قبل ہم بستری وفات پائی)
کی میراث اور ام ولد کی بیع اور شراب و زنا کی حد اور مخنث کی دیت اور زرخرید
کنیز عیب دار کا ہم بستری کے بعد واپس کرنا اور مباشرت بلا انزال سے غسل کا واجب
ہونا وغیر ذالک۔ اور یہ امر کسی ایک سے بھی منقول نہیں کہ انہوں نے اپنی تمام عمر میں
باوجود کثرت واقعات اور باہمی اختلافات کے توریت کی طرف رجوع کیا ہو خاص کر
اس حالت میں جب کہ یہودیوں کے علماء مسلمان ہو گئے تھے جیسے عبد اللہ بن سلام اور
کعب احبار اور وہب بن منبہ (جن کے اقوال توریت کے متعلق مستند سمجھے جاسکتے
تھے) ان کے ذریعے یہ رجوع آسان تھا۔ مگر ایسا نہ کیا اور مسائل میں انہوں نے
اپنے ہی قیاس کی طرف رجوع کیا۔ یہ بات کتاب اللہ سے مایوسی کے بعد جائز ہوتی ہے
اور مایوسی کتاب اللہ کو سیکھنے سے پہلے ہو نہیں سکتی جب انہوں نے نہ ان کتابوں کو
سیکھا نہ ان کے احکام دریافت کیے تو معلوم ہوا کہ انہوں نے ان کتابوں کو قابل
تمسک نہ سمجھا۔

چوتھی دلیل آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ کے اس قول کو کہ
"میں کتاب اللہ اور سنت میں کوئی حکم نہ پاؤں گا تو اپنے اجتہاد سے فتویٰ دونگا" پسند کیا
اگر ان کو توریت کی پیروی کا حکم تھا تو ان کا اپنے اجتہاد پر عمل کرنا جائز نہ ہوتا تاوقتیکہ توریت
وانجیل کو وہ دیکھ نہ لیتے۔ اس دلیل پر اگر یہ اعتراض ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے معاذ کو اسی صورت میں اجتہاد کی اجازت دی جبکہ کتاب اللہ میں انہیں کوئی حکم نہ ملے اور توریت بھی تو کتاب اللہ ہے۔ یا یہ اعتراض ہو کہ توریت کا صاف نام انہوں نے اس لیے نہیں لیا کہ توریت کی طرف رجوع کرنے کا حکم قرآن میں آچکا ہے۔ لہٰذا قرآن کی طرف رجوع کرنا خود توریت کی طرف رجوع دلاتا ہے۔ تو پہلے اعتراض کا ایک جواب تو یہ ہے کہ (مسلمانوں میں) جب لفظ کتاب اللہ بے قید بولا جاتا ہے تو اس سے قرآن مراد ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سے توریت و انجیل بلا دلیل مراد نہیں ہو سکتیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت معاذ بن جبل سے کہیں ثابت نہیں ہوا کہ انہوں نے توریت و انجیل کو سیکھا یا ان کے محرف وغیر محرف احکام میں تمیز کی ہو۔ جیسا کہ قرآن کا پڑھنا اور سیکھنا اُن سے بخوبی ثابت ہے۔ دوسرے اعتراض کا جواب بھی ادا ہو گیا کہ موجودہ توریت و انجیل کی طرف ہر بات میں رجوع کرنے کا قرآن میں حکم ہوتا تو حضرت معاذ ان کتابوں کو پڑھتے اور سیکھتے اور ان کی طرف کبھی تو رجوع کرتے۔"

اس بارہ میں جن لوگوں نے غلطی کھائی ہے انھوں نے غالباً ان آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے سمجھنے میں غلطی کی ہے جن میں بطور اجمال ان کتابوں کو نور و ہدایت کہا گیا ہے اور بعض مواقع خاص میں ان کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن حق بات یہ ہے کہ ان آیات و احادیث میں توریت و انجیل کی ہر بات کو ہدایت و نور نہیں کہا گیا۔ اور نہ ہر موقع و محل میں ان کتابوں کی طرف رجوع کرنے کا خدا اور رسول نے حکم دیا ہے۔ بلکہ ان کو بالاجمال ہدایت کہنے سے انہیں باتوں کا ہدایت ہونا مقصود ہے جن کا منجانب اللہ محفوظ و واجب العمل ہونا بشہادت قرآن و حدیث ثابت ہے اور انہیں مواقع خاص میں ان کتابوں کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے جن میں اہل کتاب کے تصرف و دخل نہیں ہونے پایا۔ کوئی مسلمان اس بات کو نہیں مان سکتا کہ موجودہ توریت و انجیل میں جو کچھ لکھا ہے

سب سچ ہے۔ مثلاً کوئی مسلمان اس بات کے ماننے کے لئے تیار نہیں کہ لوط علیہ السلام نے اپنی بیٹیوں کے ساتھ اور داؤد علیہ السلام نے اوریا کی جورو کے ساتھ (نعوذ باللہ) زنا کیا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام معاذ اللہ) خدا کے بیٹے یا خود خدا یا تین خداؤں کی کمیٹی کے ممبر تھے اور باوجود اس کے گنہگاروں کے بدلے معذب ہوئے۔ اللہ و رسول اس سے بری ہیں کہ مسلمانوں کو ان لغو اور بیہودہ باتوں پر ایمان لانیکا حکم دیں۔ بلکہ اللہ و رسول نے ان کتابوں کی بہت سی باتوں کو رد کر دیا ہے اور انکو کفر و ضلالت قرار دیا ہے مزید تفصیل و تشریح میں طوالت ہے اس لیے مندرجہ بالا اجمال ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

خلاصہ ان مضامین سے یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی ہوگی کہ مسلمانوں نے جتنا احترام انبیاء سابقین اور کتب منزل من اللہ کا کیا ہے اُتنا خود ان لوگوں سے بھی نہ ہوسکا جو ان انبیاء کی امت میں اپنے کو شامل کرتے ہیں۔

محققین اہل کتاب نے جو کچھ اپنی تحقیقات سے ان کتابوں کی بابت لکھا ہے اس کی ایک مختصر سی جھلک مضامین سابقہ میں دکھلائی گئی ہے۔ اس سے ہر صحیح الدماغ شخص ان ہی نتائج پر آسکتا ہے کہ ان محققین کی تحقیقات کے بموجب :-

(۱) موجودہ توریت و انجیل از اول تا بہ آخر بالکل قابل اعتبار نہیں۔

(۲) ان کے مصنفین و مؤلفین کا کچھ ٹھیک نہیں اور زمانۂ تصنیف و تالیف کا بھی کوئی صحیح تعین نہیں۔

(۳) ان مصنفین و مؤلفین کی اصلی عبارتیں بھی محفوظ نہیں رہیں۔

(۴) ان کتابوں پر اغیار کے بھی حملے ہوتے رہے ہیں اور "احباب" کے بھی جن کی وجہ سے اصلی اور ابتدائی نسخے مفقود ہو چکے ہیں اور اب جو قدیم نقلیں پائی جاتی ہیں ان کے چھٹی یا ساتویں صدی عیسوی سے قدیم تر ہونے پر عیسائی بھی متفق نہیں۔ پھر یہ نسخے بھی باہم مختلف

ہیں اور اختلافات کی تعداد بقول اہل کتاب ہی کے لاکھوں تک پہنچی ہے۔ یہ سب قراءت یا کتابت ہی کے اختلاف نہیں بلکہ اہم اور اصولی امور میں بھی شدید اختلافات واقع ہوگئے ہیں جن کا دور کرنا اصلی نسخوں کے فقدان کی وجہ سے اب محال ہے۔ ان اختلافات نے ان بنیادی اصولوں ہی کو بدل ڈالا جن پر اصولاً مذاہب حقہ کی بنیاد ہوا کرتی ہے۔

(۵) آجکل ان کتابوں کے ترجموں ہی سے سابقہ رہتا ہے اور ان ترجموں میں بھی بکثرت غلطیاں ہیں جن کی اصلاح اب بوجہ اصل کے ضائع ہو جانے کے ناممکن ہوگئی ہے۔

(۶) ان جملہ تغیرات کی بنا پر موجودہ توریت و انجیل کو وہ توریت و انجیل نہیں کہہ سکتے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائیں۔

باوجود ان تمام خرابیوں کے جن کے اعتراف پر علماء اہل کتاب مجبور ہیں مسلمان علماء اس درجہ احتیاط سے کام لے رہے ہیں کہ وہ متفقہ طور پر یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ:-

(۱) توریت و انجیل کو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام پر جو اللہ کے پیغمبر تھے نازل فرمایا۔

(۲) موجودہ توریت و انجیل میں جتنا حصہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اس پر ہم ایمان لائے اور اس کا سچا ہونا ہم تسلیم کرتے ہیں۔

(۳) ان میں جو کچھ قرآن و حدیث کے خلاف ہے ان کو بشہادت قرآن و حدیث ہم الحاقی سمجھتے ہیں۔ اور جن عبارتوں سے اللہ تعالیٰ کی توہین لازم آتی ہے یا انبیاء علیہم السلام کی بے احترامی پائی جاتی ہے یا ادیان حقہ کے بنیادی اصولوں میں تبدیلی واقع ہوجاتی ہے ان کو ہم توریت و انجیل سے خارج سمجھتے ہیں۔

(۴) ان کتابوں کی وہ باتیں جن پر قرآن و حدیث ساکت ہیں ہمارے لیے بھی سکوت

کا مطالبہ کرتی ہیں اس لیے ہم اُن کی نہ تصدیق کرتے ہیں نہ تکذیب۔

گویا عیسائی تحقیقات پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ہماری کتابوں کی ایک بات بھی نہ مانو۔ مگر اسلامی حق پسندی کہتی ہے کہ نہیں۔ ایسا نہ ہوگا۔ ان کتابوں میں جو باتیں قابل قبول ہیں انہیں ہم قبول کرتے ہیں اور جو باتیں قابل قبول نہیں ان سے ہم کنارہ کرتے ہیں۔

(باقی)

اہل کتاب اور ایمان بالرسالت

(۲)

(از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز بی اے ہوم ڈپارٹمنٹ نئی دہلی)

حقیقت یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت اہل کتاب کے معتقدات میں ایسی باتیں آچکی تھیں کہ ان میں اور دیگر کفار و مشرکین میں کوئی فرق ہی نہ رہا تھا۔ آج اپنے زمانے میں ہی دیکھیے۔ جو جو اقوام اپنے آپکو حامل کتاب و شریعت سمجھتی ہیں بنیادی عقائد میں بھی، ایمان باللہ و یوم آخر کی نسبت ان میں ایسے اصول پائے جاتے ہیں جو کسی صورت میں بھی قرآنی تعلیم کے مطابق نہیں۔ بلکہ صریحًا انہی لوگوں سے ملتے ہیں جنھیں قرآن کافر و مشرک قرار دیتا ہے۔ انبیاء کرام کو ابناء اللہ بنا دینا، یا انہیں اوتار یعنی عین خدا سمجھنا، ان کے مجسموں کی پرستش کرنا، اعتقاد آخرت میں مکافات عمل کے بجائے کفارہ کے عقیدہ کو اصل دین قرار دینا، یا یہ کہدینا کہ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ، اور بلا عمل جنت کے اجارہ دار بن بیٹھنا، قطعًا دین فطرت کی تعلیم نہیں قرار دیجا سکتی۔ اس لیے ایمان کتب و رسل تو ایک طرف، جہانتک ایمان باللہ و یوم الآخر کا تعلق ہے، اہل کتاب اور کفار میں کوئی فرق ہی نہ رہا تھا۔ اور نہ ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۖ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا (۴: ۸)

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ ملا ہے۔ وہ بتوں اور شیطان کو مانتے ہیں اور کفار کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ لوگ بہ نسبت مسلمانوں کے زیادہ راہ راست پر ہیں۔ یہ لوگ وہ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے اور جس کو خدا ملعون بنا دے اس کا تم کوئی حامی نہ پاؤ گے

دوسری جگہ ہے :-

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۖ وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۖ إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ ۖ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۚ وَإِنْ لَمْ يَنْتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۵:۱۰)

بیشک وہ لوگ کافر ہو چکے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے۔ حالانکہ مسیح نے خود کہا ہے کہ اے بنی اسرائیل تم اللہ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ بیشک جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیگا سو اس پر اللہ تعالیٰ نے جنت کو حرام کر دیگا۔ اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ بلاشبہ وہ لوگ بھی کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تین میں کا ایک ہے۔ حالانکہ بجز ایک معبود کے اور کوئی معبود نہیں اور اگر یہ لوگ اپنے معتقدات سے باز نہیں آئیں گے تو جو ان میں سے کافر رہیں گے ان پر دردناک عذاب واقع ہو گا۔

اب ظاہر ہے کہ نصاریٰ الوہیت مسیح اور تثلیث کو تو جزو دین (بلکہ اصل دین) سمجھتے ہیں اور جو اناجیل ان کے پاس موجود ہیں ان میں یہ عقیدہ اس طرح داخل ہو چکا ہے کہ گویا وہ من جانب اللہ ہے۔ اب ان عقائد سے ان کے باز آنے کی کیا صورت ہے؟ قرآن کا دعویٰ ہے کہ یہ مسیحؑ کی تعلیم نہیں ہے، الحاق ہے تلبیس ہے۔ اب اصل تعلیم وہ کہاں سے لائیں۔ ان عقائد کی اصلاح کس طرح کریں۔ تا وقتیکہ وہ اپنی کتابوں کو صرف ان کر ان کو چھوڑ نہ دیں ان عقائد سے کس طرح منہ موڑ سکتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کے لیے قرآن کریم انہیں تجدید ایمان کی دعوت دیتا ہے۔ صرف نصاریٰ ہی نہیں، دوسری جگہ یہود و نصاریٰ ہر دو کے متعلق ہے :-

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ۖ ذَٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا

یہود کہتے ہیں کہ عزیر ابن اللہ ہے۔ نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے۔ یہ ان کے منہ کی بنائی ہوئی باتیں ہیں۔ یہ لوگ بھی ان لوگوں کی سی باتیں کرنے لگ گئے جو ان سے پہلے کافر

مِّن قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۹: ۵) ۔ ہو چکے ہیں خدا ان کو غارت کرے، یہ کدھر الٹے جا رہے ہیں۔

فرمائیے کہ اللہ پر ایمان کے بارے میں کفار اور ان اہل کتاب میں کیا فرق ہے۔ قرآن خود شہادت دے رہا ہے کہ یہ انہی لوگوں کے سے معتقدات ہیں جو کافر ہو چکے ہیں۔ اندریں حالت قرآن کس طرح سے ان کے اس ایمان کو صحیح ایمان تسلیم کرے۔

اللہ اور آخرت پر ایمان کو جس صورت میں انہوں نے مسخ کیا تھا اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ خدا کا خوف ان کے دل سے اٹھ جاتا اور وہ بداعمالیوں میں الجھ کے رہ جاتے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا تھی کہ مسلمانوں کی توجہ خاص طور پر ان کی اس حالت کی طرف منعطف کرائی گئی ہے۔ فرمایا۔

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۔ (۲: ۵)

کیا ایمان والوں کے لیے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی نصیحت کے اور جو حق کے ساتھ نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان سے قبل کتاب ملی تھی۔ پھر ان پر زمانہ گذر گیا۔ اور ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔

صحیح تعلیم کے فقدان کی وجہ سے ان کے عقائد میں تبدیلی ہوئی۔ اور یہ مسلم ہے کہ جب کسی قوم کے عقائد ہی بگڑ جائیں تو اعمال صالح کیسے رہ سکتے ہیں۔ عقائد و اعمال کی اسی اصلاح کے لیے قرآن کریم نازل ہوا چونکہ اہل کتاب گویا اسی برادری کے افراد تھے، ان کے پاس یہ روشنی پہلے پہنچ چکی تھی۔ ان کے پاس کتابوں میں اس آنے والے رسول کا ذکر موجود تھا۔ اس لیے بمقابلہ کفار و مشرکین کے جن کے کان اس صوت سرمدی سے غیر مانوس اور جن کی آنکھیں نور ایزدی سے نا آشنا تھیں اہل کتاب کو جلدی حق قبول کر لینا چاہیے تھا لیکن تعجب کہ انہوں نے ان سے بھی زیادہ مخالفت کی چنانچہ قرآن کریم نے اسی ظلم کی طرف انکو توجہ دلائی ہے۔ فرمایا۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ اور ایمان لاؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے، جو تصدیق

وَلَا تَکُوْنُوْا اَوَّلَ کَافِرٍۭ بِہٖ۔ (۲:۵) کرتی ہے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے (یعنی توریت کی) اور تم سب سے پہلے اس سے انکار نہ کرو۔

دوسری جگہ یہی دعوت سختی کے ساتھ دی ہے کہ اہل کتاب کا قرآن سے انکار سراسر ضد اور نفسانیت پر مبنی ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْھًا فَنَرُدَّھَا عَلٰٓی اَدْبَارِھَآ اَوْ نَلْعَنَھُمْ کَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ۔ وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ مَفْعُوْلًا۔ (۴:۷)

اے اہل کتاب اس کتاب پر ایمان لاؤ جس کو ہم نے نازل کیا ہے جو تصدیق کرتی ہے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے قبل اس کے کہ ہم چہروں کو مسخ کر دیں۔ اور ان کو انکی جانب کے دیں یا ان پر ہم ایسی لعنت کریں جیسی اہل سبت پر لعنت کی تھی اور اللہ کا حکم پورا ہو کر ہی رہتا ہے۔

سورۂ مائدہ، رکوع ۹ میں ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَھْلَ الْکِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَکَفَّرْنَا عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ وَلَاَدْخَلْنٰھُمْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ

اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ضرور ان کی برائیاں معاف کر دیتے اور ضرور انکو جنت کے باغوں میں داخل کرتے۔

ایک دفعہ پھر یہ پیش نظر رکھیے کہ اس ایمان کے معنی محض مان لینے کے ہی نہیں بلکہ رسول اللہ کے فیصلے کو ہر معاملے میں قول ناطق تسلیم کرنے کا نام ایمان ہے۔ یعنی اتباع رسولؐ کے بغیر ایمان حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (۴:۹)

قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایماندار نہیں ہو سکتے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ کو حکم مان لیں پھر آپ جو فیصلہ کریں اس کے خلاف اپنے دلوں میں ذرا بھی خلش نہ محسوس کریں۔ اور پورے طور پر تسلیم کر لیں۔

اور رسول اللہ سے فرمایا کہ ان لوگوں کے فیصلے قرآن کے مطابق کیا کریں، اس لیے کہ قرآن کے اندر وہ تمام صداقتیں موجود ہیں۔ جو پہلی کتابوں میں آتی رہیں اور جو اب اہل کتاب کے پاس موجود نہیں ہیں۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۔ (۵:۷)

اور ہم نے آپ کے پاس یہ کتاب بھیجی ہے جو خود بھی حق ہے اور جو اس سے پہلے کتابیں آچکی ہیں ان کی تصدیق کرتی ہے۔ اور ان کتابوں کی محافظ ہے آپ ان کے باہمی معاملات میں اس بھیجی ہوئی کتاب کے مطابق فیصلہ کیا کریں اور یہ جو حق کتاب آپ کو ملی ہے اس سے دور ہو کر ان کی خواہشوں پر عملدرآمد نہ کیجیے۔

یہی نہیں بلکہ مسلمانوں سے فرمایا کہ دیکھنا کسی معاملہ میں اہل کتاب کا اتباع نہ کرنا۔ اس اتباع کے معنی یہ ہوں گے کہ تم حق کو چھوڑ کر باطل کے پیچھے لگ جاؤ گے۔ اور یہی کفر ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ۔ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔ (۳:۱۱)

اے ایمان والو! اگر تم اہل کتاب کے کسی ایک فرقہ کا بھی کہنا مانو گے تو وہ لوگ تمہیں تمہارے ایمان لائے پیچھے کافر بنا دیں گے اور تم کفر کیسے کر سکتے ہو حالانکہ تم کو اللہ کے احکام سنائے جاتے ہیں اور تم میں اللہ کے رسول موجود ہیں اور جو شخص اللہ کو مضبوط پکڑتا ہے تو وہ ضرور راہ راست کی طرف ہدایت کیا جاتا ہے۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ اہل کتاب سے ایمان کا مطالبہ ہے ایسے ایمان کا کہ جس میں اتباع رسول و قرآن ضروری ہے ان کے معاملات کا فیصلہ از روی قرآن کیا جانا ضروری ہے یعنی شریعت قرآنی کی پابندی ان پر لازمی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کے کفر میں کوئی شک نہیں۔ بلکہ ان کا کفر متعدی ہے اور مسلمانوں کو ان کے ہر ایک گروہ کے اتباع سے منع کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ مسلمانوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی سچی سچی تعلیمات، اور ان تعلیمات کے معلم موجود ہیں، اور اہل کتاب کے پاس نہ ان کی اصل تعلیم موجود ہے نہ پیغمبر کہ ان کی غلطیوں کی اصلاح کر دے۔

ان کی تلبیس و تحریف کو ظاہر کر دے سمجھ میں نہیں آتا کہ ان آیات بینات کی موجودگی میں اہل کتاب کے بے ایمان نہ لانے کی کونسی دلیل پیش کی جا سکتی ہے قرآن نے تو مسلمانوں کو ان کی دوستی سے بھی منع فرمایا ہے کہ قلبی تعلقات سے بھی عقائد پر بڑا اثر پڑا کرتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ	اے ایمان والو تم یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بنانا۔ وہ
وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَاۗءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ	ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ
بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ	دوستی کریگا وہ انہی میں سے ہوگا۔ بیشک اللہ تعالیٰ ظالمین
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۵:۵۱)	کو راہ ہدایت نہیں دکھاتا۔

یہی نہیں بلکہ جن حالات کے تحت کفار و مشرکین سے جہاد و قتال کا حکم ہے ان میں اہل کتاب سے بھی قتال کا حکم ہے۔ فرمایا۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ	اہل کتاب جو نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں نہ روز آخرت پر اور
وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ	ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو خدا اور رسول نے حرام ٹھہرایا
دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى	ہے، اور نہ سچے دین کو ہی قبول کرتے ہیں، ان سے یہاں تک
يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (۹:۲۹)	لڑو کہ وہ ماتحت ہو کر جزیہ دینا قبول کریں۔

اس آیت سے حسب ذیل اہم نتائج مستخرج ہوتے ہیں۔

(۱) اہل کتاب کے ایمان باللہ و یوم الآخر کو ایمان تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس لیے کہ جیسا ہم پہلے عرض کر چکے ہیں ایمان سے مقصود صرف یہی نہیں کہ محض ہستی باری تعالیٰ، یا آخرت کے وقوع کے امکان کو ہی تسلیم کر لیا جائے۔ بلکہ صحیح ایمان یہ ہے کہ ذات و صفات باری تعالیٰ کے متعلق ایسا تصور قائم کیا جائے جو ہر قسم کے شرک خفی و جلی سے منزہ ہو اور حقیقت یہ ہے کہ باری تعالیٰ کا تصور جس رفعت و تقدس کے ساتھ قرآن کریم نے متعین فرمایا ہے ایسا اور کہیں نہیں ملتا۔ اس لئے اس تصور کے علاوہ جس قسم کا بھی تصور ہوگا، ایمان نہیں کہلایا جا سکتا، ورنہ اگر محض خدا کو

ہستی کے ماننے کا نام ہی ایمان ہو تو دنیا میں سوائے چند دھریوں کے جو خدا کی ہستی ہی کے منکر ہیں کافر تو کہیں ملتا ہی نہیں۔ اسی طرح اگر ایمان آخرت سے مراد ایک دوسری زندگی کے وقوع کا امکان ہی ہو تو سوائے مغرب کے مادیین کے اور کوئی اس کا منکر بھی نہیں ملیگا۔ آخرت کا ایمان بھی انہی خطوط کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیے جو قرآن کریم نے مقرر فرمائی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل کتاب کے ایمان باللہ و آخرت کو قرآن نے ایمان تسلیم نہیں کیا

(۱) ایمان باللہ و آخرت کے ساتھ ہی ساتھ شریعت اسلامی یعنی خدا و رسول کی تحریم و تحلیل پر کاربند ہونا بھی اہل کتاب کے لیے ضروری ہے۔

۲- ان پیروں کو اپنے طور پر صحیح تسلیم کر لینا ہی کافی نہیں بلکہ دین الحق (سچے دین) کو قبول کرنا بھی لازمی ہے

ان تصریحات کو سامنے رکھ کر دیکھیے کہ قرآن کریم کی رو سے اہل کتاب کے لیے ایمان لانا، دائرہ اسلام میں داخل ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کفار و اہل کتاب میں کچھ فرق ہی نہیں سمجھتا، سوائے اس کے کہ چند معاشرتی آئین میں انھیں دیگر کفار پر ذرا سی ترجیح دی گئی ہے، یعنی ان کے ہاں کا کھانا جائز ہے اور ان کی پاک دامن عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت ہے اور یہ اس لیے کہ۔

گو واں نہیں، پہ واں سے نکالے ہوئے تو ہیں۔

کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

ان توضیحات کے بعد اب ہم ان آیات کو لیتے ہیں جن سے اہل کتاب کے ایمان کے حق میں استدلال لایا جاتا ہے۔ گزشتہ دو ایک سال میں جتنے اعتراضات نظر سے گزرے ہیں ان میں تین چار آیات مشترک دکھائی دی ہیں۔ انہی آیات کو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے اس آیت سے استدلال لایا جاتا ہے۔

قُلْ يَآ أَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ (اے رسول) اہل کتاب سے کہدیجیے کہ آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے۔ یہ کہ ہم بجز اللہ کے

شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ (۳: ۷)

کسی اور کی عبادت نہ کریں۔ اور اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو رب نہ قرار دے۔ اللہ کو چھوڑ کر۔ پھر یہ لوگ اعراض کریں تو کہہ دیجیے کہ تم گواہ رہو ہم تو ماننے والے ہیں۔

اس سے نتیجہ یہ نکالا جاتا ہے کہ اہل کتاب سے صرف عقیدۂ توحید کا مطالبہ ہے، ایمان بالرسالت کا نہیں ہے یعنی اگر وہ شرک کو چھوڑ دیں، تو قرآن انہیں پھر کسی اور چیز کی دعوت نہیں دیتا، اور ان سے مزید تعرض نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم سے استنباط نتائج کے صحیح اصول کو نظر انداز کر دینے سے ہم اس قسم کی الجھنوں میں پڑ جاتے ہیں۔ قرآن کریم سے صحیح مفہوم اخذ کرنے کے لیے ہمیشہ اس اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جہاں تک ہمیں نص قرآنی لے جاتی ہو، صرف وہیں تک چلیں، اس کے بعد اپنے ذہن سے قیاس آرائیاں شروع کر کے مزید نتائج اخذ کرتے نہ چلے جائیں۔ بلکہ اس سے آگے بڑھنے کے لیے بھی قرآن کریم سے ہی استشارہ کریں۔ پھر معاملہ صاف ہو جائیگا۔ آیت محولہ صدر میں اہل کتاب کو عقیدہ توحید کی دعوت دی گئی ہے۔ یہاں تک تو قرآن کریم نے بیان فرمایا۔ اب اس کے بعد ہمارے ذہن نے اضافہ شروع کر دیا کہ "لہذا" اس سے ثابت ہوا کہ اہل کتاب سے اس کے سوا اور کوئی مطالبہ ہی نہیں۔ یہ "لہذا" میں آکر انسان قرآن سے دور پڑ جاتا ہے۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ اگر کسی دوسرے مقام پر ان "لہذا" کے خلاف کوئی آیت موجود ہوتی ہے، تو یا تو اسے موڑ توڑ کر اس پر منطبق کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور اگر اس میں ناکامی ہوتی ہے تو قرآن میں تضاد کا شبہ ہونے لگ جاتا ہے۔ حالانکہ جس چیز کو وہ قرآن کا تضاد سمجھتے ہیں، وہ در اصل قرآن کا تضاد نہیں، بلکہ قرآن کا ان کے "لہذا" سے تضاد ہوتا ہے۔ یہی بنیادی غلطی آیت مذکورہ کے اخذ مفہوم میں ہوتی ہے۔ بات قاعدے کی یہی ہے کہ جب بھی مخاطب سے بحث و مناظرہ، یا دعوت و تبلیغ کا موقع ہوتا ہے، تو سب سے پہلے امور مشترکہ فیما بین کو طے کر کے الگ رکھ لیا جاتا ہے اور اس کے بعد امور متنازع فیہ کی بابت ذکر شروع ہوتا ہے۔ اس آیت میں تبلیغ و دعوت کا یہی پہلا درجہ دکھلایا گیا ہے جس میں شرک یعنی عقیدہ توحید کو سب سے پہلے طے کر دینے کی

دعوت دی گئی ہے۔اس کے بعد معاملہ آگے بڑھے گا، جو قرآن کے اسلوب کے مطابق دوسرے مقامات سے مکمل ہوگا معترضین تمام بحث کا خاتمہ اسی پہلے درجہ میں کر دیتے ہیں، اور اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ بس اہل کتاب سے اس کلمہ کو ماننے کا مطالبہ ہی باقی نہیں رہتا۔ذہن میں اس نتیجہ کو راسخ کر لینے کے بعد اب سینکڑوں دوسری آیات جن سے اہل کتاب سے ایمان بالرسالت کا مطالبہ صاف صاف پایا جاتا ہے، الٹی سیدھی تاویلات کا تختۂ مشق بنائی جاتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر استنباط نتائج کا یہی اصول صحیح ہو جو انہوں نے قائم کر رکھا ہے تو فرمائیے کہ سورۂ کافرون سے وہ کیا نتیجہ اخذ کریں گے جس میں مذکور ہے کہ:۔

قُلْ يَاأَيُّهَا الْكَافِرُونَ۔ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ۔ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَا عَبَدْتُمْ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ۔ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ۔

کہہ دیجیے کہ اے کافرو! نہ تو میں تمہارے معبودوں کی پرستش کرنے والا ہوں اور نہ تم میرے معبود کی عبادت کرنے والے ہو نہ میں تمہارے معبودوں کی عبادت کرنے والا ہوں نہ تم میرے معبود کی۔ تمہارے اعمال کی جزا تمہارے لیے میرے کی میرے لیے

ان اصول استنباط کے مطابق تو اس آیت سے ظاہر ہے کہ کفار سے کسی چیز کا مطالبہ ہی نہیں کیا گیا ان سے صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ جن معبودان باطل کی تم پرستش کر رہے ہو، کرتے رہو، نہ میں ان کی پرستش کرنے لگوں، نہ تم ان کو چھوڑ کر میرے خدا کی عبادت کرنے پر رضامند ہو، لہٰذا تم اپنے حال راضی ہم اپنے حال خوش۔ اللہ اللہ خیر صلاح لیکن ظاہر ہے کہ یہ نتیجہ کسی صورت میں بھی صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے بعد تو نہ صرف نزول قرآن و بعثت نبی اکرمؐ ہی بے معنی ہو جاتی ہے، بلکہ قرآن بنیادی طور پر ہی متضاد صورتوں کو پیش کرنے والا نظر آنے لگ جاتا ہے۔صحیح نتیجہ اخذ کرنے کے لیے وہی اصول صحیح ہے جو اوپر گذارش کیا گیا ہے۔اس سورت میں کفار سے قطع تعلق کا اعلان ہے۔اس کے بعد ان سے کیا طرز عمل اختیار کیا جائے گا؟ اس کی بابت آپ کو یہیں نہیں لہٰذا آپ کو بلکہ قرآن کے دوسرے مقامات سے دریافت کرنا ہوگا۔اسی طرح اہل کتاب والی آیت میں ان سے صرف قدر مشترک کو طے کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔اس کے بعد کیا مطالبہ ہے؟ اس کے متعلق قرآن کریم سے ہی استصواب

کرنا چاہئے۔ اور یوں بھی دیکھا جائے تو یہ پہلا مطالبہ ہی اتنا اہم ہے کہ اگر وہ اسے تسلیم کریں تو پھر انکی عیسائیت اور یہودیت میں باقی ہی کیا رہ جاتا ہے۔ ان کو تو پہلے چھوڑنا ہوگا جب کہیں قرآن کا مطالبۂ توحید پورا ہوسکیگا۔

اب اس آیت کو لیجیے۔

لَيْسُوْا سَوَاءً۔ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَائِمَةٌ	سب اہل کتاب کا حال یکساں نہیں۔ اہل کتاب میں ایک
يَّتْلُوْنَ اٰيَاتِ اللّٰهِ اٰنَاءَ الَّيْلِ وَهُمْ	جماعت ایسی بھی ہے جو کھڑی رہتی ہے اور اللہ کی آیات
يَسْجُدُوْنَ۔ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ	راتوں میں تلاوت کرتی اور سجدے کرتی ہے یہ لوگ اللہ
الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ	پر اور قیامت والے دن پر ایمان بھی رکھتے ہیں، نیک کام
عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ	کرنے کا حکم کرتے ہیں، اور برائیوں سے روکتے ہیں اور نیک
اُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ وَمَا يَفْعَلُوْا	کاموں میں دوڑکر (جاتے ہیں) یہ لوگ صالحین میں سے ہیں
مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ	اور جو نیک کام یہ کرتے ہیں، اس (کی جزا) سے محروم نہ کیے
بِالْمُتَّقِيْنَ۔ (۳: ۱۲)	جائیں گے اور اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔

اس آیت کے دو ٹکڑے زیر بحث ہیں (يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ یعنی وہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں)۔ اور وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ (کہ وہ جو نیک کام کرتے ہیں، ان کے اجر سے محروم نہ رکھے جائیں گے)۔ اس سے نتیجہ یہ نکالا جاتا ہے کہ اہل کتاب میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جن کے ایمان کو قرآن تسلیم کرتا ہے، اور ان کے اعمال کو کفار کے اعمال کی طرح باطل قرار نہیں دیتا، بلکہ ان کی جزا کا وعدہ کرتا ہے۔ یہ نتائج بوجوہ غلط ہیں۔ سیاق کلام یوں چلا آتا ہے کہ اہل کتاب نے آج سے نہیں کچھ شروع ہی سے ایسا رویہ اختیار کر رکھا ہے کہ جب بھی اللہ کی آیات ان کے پاس آتی ہیں تو یہ ان سے انکار کر دیتے ہیں۔ (يَكْفُرُوْنَ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ) اور جو نبی آتا ہے یہ اس کے قتل کے درپے ہو جاتے ہیں (يَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ الْحَقِّ) لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ کلیہ نہیں۔ بلکہ اس میں مستثنیات بھی ہیں۔ انہی میں سے وہ لوگ بھی ہیں کہ جب

اللہ کی آیات ان کے پاس پہنچتی ہیں تو وہ ان سے انکار نہیں کرتے بلکہ انکو قبول کر لیتے ہیں، ان پر ایمان لے آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن کے بعد یہود و نصاریٰ اپنے اپنے ہاں کی مذہبی تعلیم سے تو انکار کرتے ہی نہ تھے۔ وہ تو سب اس کو مانتے تھے۔ اب اس تکفیر کرنے والی جماعت کے بعد جس جماعت کا ذکر آیا ہے، جو تمیز ہے، وہ ایسی جماعت ہے جو اس پیغام خداوندی کی تکفیر نہیں کرتی، بلکہ اس پر ایمان لے آتی ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جو اہل کتاب میں سے مسلمان ہو چکی ہے۔ انہی کے ایمان کو ایمان باللہ و الآخرۃ کہا گیا ہے اور اس ایمان کی بدولت ان کے اعمال کو حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ (ان کے اعمال غارت ہو گئے) سے مستثنیٰ کر دیا ہے (۳:۹۱) اس لیے کہ ہم نے میں دیکھا ہے کہ تمام اہل کتاب کے متعلق یہ موجود ہے کہ۔ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (یہ لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے) اس لئے کہ۔ وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ (یہ سچے دین کو قبول نہیں کرتے)۔ تو جن اہل کتاب کے متعلق اتنا واضح طور پر یہ کہدیا گیا ہو انہی کے متعلق یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں ان جماعت سے لامحالہ وہی جماعت مقصود ہے جو ایمان لا کر حلقۂ اسلام میں داخل ہو چکی تھی ہمارے اس دعوے کی دلیل اسی سورۂ آل عمران کے آخر میں موجود ہے۔

وَاِنَّ مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ لَمَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْھِمْ خٰشِعِیْنَ لِلّٰہِ لَا یَشْتَرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ثَمَنًا قَلِیْلًا۔ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ (۳:۲۰)

اور یقیناً اہل کتاب میں سے ایسے بھی ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور جو کتابیں ان کے پاس بھیجی گئی تھیں۔ اللہ سے ڈرتے ہوئے اللہ کی آیات کو تھوڑی سی قیمت پر نہیں بیچ دیتے ایسے لوگوں کا اجر ان کا اللہ کے ہاں سے ضرور ملیگا! اور اللہ جلد حساب کرنے والا ہے۔

اہل کتاب کی اسی جماعت کا ذکر ہے۔ اللہ کے ایمان کے ساتھ۔ قرآن کریم کے ایمان کی بھی تصریح ہے اور اُولٰٓئِکَ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ، اس وَمَا یَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلَنْ یُّکْفَرُوْہُ کی تفسیر ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن کریم پر ایمان لانے والی جماعت مسلمان اہل کتاب کی ہی جماعت تھی۔

پھر یہ بھی غور طلب ہے کہ جس جماعت کا ذکر آل عمران کے رکوع ۱۲ میں کیا گیا ہے کا فرض منصبی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی بتایا گیا ہے۔ اور یہ فریضہ صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص کیا گیا ہے جیسا کہ کئی ایک مقامات سے ظاہر ہے۔ مثلاً دو تین آیات پہلے مذکور ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللهِ۔

مسلمانو! تم بہترین امت ہو جو تمام انسانوں کے لئے علیحدہ کی گئی ہے تاکہ تم نیک کاموں کا حکم کرو۔ اور برے کاموں سے روکو۔ اور خدا پر ایمان رکھو۔

اور اس کے ساتھ ہے کہ:-

وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ

اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لے آتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا ان میں سے کچھ تو ایمان لے آئے ہیں۔ اور اکثر فاسق ہیں

اب ظاہر ہے کہ (۳ : ۱۲) میں جس جماعت کا ذکر ہے کہ ان کا منصب ہدایت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے وہ مسلمانوں کی ہی جماعت ہو سکتی ہے یا غیر مسلم اہل کتاب کی؟ پھر ان آیات کے آخر میں ہے وَاللهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ۔ اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔ اور متقین کی تعریف شروع قرآن کریم میں گذر چکی ہے کہ:-

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ

اور جو لوگ کہ ایمان لاتے ہیں اس کتاب پر جو تم پر نازل کی گئی ہے۔ اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے آ چکی ہیں اور وہ آخرت پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔

اب بھی اگر شبہ باقی رہ جائے تو شرح صدر کرنے والی تو خدا کی ہی ذات ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ:-

وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ

اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لیے بہتر تھا۔ ان میں سے

مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ کچھ تو ایمان لے آئے ہیں۔ اور اکثر فاسق ہیں۔

منہم المومنون سے مراد یہ ہے کہ "ان میں کچھ تو مومن ہیں۔ اور اکثر فاسق ہیں" یعنی قرآن ان میں بعض کو مومن تسلیم کرتا ہے۔ سو اس کی تکذیب تو خود اس آیت کا Construction کر رہا ہے لو اٰمن اَهْلُ الْكِتٰبِ۔ اگر اہل کتاب ایمان لے آتے" میں تمام اہل کتاب کا ذکر ہے۔ اگر ان میں سے بعض کو مومن تسلیم کر لیا جاتا تو سب اہل کتاب کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ان میں سے جو فاسقین تھے انہی کو مخاطب کیوں نہ کیا گیا۔ حالانکہ قرآن کریم میں اسی ایک مقام پر نہیں؛ بلکہ کوئی بھی ایسا مقام نہیں جہاں اہل کتاب کے کسی ایک حصہ کو مخاطب کرکے ایمان کی دعوت دی گئی ہو۔ اس لیے منہم المومنون سے مراد وہی لوگ ہیں جو قرآن کی اصطلاح میں ایمان لا چکے تھے۔ جیسا کہ (۲:۲۰) سے ظاہر ہے۔

باقی

تنزیل و تاویل

برزخ

اشاعت گذشتہ میں "عالم برزخ" کے عنوان سے جناب مولنا اسلم جیراج پوری کا طویل مضمون درج کیا جا چکا ہے۔ ان کی کتاب "تعلیمات قرآن" پر تبصرہ کرتے ہوئے برزخ کے متعلق ان کی تاویلات پر میں نے قصداً کوئی اظہار رائے نہ کیا تھا، کیونکہ رسالۂ "معارف" میں اس پر مفصل مضامین شائع ہو چکے تھے، اور مجھے امید تھی کہ ان کو دیکھکر مولانا نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا ہوگا۔ لیکن اب ان کے تازہ مضمون سے معلوم ہوا کہ انھیں ابھی تک اس رائے پر اصرار ہے۔ مزید براں ان کو اس بات پر تعجب بھی ہے کہ میں (مدیر ترجمان القرآن) قرآن کی حمایت و نصرت و اشاعت کا "مدعی" ہونے کے باوجود ان حضرات کا ہم خیال ہوں جنہوں نے "معارف" میں ان کے خیالات کی تردید کی ہے۔ حالانکہ ان سے زیادہ مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ جن خیالات کی تردید اتنے قوی دلائل سے کی جا چکی ہے، ان پر مولانا کو ابھی تک اصرار ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ شائد میں کوئی ایسی بات نہ کہہ سکونگا جو حیات برزخیہ اور عذاب و ثواب برزخ کے حق میں نہ کہی جا چکی ہو۔ تاہم میں کوشش کرونگا کہ ہر قسم کی تلخ گفتاری سے پرہیز کر کے زیادہ سے زیادہ دلنشین انداز بیان کے ساتھ ان آیات قرآنی کی صحیح تاویل پیش کروں جن کے سمجھنے میں مولانا نے پے در پے غلطیاں کی ہیں۔ اس لیے کہ سابق مضامین میں اگر کوئی قصور تھا تو وہ صرف یہی کہ ان کے لہجہ میں تلخی تھی جس سے مخاطب کی طبیعت مشتعل ہو کر مشاہدۂ حق سے پھر جاتی ہے۔

برزخ کا مفہوم | سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ لغت کے اعتبار سے برزخ کا مفہوم کیا ہے۔ دو چیزوں کے درمیان جو چیز واقع ہو، اور ان کو باہم ملنے سے روکدے یا ان کو الگ الگ کر دے وہ عربی زبان میں

"برزخ" کہلاتی ہے، خواہ وہ پردہ یا اوٹ ہو، یا زمانہ، یا کوئی اور شئے۔ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ۔ اور جَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا میں برزخ سے مراد وہ روک ہے جو دو سمندروں کو ملنے سے باز رکھتی ہے۔ ایک حدیث میں ذکر آیا ہے کہ اِنَّهُ صَلّٰى بِقَوْمٍ فَاسْوٰى بَرْزَخًا۔ یعنی آپ نے ایک جماعت کو نماز پڑھائی اور قرآن پڑھتے پڑھتے ایک مقام سے سلسلہ منقطع فرماکر دوسرے مقام کی تلاوت شروع کردی۔ یہاں اس حصہ کو جو چھوڑ دیا گیا تھا "برزخ" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں وساوس کو براز خ الایمان کہا گیا ہے یعنی شک اور یقین کی درمیانی حالت۔ مفسرین و ائمہ لغت نے برزخ کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ البرزخ الحاجز والمهلة متقاربات المعنی (ابن جریر) البرزخ ما بين كل شيئين من حاجز (نهاية ابن اثير) البرزخ الحاجز والحد بين الشيئين (راغب)۔

اصطلاحی معنی | اسی لفظ کو قرآن مجید نے اصطلاحاً اس مدت یا اس حالت کے لیے استعمال کیا ہے جو انسان کی موت سے لیکر قیامت کے دن تک ہے جس آیت میں یہ لفظ وارد ہے وہ خود اس کے اصطلاحی معنی کو واضح کر رہی ہے۔

حَتّٰى اِذَا جَاءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ	یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آتی ہے تو وہ
رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّيْ اَعْمَلُ صَالِحًا	کہتا ہے کہ پروردگار مجھے واپس کر دیجیے۔ امید ہے کہ میں
فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا	اس زندگی میں جس کو چھوڑ آیا ہوں نیک عمل کرونگا۔
وَمِنْ وَّرَائِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ	ہرگز نہیں۔ یہ تو ایک بات ہے جو وہ کہتا ہے اور ان کے
(۲۳: ٦)	آگے ایک برزخ ہے اس دن تک جب کہ وہ اٹھائے جائینگے

اس سے معلوم ہوا کہ موت کے وقت سے روز قیامت تک جو کچھ ہے اس کا نام برزخ ہے۔ آپ چاہیں تو اسے روک یا آڑ کہہ سکتے ہیں، لیکن اگر یہ آڑ ہے بھی تو میت اور دنیا کے درمیان ہے یا میت اور قیامت کے درمیان ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان ہرگز نہیں ہے۔ قرآن مجید میں کوئی اشارہ ایسا

نہیں ملتا جس سے یہ مفہوم نکلتا ہو کہ برزخ میں مردے اپنے رب کی حضوری سے آڑ میں رکھے جاتے ہیں۔ یہ محض ایک بے بنیاد قیاس ہے۔

برزخ کی کیفیت اب سوال یہ ہے کہ برزخ کی کیفیت کیا ہے۔ آیا اس میں انسان کے لیے کوئی زندگی ہے یا نہیں؟ وہاں صالحین کے لیے کوئی راحت اور فاسقین کے لیے اذیت ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ برزخ میں نفس انسانی کس حال میں رہتا ہے؟

مولٰنا اسلم جیراج پوری کا دعوی یہ ہے کہ :-

۱۔ مرنے والے برزخ میں اپنے رب کی حضوری سے آڑ میں رکھے جاتے ہیں اور صرف قیامت کے روز ان کی پیشی ہوگی۔

۲۔ برزخ مطلقاً عالم ممات ہے جس میں حیات، علم، احساس، شعور کچھ نہیں ہوتا، اور اس لیے عذاب، ثواب، راحت و اذیت بھی وہاں نہیں ہے۔

۳۔ برزخ میں رہنے سے مراد اللہ کے نوشتے میں رہنا ہے۔ یعنی انسان اس دنیا میں آخری سانس لینے کے بعد معدوم ہو جاتا ہے، اور صرف اس کا اندراج اللہ کے دفتر میں رہتا ہے۔ پھر جب قیامت ہوگی تو ان سب کو دوبارہ زندہ کیا جائیگا جو اس دفتر میں مندرج ہیں۔ پس موت سے لیکر قیامت تک نفس یا روح کی حالت ایک معدومیت اور فنائیت کی حالت ہے، اور اس کے لیے اگر موجودیت ہے تو وہ صرف کتاب اللہ میں ہے۔

۴۔ صرف وہ لوگ جو فی سبیل اللہ جنگ کرکے مارے جاتے ہیں، اس سے مستثنیٰ ہیں۔ وہ مرنے کے بعد زندہ رہتے ہیں، اپنے رب کی حضوری سے آڑ میں نہیں رکھے جاتے، بلکہ اسی وقت حاضر کر دیئے جاتے ہیں اور ان کو روزی ملنے لگتی ہے۔

ہم کو دیکھنا ہے کہ یہ دعوی قرآن سے ثابت ہوتا ہے یا نہیں، اور قرآن مجید کی رو سے مذکورہ بالا سوالات کا صحیح حل کیا ہے؟

موت اور حیات کا مفہوم | اس بحث میں پہلا حل طلب سوال یہ ہے کہ زندگی اور موت سے کیا مراد ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ:۔

كُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ (۲: ۳)۔ تم مردہ تھے پھر تم کو زندہ کیا، پھر وہ تمکو مارتا ہے پھر وہ تم کو جلائے گا۔

اس آیت میں دو موتوں اور دو زندگیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۔ پہلی موت سے مراد وہ حالت ہے جو قالب خاکی میں نفخ روح سے پہلے تھی، جیسا کہ آیت وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ...... ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ (۳۲: ۱) سے معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ پہلی زندگی سے مراد وہ حالت ہے جو جسم میں روح کے پھونکے جانے کے بعد ہوتی ہے اور جس میں انسان اپنے جسمانی کانوں سے سنتا، جسمانی آنکھوں سے دیکھتا اور جسمانی دل و دماغ سے سوچتا ہے اس کی طرف بھی آیت مذکورۂ بالا اشارہ کرتی ہے۔

۳۔ دوسری موت سے مراد وہ حالت ہے جو جسد خاکی سے نفس یا روح کے سلب کر لیے جانے کے بعد ہوتی ہے۔ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا (۳۹: ۵) اور وَلَوْ تَرَى إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُوا أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنْفُسَكُمْ (۶: ۱۱) اسکی دلیل ہے۔

۴۔ دوسری زندگی سے مراد وہ حالت ہے جس میں قیامت کے روز وہی جان جو موت کے وقت جسم سے نکالی گئی تھی دوبارہ جسم میں پھونکی جائیگی۔ اس پر وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ (۸۱) اور كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ (۲۱: ۷) اور ایسی ہی بہت سی آیات دلالت کرتی ہیں۔

جسمانی موت کے بعد روحانی زندگی | پس معلوم ہوا کہ قرآن مجید نے عموماً موت سے جسم و روح کا انفصال اور زندگی سے جسم و روح کا اتصال مراد لیا ہے۔ لیکن اس معنی میں جس حالت کو وہ موت کہتا ہے اس

مرادِ عدم نہیں ہے بلکہ وہ بھی ایک طور کی زندگی ہے جس میں روح بولتی اور سنتی اور شعور وادراک رکھتی ہے چنانچہ خود قرآن مجید سے اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ دیکھیے پہلی موت کے دور کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ:۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا (۷:۱۷۲) — اور جب کہ تیرے رب نے بنی آدم سے ان کی پیٹھوں میں سے انکی ذریت کو نکالا اور خود ان کے اوپر ان کو گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے کہا ہاں، ہم گواہ ہوئے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب روحیں جسموں میں پھونکی نہ گئی تھیں، اور جب کہ ان پر موت طاری تھی اس وقت بھی وہ اس معنی میں مردہ نہ تھیں کہ ان میں سماعت اور گویائی اور علم وشعور نہ تھا حق تعالیٰ نے ان سے جو سوال کیا اس کو انھوں نے سنا، اس کا جواب دیا، اور جواب علم کی بنا پر دیا۔ پس وہ موت محض اجساد سے جدائی کا اعتبار کرتے ہوئے تھی۔ ورنہ حقیقت میں وہ بھی زندگی ہی تھی کیونکہ علم اور سمع اور گویائی کی صفات زندگی ہی میں پائی جاتی ہیں۔

پھر دوسری موت کی حالت میں بھی ارواح کا ان اوصاف سے متصف ہونا، قرآن مجید کی متعدد آیات سے ثابت ہوتا ہے۔ فرمایا:۔

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآىِٕلُهَا وَ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (۲۳:۹۹) — یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ پروردگار! مجھ کو واپس کر دیجیے۔ امید ہے کہ میں اس زندگی میں جس کو میں چھوڑ آیا ہوں نیک عمل کروں گا ہرگز نہیں یہ تو ایک بات ہے جو وہ کہتا ہے اور ان کے آگے برزخ ہے اٹھائے جانے کے دن تک۔

اس آیت میں اِرْجِعُوْنِ اور فِیْمَا تَرَكْتُ اور مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ بَرْزَخٌ کے الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذکر اس حالت کا ہے جب دنیا چھوٹ چکی ہے، برزخ اس کے اور دنیا کے درمیان

حائل ہو چکی ہے، اور دنیا میں رہنے کا نہیں بلکہ دنیا میں واپس جانے کا مسئلہ درپیش آگیا ہے۔ اس حالت موت میں انسان اپنے رب سے کلام کرتا ہے اور دنیا میں واپسی کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں خوف و رجا کے جذبات ہوں گے، اپنی دنیوی زندگی کے کارنامے اس کو یاد ہوں گے، ان پر ندامت اور مستقبل کے خطرات کا احساس ہوگا، اپنے پروردگار کو وہ جانتا ہوگا، اور اس میں گویائی کی قوت بھی ہوگی جبھی تو وہ ایسی بات کہے گا۔ کیا یہ مطلق عالم ممات ہو سکتا ہے جس کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ اس میں حیات کا کوئی شائبہ نہیں؟

دوسری آیات بھی اس کی تائید کرتی ہیں:۔

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ	اور خرچ کرو اس رزق میں سے جو ہم نے تم کو عطا کیا ہے قبل
يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ	اس کے کہ تم میں سے کسی کو موت آئے پھر وہ کہے کہ پروردگار
لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ	کاش تو مجھے تھوڑی مہلت اور دیتا کہ میں خیرات کرتا اور
وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (۶۳ : ۲)	صالحین میں سے ہوتا۔
اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْۤ	جن لوگوں کی جانیں ملائکہ نے اس حال میں قبض کیں کہ
اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا	وہ الکفار کی سرزمین میں رہ کر اپنے اوپر آپ ظلم کر رہے تھے
مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَالُوْۤا اَلَمْ	ان سے ملائکہ نے کہا کہ تم یہ کس حال میں پڑے ہوئے تھے
تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا	انہوں نے کہا کہ ہم زمین میں بے بس تھے فرشتوں نے کہا
(۴ : ۱۴)	کیا اللہ کی زمین فراخ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟
حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ	یہاں تک کہ جب ان کے پاس ہمارے فرشتے ان کی
قَالُوْۤا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	روح قبض کرنے کو پہنچ گئے تو کہا کہ کہاں ہیں وہ تمہارے معبود
قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ	جن کو تم خدا کے سوا پکارتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ وہ ہما

أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ فِي النَّارِ (۷:۴)

ساتھ چھوڑ گئے، اور انہوں نے اپنے اوپر گواہی دی کہ وہ کافر تھے۔ خدا نے کہا کہ تم بھی ان قوموں کے ساتھ آگ میں داخل ہو جاؤ جو از قسم جن و انس تم سے پہلے گذر چکی ہیں

الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۴:۱۶)

جن لوگوں کی جانیں ملائکہ اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ پاک تھے، تو ان سے کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو جنت میں داخل ہو اپنے ان اعمال کے بدلے میں جو تم کرتے تھے۔

الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ فَأَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوءٍ بَلَىٰ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ فَادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا (۱۶:۴)

جن لوگوں کی جانیں ملائکہ اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنے اوپر آپ ظلم کرنے والے تھے، تو وہ ان سے دوستی ڈالیں گے اور کہیں گے کہ ہم تو کوئی برا عمل نہ کرتے تھے۔ کہا جائیگا کہ ہاں خدا جانتا ہے جو کچھ تم کرتے تھے پس تم جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جہاں تم ہمیشہ رہو گے۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ (۸:۷)

اور کاش تو دیکھتا جب کہ ملائکہ ان لوگوں کی جانیں قبض کرتے ہیں جنہوں نے کفر کیا ہے، وہ ان کو آگے اور پیچھے سے مارتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ عذاب دوزخ کے مزے چکھو۔

یہ اور ایسی ہی بہت سی آیات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عرف عام میں جس انفصال روح و جسم پر لفظ موت کا اطلاق ہوتا ہے وہ ایسی موت نہیں ہے جس میں مطلق کسی قسم کا احساس و شعور اور شائبۂ حیات موجود نہ ہو۔ برعکس اس کے اس حالت میں بھی روح میں زندگی کے وہ تمام آثار موجود ہوتے ہیں جو جسمانی زندگی میں ہوا کرتے ہیں، البتہ ان کا طور و انداز بدلا ہوا ہوتا ہے، اور جسمانی زندگی سے وہ حالت مختلف ہوتی ہے۔

عرفی موت پر زندگی کا اطلاق

چونکہ انسان کے نزدیک زندگی سے مراد جسمانی زندگی ہے، اور موت سے مراد

جسمانی موت ہے، اور اسی مفہوم کے لیئے انسانی زبان میں موت اور حیات کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے حق تعالیٰ نے بھی اپنے کلام میں عموماً موت اور حیات کو جسمانی موت اور جسمانی حیات کے معنی میں استعمال کیا ہے لیکن بعض مواقع ایسے بھی آئے ہیں جہاں انسان کے اس جاہلانہ خیال کی تردید کرنا ضروری ہوگیا کہ زندگی حقیقت میں جسمانی زندگی ہے اور جسمانی موت حقیقی موت ہے جس میں حیات کا کوئی شائبہ نہیں۔ جب حق کی خاطر جان دینے کا سوال پیش آتا ہے تو یہ جاہلانہ خیال انسان کی ہمت کو پست کردیتا ہے۔ وہ اس وقت اپنی جان قربان کرتے ہوئے ہچکچاتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ اگر مارے گئے تو زندگی کے مزے چھوٹ جائیں گے اور جسم سے جان نکلتے ہی ہم فنا ہو جائیں گے۔ ایسے موقع پر حق تعالیٰ اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ جس کو تم موت کہتے اور سمجھتے ہو وہ حقیقت میں موت نہیں ہے۔ ہماری راہ میں جان دے کر تم مطلق "عالم ممات" میں نہ چلے جاؤ گے بلکہ پھر بھی زندہ ہی رہو گے اور ہمارے رزق کے مزے اس حال میں بھی تم کو نصیب ہوں گے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ۔ (۱۶۹:۳)

اور تو ان لوگوں کو جو خدا کی راہ میں مارے جاتے ہیں مُردہ نہ سمجھ وہ تو زندہ ہیں انکے رب کے پاس انہیں رزق دیا جاتا ہے

وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ۔ (۱۹:۲)

اور تم ان لوگوں کو مردہ نہ کہو جو اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں وہ تو زندہ ہیں مگر تم جانتے نہیں ہو۔

ان مواقع پر چونکہ پردہ پڑا رہنے سے ایک بڑی مصلحت فوت ہو رہی تھی، اسلیئے حقیقت کو بے نقاب کر دیا گیا۔ مگر غور سے دیکھیے یہ نہیں کہا کہ جو لوگ فی سبیل اللہ مارے جاتے ہیں، ان پر وہ موت طاری نہیں ہوتی جس کو عرف عام میں موت کہا جاتا ہے بلکہ یہ فرمایا کہ ان کی موت کو حقیقی موت نہ سمجھو اور نہ کہو۔ وہ مارے ضرور جاتے ہیں، ان کے جسم سے جان ضرور نکل جاتی ہے۔ وہ دنیا سے رخصت ضرور ہوتے ہیں۔ ان کو دفن بھی کیا جاتا ہے۔ ان کی عورتیں بیوہ اور ان کے بچے یتیم بھی ہو جاتے ہیں۔ ان کے ترکے تقسیم بھی ہوتے ہیں۔ ان تمام

حیثیتوں سے وہ دنیا اور دنیا والوں کے لیے مرجاتے ہیں۔ مگر اس جسمانی موت کے بعد بھی ایک زندگی ہے جو ان کو حاصل رہتی ہے، اور اس کے بعد بھی اللہ کے رزق اور اس کی بخششوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اگرچہ تم کو اس کا شعور نہیں ہے۔

مولانا اسلم جیراجپوری اس نکتہ کو نہ سمجھ سکے، انہوں نے عرفی موت اور حقیقی موت میں فرق نہ کیا۔ انہوں نے اس مصلحت پر بھی غور نہ کیا کہ خاص شہداء کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے اس فرق کو کس لیے واضح کیا ہے۔ ان کی نظر ان آیات کے معانی تک بھی نہ پہنچ سکی جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرق محض شہداء کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام مرنے والوں کے لیے عرفی موت کے بعد بھی ایک روحانی زندگی ہے جس میں احساس، شعور، سمع، گویائی وغیرہ قوتیں بدستور باقی رہتی ہیں۔ اس پہلی اور بنیادی غلطی نے ان کو پے در پے غلطیوں میں مبتلا کر دیا اور آخر تک ان کے قیاسات غلط ہوتے چلے گئے۔

برزخ میں روحوں کے مقامات جسمانی موت کے بعد روحانی زندگی کا ثبوت مل چکا۔ اب ہم کو آگے بڑھ کر یہ دیکھنا ہے کہ مرنے کے بعد انسانی نفوس کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے اور وہ کہاں رکھی جاتی ہیں۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ برزخ میں نفوس کے مقام کا انحصار ان کی دنیوی زندگی کے اعمال پر ہے۔ جو نفوس دنیا میں تقویٰ اور عمل صالح کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں وہ اتنے لطیف ہو جاتے ہیں کہ مقامات رفیعہ کی طرف پرواز کرنے لگتے ہیں جسم سے نکلتے ہی فرشتے ان کو کامیابی کی خوشخبری سناتے ہیں ان کا نام عالم بالا کے دفتر میں لکھا جاتا ہے، اور یوم الفصل کے انتظار کی مدت وہ ایسی بلند منزلوں میں گذارتے ہیں جہاں ان کو جنت کی خوشبوئیں آتی ہیں، بلکہ درحقیقت وہ جنت ہی کی ابتدائی منازل ہوتی ہیں۔

الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ	جن لوگوں کی جانیں ملائکہ اس حال میں قبض کرتے
يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ	ہیں کہ وہ پاک تھے، ان سے وہ کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو

بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۔ (۱۶: ۴)

جنت میں داخل ہو اپنے ان اعمال کے بدلے جو تم کرتے تھے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْا
اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا
وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ لَيُدْخِلَنَّهُمْ
مُدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ (۲۲: ۸)۔

اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی پھر مارے گئے یا مر گئے اللہ ان کو اچھا رزق عطا کرے گا اور حقیقت میں اللہ ہی بہتر رزق دینے والا ہے۔ وہ ضرور ان کو ایسی جگہ داخل کریگا جس سے وہ خوش ہو جائیں گے۔

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ
لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا
يَجْمَعُوْنَ ۔ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ
لَاِالَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ۔ (۳: ۱۷)

اور یقین رکھو کہ اگر تم راہ خدا میں مارے گئے یا مر گئے تو اللہ کی مغفرت اور رحمت اس مال و دولت سے بہتر ہے جو لوگ دنیا میں جمع کرتے ہیں۔ اور اگر تم مر گئے یا مارے گئے تو اللہ ہی کی طرف لیجائے جاؤ گے[۱]۔

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى
قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ .... اِنِّيْ
اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ قِيْلَ ادْخُلِ
الْجَنَّةَ (۳۶: ۲)۔

اور ایک شخص شہر کے پرلے سرے سے دوڑتا ہوا آیا اور بولا کہ لوگو! رسول کی پیروی کرو ... میں تمہارے پروردگار پر ایمان لایا ہوں۔ میری بات سنو (اس پر لوگوں نے اسے قتل کر دیا[۲]) اس سے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جا۔

اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ وَمَآ اَدْرٰىكَ

نیک لوگوں کا دفتر علیین میں ہے اور علیین کو تو کیا جانے

[۱] اس آیت اور اوپر والی آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تمام صالحین کے ساتھ ایک ہی معاملہ ہوتا ہے اور اس میں شہید و غیر شہید کا کوئی فرق نہیں ہے۔ نیز مولانا اسلم جیراجپوری کے اس خیال کی بھی تردید ہو جاتی ہے کہ شہداء کے سوا تمام باقی روحیں برزخ میں اپنے رب کی حضوری سے آڑ میں رکھی جاتی ہیں۔

[۲] قرآن مجید میں اس شخص کے مارے جانے کا ذکر نہیں ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے قتل کر دیا گیا تھا۔ جو شخص روایات کو ظنی اور ناقابل اعتبار سمجھتا ہو اس کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ اس شخص کو جنت میں داخل ہونے کا حکم مرنے کے بعد دیا گیا۔

مَا عِلِّيُّوْنَ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ کہ کیا ہے۔ وہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی مقربین اس کی نگرانی کرتے ہیں۔ (۹۳)

بخلاف اس کے جو لوگ فسق و فجور میں جان دیتے ہیں ان کی روحیں گندی ہو جاتی ہیں ان کے لیے مقامات عالیہ کے دروازے نہیں کھلتے۔ جسم سے نکلتے ہی اُن پر سختیاں شروع ہو جاتی ہیں ان کو ذلت اور مصیبت کے قید خانوں میں رکھا جاتا ہے جہاں ان کو اپنے ہولناک انجام کے آثار نظر آنے لگتے ہیں، اور وہ کثافتیں جو دنیوی زندگی کے بُرے اعمال سے انہوں نے سمیٹ لی تھیں ان کو بے چین و بے قرار رکھتی ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ (۷:۵)

جن لوگوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور ان کے مقابلہ میں تکبر کیا ان کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائینگے۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ (۸:۷)

اور کاش تو دیکھتا جب کہ ملائکہ ان لوگوں کی جانیں قبض کرتے ہیں جنہوں نے کفر کیا ہے۔ وہ ان کو آگے اور پیچھے سے مارتے جاتے ہیں کہ آگ کے عذاب کا مزا چکھو۔

اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (۸۳)

بدکاروں کے نام (قیدیوں کے دفتر) سجین میں لکھے جاتے ہیں۔ اور تو کیا جانے کہ سجین کیا ہے۔ وہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔

ان کے علاوہ متعدد آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسقین پر موت کے بعد ہی سختیاں شروع ہو جاتی

۱؎ مولنا اسلم جیراجپوری نے اس آیت اور اسی سلسلہ کی ایک دوسری آیت کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ علیون کے دو معنی ہو سکتے ہیں یا تو اس سے مراد بلند عالیہ ہیں یا عالی مقام لوگ۔ اسی طرح سجین سے مراد یا قید خانہ ہے یا قیدیوں کا گروہ۔ صالحین و ابرار کے نام اس دفتر میں لکھے جاتے ہیں جو علیین کے لیے مخصوص ہے اور فاسقین و فجار کے نام سجین کے دفتر میں مندرج ہوتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نفوس فنا ہو جاتے ہیں اور صرف رجسٹر میں نام رہ جاتے ہیں۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی روحیں علیین و سجین میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ مدرسے میں بچہ کا نام لکھا گیا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بچہ غائب ہو گیا اور صرف اس کا نام رجسٹر میں رہ گیا۔

ہیں۔ مثلاً آلِ فرعون کے متعلق ارشاد ہے کہ۔

وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوْءُ الْعَذَابِ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (۴۰: ۴۵)

اور آلِ فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا۔ وہ آگ کا عذاب ہے جس پر وہ صبح شام پیش کیے جاتے ہیں۔ اور جب قیامت قائم ہوگی تو حکم دیا جائیگا کہ آلِ فرعون کو اس سے سخت تر عذاب میں داخل کرو۔

اس آیت کے الفاظ اتنے واضح ہیں کہ مفہوم میں کسی قسم کا الجھاؤ نہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ غرق ہوتے ہی آلِ فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا۔ اب وہ دائماً آگ پر پیش کیے جاتے ہیں اور جب قیامت قائم ہوگی تو اس سے زیادہ سخت عذاب دیا جائیگا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ مولانا اسلم جیراجپوری نے پہلے سے چند نظریات قائم کرلیے ہیں جو قرآن مجید کی بعض آیات کے غلط مفہوم پر مبنی ہیں اور اب بجائے اس کے کہ وہ ایسی صاف اور صریح آیات کو دیکھ کر ان نظریات میں ترمیم کرتے، وہ کوشش کر رہے ہیں کہ ان کی تاویل کرکے ان غلط نظریوں کے مطابق ڈھال لیں۔ یہی وہ ذہنیت ہے جو انسان کو قرآن کا صحیح مفہوم سمجھنے نہیں دیتی۔

اسی کے قریب المعنی وہ آیت ہے جو مدینہ اور گرد و پیش کے منافقین کے حق میں نازل ہوئی ہے۔

سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ۔ (۹: ۱۰۱)

عنقریب ہم ان کو دو مرتبہ عذاب دیں گے پھر وہ زیادہ بڑے عذاب کی طرف پھیرے جائیں گے۔

یہاں بھی الفاظ صریح اور مفہوم واضح ہے۔ عذاب کے تین مرتبے بتلائے ہیں۔ ایک دنیا کا عذاب کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوئے اور ان کی ساری تدبیریں ناکام کر دی گئیں۔ دوسرا برزخ کا عذاب۔ اور تیسرا عذاب عظیم جو قیامت کے بعد ہوگا۔ لیکن یہاں پھر مولانا کے نظریات نے ان کو ایک صاف بات سمجھنے سے روک دیا۔

چند غلط نظریات | مولانا کے نظریات میں پہلا نظریہ یہ ہے کہ وہ برزخ کو مطلق عالم ممات سمجھتے ہیں جس میں حیات کا

کوئی شائبہ نہیں اسی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ برزخ میں نہ راحت ہے اور نہ اذیت لیکن اس کی تائید میں جو آیات انہوں نے پیش کی ہیں وہ ان کے مدعا کی تائید نہیں کرتیں۔ بالفرض اگر قرآن مجید میں مشرکین وکفار کے معبودوں سے مراد انبیاء اولیاء، صلحاء اور دوسرے انسان ہیں جو وفات پاچکے ہیں، تب بھی ان آیات سے جو مولانا نے پیش فرمائی ہیں، صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ آدمیوں کی پکار نہیں سنتے، ان کی دعاؤں سے غافل ہیں، اور ان کو جواب نہیں دے سکتے۔ مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے، کہ وہ بجائے خود بے حس، بے جان، بے شعور، بے علم، اور بالکل غافل و بے خبر ہیں؟ اگر وہ اس عالم کی باتیں نہیں سنتے اور اس عالم کے لوگوں کو جواب نہیں دے سکتے، تو اس سے یہ نتیجہ کیوں کر نکالا جاسکتا ہے کہ جس عالم میں وہ ہیں، وہاں بھی ان میں بولنے اور سننے اور محسوس کرنے کی قوت نہیں ہے؟ پہلے ایک مضمون کی آیات پر غور کیے بغیر ایک غلط نظریہ قائم کرنا، پھر اس نظریہ کی بنا پر دوسری صریح آیات کی تاویل کرنا، اور الفاظ کو ان کے صاف مفہوم سے پھیرنا وہ طریقہ نہیں ہے جس سے آدمی قرآن مجید کے علوم سے استفادہ کرسکتا ہو۔ قرآن مجید ایک جگہ کہتا ہے کہ تم مُردوں کو نہیں سُنا سکتے، اور مردے تمہاری دعاؤں کا جواب نہیں دے سکتے۔ دوسری جگہ وہی قرآن کہتا ہے کہ فرشتے مُردوں سے باتیں کرتے ہیں اور مُردے ان کو جواب دیتے ہیں۔ کیا ان دونوں باتوں میں کوئی تناقض ہے؟ اگر نہیں تو آپ جس طرح پہلی بات کو مانتے ہیں، اسی طرح دوسری کو بھی مانیے اگر ہے تو تناقض ثابت کیجیے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ "قرآن کی رو سے انسان کے لیے دو ہی موتیں اور دو ہی زندگیاں ہیں"۔ دنیاوی زندگی کے بعد "دوسری زندگی حشر کے دن ملے گی نہ کہ قبر میں۔ لہٰذا اس دنیاوی زندگی کے منقطع ہوجانے کے بعد اہل برزخ میں مطلقاً زندگی کا کوئی شائبہ نہیں"۔ یہاں دراصل موت اور حیات کا مفہوم سمجھنے میں مولانا سے لغزش ہوئی ہے۔ جس انفصال جسم و روح پر لفظ موت کا اطلاق کیا گیا ہے اس کے متعلق مولانا نے فرض کرلیا کہ اس میں مطلقاً زندگی کا کوئی شائبہ نہیں، اور زندگی محض اتصال

جسم و روح کا نام ہے۔ لیکن اوپر قرآن مجید کی آیات سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ یہ مفروضہ بالکل غلط ہے۔

تیسرا نظریہ بھی ایسا ہی عجیب و غریب ہے۔ ایک آیت میں وارد ہوا ہے کہ مردے جب حشر کے دن اٹھائے جائیں گے تو کہیں گے کہ "ہائے کس نے ہم کو ہماری خوابگاہ سے اٹھا دیا" بعض اور آیات میں ہے کہ دنیوی زندگی اور قیامت کے مابین وہ زیادہ سے زیادہ ایک گھڑی کا فصل سمجھیں گے۔ اس سے مولانا نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ برزخ میں مُردے بالکل غافل و بے خبر پڑے ہوئے ہیں، اور ان کو زمانے کا مطلق احساس نہیں ہے۔ کیونکہ اگر وہ زندہ ہوتے اور عذاب یا ثواب ان پر ہو رہا ہوتا تو اس طویل مدت کو بھول نہ جاتے۔ لیکن قرآن میں یہ بھی تو فرمایا گیا ہے کہ حشر کے دن لوگ اپنے قیام زمین کی مدت کا اندازہ ایک دن یا زیادہ سے زیادہ دس دن لگائیں گے۔ پھر کیا بالکل اسی طرح اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ دنیا کی زندگی میں بھی انسان غفلت و بے خبری اور "مطلق عالم ممات" میں پڑا رہا؟ سوال یہ ہے کہ آخر اس قسم کی قیاس آرائیاں کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ جو نتیجہ آپ نکال رہے ہیں وہ قرآن میں مذکور نہیں۔ قرآن میں صرف ایک واقعہ کے طور پر یہ بیان ہوا ہے کہ قیامت کے روز جب دوبارہ اجساد میں جان ڈالی جائے گی اور لوگ نشأۃ آخرت میں داخل ہوں گے تو ان کو ایسا اور ایسا محسوس ہوگا۔ یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ اس سے پہلے برزخ میں وہ بے ہوش، بے حس اور "مطلق عالم ممات" میں ہوں گے۔ اس واقعہ پر محض آپ کا اپنا قیاس ہے۔ اور اس قیاس کو آپ اتنی اہمیت دے رہے ہیں کہ قرآن کی ان صریح آیات کو جن میں اہل برزخ کی سماعت، گویائی، اور ان کی راحت یا تکلیف کا ذکر کیا گیا ہے ان کے صاف مفہوم سے پھیر کر اس قیاس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیا قرآن کو قرآن سے سمجھنے کا یہی طریقہ ہے؟ اگر آپ کو قیاس ہی کرنا تھا تو آپ نے یہ قیاس کیوں نہ کیا کہ ایک عالم سے دوسرے عالم میں پہنچنے کے بعد انسان پہلے عالم کو فراموش کر جاتا ہے، یا اس کو پہلے عالم کا محض ایک موہوم سا خیال رہتا ہے، یا پہلے عالم میں اپنی حالت کے متعلق اس کا اندازہ غلط ہوتا ہے جیسا کہ کذالک

كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں آپ کے قیاس کی بہ نسبت یہ قیاس قرآن مجید کے ارشادات سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔

مولنا کا آخری نظریہ ان آیات پر مبنی ہے جن میں صرف دنیا اور آخرت کے عذاب و ثواب کا ذکر ہے، اور برزخ کا ذکر نہیں ہے، اور جن میں صرف دار آخرت کو دار الجزاء فرمایا گیا ہے۔ اس سے مولنا یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ دنیوی زندگی کے بعد اور قیامت سے پہلے کوئی عذاب و ثواب نہیں ہے لیکن یہ نظریہ متعدد وجوہ سے باطل ہے۔

(۱) ان آیات میں کہیں برزخ کی روحانی زندگی اور اس کے عذاب و ثواب کی نفی نہیں کی گئی ہے بلکہ ان میں دنیا و آخرت کے عذاب و ثواب کا ذکر اسی طرح ایک واقعہ کے طور پر کیا گیا ہے جس طرح بعض دوسری آیات میں برزخ کی زندگی اور اس کے عذاب و ثواب کا ذکر بطور واقعہ آیا ہے۔ پھر پہلی قسم کی آیات دوسری قسم کی آیات کے لئے ناقض کیونکر ہو سکتی ہیں؟

۲۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ دار الجزاء اور یوم الفصل دراصل دار آخرت ہی ہے لیکن قرآن مجید کی متعدد آیات سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ برزخ میں انسان کو ایک طرح کی روحانی زندگی حاصل ہوگی جس میں شعور و احساس پایا جائیگا ایسی صورت میں یہ ناگزیر ہے کہ فیصلہ کے دن تک انتظار کرنے کے لئے نفوس انسانی جہاں رکھے جائیں گے وہاں نفوس زکیہ کے لئے راحت اور نفوس خبیثہ کے لئے اذیت ہو۔ اگرچہ ان کے اعمال کی پوری پوری جزا و سزا ان کو فیصلے کے دن ہی ملے گی لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انتظار کی مدت میں دونوں قسم کے نفوس ایک ہی حال میں رکھے جائیں۔

۳۔ آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ شہداء کو مرنے کے بعد ہی ثواب ملنا شروع ہو جائے گا۔ اب فرمائیے کہ یہ ثواب یوم الفصل سے پہلے ہے یا اس کے بعد؟ اگر بعد ہے تو کیا شہداء کی قیامت عام لوگوں کی قیامت سے پہلے قائم ہو جائیگی؟ اور اگر یہ ثواب یوم الفصل سے پہلے اور دنیوی زندگی ختم ہونے کے بعد ہے تو آپ کا نظریہ ٹوٹ گیا کیونکہ اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ انتظار کی مدت میں نفوس کو رزق عطا ہونا قرآن مجید کے اس ارشاد کے خلاف نہیں کہ اصلی جزا و سزا کا دن، فیصلہ کا دن ہے

حاملان قرآن

حضرت قطب عمادی

از

جناب مولوی محمد عثمان صاحب عمادی بی ایس سی (علیگ)

تا زہر بادے بجنبی پاید امن کشش چو قطب

کاو مشت غبار و دہر باد صر صر است

حضرت شیخ عماد رضی اللہ عنہ کے خیر الخلف اور علمائے آل عماد کے نعم السلف تھے خلافت نبوی پر اپنے والد کی وساطت سے فائز ہوئے تیمناً حضرت قطب بینا دل سے بھی خلافت حاصل تھی علوم کی تکمیل اپنے والد ہی سے فرمائی حقائق کلام اللہ و تدبر فی آیات اللہ میں اس قدر انہماک تھا اور حلقہ درس میں ایسے ایسے اسرار و معارف آپ پر منکشف ہوتے تھے کہ لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر، اسی لیے علمار کاملین آپ کو حبر الامۃ اور ابن عباس ثانی کہتے تھے۔

حطام دنیا سے سخت کارہ تھے، ایک مرتبہ سلطنت نے خدمت صدارت کے لئے آپ کو دارالسلطنت میں بلایا، فرمان طلب پر آپ نے یہ فقرہ لکھکر واپس فرمایا کہ "القطب لن یتحرک من مکانہ" (قطب از جائی جنبد) لطور مثل سائر یہ فقرہ زبانوں پر دائر ہے۔

کلام اللہ کے متعلق آپ کے امالی کے بعض حقائق پیشکش ہیں۔

قریہ کی بحث | حضرت بن یامین کی جانب انتساب سرقہ کی ذیل میں قرویت کی بحث تھی کہ "واسئل القریۃ"

کہنا اور " واسئل اھل القریہ " مراد لینا کیا لطف رکھتا ہے اور اس میں کیا خاص بلاغت ہے؟

فرمایا پوری آیت یوں ہے :۔

ارجعوا الی ابیکم فقولوا یاابانا ان ابنک سرق وما شھدنا الا بما علمنا وما کنا للغیب حافظین ، واسئل القریۃ التی کنا فیھا والعیر التی اقبلنا فیھا وانا لصادقون۔

یوسف کے بڑے بھائی نے اپنے چھوٹے بھائیوں سے کہا کہ والد کے پاس لوٹ جاؤ اور کہو کہ ابا جان آپکے صاحبزادے نے چوری کی، ہم نے وہی کہا جس کا ہمیں علم ہوا غیب کے حافظ ہم نہ تھے اس قریہ سے پوچھیے جس میں ہم تھے اس قافلہ سے پوچھیے جس کے ساتھ ہم آئے کہ حقیقت میں ہم سچے ہیں۔

فرمایا :۔ آجکل قریہ گاؤں کو کہتے ہیں کہ درجہ میں شہر سے فروتر ہوتا ہے، لیکن برادران یوسف علیہم السلام تو مصر کے دارالملک میں فروکش ہوئے تھے اور وہیں ان کا قافلہ بھی ٹھیرا تھا، پھر اس کو گاؤں (قریہ) کہنا کیونکر درست ہو سکتا ہے ؟

تحقیق معنے | اصل یہ ہے کہ قدیم عربی زبان میں قریہ کے معنی آبادی کے تھے، اُن میں مقام، منزل کی اہمیت نہ تھی، مقیم و نزیل ہی سے اُن کو سروکار تھا۔

ومن مذھبی حب الدیار لاھلھا

(میرا مذہب یہ ہے کہ گھروں کی محبت گھروالوں کی باعث ہے)

وللناس فیما یعشقون مذاھب

(دوسرے لوگوں کے طور وطریق اس باب میں جدا جدا ہیں)

بحرین کے عمالقہ نے جنھیں آجکل فنیقی کہتے ہیں اندلس کے ساحل پر ایک شہر آباد کیا تھا اور اس کا نام " القریہ " رکھا تھا، اگر قریہ گاوں ہوتا تو یہ شہر کا نام نہ پڑتا، قریہ سے صرف انسانی آبادی مراد ہے اور بس

اعجاز مقال | ایک بات اور بھی ہے ابوبکر بن الانباری کہتے ہیں :۔

اسئال القرية والعير والجدار و السلطان فانها تجيبك وتذكر لك صحة ما ذكرناه لانك من اكابر انبياء الله فلا يبعد ان ينطق الله هذه الجمادات معجزة لك حتى تخبر بصحة ما ذكرناه

قریہ سے پوچھو، قافلہ سے پوچھو، دیوار سے پوچھو اور بادشاہ سے پوچھو یہ سب جواب دیں گے اور ہمارے بیان کی صحت پر صاد کریں گے آپ بڑے پیغمبروں میں ہیں کیا دور ہے کہ بطور معجزہ کے اللہ تعالیٰ ان جمادات کو گویا کر دے کہ ہمارے بیان کی درستی پر ناطق ہوں۔

زبان حال | ابن الانباری کا بیان دلیل معجزہ ہو یا دلیل عجز، اس پر رد و قدح کی ضرورت نہیں ضرورت یہ ہے کہ اسلوب عرب سے آگاہی ہو، کہتے ہیں۔

سل الارض فقل من حفر انهارك وغرس اشجارك وجنى ثمارك فان لم تجبك حوارا اجابتك اعتبارا

زمین سے پوچھو کہ تیری نہریں کس نے جاری کیں، درخت کس نے لگائے، پھل کس نے چنے، اگر اس نے زبان قال سے اس کا جواب نہ دیا تو زبان حال سے ضرور اس کا جواب دیگی

عرب منازل محبوب سے مخاطب ہوتے ہیں، ٹوٹے پھوٹے گھروں سے خطاب کرتے ہیں:

یا دار عبلة بالجواء تکلمی — وعمی صباحا دار عبلة واسلمی

(اے عبلہ (محبوبہ) کے گھر کہ مقام جواء میں ہے مجھ سے باتیں کر) (اے عبلہ کے گھر میں تجھے صبح بخیر کہتا ہوں اور سلام کرتا ہوں)

والدار لو نطقتنا ذات اخبار

(گھر اگر ہم سے باتیں کرنا چاہے تو اس کے پاس بہتیری خبریں ہیں)

آسمان و زمین کی باتیں | توضیح مزید کے لیے اس مقدمہ کو ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ مدار اسلوب عرب اس پر ہے:

ان الشیء اذا ظهر ظهورا تاما كاملا فقد يقال فيه سل السماء والارض و جميع الاشياء عنه والمراد انه بلغ

جب کوئی چیز پوری طرح اور مکمل طور پر نمایاں ہو چکی ہو تو بعض اوقات اس صورت میں کہتے ہیں آسمان سے پوچھو زمین سے پوچھو اور تمام چیزوں سے اس باب میں پوچھ دیکھو

فی الظهور الی الغایۃ التی ما بقی للشک فیہ مجال۔

مراد یہ ہوتی ہے کہ ظہور و نمود میں یہ بات اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اب اس میں شک و شبہ کی مجال ہی نہیں۔

دخول نار | گفتگو یہ تھی کہ خلق سموٰت و ارض و اختلاف لیل و نہار میں اولی الالباب جب اللہ کی نشانیاں مشاہدہ کرتے ہیں تو ہر حال میں اللہ کی یاد اور اس کی مخلوقات میں تفکر کرنے سے ان کو ماننا پڑتا ہے کہ یہ تمام کارخانہ آفرینش باطل اور رائیگاں نہیں، اس یقین کے بعد قلب سلیم اسی رؤف و رحیم کی جانب رجوع کرتا ہے، عذاب نار سے پناہ مانگتا ہے، اور رسوائی سے بچنے کی دعا کرتا ہے کہ:۔

رَبَّنَا إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ۔

اے ہمارے پروردگار حقیقت میں تو نے جسے آگ میں ڈالا اس کو رسوا کر دیا اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

حل اشکال | آیت میں یہ اشکال محسوس ہو رہا تھا کہ دخول نار موجب رسوائی ہے تو اللہ کا کام ہے کہ مومنین کو اس سے محفوظ رکھے، قیامت میں کوئی مومن ایک لمحہ کے لیے بھی دوزخ میں نہ جائے اور کسی پر آنچ تک نہ آنے پائے، وہ خود کہہ چکا ہے کہ:۔

يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ

روز قیامت وہ دن ہوگا جس دن اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو رسوا ہونے دیگا اور نہ ان مومنین کو جو آپ کے ساتھ ایمان لائے۔

احقاق حق | فرمایا۔

اِنَّ قَوْلَهٗ "يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهٗ" اِنَّمَا يَقْتَضِيَ اَنْ لَا يَحْصُلَ الْاِخْزَاءُ حَالَ مَا يَكُوْنُوْا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ وَهٰذَا النَّفْيُ لَا يُنَاقِضُهٗ اِثْبَاتُ الْاِخْزَاءِ فِي الْجُمْلَةِ

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ "قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مومنین صحابہ کو اللہ رسوا نہ کریگا" اس کے محض اسی قدر معنی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت اور صحبت کی برکت سے مومنین بھی رسوائی سے محفوظ رہیں گے۔ یہ نفی دوسری صورتوں میں اثبات اخزاء کے مناقض نہیں۔

یعنی جن مومنین کو صحبت نبوی کی سعادت حاصل نہیں اور بقدر خطایا و ذنوب کچھ مدت کے لیے وہ معذب بالنار ہوے تو اس آیت سے کیا تناقض ہوا جس میں آنحضرت اور آپ کے صحابہ مومنین سے خزی و رسوائی کی نفی ہے اور اس کی اسی حد تک تخصیص و تحدید کر دی ہے۔

منادی برحق | عرض کی اسی کے ساتھ یہ آیت ہے :۔

رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۔	اے ہمارے پروردگار حقیقت میں ہم نے ایک ندا لگانے والے کو سنا کہ وہ ایمان کی آواز دے رہا تھا کہ تم سب اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ، اسی آواز پر ہم ایمان لائے لہذا اے پروردگار ہمارے گناہوں کو بخش دے ہماری بدکاریوں کو ہم سے مٹا دے اور نیک آدمیوں کے ساتھ ہمیں موت نصیب کر۔

یہاں ندا لگانے والے سے اکثر مفسرین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مراد لیتے ہیں اس کی کیا حقیقت ہے ؟۔

قرآن کی آواز | فرمایا۔

المنادی هُوَ القرآن لانه لیس کل احد لقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم اما القرآن فکل احد سمعه و فهمه	منادی یعنے ندا لگانے والے سے مراد قرآن ہے ہر شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کہاں سنی قرآن کی آواز تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد بھی سب نے سنی اور سب اس کا مطلب سمجھے۔
مجاز متعارف | و هذا و ان کان مجاز الا انه مجاز متعارف لان القران لما کان مشتملا علی الرشد و کان کل من تامله وصل	یہ معنی اگرچہ مجازی ہیں تاہم یہ مجاز متعارف ہے قرآن تمام تر رشد و ہدایت ہے جس نے اس میں فکر کی اور توفیق الہی رفیق ہوئی تو اس کو ہدایت حاصل ہو گئی اس بنا پر

الی المھدی اذ ادغتہ اللہ تعالیٰ لذالک فصار کانہ یدعوا الی نفسہ وینادی بما فیہ من انواع الدلائل کما قیل فی جھنم تدعو من ادبر و تولی اذ کان مصیرھم الیھا۔	گویا قرآن زبان حال سے خود اپنی جانب لوگوں کو بلاتا ہے اور اپنے گوناگوں دلائل کا خود ہی نعرہ لگاتا ہے اسی قسم کا ہی میں جہنم کے متعلق ہے کہ تدعو من ادبر و تولیٰ یعنی جو پیچھے ہٹا اور جس نے منہ موڑا دوزخ ایسے لوگوں کو بلا لیگی کیونکہ ان دوزخیوں کی بازگشت دوزخ ہی تو ہے۔
زمانے کی صدا وا لعرب تصف الدھر بانہ ینادی ویعظ و مرادھم منھا دلالۃ تصاریف الزمان۔	عربوں کا دستور ہے کہ زمانہ کی صفت میں ظاہر کرتے ہیں کہ زمانہ آواز دیتا ہے اور نصیحت کرتا ہے جس سے مراد گردش زمانہ کی نشانیاں ہیں۔
قالوا :-	ایک عرب شاعر نے کہا ہے :-

یا واضع المیت فی قبرہ

(اے مردے کی لاش کو اس کی قبر میں آتارنے والے)

خاطبک الدھر فلم تسمع

(تجھے زمانہ مخاطب ہوا، باتیں کیں، مگر تو نے سنی ہی نہیں)۔

غرض کی اس کے بعد یہ آیت ہے :-

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ۔	اے ہمارے پروردگار ہمیں وہ عطا فرما جس کا اپنے پیغمبروں کی زبان سے تو نے وعدہ کیا تھا اور قیامت کے دن ہم کو رسوا نہ کر حقیقت میں تو وعدہ خلاف نہیں۔

اس میں کئی باتیں محل تامل ہیں۔

(۱) جب وہ جانتے تھے کہ اللہ وعدہ کر چکا ہے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اللہ وعدہ خلاف نہیں تو

وفائے وعدہ کے لیے دعا کی کیا حاجت تھی؟

۲۔حصول ثواب مُزیل عذاب ہے، یہ کہنا کہ "اپنے پیغمبروں کی زبان سے تو نے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر" طلب ثواب ہے، اور یہ عرض کرنا کہ "قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کر" طلب ترک عذاب ہے۔ طلب ثواب میں ترک عذاب خود ہی آگیا، تحصیل حاصل کے لیے اعلام معلوم سے کیا فائدہ؟

درخواست کا مطلب | فرمایا۔

المقصود من هذه الآية طلب التوفيق	اس آیت سے مقصود یہ ہے۔
للطاعة والعصمة عن المعصية۔	(۱) عبادت کے لیے طلب توفیق
	(۲) معصیت سے بچنے کے لیے طلب عصمت۔
فقوله واتنا ما وعدتنا معناه وفقنا	"ہمیں وہ دے جس کا تو نے وعدہ کیا تھا" اس کے
للاعمال التي بها نصير اهلا لوعدك	معنی ہیں کہ ہمیں ایسے اعمال کی توفیق عطا فرما جن کی بنا پر
واعصمنا من الاعمال التي نصير بها	ہم میں تیرے وعدے کی اہلیت آجائے
اهلا العقاب والخزى	اور ہمیں ایسے اعمال سے بچا جن کی بنا پر ہم عذاب اور رسوائی کے مستحق ہوں
توفیق طاعت و استقامت کانه قیل وفقنا	گویا یہ گذارش تھی کہ یا اللہ ہمیں اپنی عبادت کی توفیق
لطاعتك فانا لا نقدر على شيء من	دے، بدون تیری توفیق کے ہم سے کچھ عبادت ہو نہیں سکتی
الطاعات الا بتوفيقك واذا وفقت	اور یا اللہ جب ہمیں اپنی عبادت کی توفیق دے تو اس کی
لفعلها فوفقنا لاستبقائها فانا	استقامت کی توفیق بھی دے، بدون تیری توفیق کے نہ ہم
لا نقدر على استبقائها واستدامتها	استقامت پر قادر ہیں نہ استدامت پر قدرت
الا بتوفيقك۔	رکھتے ہیں۔
عذاب عظیم / وقوله ولا تخزنا يوم القيمة	"ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کرنا" یہ ویسا ہی ہے جیسے اللہ

شبيهُ بقولهٖ و بدالهم من الله مالم	کی جانب سے اُن پر وہ کچھ نمایاں ہوا جس کا انھیں گمان
يكونوا يحتسبونَ" فانه ربما ظن الانسانُ	تک نہ تھا"۔
انه على الاعتقاد الحق و العمل الصالح	بعض اوقات انسان اپنے آپ کو صحیح الاعتقاد و
ثم انهٗ يوم القيمة يظهر له ان اعتقادهٗ	صالح العمل سمجھتا ہے' بعد کو قیامت کے دن ظاہر ہوتا
كان ضلالًا و عمله كان ذنبًا فهنالكَ	ہے کہ اس کا اعتقاد گمراہی' اور اس کا عمل گناہ
تحصل الخجالة العظيمة والحسرة	تھا' اس وقت اُس کو بڑی خجالت' نہایت حسرت
الكاملة والاسف الشديد۔	اور سخت افسوس لاحق ہوتا ہے۔
عذاب روحانی | وذلك هو العذاب الرّوحانی	یہی روحانی عذاب ہے۔
وهذا العذاب اشد من العذاب الجسمانی	یہ روحانی عذاب جسمانی عذاب سے کہیں زیادہ سخت ہے۔
لانهم طلبوا فی هذا الدعاء اشياء	اس دعا میں کئی چیزوں کی درخواست تھی۔
فاول مطالبهم الاحتراز عن العذاب	پہلی درخواست عذاب جسمانی سے بچنے کی تھی یعنی
الجسمانی وهو قوله فقنا عذابَ النار	"فقنا عذاب النار" ہمیں آتش دوزخ سے بچا۔
و اٰخرها الاحتراز عن العذاب	آخری درخواست عذاب روحانی سے بچانے کی تھی۔
الروحانی وهو قوله ولا تخزنا يوم القيمة	یعنی "ولا تخزنا يوم القيمة" ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کر'
فثبت بذلك ان العذاب	اس رسوائی کا عذاب روحانی عذاب ہے۔
الروحانی اشد من العذاب الجسمانی	اس سے یہ ثابت ہوا کہ جسمانی عذاب کے مقابلہ میں روحانی عذاب سخت ہے

رسائل و مسائل

تعلیمات قرآن کے متعلق بحث

(۳)

از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز۔ بی۔ اے

آدم کا گناہ | اس باب میں میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ میں اور صاحب تعلیمات میں یونہی لفظی سی نزاع باقی رہ گئی ہے یعنی وہ فرماتے ہیں کہ چونکہ حضرت آدم اپنے گناہ کی پاداش میں جنت سے نکالے گئے، لہذا جس گناہ کی سزا مل جائے اس کی معافی کیا ہوئی۔ آپ فرماتے ہیں کہ جنت سے تو وہ ضرور نکالے گئے لیکن یہ اس گناہ کی پاداش میں نہ تھا، بلکہ گناہ کے طبعی اثر کی بنا پر تھا۔

آپ پہلے توبہ اور عفو کے الفاظ کو لیجیے۔ توبہ کے لغوی معنی رجوع کے ہیں۔ یعنی جدھر سے منہ موڑ لیا تھا اس کی طرف پھر رُخ کیا جائے۔ اور جب اس کی نسبت اللہ کی طرف ہوتی ہے اور صلہ علیٰ آتا ہے تو اس کے معنی توبہ قبول کرنے یعنی اپنے فضل و احسان کے ساتھ پھر اس بندے کی طرف رجوع کرنے کے ہیں۔ گویا جس کی توبہ قبول ہوئی وہ راندۂ درگاہ نہ ہوا، بلکہ اس کی رحمتوں نے پھر اس کی طرف رجوع کر لیا۔ اور عفو کے معنی ہیں القصد لتناول الشیٔ (مفردات راغب) اور قرآن کریم میں جہاں بھی عفو استعمال ہوا ہے اس کے معنی ایسی معافی کے ہیں جس کے بعد کچھ باقی نہ رہے مثال کے طور پر سورۂ بقرہ آیت (۲۳۷) میں دیکھیے ایسی عورتیں جنھیں بلا تمسک طلاق دیدی جائے ان کا نصف مہر واجب آتا ہے۔ مگر۔

اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِہٖ یہ کہ وہ خود معاف کر دیں یا وہ معاف کر دے

عقدۃ النکاح (۲:۲۱) جس کے ہاتھ میں عقدۂ نکاح ہو۔

اس قسم کی اور بہت سی آیات ہیں اسی بنا پر گناہ کے اثر کے ازالہ کو عفو گناہ کہتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ان دونوں کے معانی مختلف ہیں اور جو آیت آپنے پیش کی ہے وہی اس پر دلالت کر رہی ہے آپنے فرمایا کہ فتاب علیکم وعفا عنکم۔ میں عفا عنکم، تاب علیکم کی تفسیر کر رہا ہے اس سے خود ثبوت ملتا ہے کہ توبہ اور عفو دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اب اسی اصول پر حضرت آدم کے متعلق جو وارد ہوا ہے فتاب علیہ وہدیٰ تو اس میں توبہ کی تفسیر ہدیٰ کیوں نہ قرار دی جائے۔ اللہ نے ان کی توبہ قبول کی یعنی ہدایت فرمائی یعنی اللہ نے ان کے گناہ پر شیطان کی طرح انہیں ملعون نہیں کیا بلکہ ان کو پھر شرف و اعتبار عطا فرمایا یا ان کو استغفار کی توفیق دی۔ ان کی طرف رجوع فرمایا اور جنت میں آنے کا راستہ بتایا (وہدیٰ) کہ ایمان و عمل صالح کی راہ سے جنت میں آجاؤ۔ اور یہی کچھ تعلیمات قرآن میں ہے۔ قبول توبہ کی ایسی صورت جس میں جرم سزا سے نہ بچے، صاحب تعلیمات کے نزدیک معافی نہیں، خواہ وہ طبیعی اثر سے ہو یا کسی اور اثر سے۔

اب قرآن کریم میں دیکھیے تو کچھ ایسی ہی نہج کے اشارے ملتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں قصہ آدم میں یوں مذکور ہے

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۔ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۔ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۔	شیطان نے ان دونوں کو اس درخت کی وجہ سے لغزش دیدی سو ان کو اس میں سے نکال کر رہا جس میں وہ دونوں تھے۔ اور ہم نے کہا کہ نیچے اترو۔ تم میں سے بعض بعضوں کے دشمن رہیں گے۔ اور تمکو زمین میں چند ے ٹھیرنا

اور فائدہ حاصل کرنا ہے۔ ایک میعاد معین تک۔

یہاں ہبوط آدم کا حکم موجود ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمہیں دنیا میں ٹھیرنا اور کام چلانا ہے لیکن اس سے زیادہ کوئی ہدایت وارشاد نہیں کہ اس وقت تک رحمت الٰہی نے رجوع نہیں کیا۔ اس کے آگے دیکھیے

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۔	ازاں بعد آدم نے اپنے رب سے چند الفاظ حاصل کیے تو

إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۔ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۔ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۔

اللہ نے انکی طرف توجہ فرمائی ۔ بیشک وہی بڑا توبہ قبول کرنے والا ، مہربان ہے ۔ ہم نے کہا کہ اتر واس سے سب کے سب پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت آئے ، سو جو شخص میری اس ہدایت کی پیروی کریگا تو نہ ایسے لوگوں کو کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ ہی ایسے لوگ غمگین ہوں گے ۔

یہاں آدم نے توبہ کی ۔ اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول فرمائی ۔ اور ان سے ہدایت کا وعدہ کیا جو تو ۃ سے پہلے نہیں کیا گیا تھا ۔ یہ وہی تفصیل ہے جو فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ میں مجمل تھی ۔ ان کی توبہ قبول کی یعنی ہدایت عطا کی ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے توبہ قبول کرنے (یعنی بندے کی طرف رجوع کرنے) کی دو شکلیں ہیں ۔ ایک تو یہ کہ توبہ قبول کرنے کے بعد وہ راستہ بتا دیا جس پر عمل پیرا ہونے سے گناہ کے اثرات زائل ہوجائیں جیسا کہ حضرت آدم کے لئے فتاب علیہ وہدیٰ میں ہے ۔ دوسرے یہ کہ توبہ قبول کی اور گناہوں کے اثرات میں سے کچھ بھی باقی نہ رکھا سب محو کر دیے جیسا تاب علیکم وعفا عنکم میں ہے ۔ یہی سورۂ شوریٰ کی اس آیت میں ہے هُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُوا عَنِ السَّيِّئَاتِ (۴۲ : ۳) ۔ اللہ وہ ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور گناہوں کو معاف کر دیتا ہے ۔

آپ فرماتے ہیں کہ سزا مل جانے کے بعد شرفِ اجتبا باقی نہیں رہتا ۔ تو کیا وہ لوگ جن سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوجائے جس کی فوری پاداش اسی دنیا میں مل جاتی ہو اگر اس پاداش کے بعد توبہ کرلیں ، اور ان کی توبہ قبول ہوجائے ، تو آپ کے نزدیک کیا وہ ہمیشہ کے لیے شرفِ اجتبا سے محروم کر دیے جائیں گے ؟ توبہ قبول ہونے کے معنی ہی یہی ہیں کہ شرف اجتبا ، اور توجہات رحمانی سے محروم نہ رکھے جائیں ، لہٰذا اگر حضرت آدم کی توبہ ، بعد پاداش بھی تسلیم کرلی جائے تو یہ خدشہ باقی نہیں رہتا ۔

ا ۔ میں نے کہیں نہیں کہا ۔ میرا مطلب تو یہ تھا کہ گناہ کو معاف نہ کرنا اور اس پر سزا دینا ، پھر اسی سزا کی حالت میں شرفِ اجتبا عطا کرنا ، دو بالکل متضاد باتیں ہیں ۔ مدیر ترجمان القرآن

اس کے بعد آپ نے سزا و گناہ کے فلسفہ پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔ یہ موضوع بڑا اہم اور مستقل ہے اور افسوس ہے کہ ضمناً میں بھی اس پر شرح و بسط سے کچھ نہیں لکھ سکتا۔ لیکن آپ نے جو طبیعی اور غیر طبیعی اثرات میں فرق کیا ہے۔ میں اسے نہیں سمجھ سکا۔

آپ نے فرمایا ہے کہ ہبوط کا حکم "سزا اور انتقام کے طور پر نہ تھا، بلکہ اس شجر کا مزہ چکھنے کا طبیعی نتیجہ تھا"۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ گناہوں کی "انتقامی" سزا کے قائل ہیں۔ لیکن میں تو قرآن کریم سے کوئی اشارہ نہیں پاتا جس میں یہ ہو کہ گناہوں کی سزا بطور انتقام دی جائے گی۔ انسان اگر گناہ کرتا ہے تو اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا تو اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔ لہٰذا انتقام کیسا؟ اللہ تعالیٰ کا انتقام اس مفہوم میں کبھی نہیں ہوتا جیسا آپ نے فرمایا ہے۔

پھر آپ نے فرمایا کہ یہ ہبوط اس شجر کا مزہ چکھنے کا طبیعی نتیجہ تھا۔ کیا اللہ تعالیٰ کے یہاں سزا غیر طبیعی بھی ہوتی ہے؟ خیال فرمائیے کہ اگر حضرت آدمؑ کے گناہ کا طبیعی اثر بعد عفو گناہ بھی اس امر سے مانع تھا کہ وہ جنت میں رہ سکیں، تو دنیا میں اگر ایک شخص ایک گناہ کے بعد تائب ہو جائے۔ اور اسے اس گناہ سے معافی بھی مل جائے۔ تو آپ کے خیال کے مطابق اس گناہ کا طبیعی اثر تو باقی رہے گا جو ہو سکتا ہے کہ اسے جنت میں داخل ہونے سے روک دے۔ اور اگر کہا جائے کہ جنت میں داخلے کے وقت ایسے طبیعی اثرات (مثل احساس زوجی وغیرہ) مٹا دیے جائیں گے، تو جب حضرت آدمؑ کا گناہ معاف کیا گیا تھا تو اس گناہ کے طبیعی اثرات مٹا دینا کونسا مشکل کام تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا نظام جسمانی پر طبیعی اثر (جیسا آپ نے شراب کے نشہ والی مثال میں بیان فرمایا ہے) تو فی نفسہ کوئی شے نہیں۔ ایک چور کا ہاتھ شرعی عدالت کے حکم سے کاٹ دیا جائے اور ایک مرد مجاہد کا بازو میدان جنگ میں شہید ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ نظام جسمانی پر طبیعی اثرات یکساں ہیں، حقیقت میں کس قدر فرق ہے۔ خدا کے حضور تو اس قسم کے طبیعی اثرات کا کچھ وزن نہیں۔ اور جب گناہ معاف کر دیا جاتا ہے تو ایسے اثرات جنکی فی الواقع کوئی حقیقت ہوتی ہے

مٹا دیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ (۴۲ : ۴) جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے وہ تمہارے اعمال کی وجہ سے ہے اور اکثر قصوروں کو اللہ معاف کر دیتا ہے۔

یعنے جو گناہ معاف نہیں کیے جاتے اور اُن کی سزا دنیا میں ملجانی ہوتی ہے، ان کی وجہ سے انسان مصائب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور جن گناہوں کی معافی مل جاتی ہے ان کے نتائج بھی انسان کے سامنے نہیں آتے۔ ظاہر ہے کہ اگر معافی میں محض خدا کی ناراضگی کی معافی ہی ہوتی تو مصائب جو معالۂ طبعی شکل ہی میں آتے ہیں کس طرح سے ٹل جاتے! لہذا معافی میں اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور اعمال کے ایسے طبعی اثرات جن کا خدا کے نزدیک کچھ وزن ہو دونوں زائل ہو جاتے ہیں۔

ان تصریحات سے تو صاحب تعلیمات کا خیال ہی مرجح نظر آتا ہے۔

غلامی | بات یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ اسیران جنگ کو یا تو احسانا رہا کر دیا جائے، یا فدیہ دشکل زرنقدیا مبادلہ اسیران جنگ) لیکر۔ لیکن اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ احسانا چھوڑنا خلاف مصلحت ہو اور فدیہ ادا کرنے پر دشمن تیار نہ ہوں، تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟ صاحب تعلیمات نے لکھا ہے کہ ایسی صورت میں وہ شاہی قیدی ہوں گے۔ اور ان سے ایسا ہی سلوک کیا جائے گا لیکن اپنے فرمایا ہے کہ ایسی شکل میں وہ غلام بنا لیے جائیں گے۔ صاحب تعلیمات نے آپ کے اس دعوے کی دلیل میں قرآن کریم سے ثبوت مانگا تھا۔ سو آپنے اپنے جواب میں اس طرف توجہ منعطف نہیں فرمائی۔ اور قرآن کریم سے اسیران جنگ کو غلام بنانے کے جواز میں ثبوت پیش نہیں کیا۔ البتہ دو دلیلیں پیش کی ہیں۔ اول تو یہ کہ جب دشمن مسلمان اسیران جنگ کو غلام بنا کر رکھیں تو مسلمان ان کے قیدیوں کو کیوں نہ غلام بنائیں۔ بات تو ہے یہ جی لگتی ہوئی لیکن اس کا کیا علاج کہ قرآن کریم مسلمانوں کو اس سطح سے بہت بلند لے جانا چاہتا ہے کہ اگر دشمن تمہارے ساتھ نازیبا سلوک کریں تو تم بھی ایسا ہی ناشایستہ سلوک ان سے کرو۔ مسلمانوں کو تو یہ بھی اجازت نہیں دیگئی کہ مشرکین کی مٹی کی مورتیوں کو بھی گالی دیں۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ ان غلاموں

سے انتہائی رافت و رحمت کے سلوک کا حکم دیا گیا ہے یہ بات از خود آپ کے قائم کردہ اصول کے خلاف ہے۔ کفار تو آپ کے قیدیوں سے انتہائی بدسلوکی کا برتاؤ کریں اور آپ انہیں اپنی سوسائٹی کے بہترین افراد میں جگہ دیں۔ پھر اگر آپکا اصول مان لیا جائے تو کیا آپ اس کی بھی اجازت دیں گے کہ دشمن اگر مسلمان قیدی عورتوں سے کوئی گستاخی کریں، تو اس کے بدلے میں مسلمان بھی ان کی قیدی عورتوں سے ایسا ہی سلوک کریں؟ اسلام کے اصول تو بالکل "اپنے ہیں" اور یہ انھیں کے ماتحت حکم دیگا۔ دنیا خواہ کچھ کرے۔

دوسری دلیل پھر اصحاب رسول اللہ اور اہل بیت کے طرز عمل کی پیش کی ہے۔ میرے لیے تو یہ کافی ہوسکتی ہے لیکن معترض اگر کہیں کہ آپ تو وعدہ کر چکے ہیں کہ قرآن سے باہر نہیں جاؤں گا پھر اسی سے ثبوت کیوں نہیں دیا جاتا، تو کیا حق بجانب نہیں ہوگا؟

آپ نے فرمایا ہے کہ احساناً قیدیوں کو چھوڑ دینے میں مسلمانوں کو بہت نقصان رہتا ہے کہ اس صورت میں کوئی قوم اتنی احمق نہ تھی کہ زر فدیہ ادا کرتی لیکن میں تو دیکھتا ہوں کہ بطور احسان چھوڑ دینے میں جو فائدے حاصل ہوئے زر فدیہ کے درہم و دینار انکا کم ہی مقابلہ کرسکتے ہیں۔ اس سے اسلام کے متعلق لوگوں کی ذہنیت بدل گئی۔ آنحضرت نے ہزارہا قیدی بلا فدیہ لیے رہا کر دیے اور ان احسانات کا جو اثر ہوا اس کے شاہد زمین و آسمان ہیں۔ پھر سوال تو غلام بنانے اور انھیں فروخت کرنے کا ہے اس کے متعلق فرمائیے کہ قرآن کا کیا حکم ہے؟ اور آج اگر کوئی قوم فدیہ نہ ادا کرے، اور مسلمان ان کے اسیران جنگ کو احساناً نہ چھوڑنا چاہیں تو ان سے کیا سلوک کریں؟ مَا ملکت ایمانکم اور اسیران جنگ کی بحث آج بڑے اہم مسائل میں سے ہے۔ اسے ضرور حل کیجیے۔

(باقی)

الجواب

توبہ کا مسئلہ | توبہ کے مسئلہ میں میرے اور صاحب تعلیمات قرآن کے درمیان لفظی سی نزاع نہیں ہے جیسا کہ آپ نے خیال فرمایا ہے، بلکہ یہ ایک اصولی نزاع ہے۔ صاحب تعلیمات نے لکھا تھا۔

"آدم کے گناہ کو اللہ نے معاف نہیں کیا اور نہ ان کو جنت سے نکالتا۔ صرف ان کی توبہ قبول کی"۔

اس پر مجھے دو حیثیتوں سے سخت اعتراض ہے :-

اولاً، اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے توبہ قبول ہونے کے بعد بھی گناہ باقی رہتا ہے اور اس کی سزا ملتی ہے۔ یہ بات قرآن کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔

ثانیاً، قرآن مجید میں کہیں یہ نہیں فرمایا گیا کہ ہم نے آدم کا گناہ معاف نہیں کیا۔ برعکس اس کے وہاں تو یہ ارشاد ہوا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو برگزیدہ کیا اور ان کی توبہ قبول کی اور انہیں ہدایت بخشی۔ یہ محض صاحب تعلیمات کا اپنا قیاس ہے کہ اللہ نے چونکہ حضرت آدم کو جنت سے نکال دیا۔ اور توبہ کے بعد انہیں واپس نہیں کیا" لہٰذا" (اور یہ وہی "لہٰذا" ہے جس کی خود آپ نے اپنے مضمون ایمان بالرسالت میں مذمت فرمائی ہے) اللہ نے آدم کا گناہ معاف نہیں کیا۔ قرآن مجید میں اس قسم کی قیاس آرائی کو میں اصولاً ناجائز سمجھتا ہوں، اور یہی وہ تفسیر بالرائے ہے جس کو ہمیشہ سے علمائے حق ناجائز کہتے آئے ہیں۔

امر اول کے متعلق جو تصریحات قرآنی اس سے پہلے میں اپنے ایک مضمون میں نقل کر چکا ہوں، معلوم ہوتا ہے کہ ان سے آپ کی تشفی نہیں ہوئی؛ لہٰذا اب میں ذرا تفصیل کے ساتھ اس پر بحث کروں گا۔

معنی توبہ | توبہ کے لغوی معنی وہی ہیں جو آپ نے بیان کیے ہیں، یعنی عود اور رجوع۔ اگر یہ بندے

کی طرف سے خدا کی جانب ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ اپنی نافرمانی پر نادم ہوا، اور از سر نو فرمانبرداری کی طرف پلٹ آیا۔ اور اگر یہ خدا کی جانب سے بندے کے حال پر ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ حضرت حق نے اس کی ندامت اور اس کے رجوع الی الطاعت کو قبول فرما لیا اور اپنی مہربانی کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اب سوال یہ ہے کہ بندے کی ندامت و رجوع الی الطاعت، اور اللہ تعالیٰ کے اس کی جانب مہربانی کے ساتھ متوجہ ہونے کا نتیجہ کیا ہے؟ آیا یہ کہ اس کا گناہ بخش دیا جائے اور جس سزا کا وہ مستحق ہو چکا تھا اس سے معاف کر دیا جائے؟ یا یہ کہ صرف توبہ قبول کر لی جائے مگر گناہ پھر بھی باقی رہے اور اس کی سزا پھر بھی دی جائے؟ صاحب تعلیمات دوسری صورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ جس نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔ (کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۶ : ۲) پہلی صورت کو ترجیح دیتا ہے، اور بار بار یقین دلاتا ہے کہ جب تم گناہ کرکے اس پر شرمسار ہوگے اور نافرمانی کے بعد پھر اطاعت میں داخل ہو گئے تو ہم تمہارے جرم کو مہربانی سے ڈھانک دیں گے (مغفرت) اور اس جرم کے اثر کو مٹا دیں گے۔ (عفو)۔

فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵ : ۶)۔	پس جس نے ظلم کرنے کے بعد توبہ کی اور نیک رویہ اختیار کیا تو اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے یقیناً اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔
مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۶ : ۶)	جس کسی نے تم میں سے کوئی برا فعل جہالت کی بنا پر کیا، پھر اس کے بعد توبہ کر لی اور نیک رویہ اختیار کر لیا تو یقیناً اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔
وَ الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا	اور جن لوگوں نے برے اعمال کیے پھر ان کے بعد توبہ کر لی اور ایمان لائے تو ان کے بعد تیرا رب یقیناً بخشنے والا

لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۷ : ۱۹) — مہربان ہے۔

وَاِنِّىْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى (۲۰ : ۴) — اور یقیناً میں اس کیلیے بڑا بخشنے والا ہوں جس نے توبہ کی اور ایمان لایا، اور نیک عمل کیا پھر راہ راست اختیار کی۔

وَهُوَ الَّذِىْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ (۴۲ : ۳) — اور وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے اور گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔

غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ (۴۰ : ۱) — وہ گناہوں کو بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔

یہ آیات صاف بتا رہی ہیں کہ بندے کی توبہ کا یقینی نتیجہ حق تعالیٰ کی طرف سے قبول توبہ ہے اور قبول توبہ کا یقینی نتیجہ عفو و مغفرت ہے۔ اور کیسے نہ ہو؟ جو خدا اپنے بندوں میں یہ صفت دیکھنا چاہتا ہے کہ وَ اِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ (۴۲ : ۴) اور وَ الْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۳ : ۱۴) کیا وہ خود اپنے لیے اس بات کو پسند کر سکتا ہے کہ ایک بندہ اپنی فطری کمزوری کی بنا پر گناہ کرنے کے بعد شرمسار ہو اور اس کے آگے گڑگڑا گڑگڑا کر معافی کا طلبگار رہو، مگر وہ اسے معاف نہ کرے اور سزا دے کر ہی چھوڑے؟ اگر خدا میں یہ صفت ہو تو اس کے سوا پھر کون ہے جس سے انسان مغفرت کی امید کر سکے؟ وَ مَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ۔ (۳ : ۱۴)۔

آدمؑ کا گناہ | جب یہ قاعدۂ کلیہ قرآن مجید سے معلوم ہو گیا تو آدم علیہ السلام کے متعلق جو یہ فرمایا گیا ہے کہ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۲ : ۴)۔ اور ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَ هَدٰى (۲۰ : ۷) اس کے معنی یہی لینے چاہییں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی اور ان کے گناہ کو معاف کر دیا۔ محض اس واقعہ پر کہ آدم علیہ السلام جہاں سے نکالے گئے تھے، وہاں واپس نہیں کیے گئے، کوئی قیاس قائم کرنا، اور قرآن کے بتلائے ہوئے

قاعدے کے خلاف اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اللہ نے قبول توبہ کے باوجود حضرت آدم کے گناہ کو معاف نہیں کیا، ایک ناجائز قیاس آرائی ہے۔ حضرت آدم نے صرف ایک حکم کی خلاف ورزی کی تھی، کوئی شرک نہیں کیا تھا کہ وہ معاف نہ ہو سکتا۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ (۴: ۱۸) اور بالفرض اگر وہ شرک بھی کرتے، تو اس سے توبہ کر لینے کے بعد وہ اسی طرح معاف کر دیے جاتے جس طرح عرب کے مشرکین اسلام لانے کے بعد معاف کر دیے گئے۔ لہذا ایک مسلمان پر واجب ہے کہ حضرت آدم کے جنت میں واپس نہ جانے کی کوئی اور وجہ تلاش کرے، اور اگر کوئی وجہ اس کو نہ ملے، یا کسی وجہ پر اس کا اطمینان نہ ہو، تو سکوت اختیار کرے۔ اپنی عقل سے ایسے نتیجے نکالنا جو قرآن مجید کی تعلیم کے خلاف ہوں، کسی مومن قانت کا کام نہیں ہے۔

تفسیر القرآن بالقرآن کا غلط طریقہ | یہ بات ایک حد تک قابل مسرت ہے کہ آپ نے صاحب تعلیمات کا قدم بقدم اتباع نہیں کیا، اور قرآن مجید کے بیانات پر اپنے قیاسی "لہذا" کی عمارت نہیں اٹھائی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات قابل افسوس بھی ہے کہ آپ نے قرآن مجید سے استدلال کر کے اس سے وہ نتیجہ نکالنا چاہا ہے جو خود قرآن ہی کے مقرر کیے ہوئے ایک قاعدۂ کلیہ کے خلاف ہے۔ آپ کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ :-

> "آدم علیہ السلام نے گناہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی سزا اس صورت میں دی کہ جنت سے نکال باہر کیا۔ آدم علیہ السلام نے اس پر توبہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کر لی، مگر گناہ کی وہ سزا بحال رکھی جو ان کو دی گئی تھی، اور گناہ کے اثرات کو زائل نہ کیا، البتہ ان کے لیے قبول توبہ کی یہ شکل اختیار کی کہ انہیں جنت میں واپس آنے کا راستہ بتا دیا۔"

یہ نتیجہ جو آپ نکال رہے ہیں قرآن مجید کی اس تصریح کے خلاف ہے کہ وَھُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ عَنْ عِبَادِہٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ (۴۲: ۲) اس آیت میں تصریح ہے کہ قبول توبہ کے بعد گناہوں کے اثرات مٹا دیے جاتے ہیں۔ مگر آپ اس کے برعکس فَتَابَ عَلَیْہِ وَھَدٰی

سے یہ معنی نکال رہے ہیں کہ توبہ قبول کرنے کے بعد گناہ کا اثر باقی رہا اور صرف اس شکل میں توبہ قبول کی گئی کہ وہ راستہ بتا دیا گیا جس سے گناہ کے اثرات زائل ہوجائیں۔ یہ بات تفسیر القرآن بالقرآن کے اصول کے خلاف ہے، قرآن سے قرآن کی تفسیر کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایک آیت کی ایسی تفسیر کی جائے جو قرآن مجید کی دوسری آیت یا آیات سے مطابقت رکھتی ہو۔

گناہ سزا اور توبہ کی حقیقت میں نے سزا اور گناہ کے "فلسفہ" پر جو روشنی ڈالی تھی وہ اسی غرض سے تھی وہ میرا اپنا اختراعی فلسفہ نہ تھا، بلکہ قرآن مجید کے ارشادات سے ماخوذ تھا، اگر آپ اس پر غور فرماتے اور اس کو سمجھ لیتے تو حضرت آدم کی توبہ کے مقبول ہونے اور ان کا گناہ معاف ہوجانے اور اس کے باوجود ان کے جنت سے نکالے جانے کی وجہ آپ کی سمجھ میں آجاتی۔ آئیے، اب قرآن مجید سے اس فلسفہ کی تھوڑی سی تشریح سن لیجیے۔

سب سے پہلے یہ قاعدہ ذہن نشین ہوجانا چاہیے کہ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے۔ ایک نظام جسمانی۔ دوسرے عقل جو غور و فکر کرتی اور بھلے برے میں تمیز کرتی ہے۔ پہلی چیز پر اللہ تعالیٰ کے قوانین طبیعی (Physical Laws) حکمران ہیں، اور دوسری چیز پر اس کے عقلی احکام و اوامر (R .tional Laws) کی حکومت ہے۔ طبیعی قوانین ایک خاص ڈھنگ پر بنائے گئے ہیں اور سارے عالم مادی کی طرح انسان کا جسم بھی ان کے ماتحت ہے۔ اس عالم میں انسان جو حرکت بھی کرے گا اس کا وہی نتیجہ برآمد ہوگا جو قوانین طبیعی کے تحت مقرر ہے، اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مصلحت سے کسی خاص موقع پر اس کو بدل دے۔ بخلاف اس کے عالم عقلی میں حرکات کے نتائج اس طور پر مقرر نہیں ہیں جس طور پر عالم طبیعت میں مقرر تھا۔ یہاں ان کے درمیان اس لحاظ سے تمیز کی جاتی ہے کہ وہ امر الٰہی کے اتباع میں ہیں یا اس کے خلاف۔ اتباع میں ہیں تو وہ اعمال صالحہ ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر خوش ہوتا ہے اور انعام دیتا ہے، خواہ قوانین طبیعی کے ماتحت ان کے نتائج

بالکل مختلف صورت میں ظاہر ہوں۔ اور اگر وہ امر آلہی کے خلاف ہیں تو وہ گناہ ہیں، اعمال قبیحہ ہیں اللہ تعالیٰ ان پر غضبناک ہوتا ہے، اور سزا دیتا ہے خواہ قوانین طبیعی کی رو سے ان کے نتائج اس دنیا میں خوش گوار ہوں۔ اگر انسان کسی گناہ کے بعد توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف کر دیتا ہے، اس کا غضب فرو ہو جاتا ہے اور اس فعل کا وہ عقلی نتیجہ ظاہر نہیں ہوتا جو قوانین عقلی کی رو سے ایسے افعال کے لیے مقرر کیا گیا ہے لیکن توبہ سے اس فعل کے طبیعی نتائج کا بدل جانا ضروری نہیں ہے، اس لیے کہ جس طرح گناہ ایک امر عقلی ہے اسی طرح توبہ بھی ایک امر عقلی ہے قوانین طبیعی کے اعتبار سے گناہ کی حیثیت محض ایک حرکت کی ہے، اور حرکت سے اسباب طبیعی میں جو تحریک ہوتی ہے، وہ بہر حال اپنے طبیعی نتائج کی طرف منجر ہوتی ہے۔ توبہ سے اس تحریک میں کوئی انقطاع واقع نہیں ہوتا، اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص موقع پر خاص مصلحت سے اس کے لیے قوانین طبیعی میں کوئی جزئی ترمیم کر دے چونکہ اللہ تعالیٰ عالم عقلی کی طرح عالم طبیعی کا بھی حاکم مطلق ہے، اس لیے بسا اوقات وہ عالم طبیعت میں بھی امور عقلیہ کے مطابق تصرف کرتا ہے، مثلاً کسی قوم کے گناہوں پر اسے دنیا میں عذاب دینا اور کسی نیک بندے کو ان نتائج سے بچا دینا جو اس کے فعل پر قوانین طبیعی کے تحت رونما ہونے چاہئے تھے اور کسی گناہ گار بندے کی توبہ کے بعد ان اثرات کو بھی زائل کر دینا جو قوانین طبیعی کی رو سے ظاہر ہونے والے تھے لیکن یہ سب کچھ حق تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہے۔ اگر وہ چاہے تو امور عقلیہ کی خاطر قوانین طبیعی میں ترمیم کر دے جس طرح حضرت ابراہیم یا قوم یونس کے لیے کی تھی، اور نہ چاہے تو نہ کرے، جیسا کہ ہم رات دن اہل خیر کو دنیوی مصائب میں مبتلا ہوتے اور اہل شر کو پھلتے پھولتے دیکھتے ہیں۔

جو کچھ بیان ہوا ہے، قرآن مجید کی بکثرت آیات اس پر شہادت دیتی ہیں۔ قرآن کی رو سے انسان اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کے احکام و اوامر کا مخاطب اس حیثیت سے نہیں ہے کہ وہ ایک جسم نامی متحرک بالارادہ ہے بلکہ اس حیثیت سے ہے کہ وہ صاحب عقل و فکر، اور قوت علمیہ سے بہرہ ور ہے، قد

فَصَّلْنَا الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ (۶ : ۱۲) كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُوْنَ (۱۰ : ۳) وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ (۳۰ : ۴) وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَابِ (۲ : ۳۶) وَكَذٰلِكَ يُبَيِّنُ الْاٰيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ (۲ : ۲۱)

اس عقل وفکر کو خطاب کرکے جتنے امر ونہی کے احکام دیے گئے ہیں وہ سب امور عقلیہ ہیں، ان کے اتباع یا ان کی خلاف ورزی میں جتنے افعال انسان کرتا ہے، وہ بھی اس اعتبار سے عقلی افعال ہیں، اور ان پر ثواب وعقاب جو کچھ ہوتا ہے وہ بھی ایک امر عقلی ہے۔ دیکھیے جو لوگ اللہ سے کفر کرتے ہیں اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان پر وہ غضبناک ہوتا ہے:۔

مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ (۱۶ : ۴) عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ (۴۸ : ۱) اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (۵۸ : ۳) حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ (۴۲ : ۲) اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۲۰ : ۴) یہ کفر اور نافرمانی بھی عقلی ہے اور اس پر غضب بھی عقلی ہے۔

پھر جب اللہ کسی پر غضبناک ہوتا ہے تو اس سے انتقام[1] لیتا ہے، اور اسے سزا دیتا ہے:۔

وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ (۵ : ۱۳) فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا (۳۰ : ۵) اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ (۳۲ : ۲) قَالُوْا اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كَافِرُوْنَ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ

[1] لفظ انتقام کو لوگ نفسانی انتقام کے معنوں میں لیتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کے حق میں یہ لفظ سن کر کان کھڑے کرتے ہیں لیکن درحقیقت یہ انتقام عقلی ہے، عقل وحکمت کا مقتضی یہ ہے کہ حکم کی خلاف ورزی پر حاکم ناخوش ہو اور اس کی سزا دے اور انجام کار میں نافرمان اور فرمانبردار برابر نہ رہیں، اسی چیز کی طرف قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ؟ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ (۳۸ : ۳)۔

(۴۴:۲) فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ (۴۳:۴)۔ انتقام کبھی تو صرف آخرت میں جیسے عذاب جہنم ہی ہوگا يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ (۴۴:۲) اور کبھی دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ اسباب طبیعی سے کام لے کر ان قوموں پر بلائیں نازل کرتا ہے جن سے وہ انتقام لینا چاہتا ہے، فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا (۷:۱۶) اِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ (۱۵:۵) فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا (۲۹:۴)

ان آیات میں جن دنیوی عذابوں کا ذکر ہے وہ ان قوموں کی حرکات کے طبیعی نتائج نہ تھے، کیونکہ رسولوں کی تکذیب اور آیات الٰہی سے کفر وہ چیز نہیں جس پر قوانین طبیعی کے تحت آندھی اور سیلاب آئیں یا پتھراؤ ہو، یا زمین دھنس جائے۔ اگر کسی خاص موقع پر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو ان امور عقلیہ پر اسباب طبیعی بھی حرکت میں آجاتے ہیں لیکن عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ رات دن ہم دیکھتے ہیں کہ رسولوں کی تکذیب کی جاتی ہے اور آیات الٰہی سے کفر ہوتا ہے مگر ہر ایسے موقع پر سیلاب نہیں آتے۔ نہ پتھراؤ ہوتا ہے، نہ زمین دھنستی ہے، اس لیے کہ یہ افعال دراصل عقلی افعال ہیں، اور ان کا اصلی نتیجہ عقلی نتیجہ ہے جو قیامت کے دن ظاہر ہوگا۔ اس دنیا میں ان کے برے نتائج کا ظہور ضروری نہیں ہے۔

اسی طرح توبہ (جو ایک امر عقلی ہے) کا بھی عقلی نتیجہ صرف یہ ہے کہ اللہ کا غضب جو گناہ پر بھڑک اٹھا تھا، فرو ہو جائے، اور انسان اس کی عقلی سزا (یا قرآن کی اصطلاح میں انتقام) سے معاف کر دیا جائے۔ رہی یہ بات کہ اس فعل کے جو طبیعی نتائج قوانین طبیعی کے تحت مترتب ہونے والے تھے وہ بھی توبہ کے ساتھ ہی روک دیے جائیں، تو یہ ضروری نہیں ہے۔ اللہ جب چاہتا ہے تو کسی خاص مصلحت کی بنا پر ان کو روک بھی دیتا ہے، جیسا کہ قوم یونس کے حق میں اس نے کیا۔ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (۱۰:۱۰) لیکن عموماً وہ عالم مادہ و اجسام میں امور عقلی

کی خاطر عادت مقررہ کو نہیں بدلتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ شراب کی عادت رکھنے کے بعد توبہ کر لیتے ہیں ان کے اعضاء رئیسہ کی خرابیاں توبہ کے ساتھ دور نہیں ہوتیں۔ البتہ وہ توبہ کی بدولت اس کی عقلی سزا سے حسب وعدۂ آلہی مصئون ہو جاتے ہیں۔

اب یہ بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ آدم علیہ السلام نے جو فعل کیا تھا اس کی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک نفس فعل ہونے کی حیثیت، یعنی شجر ممنوع کو چکھنا جس کا ایک طبیعی نتیجہ مقرر تھا۔ دوسری اس کی حیثیت کہ وہ امر آلہی کے خلاف تھا، ظلم اور گناہ تھا جس کا عقلی نتیجہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور انتقام کی صورت میں ظاہر ہونا چاہیئے تھا۔ حضرت آدم یہ فعل کرنے کے بعد اس کے طبعی اور عقلی دونوں نتائج کے مستحق ہو چکے تھے۔ مگر جب انھوں نے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ نے اس امر عقلی کی بنا پر اس فعل کے عقلی اثر کو زائل کر دیا، یعنی ان کی توبہ قبول کر کے ان کے گناہ کو معاف کر دیا، انھیں برگزیدگی کا شرف عطا کیا اور ان کو راہ راست کی طرف ہدایت عطا فرمائی۔ رہا ان کے فعل کا طبیعی نتیجہ، تو وہ ظاہر ہوا۔ وہ اپنی بشری کمزوریوں کے ظاہر ہو جانے کے بعد قیام جنت کے لائق نہ رہے تھے اس لیے انھیں زمین پر اتار دیا گیا، اور جنت میں واپس آنے کے لیے شرط لگا دی کہ اپنے نفس پر غلبہ پاکر قیام جنت کا استحقاق ثابت کرو۔ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىۙ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰى (۷۹:۲)

آپ کہتے ہیں کہ توبہ کا یہ اثر بھی کیوں نہ ہوا کہ ان کے فعل کا طبیعی اثر بھی زائل کر دیا جاتا۔ لیکن یہ اللہ سے خرق عادت کا مطالبہ ہے جس کو پورا کرنے پر وہ مجبور نہیں۔ وہ یقیناً خرق عادت پر قادر ہے اور جب اس کی مصلحت کا اقتضا ہوتا ہے تو وہ اپنی اس قدرت کو ظاہر بھی کرتا ہے، لیکن امور عقلیہ کی خاطر قوانین طبیعی میں ترمیم کرنا ہمیشہ ضروری نہیں ہے، اور نہ مصلحت خاص کے بغیر وہ کبھی ایسا کرتا ہے بلکہ حضرت آدم کے معاملہ میں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ مصلحت اسی کی مقتضی تھی کہ ان کے فعل کا طبیعی

نتیجہ ہبوط کی صورت میں ظاہر ہوتا، کیونکہ وہ جنت میں رہنے کے لیے نہیں بلکہ زمین کی خلافت کے لیے پیدا کیے گئے تھے اور کبھی نہ کبھی ان کا زمین پر اترنا ضروری تھا۔

غلامی کا مسئلہ | مولٰنا اسلم جیراجپوری نے اسیران جنگ کو غلام بنانے کے خلاف اس آیت سے استدلال کیا ہے:

حَتّٰی إِذَا أَثْخَنْتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ یہاں تک کہ جب ان کا زور توڑ لو تو ان کو قید کرلو۔

فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً (۴۷:۱)۔ پھر یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر۔[1]

اس آیت سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسیران جنگ کے حق میں دو ہی صورتیں قرآن نے تجویز کی ہیں۔ یا تو بلا کسی معاوضہ کے انھیں رہا کیا جائے یا معاوضہ لے کر لیکن رہا کرنے کا حکم قطعی ہے، اور غلام بنا کر رکھنا کسی حال میں جائز نہیں۔

اب ہم کو تین حیثیتوں سے اس آیت پر نظر ڈالنی چاہیے:

اولاً یہ کہ آیت کے الفاظ سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟

ثانیاً یہ کہ قرآن مجید کی دوسری آیات کی روشنی میں اس کی صحیح تفسیر کیا ہے۔

ثالثاً یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کیا مفہوم سمجھا اور کس طرح عمل کیا؟

آیت کا مفہوم | آیت میں مَنًّا اور فِدَاءً دونوں کے ساتھ لفظ اِمَّا آیا ہے، جو یا تو تخییر کے معنی میں ہے یا اباحت کے معنی میں یعنی اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ تمہیں اختیار ہے چاہے احسان کرو چاہے فدیہ لے لو، یا یہ مطلب ہے کہ تمہارے لیے احسان کرنا بھی جائز ہے اور فدیہ لینا بھی۔ اس سے کسی طرح بھی حصر کا مفہوم نہیں نکلتا کہ تم ان دونوں صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کرنے پر مجبور ہو۔ حکم قطعی تو صرف اس حد تک تھا کہ فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰى إِذَا أَثْخَنْتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ۔ یعنی جب کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو انکی گردنیں مارو یہاں تک کہ جب تم ان کو خوب مار چکو اور ان میں مقابلے کی طاقت باقی نہ رہے تو بقیۃ السیف لوگوں کو باندھ لو۔ اس حکم کے بعد مسلمانوں کو اختیار دیا جاتا ہے یا ان کو مجاز

[1] ترجمہ خود مولانا اسلم جیراجپوری کا ہے۔

کیا جاتا ہے کہ چاہیں قیدیوں کے ساتھ احسان کریں، چاہیں فدیہ لے لیں۔

اس کے بعد لفظ مَنّ قابل غور ہے۔ مَن کے معنی صرف احسان کے ہیں۔ "احسان رکھ کر چھوڑ دو" مترجم کا اپنا اضافہ ہے۔ اگرچہ احسان کی ایک صورت یہی ہے کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے لیکن ایک صورت یہ بھی تو ہے کہ قیدی کی حالت میں اُن کے ساتھ احسان کا برتاؤ کیا جائے۔ اس صورت کی نفی، اور صرف رہائی میں مفہوم احسان کا انحصار کہاں سے نکلتا ہے۔ اگر قرآن میں کوئی لفظ یا اشارہ ایسا ہے جس سے یہ مفہوم نکلتا ہو کہ احسان سے مراد صرف رہا کر دینا ہے، تو براہ کرم اس کو بیان کیا جائے۔

قرآن مجید کی دوسری آیات اب تلاش کیجیے کہ قرآن میں کونسی آیت ایسی ہے جس میں یہ حکم ہو کہ قیدیوں کو بلا عوض رہا کرنے یا فدیہ لے کر چھوڑنے کے سوا کوئی تیسری صورت جائز نہیں ہے اور ان کو غلام بنا کر رکھنا حرام ہے۔ یقیناً ایسی کوئی آیت آپ پیش نہیں کر سکتے۔ برعکس اس کے لونڈیوں اور غلاموں کے متعلق بکثرت احکام آپ کو قرآن میں ملتے ہیں جو مذکورہ بالا آیت کے بعد نازل ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے کے احکام کے متعلق تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت تک رہائی کا حکم قطعی نہیں آیا تھا اس لیے لونڈی غلاموں کا رکھنا جائز تھا اور ان کے متعلق احکام بھی آئے تھے لیکن بعد کی آیات کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟ اس آیت کا جو مفہوم آپ لے رہے ہیں اس کی رو سے تو یہ آیت نازل ہوتے ہی تمام لونڈی غلام رہا ہو جانے چاہییے تھے۔ مگر بعد کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رہا نہیں ہوئے، اور ان کے متعلق اسی طرح احکام آتے رہے جس طرح پہلے آتے تھے۔

آیت مذکورہ سورۂ محمدؐ کی ہے جس کا کچھ حصہ مکہ میں اترا ہے، اور کچھ حصہ مدینۂ طیبہ کے ابتدائی زمانہ میں۔ ابن عباسؓ نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کا مطلب یہ ہے کہ جب جنگ بدر کے روز کفار سے تمہارا مقابلہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت جنگ بدر سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس کی تائید قرآن مجید کی یہ آیت کرتی ہے۔ مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَهٗ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ اِلٰی اٰخِرِ الْاٰیَة (۸:۹)

یہ آیت جنگ بدر کے قیدیوں کے حق میں نازل ہوئی ہے اور اس میں جو عتاب نازل ہوا ہے وہ صاف اشارہ کرتا ہے

کہ سورۂ محمد والی آیۃ میں شدّ وثاق سے پہلے اثخان فی الارض کا جو حکم دیا گیا تھا، اس پر پورا پورا عملدرآمد نہ کرنے کی وجہ سے عتاب فرمایا گیا پس متحقق ہو گیا کہ سورۂ محمد کی یہ آیت ۲ھ میں جنگ بدر سے پہلے نازل ہوئی ہے۔

اب ملاحظہ ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ان لونڈیوں کو جائز کیا جاتا ہے جو جنگ میں گرفتار ہو کر آئی ہوں۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ (۳۳ : ۶)

اے نبی ہم نے تمہارے لیے حلال کی ہیں تمہاری وہ بیبیاں جن کے تم نے مہر ادا کیے ہیں، اور وہ لونڈیاں جو خدا نے تم کو جنگ میں بطور غنیمت دلوائی ہیں۔

اس آیت میں مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ سے مراد لونڈیاں ہیں، اور لونڈیوں کی تعریف مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ جو اللہ تعالیٰ نے تم کو لڑائی میں بطور غنیمت دلوائی ہوں، سے کی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ بدر سے پہلے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی فے عطا نہیں کیا تھا۔ لہٰذا بدر کے بعد لڑائیوں میں جو عورتیں مسلمانوں کے پاس قید ہو کر آئیں انہی کو لونڈیاں بنا کر رکھنا قرآن مجید نے جائز قرار دیا ہے۔ بعد پھر ارشاد ہوتا ہے۔

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ (۳۳ : ۶)

اس کے بعد تمہارے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں ہیں اور نہ یہ کہ ان کو بدل کر دوسری بیبیاں کر لو۔ اگرچہ تم کو ان کا حسن پسند آئے مگر لونڈیاں حلال ہیں۔

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی ہے جب ازواج مطہرات کی تعداد گیارہ تک پہنچ چکی تھی حضور کا آخری نکاح ۷ھ کے خاتمہ پر ہوا ہے لہٰذا اس آیت کے نزول کا زمانہ ۸ھ سمجھنا چاہیے یہاں پھر مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ کی تحلیل موجود ہے۔

۵ھ کے اواخر میں غزوۂ اوطاس ہوا بہت سی عورتیں پکڑی ہوئی آئیں ان میں جو بیاہی ہوئی تھیں ان کے معاملے میں مسلمان متردد ہوئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (۴ : ۴)

تمہارے لیے بیاہی ہوئی عورتیں حرام ہیں، مگر وہ عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو جنگ میں گرفتار ہو کر تمہارے ہاتھ آئیں

سورۂ نساء کے پہلے رکوع میں ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ( )

اور اگر تم کو خوف ہو کہ یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان سے نکاح کر لو دو دو تین تین چار چار۔ اور اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی نکاح کرو یا جو لونڈی تمہارے قبضہ میں ہو۔

یہ حکم سنہ اور سنہ ہجری کے درمیان کا ہے۔ ان مختلف احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً سے قرآن مجید کا مقصود وہ نہ تھا جو مولانا اسلم جیراجپوری نے سمجھا ہے۔ ورنہ اس آیت کے نزول کے بعد لونڈیوں کا رکھنا سرے سے ممنوع ہو جاتا نہ کہ اس کی اجازت دی جاتی اور ان کے متعلق احکام دیے جاتے

ایک نکتہ | اس سلسلہ میں مولانا اسلم جیراجپوری نے ایک لطیف نکتہ بھی بیان فرمایا ہے۔ وہ یہ کہ قرآن میں جہاں جہاں مملوکوں کا ذکر ہے بصیغۂ ماضی یعنی ما ملکت ایمانکم ہے بصیغۂ مستقبل کہیں نہیں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے جن غلاموں کے وہ مالک ہو چکے تھے صرف انہی کی ملکیت قائم رکھی گئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن میں جو احکام بصیغۂ ماضی ارشاد ہوئے ہیں وہ مستقبل کے لیے نہیں ہیں۔ مثلاً ربیبہ لڑکیاں اپنے سوتیلے باپوں کے لیے جس آیت میں حرام کی گئی ہیں اس کے الفاظ یہ ہیں وَرَبَآئِبُکُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ مِّنْ نِّسَآئِکُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِہِنَّ (۴: ۴) یہاں دَخَلْتُمْ صیغۂ ماضی ہے لہٰذا صرف ان عورتوں کی بیٹیاں حرام ہوئیں جو نزول آیت سے پہلے مسلمانوں کے نکاح میں آ چکی تھیں۔ آیندہ کے لیے یہ حکم نہیں ہے وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ (۸: ۵) میں بھی خمس کا حکم صرف ماضی کے لیے ہے۔ بعد کے غنائم میں خمس نہیں ہے۔ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ (۶۲: ۲) میں جمعہ کی نماز کا حکم بھی ان لوگوں کے لیے تھا جو اس وقت ایمان لا چکے تھے۔ بعد کے مسلمان اس حکم سے بچ گئے۔ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْہِ مِنْ شَیْءٍ فَحُکْمُہٗٓ اِلَی اللّٰہِ (۴۲: ۲)

میں صرف ان اختلافات کا فیصلہ احکام الٰہی کی رو سے کرنے کا حکم ہے جو پہلے واقع ہو چکے تھے۔ بعد کے اختلافات میں حکم الٰہی کی طرف رجوع کرنا ضروری نہ ہوگا۔ غرض جناب مولانا نے یہ ایسا نکتہ نکالا ہے جو آج تک کسی کو نہ سوجھا تھا۔ ورنہ اب تک مسلمان ان بہت سے احکام کی بندشوں سے آزاد ہو چکے ہوتے جو بصیغۂ ماضی دیے گئے تھے! اور جن میں اللہ میاں نے (نعوذ باللہ) شاید بے احتیاطی کی بنا پر استقبل کا صیغہ استعمال نہ کیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس طرح تو کافروں اور آیات الٰہی کو جھٹلانے والوں کے لیے بھی آتش دوزخ سے رہائی مل جاتی کیونکہ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ (۴۶:۱۱) میں کفروا اور کذبوا دونوں ماضی کے صیغے ہیں۔ لہٰذا بعد کے تمام کفار و مکذبین اس وعید سے بچ گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی نکتہ آفرینی معنوی تحریف کی حد تک پہنچتی ہے۔ قرآن مجید کے معانی میں ایسی تحریف کرتے ہوئے ایک مسلمان کا ایمان لرز جانا چاہیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل | اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً اور مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کا کیا مفہوم سمجھا اور اس پر کس طرح عمل کیا۔

. بنی قریظہ کے حق میں حضرت سعد بن معاذ نے فیصلہ کیا کہ ان کے بالغ مرد قتل کیے جائیں اور عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنا لیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فیصلہ کو نافذ فرمایا۔

خیبر کی جنگ میں بہت سی عورتیں گرفتار ہوئیں اور وہ مسلمانوں میں تقسیم کی گئیں۔ ام المومنین حضرت صفیہ انہی عورتوں میں سے تھیں۔

غزوۂ حنین میں ۶ ہزار عورتیں اور بچے قید ہوئے۔ بعد میں ہوازن کا وفد حاضر ہوا اور اس نے سبایا کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ آنحضرت نے فرمایا کہ جو میرے اور بنی عبدالمطلب کے قبضہ میں ہیں ان کو میں احسان کے طور پر رہا کرتا ہوں۔ مگر دوسروں کے معاملہ میں حکم دینے کا مجھے حق نہیں۔ صرف سفارش کر سکتا ہوں۔ چنانچہ حضور کی سفارش پر انصار اور مہاجرین نے اپنے اپنے حصے کے سبایا کو چھوڑ دیا۔ مگر

بنو تمیم اور بنو فزارہ اور بنو سلیم کے نمایندوں نے انکار کیا۔ آخرکار حضور نے ان سے وعدہ کیا کہ عہد کی لڑائیوں میں جو سبایا ہاتھ آئیں گے ان میں سے ہم تمکو ایک ایک کے بدلے چھ چھ دیں گے۔ تب وہ ہوازن کے قیدیوں کو چھوڑنے پر راضی ہوئے۔

اوطاس کے سبایا کا اوپر ذکر ہو چکا ہے جن کے حق میں خود قرآن مجید کی آیت وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ نازل ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ حضور نے بعض مواقع پر قیدیوں کو احسان کے ساتھ رہا بھی کیا ہے کبھی قیدیوں کا مبادلہ بھی کیا ہے، اور کبھی زر فدیہ لے کر بھی چھوڑ دیا ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کے عہد میں بکثرت قیدی لونڈی غلام بنا کر بھی رکھے گئے ہیں۔ اور ان کو مسلمانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کیا قرآن مجید کے احکام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ سمجھنے والا اور ان کے مطابق عمل کرنے والا کوئی اور ہو سکتا ہے؟ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو ایسا سمجھتا ہے تو سمجھنے دیجئے اس کا معاملہ ہم خدا پر چھوڑتے ہیں لیکن مسلمانوں کا عقیدہ یہ نہیں ہے، اور وہ اسی قانون کو برحق سمجھتے ہیں جو اللہ کے رسول نے اپنے قول و عمل سے بنا دیا ہے۔ (باقی)

مکتبۂ علمیہ

ایک مکمل تجارتی کتب خانہ ہے جہاں سے ہر مذاق اور ہر علم و فن کی اُردو عربی فارسی اور انگریزی کتابیں مل سکتی ہیں۔ طلباء کے لیے درسی کتابوں کا بھی انتظام کیا گیا ہے بیرونی مقامات سے لوگوں کو بھی حسب فرمایش کتابیں بھیجی جا سکتی ہیں۔

مکتبۂ علمیہ۔ چارمینار حیدرآباد دکن

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن ، بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا۔ مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں۔ ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہونگی اُن کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام کسی طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیئے۔ ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرتے ہیں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لیے مضامین اور حل طلب مسائل تمام اڈیٹر کے نام سے بھیجے جائیں۔ لیکن اڈیٹر پر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

(طابع و ناشر ابوالاعلیٰ مودودی) مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن